









وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْكُمْ مِنْ رُسُلٍ إِلَّا قُلُوبًا

مَعْرُومَةً مِنْ سَبَابِ الْمَنَسِّ

یعنی

ڈاکٹر جان ولیم ڈریسپر ایم۔ اے۔ ایل ایل ڈی

کی شہرہ آفاق تصنیف

کا فنکٹ بٹون ریجن اینڈ سائنس

کا اردو ترجمہ

مترجم

ظفر علی خاں بی۔ اے (علیگ)

حسب ایما سے انجمن ترقی و حیدر آباد دکن

مطبوعہ فادہ عالم سٹیم پریس لاہور

ایک ہزار

سلاسل

طبعی ایل



# انتساب

عالی جناب نواب محسن الملک مولوی سید  
فہمی علی خاں صاحب مرحوم و مغفور جن کا نام  
مسلمانان ہند کی علمی تیارخ میں آب زر سے لکھا  
جا چکا ہے سب سے پہلے شخص تھے جن کی تحریک  
میں آج سے پندرہ سال پہلے اس کتاب کا ترجمہ  
اُردو میں کیا تھا۔ اس لئے میں اس کتاب کو جو اب  
نظر ثانی کے بعد حوثی کے ساتھ مکمل ہو کر شائع ہوئی  
عالی جناب مدوح کی پاک یاد کے ساتھ نسبت دینے  
کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ ✽ ظفر علی خاں



# معرکہ مذہب و سائنس

فہرست مضامین

از صفحہ ۳ تا ۱۰

صفحہ ۱

از صفحہ ۱ تا ۸۰

از صفحہ ۸۱ تا ۹۲

از صفحہ ۹۲ تا ۱۰۱

فہرست مضامین

اظلام نامہ

مقدمہ کتاب از مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے

حیات ڈاکٹر ڈرہیر از مترجم

دربارہ مصنف

## پہلا باب

سائنس کی ابتدا

یونانیوں کی مذہبی حالت پورے ترقی صدی قبل مسیح میں سلطنت ایران پر حملہ آور ہو کر  
 قدرت کے نئے نئے مناظر دیکھتے ہیں اور سنئے سنئے مذاہب و اقیقت حاصل کرتے ہیں۔  
 مقدونی فوج کشی سے فن حرب فن انجیری اور سائنس کو جو حرکت پہنچی ہے اسکندریہ میں ایک دارالعلم کے قیام  
 کا باعث ہوئی ہے یہی دارالعلم ہیں تجربہ شاہدہ اور پسند سائنس نقیذ کے ذریعہ سے علوم و فنون کی ترقی کے  
 وسائل اختیار کئے جاتے ہیں سائنس یعنی علوم و فنون کا سرچشمہ قرار پاتا ہے۔

صفحہ ۱

## دوسرا باب عیسائیت کی ابتدا

شاہی اقتدارات چل کرنے کے بعد اس کی قلب ماہیت اس کا تعلق سائنس کے ساتھ۔  
روما کی جمہوری حکومت کی مذہبی حالت جمہوریت کے تبدیل حکومت شخصی مرنے سے لوگوں  
کا میلان توحید کی طرف ہو جاتا ہے۔ سائنسیتہ۔ وہاں مذہب عیسوی کی اشاعت عیسائیت کو ملکیت  
جس طریقہ سے انداز آتی ہے اس کے سیاسی تحقیقات عیسائیت اور بہت پرستی کے باہمی اتحاد کو لازم  
قرار دیتے ہیں۔ عیسائیت کے عقاید اور رسوم کے متعلق قرطین کاریاں قسطنطین کی حکومت علی کا خراج  
اشرف عیسائیت کا اتحاد حکمران جماعت کے ساتھ۔ عیسائیت اور سائنس کا تعلق باہمی کتب خانہ  
اسکندریہ کی بربادی اور تحصیل فلسفہ کی جماعت۔ انکشاف کے فلسفہ اور پادریوں کے علوم کی حقیقت  
کتب مقدس کو سائنس کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔

## تیسرا باب

سائنس مذہب سائنس دربار مسئلہ توحید پہلی بینی جنوبی اصلاح  
الصلح اسلام کرتے ہیں کہ مدیحہ عذر کی پرستش کو رواج عام دیا جائے۔ قسطنطین کا بطریق  
فلسفہ ان کی مخالفت کرتا ہے لیکن انجام کار جو اس میں سے جو منہ لوں کو دربار میں داخل ہے  
وہ منظر کو جلو میں کر دیتے ہیں۔ اور قسطنطین کے سریر و مستشرق بد جانتے ہیں +  
اصلاح جنوبی (یعنی اسلام) کا آغاز حملہ ایران۔ اس کے اطلاق نتائج +  
اصلاح عرب حضرت محمدؐ بطریق فرستے کے راہبوں سے ملے ہیں۔ اور ان کے اصول  
امتیار کر کے ان اصول پر اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ مدیحہ عذر کی پرستش مسئلہ تخلیق  
اور اس عقیدہ سے نسبت جو توحید باری سے توفیق نہیں۔ کھانا ابا کرتے ہیں۔ عرب کی بہت پرستی کو

جو چیرا دیتے ہیں اور دولت رو ما پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ انھیں حضرت صلعم کے حاشیہ  
 شام مصر و شام کے کو چک عثمانی افریقہ اور ہسپانیہ کو مسخر اور فرانس پر حملہ کرتے ہیں +  
 اس کشمکش سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وحدت و انجیب الوجود کا اصول دولت روم کے اکثر حصہ میں رائج  
 ہوتا ہے۔ سائنس اور سر نو ذلج جو تلمیذ اکیسی دنیا کے بہت سے مشہور مرکز حکومت مثلاً اسکندریہ  
 کا نتیجہ یہاں تک کہ بیت المقدس تک عیسائیوں کے ہاتھ سے غل جاتے ہیں + صفحہ ۹۱

## چوتھا باب

### جنوب میں سائنس کا احیا

منظوریوں اور پیو دیوں کے اثر کی وجہ سے عرب الکتاب علوم و فنون کی طرف متوجہ ہو  
 رہے ہیں۔ تفسیر و ترمیم اور سر نوشت اہل کے متعلق ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور کائنات  
 کی بحیثیت ترکیب کا ان کو صحیح صحیح علم ہو جاتا ہے۔ دوزمین کی جسامت اور شکل کی تحقیق کرتے ہیں۔ اہل  
 کے خلفاء عظیم الشان کتب خانوں کی بنیاد ڈالتے ہیں علوم و فنون کے ہر شعبہ کی سرپرستی کرتے ہیں اور  
 رستہ گاہیں قائم کرتے ہیں۔ دوزمین کو ترقی دینے میں الجبر ایجاد کرتے ہیں اور فن ہندسہ و  
 پیمائش کو کچھ اضافہ کرتے ہیں فنون ریاضی و میزیت کے متعلق قدیم یونانی تصانیف کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں  
 ان کا عربی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں اور حلو کے طریقہ ہنقرائے نام پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھتے ہیں  
 سائنس اور علم قائم کرتے ہیں اور نظوریوں کی مدد سے موجودہ وضع کے مدارس کھولتے ہیں۔ عربی سائنس  
 و اعداد و فن حساب کو رونق دیتے ہیں اور ستاروں کی فہرستیں مرتب کر کے ان کے نام رکھتے ہیں جو  
 فنون ہیئت و طبیعیات کی بنیاد رکھتے ہیں اور فلکات و صنعت و حرفت کو بہت کچھ ترقی دیتے ہیں + صفحہ ۱۸۶

## پانچواں باب

تاریخ مذہب و سائنس و بار بار ماہیت روح مسئلہ انفصال و انجذاب  
 روح کی بحیثیت کے متعلق قدیم اہل یوں کے خیالات۔ یعنی روحیہم کے مشابہت۔



اہل شرق کے فلسفہ و خیالات - ہندو مذہب اور بدھ مذہب مثلاً انفصال اخذ اب کی  
تلقین کرتے ہیں۔ یہی مذہب ارسطو کا بھی ہے جس کی تقلید ہیران فلسفہ اسکندر یہ اور بعد میں رومی  
اور عرب کرتے ہیں۔ یہی مسئلہ ایچینا کی تصانیف میں بھی پایا جاتا ہے +  
اس مسئلہ کا تعلق مسئلہ بقا و تناسب قوت کے ساتھ جسم اور روح کے آغاز و انجام کی باہمی  
مماثلت - روح انسانی کا قیاس روح حیوانی پر +

فلسفہ ابن رشد جو انہیں واقعات پر مبنی ہے آئینہ آئینہ ہوتا تھا مسیحی دنیا میں پہنچا ہے  
فلسفہ ابن رشد کے ہتھیار کی تاریخ - اسلام کا اس سے ابکارنا - یہودیوں کے مذہبی  
کی مخالفت - پاپائے روما کا اس فلسفہ کے متبادہ بننے پر کمر باندھنا - انکویریشن - دیکھو احتساب  
مذہبی کا آئینہ میں قائم ہوتا - اس حکم کے حشیانہ مظالم اور ان کے نتائج - یہودیوں اور عربوں  
کا اخراج - یورپ میں فلسفہ ابن رشد کی پائمانی - "ڈیٹیکن کونسل" کا فیصلہ + صفحہ ۱۷۲

## پھٹا باب

نزاع مذہب و سائنس در بارہ ماہیت عالم  
ماہیت عالم کی نسبت مذہبی خیال میں زمین چھٹی ہے - بہشت اور دوزخ +  
اہل سائنس کا خیال میں زمین گول ہے - زمین کی جسامت کی دریافت - نظام شمسی میں  
اس کا درجہ اور نظام شمسی کے دوسرے اجزاء کے ساتھ اس کے تعلقات - کوپرنیکس کی  
ریولوشن کے تین بڑے بحری سفر سیاحت گرد زمین - ایک درجہ کی پیمائش اور رقاصہ ساعت  
کے ذریعہ گردیت زمین کی تعیین +

کوپرنیکس کے انکشافات - دورہ بین کی ایجاد - گیلیلیو ٹانکو بریشین کے اجلاس میں حاضر کیا  
جہاں ہے - اس کی مزید باہمی سائنس کی فتح کلیسا پر +

جسامت نظام شمسی کی تحقیق کی کوشش - سیارہ زہرہ کے مرد و منقہ البروج کی بنا پر آتا

کے زاویہ اختلاف منظر کی تیسین۔ کرہ زمین اور انسان کی اینچ میری +  
 خیالات و بارہ جسامت کا ثبات۔ روایاتے اختلاف مناظر کو اکب۔ برد و برہم  
 کرتا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی آباد دنیا میں موجود ہیں۔ محکمہ "انکو پزیشن" اسے گرفتار کر کے  
 قتل کر دیتا ہے +  
 صفحہ ۲۱۳

## ساتواں باب

### نزاع در بارہ عمر زمین

بائبل کی رو سے زمین کی عمر صرف چھ ہزار سال ہونا اور اس کا ایک ہفتہ کی مدت میں بنایا  
 جانا۔ پادریوں کے علم التایخ کا انبیاء سلف کی عمروں پر مبنی ہونا۔ بائبل کے مختلف نسخوں میں  
 مختلف تخمینوں کی وجہ سے تناقض +

قصہ طوفان نوح۔ رو سے زمین کا از سر نو آباد ہونا۔ مینارہ بابل۔ اختلاف  
 السنہ لشبان کی تبدیلی زبان +

کیسینی کا یہ اکتشاف کہ سیارہ مشتری سطح الطرفین ہے۔ نیوٹن کا یہ اکتشاف کہ کرہ  
 ارض سطح الطرفین ہے۔ اس اکتشاف سے اس نتیجہ کا استخراج کہ زمین نے حرکات  
 ذیل کے سانچے میں اصل کر موجود شکل اختیار کی ہے۔ احاطہ آبی کی طبقات الارضی  
 تحقیقات سے اس نتیجہ کی تصدیق آتا کہ اجسام ذوی الاعضاء سے اس نتیجہ کی مزید توثیق۔  
 زمین کی عمر کا اندازہ کرنے میں مدت ہائے مدید کے تسلیم کرنے کی ضرورت۔ مسئلہ پیدائش  
 کی جگہ مسئلہ ارتقاء سے ملتا ہے۔ اکتشافات و بارہ قدامت انسان +

کائنات کے پیمانہ و ان و مکان کا غیر محدود ہونا۔ زمین کی عمر کی بحث میں افراط و  
 تفریط سے احتراز +

# آٹھواں باب

## نزاع در بارہ معیار حق

فلسفہ قدیمہ کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کے پاس اجتہاد حق کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔  
قدیم سیحوں میں عقاید کے اختلافات کلیسیائی کونسلیں ان اختلافات کے مٹانے کی  
بے سود کوششیں کرتی ہیں۔ حجت سچہ و حجت اٹل کی ترویج ہے۔

پاپائے روم طریقہ اعتراف بہتری کو جاری کرتا ہے۔ - محکمہ احتساب عقاید کو اپنا  
آلہ اقتدار بناتا ہے۔ اور اختلافات عقاید کے رفع کرنے کے لئے وحشیانہ مظالم پر  
اُتر آتا ہے۔ +

قصر جینیٹ کے مجلہ القوانين کی دریافت اور قانون دینیہ کے نشوونما کا اثر نوعیت  
وماہیت شہادت پر۔ قانون شہادت میں درایت کی نشان منور ہونے لگتی  
ہے۔ +

اصلاح کلیسائی بدولت ہر انسان کو اپنی عقل اور سمجھ کے لحاظ سے رائے قائم کرنے  
کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ کلیسائے رومن کیتھولک دعویٰ کرتا ہے کہ حق و صدق کا میاں  
نہو کلیسا ہے۔ مذہب کتب محرمہ کے اجراء سے وہ کتابوں کے مطابقت کی ضمانت کرتا  
ہے اور حکم امتناعی کی خلاف ورزی کرنے والوں کا قلع و قمع سینٹ برتھولمیوس کے قتل  
عام کے سے ذرائع سے کرتا ہے۔ +

پرنسٹن : مذہب وراثت کو معیار حق تسلیم کرتا ہے۔ - قورات کی سرورقیت پر نظر ثانی  
: اسلئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کون محرم ہے۔ +

سائنس کی روست معیارات انکشافات فطرت ہیں۔ پرنسٹن کے نزدیک یہ معیار کتب  
مقدس میں موجود ہے اور رومن کیتھولک کی رائے میں پاپائے معصوم اس کا سودا بہت کم صرف  
۱۲۹۵

## نواں باب

### نزاع در بارہ انتظام عالم

انتظام عالم کے تصور کی دو حیثیتیں ہیں۔ اول بذریعہ توفیق ربانی دوم بذریعہ قانون فنیق  
اول کا تعلق پیشوایان مذہب سے۔ فنیق ثانی کی ترویج کا منقہ بیان +

کپڑوں قوانین دریافت کرنا پہلے جو نظام شمسی پر بخوبی ہیں۔ پاپائے روم اس کی تصانیف  
کی تکفیر کرتا ہے۔ ڈاؤنسی فلسفہ حرکات ذیل کی بنا ڈالتا ہے +

تکلیف علم ترکیب الاجرام کے اصولی قوانین دریافت کرتا ہے۔ نیوٹن اجرام سماوی کی حرکات  
کو ان قوانین کے جبرِ اخلاق میں لا کر ثابت کرتا ہے کہ نظام شمسی کی عثمان نظم و نسق مہندس ساجید  
کے ہاتھ میں ہے۔ ہر شے ثابت کرتا ہے کہ کل کائنات اسی قانون کی تابع فرمان ہے۔ سلسلہ  
ضیاء بہ نجوم۔ اس پر متالین کے اعتراضات +

اس امر کا ثبوت کہ ترکیب ارضی و نشو و نما کے سلسلہ نباتی و حیوانی تابع قانون ہے۔  
نباتات و حیوانات کا ظہور بذریعہ پیدائشی غیبی ہوا بلکہ بذریعہ ارتقا ہو ہے۔

حکومت قانون کا ثبوت انسانی جماعتوں کے تاریخی حالات اور نیز انداز انسانی سے  
بہم پہنچتا ہے +

اصول یافتہ کلیساؤں میں سے بعض اس خیال کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ تسلیم کر لیتے  
نصف (۳۲) ہیں +

## دسواں باب

### لاطینی مسیحیت اور تمدن جدید کا تعلق

ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ تک لاطینی مسیحیت نے یورپ کے عقل و دماغ پر قبضہ  
کئے رکھا جس کے نتائج کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی ہے +

ان نتائج نے جو شکل اختیار کی وہ اصلاح کینسہ کے وقت شہر روم کی حالت اور خانگی و  
 عمرانی زندگی میں یورپ کی حالت سے ظاہر ہوتی ہے۔ ماقوام یورپ کے کڑھوں پر دہری  
 حکومت کا چار کھا ہوا غنائی ایک طرف انہیں حکام دیہی کی متابعت کرنی پڑتی تھی دوسری  
 طرف حکام دیہی کی۔ اہل یورپ جمالت اودام پرستی اور نکالیف منیتہ میں مبتلا تھے۔ رومن  
 کیتھولک مذہب کی ناکامیابی کی وجہ۔ پاپائیت کی سیاسی تاریخ۔ دینی دروہانی حکومت  
 سے ترقی کر کے یہ مطلق العنان شخصی حکومت کی شکل میں بدل گئی۔ سکروہالوں کی انجمن اور کیوریا  
 کی کامدوائی۔ پاپائی خزانہ کے لئے بیش قرار محال کی ضرورت بد اخلاقی کی محرک ہوتی ہے  
 جو فائدہ سے یورپ کو کیتھولک عہد حکومت میں پہنچے ان میں حکومت کے منشا کو کچھ دخل  
 نہ تھا بلکہ محض اتفاقی یا مضمی تھے۔

۳۵۰

عام نتیجہ یہ ہے کہ پاپائیت کا سیاسی اثر موجود زمانہ کے تمدن کے حق میں مضر تھا۔

## گیارہواں باب

### سائنس کا تعلق تمدن جدید کے ساتھ

سائنس کے عام افواج کی مثال تاریخ امریکہ سے +

سائنس کا یورپ میں داخل ہونا اسلامی سپین سے قبل کر۔ سائنس کا گزر شمالی اٹلی میں

ہوا۔ جہاں بوجہ اس کے کہ پاپائیت کا مستقوی قیام میں منقل ہو گیا تھا اس نے خاطر خواہ

مشورہ دیا۔ پاپائی۔ بحری اسفار اور اصلاح کینسہ کا اثر۔ اطالوی محاسن علمی کا قیام +

سائنس کا عقلی اثر۔ یورپ میں اوراک کی طرز روش بدل ڈالی۔ لندن کی اصل

سوسائٹی اور دوسری علمی مجلسوں کے کارناموں سے اس کی تصدیق و توضیح +

سائنس کا اقتصادی اثر۔ جیشا۔ ایجادات متعلق فن جزیقل و فن طبعیات سے ظاہر ہوتا

ہے جو ہر دو سو صدی کے آغاز سے کی گئی ہیں۔ ان ایجادات کا اثر صحت ملی اور خانگی

زندگی اور نینون رزم و بزم پر

اس سوال کا جواب کہ سائنس نے بنی نوع انسان کو کیا نفع پہنچایا ہے ؟ صفحہ ۳۹۱

## بارہواں باب

### خطرہ کی آمد آمد

مذہب کے بتائے خطرہ ہونے کی قریب الوقوع علامات - کیسا ہے ۔ و ما جو نصراہیت  
 کرکے کہیں ہے۔ ان علامات کو پہچان کر آنے والے خطرہ سے مقابلہ کرنے کی تیاری کرنا  
 ہے۔ پاپائے پائس تاج مجلس عربیہ سیوہ منفذہ ہے۔ مختلف دول اور پکے تعلقات پاپائے  
 کے ساتھ۔ کیسا کے تعلقات سائنس کے ساتھ حسب تصحیح مندرجہ مکتوب عمومی و شخص پاپائے  
 وٹیکن کونسل کے فتوے عصمت پاپائے کے متعلق اور نیز و بارہ سائنس۔ کونسل کے قائد  
 کا خلاصہ حکومت پر وٹیکن اور پاپائیت کی مٹ بھیجے یہ مقابلہ تفریق اور غلبہ کے حصول کے  
 لئے وٹیکن سلطنت اور کیسا کا مقابلہ ہے۔ یورپ میں دو عملی حکومت کا اثر۔ وٹیکن کونسل  
 کا اعلان اس امر کے متعلق کہ پاپائیت سائنس کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ رومن کیتھولک پاپائے  
 کی حکمرانی سائنس۔ خدا۔ الہام آہن او عقل کے متعلق اس کی تعریفات۔ اس کا سبب شکر  
 نہ بن بد پر اس کی سے دے۔

جہاں اتحاد انجیلیہ فرقہ پڑھنٹ اور اس کے فیوضات

۳۳۸  
 سابقہ انگریز فیملی جات و قادی پر ایک عام نظریہ شد زیر بحث کی موجود و متن صورت صفحہ

ضمیمہ

# اغلاط نامہ کتاب بہرکہ مذہب سائنس

صفحہ	سطر	اغلاط	صحیح	صفحہ	سطر	غلو	صحیح
۴	۵	صحیح	صحیح	۳۴۱	۱۶	قابل	قابل
۱۲۷	۱۵	کا	کی	۳۴۹	۵	کشتیش	کشتیش
۱۳۱	۱۰	سے	کے	۳۵۱	۱۸	جھٹکار	جھٹکا
۱۳۳	۱۹	چھو	چھو	۳۶۱	۱۹	اب	اب ہم
۱۴۶	۲۱	مقبول	مقبول	۳۶۴	۱	غلاطمان	غلاطمان
۱۷۱	۱۳	راز	دراز	۳۶۸	۱۶	چھین	چھین کی
۱۷۸	۱۶	دلت	لاعن	۳۶۹	۱۳	القدس	القدس
۲۴۴	۲۰	دولاکہ چھین بل	ایک لاکہ چھین بل	۳۷۰	۱۴	لغتن	لغتن
۲۵۴	۱۳	مناظر	مناظرہ	۳۷۱	۷	مضا	مضا
۲۷۷	۹	روایت	ورایت	۳۷۲	۹	جاری	جاری
۲۸۰	۱۶	کے	سے	۳۷۶	۱۸	کلیسائی	کلیسائی
۳۲۲	۲۰	چنانچہ	چنانچہ	۳۷۸	۱	اکتار	اکتار
۳۲۳	۳	زمین	زمین	۳۸۱	۱۹	کردنیالوں	کردنیالوں
۳۲۹	۱۸	پر ہے	پر ہے	۳۸۲	۹	چالیس	چالیس سال
۳۳۶	۶	صغار	صغار	۳۸۳	۲۰	زماہم	زماہم
۳۳۷	۴	ضابطہ الخیرم	ضابطہ الخیرم	۳۸۴	۱۵	سات	سات
۳۴۰	۱۳	نمودار	نمودار نہیں	۳۸۵	۵	آرزو	آرزو
۳۴۱	۵	ہوتا ہے	ہوتا ہے	۳۸۶	۱۶	ابراہی	ابراہی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۸۵	۱۹	ابرانی	عبرانی	۴۲۴	۱۱	آتی	پٹی آتی
۳۸۷	۲	چھانپوں	چھاؤنیوں	۴۲۵	۲	ڈبروں	ڈاڑیوں
"	۱۱	نشو و نما	نشو و نمائے	"	۶	ر	کر
۳۸۸	۱	موندہ	مواغذہ	"	۲۰	کاشیں	کارنشین
۳۸۹	۱۸	رومن	کرومن	۴۲۶	۳	شیرے	اشترے
۳۹۲	۹	پورپین	پورپین	۴۲۷	۲	ذرایعہ	ذرایع
۳۹۵	۱	امتباع	امقباء	"	۱۵	مروج	مزوج
۳۹۶	۶	برفیئر	بہ فیئر	۴۲۹	۱۵	مسابفت	مسابفت
۳۹۷	۲۰	جنسی	جنس	۴۳۰	۱	۱۶۶	۱۶۶
۴۰۱	۱۵	طرف	طرح	"	۱۲	اتحاد	احاد
۴۰۲	۳	خونریز	خونریز	۴۳۳	۱۱	کھربائی	کھربائی
۴۰۸	۱۲	مصر	عصر	"	۱۲	ایوان	الوان
"	۱۹	تاریخی	یہ تاریخی	"	۱۳	کیمبا	کیمبا
۴۱۲	۱۱	تکلم	تکلمیم	"	"	تلمشہ	تلمشہ
۴۱۳	۱۷	تغییرات	تغییرات	۴۳۴	۱۳	کے	کے
۴۱۶	۷	جو	کہ جو	۴۳۵	۱۶	جواجو	جوا
"	۱۳	کسی	گئی	"	۱۸	مئے	مئے
۴۱۷	۸	ارض کے	ارض کی کیفیت	۴۳۶	۱۶	انسدہ	انسان
۴۲۲	۴	بیچا ہیرل	بیچا ہیرل	۴۳۹	۴	چو چھاڑ	بوچھاڑ
"	۱۵	نایت	ہی	۴۴۰	۸	اموری	امور



صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۶۴	۱۶	جھپکے	جھپکے	۳۵۴	۱۰	تغزیری	تغزیری
۳۵۰	۳	غیر	غیر	۳۵۶	۳	پر فاج	پر فاج
۳۵۱	۱۱	جزیات	جزیات	۱۳	۱۳	رغم	رغم
۳۵۲	۱۰	خارج از	خارج از	۶	۶	جس	جس
۳۵۳	۲۱	دیکھ کر	دیکھ کر	۰	۰	۰	۰

مکرر

۴	۱۳	کرتے	کرتے	۲۱۵	۵	پنچتی	پنچتی
۷۲	۱۷	تثلیث	تثلیث	۲۲۰	۲۰	بتانی	بتانی
۷۰	۱۸	بت پرستی	بت پرستی	۲۲۳	۱۷	ملکہ	ملکہ
۸۱	۳	کامل	کامل	۲۲۴	۱	اٹھایا	اٹھایا
۱۰۹	۱۸	آفرینی	آفرینی	۲۴۷	۱۹	۲۴۸	۲۴۶
۱۰۸	۱۹	عرب کا	عرب کا	۲۵۱	۱۷	دہریہ	دہریہ
۱۱۳	۴	آپ کی	آپ کی	۲۵۴	۲۱	خباہی	خباہی
۱۲۸	۲۰	کچی	کچی	۲۶۵	۶	بے پردہ	بے پردہ
۱۵۷	۱۰	لجھ	لجھ	۲۷۲	۱	تقی	تقی
۱۶۲	۱۷	دائرہ	دائرہ	۲۹۵	۱۵	اور امر	اور امر
۱۶۱	۱۰	جیب ستی	جیب ستی	۳۱۲	۴	آن	آن
۱۶۹	۱۰	اور تار	جیب ستی	۳۳۶	۱۴	معاوم	معاوم
۱۷۹	۴	کیا جا	کیا جاتا	۳۳۷	۱۳	زمانوں	زمانوں

# مقدمہ

## کتاب معرکہ مذہب و سائنس

ترجمہ جناب مولوی عبدالحق صاحب - بی۔ اے۔ - (علیگ)

سکرٹری انجمن اُردو حیدرآباد دکن

۱

جن لوگوں نے فرووسی کی زنج کتاب شاہنامہ کو پڑھا ہے، انہیں جنگ سہراب و رستم کی دلکش داستان یاد ہوگی۔ شاعر نے اس رزم کو اس خوبی اور لطف اور فصاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور تخیل میں وہ شان پیدا کی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ دونوں آواز جنگ کو پیکار ہیں لیکن ایک دوسرے سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے تو یہ ہولناک سانحہ اور یہ پُرالم ٹریجڈی واقع نہ ہوتی +

اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ لطف و فصاحت کے ساتھ امریکہ کے نامور فاضل تھاکر ڈبیر نے مذہب و سائنس کی رزم دکھائی ہے۔ مصنف کا زور قلم اور تبحر شاعر کے تخیل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس مضمون پر بحث کرنے میں فاضل مصنف نے دنیا کے تمام علوم اور مذاہب اور اضافی فطرت پر ایسی غراور وسیع نظر ڈالی ہے کہ گویا

دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ کتاب ختم ہو جاتی ہے لیکن جنگ ختم نہیں ہوتی۔ پڑھنے والا سوچتا ہے کہ کیا یہ جنگ یونین ٹھنی رہے گی؟ کیا انسان ہمیشہ اسی دھکڑ کپڑ اور دنگڑا میں رہے گا؟ کیا وہ یونینیں اندھیرے میں ٹانک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ اور فوراً نشت کبھی نہ پہنچے گا؟ رستم و شہراب کے حال سے تین شخص واقف تھے ایک شہراب کا ماموں زرنم جسے اُس کی ماں نے اسی غرض سے اُس کے ساتھ کر دیا تھا۔ دوسرا ہجیرتیسرا ایک کاؤس۔ لیکن افسوس کہ تینوں ہدایت سے باز رہے۔ پہلا حقیقت نیک نیت ہے اور اسی کام کے لئے آیا ہے لیکن قبل اس کے کہ کچھ کئے رستم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ دوسرا طح طرح کے توہمات میں مبتلا ہو گیا اور اُس نے جان بچھڑا اس راز کو چھپایا۔ تیسرے نے محض نفسانیت سے کام لیا۔ اسی طرح کی تین قوتیں نہب و عزم کی مصالحت میں بھی کھنڈت ڈالنے والی ہیں یعنی جمالت مخالفت حق اور نفسانیت لیکن توہمات اور نفسانیت ایک دن سٹ کر رہے گی۔ حق کا بول بالا ہو گا۔ دونوں بچا ایک دوسرے کو جانیں اور بچا نیٹنگے ظلمت کا پرہ درمیان سے اٹھ جائے گا۔ دوسری شمنی سے۔ رنج راحت سے۔ اور رٹہ بچڈی کا ڈی سے مبدل ہو جائے گی۔ اور انسان کی کشمکش اور ابھن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکر؟ اسے ہم آگے بیان کریں گے۔

۱۵۔ میں اس موقع پر اس امر کا اظہار واجب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہو اسے کہ اردو زبان میں یا دیکھئے گا جہاں تک بہر علم ہے اردو زبان میں یہ پہلی علمی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہ قائم رکھا گیا ہے اس کتاب کے ترجمے میں دوسری شکلیں تھیں ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث۔ دوسری زبان کی خوبی و فصاحت۔ اردو سی بے بضاعت زبان میں ان دونوں کا قائم نہایت دشوَر کام تھا۔ مگر مولوی ظفر علی خاں صاحب نے جو درحقیقت قابل مبارکباد ہیں اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے لیکن یہ اُمی سے ہو سکتا ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور بھجے زبان پر اس قدر فصاحت ہو جیسی فاضل ترجمہ

بچے کو دیکھو اس کی ساری حرکات حیوانی اور اضطراری ہیں۔ اس کا ہاتھ پاؤں مارتا غصے سے سم جانا۔ پیار کرنے سے ہلک کر آنا۔ ماں کی محبت۔ خیروں سے ہشت۔ غرض یہ وہ زمانہ ہے جب کہ حیوانی قوی کا غلبہ ہوتا ہے اور دماغی قوی اونٹنے کی حالت میں ہوتے ہیں۔ جب بڑا ہو کر سیانا ہو جاتا ہے تو احساس اور خواہش کا زور شروع ہوتا ہے۔ اور اعلیٰ دماغی قوی کے نشو و نما سے نظام جسمانی کی قوت دھیمی پڑ جاتی ہے۔ احساس کی قوت بڑھ جاتی ہے اور حسی غدود عصبانی کی ساخت اور توسیع میں ترقی ہونے لگتی ہے۔ یہ حالت جوانی و جوانی کی ہے۔ جب شباب کامل ہو جاتا ہے تو تمیز حیوانی۔ احساس اور خواہشات عقل کی تابع ہو جاتی ہیں اور دماغی قوی اپنا رنگ دکھاتے ہیں۔ لہذا انسان کی نشو و نما کی تین صورتیں ہوئیں۔ حیوانی۔ احساسی اور عقلی۔

قوة الحيوانية کے ذریعہ سے انسان اپنے جسم میں قوت جذب کرتا ہے۔ اور پھر اُسے اپنے افعال۔ جذبات و خیالات اور ارادے میں صرف کرتا ہے۔ مثلاً جسمانی ورزش (یعنی عصبانی حرکت) سے بھوک لگتی ہے۔ سخت رنج و الم یا غصہ یا دیگر جذبات کی وجہ سے آدمی مذہال ہو کر کام سے رہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ حیات قائم رکھنے کے لئے ہمیں غذا کی یہی ضرورت ہے جیسے انجن کو ایندھن کی۔ یہی ایندھن یا غذا عضلات یا عصبانی ایشیہ میں بدل جاتی ہے۔ جب ہماری قوت صرف ہوتی ہے تو ہمارا اندرونی انجن حساب پورا کرنے کے لئے ایندھن طلب کرتا ہے۔ اگر غذا نہ پہنچے گی تو حساب میں فرق آ جائیگا اور ضعف اس قدر بڑھ جائے گا کہ رشتہ حیات ٹوٹ جائے گا۔

قوة الحيوانية قوت جمع کر لینے کے بعد اسے حیوانی حسی یا عقلی حصے میں صرف کر سکتی ہے۔ تمام حیوانات سوائے انسان کے اس قوت کو اپنی نشو و نما اور اس کے انتقال سے اپنی نسل کے نمونے میں صرف کرتے ہیں۔ ان میں جو تھوڑی بہت عقل ہوتی ہے وہ غذا

کی تلاش گھر کی ساخت اور زوج کی جستجو میں کام آتی ہے۔ انسان اس قوت کو جو وہ غذا سے حاصل کرتا ہے چاہے تو اپنے جسمانی حصے کی تکمیل صرف کر سکتا ہے اور چاہے تو دماغی تکمیل میں ایک گنوار کو دیکھو اس کی زندگی بہت کچھ جانوروں سے ملتی جلتی ہے۔ بہت بڑی مقدار قوت کی حامل کرتا ہے اور اسے وہ عضلات، گوشت اور خون کے بنائے ہیں صرف کر دیتا ہے۔ اس کا صرف یہ مقصد ہے کہ اپنی زندگی کو قائم رکھے اور اپنی شکل کو بڑھائے تعلیم کا یہ اثر ہے کہ وہ اس قوت کو دماغ کی طرف رجوع کر دیتی ہے۔ اور وہ خون کی نہ تمام طرح پر پہنچتی ہے جس سے خاکستری رنگ کے عروقی مادہ میں اکسا پیدا ہوتا ہے اور یہ تغیر خیال کے پیدا ہونے کی علامت ہے۔ دن میں جو کمی ہو جاتی ہے رات میں نیند اس کی تلافی کر دیتی ہے اور دماغی ذرات میں اضافہ اور دماغی تلیف گہری ہو جاتی ہے۔ اور اکسا دے لئے زیادہ گنجائش ملتی ہے جس طرح بہت سی چیزیں خون کو بناتی اور بڑھاتی ہیں اسی طرح وہ بعض چیزوں کو بڑھانے کے خارج بھی کرتا رہتا ہے جو پیشاب پیدہ وغیرہ کے ذریعہ سے نکل جاتی ہیں لیکن جس قدر قوت کہ جذب کی جاتی ہے وہ سب کی سب پیشاب وغیرہ کی راہ سے خارج نہیں ہو جاتی۔ بلکہ دماغی و رزش سے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ دماغ میں رہتے ہیں۔ اور ان خیالات کو دماغ میں قائم رکھنے کے لئے بہت سا محنت قوت کا صرف ہوتا ہے یہ قوت اس طرح منتشر ہوتی ہے +

صرف غذا کے ذریعہ سے ہی قوت دماغ میں داخل نہیں ہوتی بلکہ ہر جس کے ذریعہ سے کچھ نہ کچھ قوت پہنچتی رہتی ہے اور ہر عضلہ قوت کا توازن قائم رکھتا ہے۔ باصرہ۔ سامعہ۔ ذائقہ۔ حرکت کی مختلف صورتیں ہیں جس طرح برف آس پاس کی اشیاء سے ایک مقدار حرارت کی جذب کر لیتی ہے۔ یہ حرارت قوت کی ایک صورت ہے۔ اور جب برف پانی کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے تو یہ قوت اس میں مستتر رہتی ہے۔ پانی جب بخار کی صورت اختیار کرتا ہے تو اسے زیادہ قوت جذب کرتا ہے۔ اس طرح ایجاد۔ سیلان

اور بغیر قوت کی مختلف صدہ تئیں ہیں۔ اسی طرح روشنی ایک قسم کی قوت ہے۔ جو روشن جسم کے اجزائے صغیر کی کپکپاتی ہوئی حرکت پر مشتمل ہے۔ اس کی لہریں آنکھ کی پتی میں پہنچتی ہیں۔ اور دیکھنے کی طرف یقیناً تشبیہ پر جا کر لگتی ہیں۔ اور اپنی حرکت وماغی اعصاب تک پہنچاتی ہیں جہاں وہ روشنی کے علم سے خیال کو پیدا کرتی ہیں۔ آواز بھی ہوا کی حرکت ہے۔ جب ہم اپنی انگلی سے ستار کے تار پر ضرب لگائے ہیں تو ہوائیں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کی لہریں کان تک پہنچتی ہیں جو دہان سے قدام و خلف ہل اٹیں تو بچ پیدا کرتی ہوئی اعصاب باصرہ میں جا کوںجتی ہیں۔ اور وہاں وہ موسیقی کے خیال سے تبدیل ہو جاتی ہیں۔

غرض یہ کہ اعصابی فعل قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہم اس صدے کی قوت کو جو سرخی کی شاعروں سے تشبیہ پر لگ کر دماغ پر پہنچتی ہے بتا سکتے ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قوت کہاں صرف ہوتی ہے۔ لہذا وہاں پہنچ کر یہ مستتر ہوتی ہے جس طرح کہ سوچ کی قوت کو تلے کی تھون میں مستتر ہوتی ہے۔ اور اس وقت صرف ہوتی ہے جب وہ جلتا ہے اسی طرح سرخ روشنی کی موجوں کے صدے سے جو قوت پیدا ہوتی ہے وہ دماغ میں پہنچ جاتی ہے۔ اور وہاں جا کر خیال میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور حالت منفعلہ میں رہتی ہے۔

جہاں اور اک نہیں ہوتا وہاں کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ مادر زاد اندھے کے دماغ میں سرخی کا کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دیکھنے کے اعصاب میں وہ قوت نہیں پہنچی جس سے سرخی کا خیال پیدا ہوتا ہے نفی سے نفی پیدا ہوتی ہے۔ اور عالم خیال اور عالم بادی دونوں میں یہ حالت یکساں ہے۔

پس جس چیز کو ہم نے دیکھا اُسنا سو نگہا یا چکھا نہیں اس کی نسبت ہم خیال بھی قائم نہیں کر سکتے۔

عالم خیال یادداشتوں کے مجموعے یا اس کے صرف کا نام ہے۔ یہ یادداشتیں اور اکٹے اتار باقیہ ہیں۔ اگر خیال صرف نہ کیا جائے گا تو وہ باقی رہے گا۔ مثلاً فرض کرو صن کا خیال ہے۔ جب ایک مصور کوئی تصویر بنانا ہے اور اس خیال کو کام میں لانا چاہتا ہے تو یہ مستمر قوت اس کے دماغ میں سے فوراً نکل آتی ہے +

جائزہ کا فعل فطری ہوتا ہے۔ جسے تمیز حیوانی کہتے ہیں وہ احساس ظاہری کے تابع ہوتی ہے۔ عقل سے اسے کچھ علاقہ نہیں۔ انسان میں احساس کا اثر اعصاب دماغی تک جاتا ہے جہاں خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ خیال شامل عمل رہتا ہے۔ اور اک عقل کا دروازہ ہے۔ احساس علم ہے۔ بیرونی اشیاء کا جو جمائی اثر سے چل ہوتا ہے۔ اور اک میں یہ اعصابی اثر ایک مرحلہ اوسط کرتا ہے اور وجہ اس توفیق کے جو دماغ اور بیرونی دنیا میں ہے یہ ذہنی صورت اختیار کرتا ہے اور عقلی یا دماغی مظہر بن جاتا ہے بعض اوقات آوازیں ہمارے کان تک پہنچتی ہیں مگر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس لئے کہ ہماری توجہ دوسری طرف ہے۔ یا بعض اوقات ہم دانتیں سننے یا کتاب پڑھتے ہیں۔ مگر حضورِ دیہ تک سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن جو نہیں کہ رکاوٹ رفع ہو جاتی ہے احساس دماغی اعصاب تک پہنچ جاتا ہے اس واقع ہوتا ہے اور ان الفاظ کے مطابق جو ہمارے کان تک پہنچتے تھے خیال کی صورت قائم ہو جاتی ہے +

وہ اعصاب دماغی جو احساس سے متاثر ہوتے ہیں مقام جذبات لطیف انسانی ہیں۔ انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ خیال کو جذبات لطیف کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ مثلاً میں نے ایک شے دیکھی اس کا اور اک خطرے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خوف کے جذبہ کو تحریک ہوئی دل سکڑنا اور دم گھٹنا شروع ہوا +

انسان میں دماغ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ عقل کا دار الخلافہ ہے۔ اور اسی کی وجہ سے انسان و حیوان اور شائستہ اور غیر شائستہ انسانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ شائستہ

اور مہذب اقوام کے لوگوں میں دماغ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے بنسبت حبشیوں یا اور جنگلی لوگوں کے پھیل یا گونڈ کی زندگی کا انحصار اُس کے جسم کی چستی اور چالاکی پر ہے اس لئے اُس کی قوتہ حیوانیہ بنسبت دماغ کے جسم پر زیادہ صرف ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کے افراد کا انحصار زندگی عقلی پر ہے اور اس لئے اس کی قوتہ الحیوانیہ دماغ کو بڑھاتی اور جسم کو کمزور کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عضلات کی ورزش سے جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری قوتہ حیوانیہ کی توجہ زیادہ عضلاتی ریشوں کے بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تعلیم سے فہم تیز ہو جاتا ہے یعنی قوتہ حیوانیہ دماغی ماہ کی پرورش میں لگ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر ہم اپنی قوت عضلاتی ورزش میں صرف کرتے ہیں اسی قدر عقلی فعل کمزور ہو جاتا ہے اور جس قدر دماغی کام پر زور دیا جاتا ہے اسی قدر عضلاتی قوت ضعیف ہو جاتی ہے۔

دماغ کی فضیلت کے تو سب قائل ہیں لیکن جذبات انسانی کچھ ایسے قابلِ وقت نہیں سمجھے جاتے حالانکہ یہ بھی بڑی چیزیں ہیں۔ لہذا اب ہم ان کی طرف توجہ کر سکتے ہیں جذبات عقلی تحریک کے بہت بڑے محرک ہوتے ہیں اور ہمارے سرخ و راحت کا حتمی انہیں کے ماتھے میں ہے بعض چیزیں ہم ایسی دیکھتے ہیں یا بعض آوازیں ہم ایسی سنتے ہیں جو ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے جذبات ہماری عقل کو ابھارنے میں کہ ایسا ڈھنگ نکال کہ ان خوشگوار اثرات کا پھر اعانہ ہو سکے لیکن بخلاف اس کے جب ہم بعض چیزیں ایسی دیکھتے یا بعض آوازیں ایسی سنتے ہیں کہ وہ ہمیں ناگوار گزرتی ہیں تو ہمارے جذبات عقل کو ایسے ڈھنگ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کا نام نہ آنے پائے۔

مطالعہ میں اگر لطف نہ آئے تو انسان کی دماغی ترقی کا خاتمہ ہو جائے۔ بال بچوں



عزیزوں اور دوستوں سے محبت نہ ہو تو نہ کوئی خاندان ہو نہ لطف محبت ہو شکل رنگ اور آواز کے تناسب سے اگر خوشی نہ ہو تو فزون لطیفہ بھی نہ ہوں۔ یہ سب جذبات کا کھیل ہے۔

جذبات درحقیقت عقلی اور دماغی حرکت کا سرچشمہ ہیں اور ان کی نشو و نما انسان کی بہبود ہی اور ترقی کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسی قوائے عقلی کی نشو و نما۔ خیالات اور جذبات کا تعلق ایسا گہرا ہے کہ وہ عموماً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان میں ان بن ہو جاتی ہے۔ مثلاً غواہش کا رنجان ایک خاص طرف ہے۔ مگر عقل کشتی ہے کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں۔ اور یہی بنائے مخاصمت ہوتی ہے۔ جذبات کا اثر جسم پر بہت بڑا ہوتا ہے۔ زیادہ عرصہ کرنے سے دل کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسے شرم کے تمام سطح جسم پر خون دوڑ جاتا ہے۔ شدید جذبات کے اثر سے دماغی ریشوں میں بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے اور دماغی امراض سے عقل میں فتور آ جاتا ہے۔ ایک خبیث بد باطن کے چہرے کو دیکھنے کیسی پھٹکا رہیستی ہے بخلاف اس کے ایک نیک نفس زن دل کے چہرے کو ملاحظہ کیجئے جیسے پھول کھلا ہو۔

اسی طرح جسمانی حالت کا اثر جذبات اور جذبات کے ذریعہ سے دماغ پر پڑتا ہے۔ بیمار آدمی کیسے چڑچڑے اور عرصہ رہ رہا ہوا ہے۔ قوی آدمی کے جذبات بھی قوی ہوتے ہیں اور ضعیف کے ضعیف۔ یہ طبیعت نہ حال ہوتی ہے تو خواہشیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں۔

غرض جذبات اور عقل دماغ کی دو حالتیں ہیں ایک زمانہ ہے دوسری مردانہ اگر صرف عقل ہی کی نشو و نما اور ترقی زیادہ ہوگی تو جذبات محو و داور کمزور ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر عقل کی طرف سے غفلت کی گئی اور جذبات کی پرورش زیادہ ہوئی تو انسان فکری کس اور ہر و عزیز اور کم عقل ہو جاتا ہے۔

جذبات کا کام عقل کو تحریک دینا اور عقل کا کام جذبات کو اعتدال پر لانا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہیں نہ کہ زائل کرنے کے لئے۔

عقل انسان میں تشخص اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور جذبات مدینیت اور انس۔ بحیثیت عقل کے وہ ایک اور اکیلا ہے۔ اور بحیثیت جذبات کے وہ منجھد اوروں کے ایک ہے۔ پر زور عقل و دماغ کا آدمی اپنے ابنائے جنس سے بھاگتا اور صحبت سے نفرت کرتا ہے۔ اور تنہائی میں خوش رہتا ہے۔ لیکن پر زور جذبات والے آدمی کے لئے تنہائی موت ہے۔ وہ دوسروں میں ایسا گھل مل جاتا ہے کہ اس میں سے رفتہ رفتہ رنگ نشہ غائب ہو جاتا ہے۔ اور خیالات کو باقاعدہ ترتیب دینے کی قوت نہیں رہتی۔ پر زور عقل و دماغ کا آدمی خود مختار اور آزاد ہوتا ہے اور سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں رہتا۔ جہاں عقل ہی عقل ہوتی ہے۔ اور جذبات نہیں ہوتے وہاں صرف اپنی حفاظت اور اپنا ہی خیال ہوتا ہے جو خود غرضی تک پہنچ جاتا ہے۔ جذبات ہمیں صرف اپنی ایک ذات تک نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کی طرف بھی نائل کرتے ہیں۔ دوسرے انسانوں اور اشیاء قدرت سے محبت ہوتی ہے اوروں کے درد کو ہم اپنا درد سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ۔ سے دماغی قومی اور علوم و فنون میں ترقی ہوتی ہے۔

عقل اور جذبات میں اتحاد پیدا کرنا۔ ظاہر اور باطن میں موافقت قائم رکھنا حدیک دوسرے کو حد اعتدال سے نہ بڑھنے دینا جسم کے افعال کو عقل و جذبات کے زیرِ حکومت رکھنا مذہب کا کام ہے۔

فلسفہ و منطق اور علوم نظری عقل کو بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں۔ تمدن۔ پالیٹیکس اور اتحاد و مقاصد انسانی و قومی جذبات کو فروغ دیتے ہیں لیکن مذہب کا حق یہ ہے کہ وہ عقل و جذبات کو ساتھ ساتھ اور برابر بڑھائے۔ باہم اعتدال قائم رکھے۔ اور قوت پیدا کرے اور دماغی اور احساسی حصہ جسم کی پرورش اور نشوونما میں یکساں صرف کرے۔

حیات کے دو مقصد ہیں۔ ایک ذاتی ترقی دوسرا افزائش نسل +

قوت کے انجذاب کے لئے ضرور ہے کہ اس کا اندفاع بھی کیا جائے۔ اور اس غرض سے کہ وہ مان اور قوت کا انجذاب اور اندفاع کر سکے حیات کے لئے ضرور ہے کہ اس میں معرفت طبعی ہو۔ جہاں ساخت اعضا دئے درجہ کی ہے وہاں یہ کم ہوتی ہے۔ اور جہاں ساخت چمپین ہوتی ہے وہاں زیان ہوتی ہے +

بقول لب نمر کے حیات چھریات میں سوتی ہے۔ بچوں میں خواب دیکھتی ہے اور انسان میں جاگتی ہے +

اس معرفت طبعی میں ارادہ ہونا چاہئے زلف رہنے بڑھنے اور نسل کے بڑھانے کا۔ نیز طبعی تمیز ہونی چاہئے جس کے ذریعہ سے وہ سمجھے کہ کیونکہ زندہ رہنا بڑھنا اور نسل بڑھانی چاہئے۔ بغیر اس تمیز کے ترقی حیات کے لئے مناسب اور غیر مناسب اشیاء کا انتخاب کرنا ناممکن ہے۔ اور بغیر اس ارادہ کے کہ زندہ رہنا چاہئے اس علم سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا +

تبع طبعی افزائش اور نشو و نما کا پیمانہ ہے۔ اس کا تعلق ہر وجہ کی ضروریات سے اس طور پر ہے کہ حیات کے ان دو مقاصد کے لئے کافی ہو۔ کیونکہ اگر یہ تعلق اس طرح قائم نہ ہو تو ممکن ہے کہ اس کی قوت ایسی شے کے حاصل کرنے میں صرف ہو جائے جو حاصل نہیں ہو سکتی اور قوت کی تولید ضائع اور بیکار ہو جائے۔ پودے کو نشو و نما کے لئے روشنی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ پودا کسی اندھیرے اور گرم حجرے میں گھلادیا جاتے تو جو قوت اس نے زمین سے حاصل کی ہے وہ اس شے کے حصول کی کوشش میں صرف ہو جائے گی جو وہاں نہیں مل سکتی۔ جب یہ قوت اس کوشش میں صرف ہو جائے گی تو وہ مرجھا نا شروع ہو گا۔  
اور مرجھا جانے گا +

پودے کی نشوونما کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ پانچ چھ ہیں۔ وہ اُسے کچھ تو اُس زمین سے حاصل ہو جاتی ہیں جس میں وہ لگا ہوا ہے اور کچھ ہوا اور روشنی سے +  
 حیوانی زندگی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ایک جگہ نہیں۔ بلکہ درہمچلی ہوتی ہیں۔ اور ان کے جمع کرنے کے لئے اُسے حرکت کی ضرورت ہے۔ لہذا وہ اُسے دی گئی ہے +

حیوانات کو ایک اور محرک شے عطا ہوتی ہے جو پودوں میں نہیں یعنی خوشی کا احساس۔ یہ اُس وقت ہوتا ہے جب وہ ایسا فعل کرتا ہے جو اس کی کامل نشوونما کا باعث ہوتا ہے اور ایک احساس تکلیف کا ہے جو اُس وقت ہوتا ہے جب کہ اس سے ایسا فعل صادر ہو جو اس کی ترقی کو روکے۔ مگر اُسے تکلیف محسوس نہ ہو تو وہ کھانے کی بھی کوشش نہ کرے گا اور اس طرح اُس کی حیات کا خاتمہ ہو جائے گا +

جو اس ارادہ کو اُکسانے اور تیز طبعی کو سبق دیتے ہیں۔ لیکن نہ وہ ایک دوسرے سے مقدم ہیں اور نہ ایک دوسرے کا پیدا کرنے والا ہے۔ چھوٹا پرزہ انڈے کے اندر نہ صرف خیال کرتا ہے بلکہ اس سے فعل بھی صادر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نکلنے کے لئے نکل تو رہا ہے۔ اور باہر نکلتے ہی دانہ چھنے کے لئے چرچ کھولتا ہے۔ قید کی جس نے اُس کے ارادہ کو ابھارا جس سے اس کے عضلات حرکت میں آئی اور نکل پڑا۔ لیکن یہ تیز طبعی کا کام تھا۔ تجربہ سے کچھ علاقہ نہیں۔ کیونکہ اس سے پیشتر وہ کوئی ایسے محسوس تو ذکر باہر نکلا تھا۔ اسی تیز نے اس کی چرچ کھلوائی۔ یہ تھا سا جاورز زندہ ہے اور زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اسے زندگی دی گئی ہے اور زندگی کے ساتھ زندگی کی محبت بھی عطا ہوئی ہے۔ چھوٹا بچہ دنیا میں ارادے۔ تیز طبعی اور احساسات کے ساتھ آتا ہے۔ زندہ رہنا اس کے لئے لطف ہے۔ خواہش اس کا پہلا احساس ہے۔ اس خواہش کا پورا ہونا اس کی پہلی خوشی ہے۔ خواہش کا پورا نہ ہونا اس کی پہلی تکلیف ہے اور اس کی طلب

اس کی پہلی کوشش ہے کس تجربہ نے اُسے یہ بتایا ہے کہ منہ اور گلے کے ذریعہ سے دودھ کا پینا اُس کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ یہ تمیز طبعی ہے جس نے اُسے اس فعل پر آمادہ کیا جس سے اُس کی بھوک احساسِ رفع ہو۔

حیوانات کو خوشی اور تکلیف کے ایسے احساسات ہوتے ہیں جو اس کے حیوانی نشوونما کا باعث ہوتے ہیں۔ ہر چیز جو حیوان کے ارد گرد پائی جاتی ہے جہاں تک کہ اس کی ذاتی نشوونما یا اس کی نسل کی افزائش کا تعلق ہے یا تو اُسے خوشی دیتی ہے یا تکلیف۔

نظامِ اعصابی ایک بڑی قوی آلہ قوت پہنچانے کا ہے۔ تمام ہم پرستی اعصاب پھیلے ہوئے ہیں اور یہ سب اعصابی مرکز سے پھوستے ہیں جس میں باریک باریک اعصابی جڑیں ہوتی ہیں اور آپس میں خوب ملی ہوئی ہیں۔ سب سے بیرونی عصبہ جو اثر حاصل کرتا ہے وہ اسے دلخ

تک پہنچاتی ہیں۔ اور وہاں یہ اثرات یا خیالات جمع رہتے ہیں۔ اور ان خیالات پر سے افعال سرزد ہوتے ہیں۔ وہ سرے حیوانات خیالات پر سے کام نہیں کرتے ہیں۔ سو اِس حالت کے جب وہ ان دو مقاصد کے مفید ہوں۔ یعنی ذاتی فلاح اور افزائشِ نسل۔

انسان اور بھی کئی باتوں میں وہ سرے حیوانات سے مختلف ہے۔ وہ سرے حیوانات کو جو گرمی سردی محسوس کر سکتے ہیں۔ فطرت نے لباس اور پناہ دے رکھی ہے۔ مثلاً ان کے بال یا پر یا خول ہوتے ہیں یا زمین کے اندر کھوئوں اور غاروں میں رہتے ہیں۔ جہاں گرمی

سردی کا کرنا نہیں۔ لیکن جسم انسان کی اعصابی سطح بہ نسبت وہ سرے حیوانات کے اس قدر کمزور ہے۔ اور تاہم وہ دنیا جس سبب بال و پر کے ننگا منگا آتا ہے لہذا اُسے مصنوعی لباس کی ضرورت ہوتی لیکن لباس کے تیار کرنے کے لئے اُسے ایسی قوت عطا کی گئی ہے جو دیگر حیوانات کی تمیزِ طبعی سے ملے۔

اسی طرح عقل انسان کی حیوانی فطرت کے لئے ضروری ہے۔ ہر حیوان کو ایسی قوت عطا ہوئی ہے جو اُس کی ضرورت کو پورا کر سکنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اور یہ قوت اس

ضرورت کی مناسبت سے ہوتی ہے +

بھیڑ مادہ اور قوت کو غذا کے ذریعہ سے اپنے میں جذب کرتی ہے اور وہ قوت اُن کی شکل میں مادہ کو پیدا کرتی ہے۔ انسان میں بھی مادہ اور قوت ایک دوسری صورت اختیار کرتا ہے اور دماغ پیدا کرتا ہے جو اُسے مصنوعی طور سے سردی سے بچانے میں مدد دیتا ہے۔

اگر ہم انسان کی قوتوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی وسعت محض شہوانی زندگی تک نہیں بلکہ اس سے پرے تک پہنچتی ہے۔ لیکن ہے کہ ایک جنگلی انسان کی خواہش اپنی حفاظت تک محدود ہو۔ مگر کثرت سے اقوام انسانی ایسی ہیں جن کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ان کی آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے دماغ میں وہ روشنی پہنچتی ہے جو ہماری زندگی کے اس حصے کو منور کرتی ہے جسے حیوانی یا مادی زندگی سے کچھ تعلق نہیں ہیں۔ رنگوں کے تناسب حسن صورت اور آوازوں کی موزونیت میں خاص لطف آتا ہے حیوانی زندگی کو ان کی مطلق ضرورت نہیں۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اُس میں حیوانی احساس کے علاوہ ایک اور احساس بھی ہے جسے روحانی کہنا چاہئے۔ کیونکہ اگر ہم اسے نہیں مانتے تو ایک خاص سلسلہ فطرتی تمیزوں۔ احساسات اور قوت ارادی کا محض بیکار جانا ہے۔ انسان ایسی اشیاء سے بے حد مسرت اور لطف حاصل کرتا ہے۔ جنہیں اُس کے حیوانی احساس سے کچھ تعلق نہیں۔ آسمان پر خوشنما اور خوش رنگ و نہنگ کو دیکھ کر کتے یا گھوڑے کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ انسان اس سے لطف اٹھاتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دیکھنے سے اُس کی روحانی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ جو اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے یہاں تک کہ بچے بھی اس لطف کا اظہار کرتے ہیں۔ لہٰذا یا گانا سننے سے انہیں بھی مزہ ملتا ہے۔ خوبصورت پھول دیکھنے سے وہ بھی اسی طرح خوش ہوتے ہیں +

انسان کی ساخت میں حصہ عقل میں حیوانی آلات ہیں اور حصہ عقل میں روحانی

آلات حصہ اسفل کو باضمدہ اور توالد سے تعلق ہے اور حصہ اعلا قوت حاصل کرنے کا آلہ ہے۔ جسے حصہ اسفل توالد و تناسل میں صرف کر دیتا ہے حصہ اعلا میں دماغ یعنی مقام عقل ہے۔ قوت حیوانی ارادے کے زور سے ہر طرف پہنچ سکتی ہے۔ جذبات گویا اس طرح واقع ہیں کہ ذرا سی ٹھیس سے فطرت حیوانی یا فطرت روحانی کی طرف مائل ہو سکتے ہیں وحشی اقوام میں قوت حیات شہوانی زندگی میں صرف ہوتی ہے اور دماغ بیکار رہتا ہے لیکن تعلیم یافتہ اقوام میں قوت حیات زیادہ تر دماغ کی طرف مائل ہوتی ہے اور شہوانی زندگی کمزور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سخت دماغی محنت سے اعصابی ریشے زیادہ بیکار ہوتے ہیں اور ان کی درستی کے لئے دوسرا اعصابی مادہ صرف ہوتا ہے۔ اور وہ ذرات جو توالد و تناسل کے لئے ضروری ہیں بننے بند ہو جاتے ہیں۔ لہذا جس قدر دماغی محنت کی جائے گی اسی مناسبت سے وہ توالد و تناسل کے مزاحم ہوگی۔ کیونکہ دماغی محنت میں وہ تمام قوت صرف ہو جاتی ہے جو بصورت دیگر ان ذرات کے بنانے میں صرف ہوتی جو توالد و تناسل کا باعث ہوتے ہیں +

جب توجہ فطرت حیوانی کی طرف ہوتی ہے اور جذبات و عقل کو اس کے تابع کر دیا جاتا ہے تو دماغ صرف اسی قدر کام دیتا ہے جیسے دوسرے حیوانات میں تیز طبیعت اُس وقت وہ مسرت جو معمول علم۔ ورزش عقل۔ احساس حسن وغیرہ سے ہو سکتی ہے۔ زائل ہو جاتی ہے۔ بخلاف اس کے جب عقل پر ہیجہ زور دیا جاتا ہے تو رنج و راحت کا وہ احساس جو ان چیزوں سے حاصل ہوتا ہے۔ جو حیوانی فطرت سے بہت پرے ہیں تیز ہو جاتا ہے۔ اور فطرت حیوانی کمزور ہو جاتی ہے +

رنج و راحت کا ادراک کیا ہے؟ یہ درحقیقت قوت کی تحلیل کا نام ہے۔ چنانچہ دوسرے حیوانات کی زندگی کو دیکھو کہ انسان کو جن چیزوں سے لطف آتا یا صدمہ ہوتا ہے اُسے نہیں ہوتا۔ ایک گنوار کو عمدہ تصویر یا خوشخط کتاب دکھاؤ اُسے کچھ لطف نہ آئے گا۔ کیونکہ اُس کے

دماغ میں کوئی شے اُسے گرفت یا تحلیل کرنے والی نہیں ہے۔ اُس کی حالت صاف شیشے کی چادر کی سی ہے جس میں شعاعیں آئیں اور ٹکرائیں۔

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مادی قوت ہے ایک روحانی قوت بھی ہے اور روحانی قوت والد و تناسل کا سلسلہ عالم خیال میں جاری ہے مگر اس طرح نہیں جیسے ہم عالم مادی میں پاتے ہیں۔

پانسو برس ہوئے ایک بڑے دانشمند نے ایک کتاب لکھی تھی۔ اُس کے خیالات ننھے ننھے بچہ تھے جو ڈال دینے گئے تھے میں نے اس کتاب کو کھولا اور پڑھا۔ اُن بچوں نے میرے دماغ میں جڑ پکڑی۔ بڑے ہوئے اور پھولے پھلے۔ میں نے ان خیالات کو بات چیت یا تحریر کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچایا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی خیالات وہی باتیں وہی تحلیل و تناسل پیدا ہوا اور بڑھا اور زامانہ کی مناسبت سے انہیں تغیر تبدیل بھی کرتا رہا۔ گویا یہ سب اُن اہلی خیالات کی زنجیرِ اولاد ہیں جو اُس وقت وجود میں آئے تھے جب تاریخ کا نام و نشان بھی تھا۔

قطع نظر اس قیاس کے ہم مادی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ قوت میں کیسی کیسی بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً قوتِ ہسی کے تغیر و تبدل سے روشنی حرارت اور برقی صیسی مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دماغ میں بھی تغیر و تبدل سے قوتِ افعالِ آدم اور اک اور خیالات و جذبات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حیوانی زندگی میں بچ و راحت سے قوت کی تحلیل کا پتہ لگتا ہے۔ اور ہم اُس قوت کا اندازہ جو بڑھتی اور نشو و نما پاتی ہے اُس قوت سے کر سکتے ہیں جو جذب یا داخل ہوئی تھی۔ روحانی زندگی میں بھی بچ و راحت قوت کی تحلیل کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو قوت کہ جذب ہوئی ہے وہ خیالات کے سلسلہ سے نشو و نما پاتی ہے۔

مقصد حیات جس کے کارکن بچ و راحت ہیں حیوان کی نشو و نما اور اس کی نسل کی افزائش



روحانی احساس کا مقصد روحانی زندگی کی نشوونما ہے جسم میں قوت کا انجذاب ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اندفع ہوتا ہے۔ اب جو باقی رہی اس سے نشوونما ہوتی ہے۔  
حیات کے ذریعہ سے روحانی زندگی بڑھ سکتی اور نشوونما پاسکتی ہے۔ بہر وقت اور حیوان کی نشوونما کی ایک حد ہے۔ تو روحانی زندگی کی حد کیا ہے؟

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں ایسی سہولتوں کا احساس ہوتا ہے جنہیں مادی فلاح سے کچھ تعلق نہیں تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہم میں کوئی ایسی قوت ہے جو ہمیں کسی خاص سمت میں لے جا رہی ہے۔ وہ سمت کیا ہے؟

دنیا نے اس کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کی غایت تمدنی اور پولیٹیکل ترقی ہے اور اسی پر اسے ساری ہمت اور قوت صرف کر دینی چاہئے اس خیال کی بنا پر بنی نوع انسان کل ایک ہی جن کا مقصد موجودہ کی تکمیل اور آئینہ کا کمال ہے۔ گزشتہ تجربہ اور علم سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانہ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اور آئینہ زمانہ موجودہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہوگا۔ غرض تمام توجہ اور خیال انسان کی آئینہ ترقی پر ہونا چاہئے۔ اور نیکی اور برائی اسی میں ہے جس سے عام بنی نوع انسان کی بہبودی یا مضرت متصور ہو۔

لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ عقلی ترقی حیوانی انحراف کا باعث ہوتی ہے۔ جن جن تہذیب ترقی کرتی جاتی ہے اس میں ایسی خرابیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ جو وحشی اقوام میں نہیں پائی جاتیں۔ ایک وحشی قوم کے بہ قوارہ ضعیف اور مریض افراد کو جن میں مریض جلتے ہیں۔ مذہب مانگ میں امراض اور جسمانی نقائص بڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ کیونکہ سامن ان خرابیوں کی حفاظت کرتا انہیں پھیلانا اور آئینہ تسلسل تک پہنچاتا ہے۔ وحشی اقوام میں ازروئے انتخاب فطری ضعیف اور مریض خود بخود مر جاتے ہیں۔ مذہب اقوام میں اس قانون پر عمل نہیں ہونے پاتا۔ اور اس لئے قوم میں انحطاط

پیدا ہو جاتا ہے +

سب سے اولیٰ جان داروں میں سب سے زیادہ افزائش نسل ہوتی ہے۔ بعض چھوٹے جان دار ایسے پائے گئے ہیں کہ چند گھنٹوں میں اس قدر بچے پیدا کر دیتے ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ دودھ پلائے والے جانوروں میں بلوغ تک پہنچنے کے لئے آٹھ تا دس سال درکار ہوتا ہے اور بچے بھی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح جن جانوروں میں عقل کا درجہ بڑا ہے ان میں اولاد بھی کم ہوتی ہے۔ انسان میں بھی یہی قاعدہ جاری ہے مغرب لوگ جنہیں جسمانی دوزش زیادہ کرنی پڑتی ہے اور عقل سے کام کم لینا پڑتا ہے ان کے اکثر سے بال بچے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جنہیں دماغی محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے ان کے اولاد کم ہوتی ہے +

علاوہ اس کے تمدنی ترقی تقسیم کاریں ہے۔ غیر تمدن حالت میں جو کام ایک شخص کرتا تھا۔ وہ اب بیس شخص کرنے ہیں۔ پہلے ایک ہی شخص کو ہا۔ بڑھتی۔ درزی۔ موچی۔ معمار ہوتا تھا۔ تھوڑی ترقی کے بعد لوہار کا کام ایک کرنے لگا۔ بڑھتی کا دوسرا۔ درزی کا تیسرا۔ موچی کا چوتھا۔ معمار کا پانچواں۔ اسی طرح ایک ایک پیشہ ایک ایک شخص کو مل گیا۔ اب جو اور ترقی ہوئی تو ایک ہی پیشہ کی کئی شاخیں ہو گئیں اور ہر شاخ کا کام علیحدہ علیحدہ شخص کرنے لگے۔ اور روز بروز کام کی تقسیم کو ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص بولتا جاتا ہے۔ دوسرا لکھتا ہے۔ تیسرا صاف کرتا ہے۔ چوتھا اُسے صحیح کرتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ہی شخص کا کام ہے۔ کیا درحقیقت یہ تقسیم کار ترقی کی علامت ہے؟ انسان یہاں کچھ ایسے بکھیر دس اور مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہے کہ اُس کی خوشی دار و مدار زیادہ تر اُس کی ذات پر ہے۔ اُسے یہ خیال ہرگز تسلی نہیں دے سکتا کہ آئین دو ہزار یا تین ہزار سال کے بعد انسان کی یہ تکلیفیں رفع ہو جائیں گی۔ اس خیال سے اُس کی تکلیف یا درمیں تخفیف نہیں ہو سکتی۔ دوسرے ایک ایسی قوم ہیں جو اعلیٰ درجہ کی ہذا

نہیں خوشی کی مقدار بہت زیادہ ہے پر نسبت ایک ایسی قوم کے جو بہت زیادہ ترقی یافتہ اور مذہب ہے۔ ایک گنوار یا کھیت کے مزدور کو دیکھو کیسا خوش اور گن ہے۔ برخلاف اس کے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں جاؤ مثلاً لندن پیرس۔ چکاگو۔ نیویارک میں چشم و چراغ عالم کھلائے ہیں۔ وہاں امرائے خوشی کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں طرح طرح کی کوشش کرتے ہیں دولت صرف کرتے ہیں لیکن پھر بھی خوش نہیں رہ سکتے اور غریب ہیں کہ قعر ذلت و افلاس میں پڑے ہیں۔ لہذا محض تمدنی و پولیٹیکل ترقی اور محض یہ خیال کہ آئندہ کسی بے حد زمانے میں یہ تکلیف اور رکاوٹیں رفع ہو جائیں گی انسان کے دل کو تسلی نہیں دے سکتا۔ اب دوسرا جواب مذہبی عقیدہ میں ہے۔ مذہبی خیال میں حیوانی فطرت کو دخل نہیں۔ ذاتی یا انفرادی مقصد انسان کو زیادہ تحریک دیتا اور ابھارتا ہے پر نسبت ایک ایسے مقصد کے جس کا تعلق عام بہبودی سے ہو۔ اور انسان میں ایک ایسی خواہش موجود ہے۔ اس میں کچھ شبہ ہو نہیں سکتا۔ عام بہبودی یا ایثار کا خیال ذاتی بہبودی کے خیال کو روک دیتا۔ اور تمدنی اور سیاسی ترقی کی طرف لے جائے گا۔ انفرادی بہبودی کا خیال انفرادی ترقی کا باعث ہوگا۔ اُن قومی اور امتیازات کا وجود جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرتے ہیں قطعی ہے۔ دوسرے حیوانات اس وقت تک نہ کوئی خیال سوچتے ہیں اور نہ کسی خیال کو اپنی خواہش کا مصداق قرار دیتے ہیں جب تک کہ وہ ان کی ذاتی نشو و نما یا ترقی کا باعث نہ ہو۔ لہذا کسی گوشت کھانے کا خیال نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کی نشو و نما کے لئے ضروری نہیں ہے پس وہ چیزیں جن کے لئے انسان کی حیوانی فطرت خواہشمند ہے ضرور حقیقی وجود رکھتی ہیں۔ اسی طرح وہ چیزیں جن کی طرف انسان کی دماغی اور جذباتی فطرت موڑتی ہے ان کا بھی ضرور کوئی وجود ہے۔ نیز طبعی ایک قسم کی خواہش ہے جو ہمارے وجود کے قانون کا اتباع کرتی ہے۔ اور ہر قانون کا مقصد مخلوق کی خوشی اور تکمیل ہے۔ انسان کی مذہبی عقیدہ کا سراغ لگنا اس کی بہبودی کے قانون کا سراغ لگانا ہے۔

جب مذہبی تمیز ہم میں نمودار ہوتی ہے تو وہ ہماری روحانی فطرت کی آواز ہے جو اس غذا کو طلب کرتی ہے جو اس کی حیات و تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ جب کبھی مذہبی تمیز ہمیں غلطی کی طرف لے جاتی ہے تو اس کے تئیں نہیں ہیں کہ وہ مذہبی تمیز غلط ہے بلکہ یہ بات ہے کہ اس لئے اسی قسم کی دوسری تمیزوں کو دبا دیا ہے۔ مثلاً ہر طریقہ کو درست سمجھ کر پر قائم ہوتا ہے لیکن جب وہ دوسرے صحیح اصولوں کو پامال کر دیتا ہے تو اس طریقہ کو درست میں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مذہب میں غلطی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب وہ مجموعہ توہمات ہو جاتا ہے تو اس کے نظام میں خرابی واقع ہو جاتی ہے کسی ایک صداقت میں مبالغہ کیا جاتا ہے اور اُسے آسمان پر چڑھادیا جاتا ہے اور دوسری صداقتوں سے بالکل روگردانی اختیار کر لی جاتی ہے۔ اس وقت مذہب کو زوال شروع ہوتا ہے +

۴

انسان میں دو طبعی تمیزیں ایسی ہیں جن کا اثر انسان کی تمدنی زندگی پر بہت بڑا ہوتا ہے ان میں سے ایک تو ہر واقعہ کے سبب دریافت کرنے کی چوہ ہے۔ دوسرے منہٹائے کمال کا تصور۔ اب ہم ان دونوں پر الگ الگ غور کریں گے +

انسان کے دماغ پر دو قسم کے اثرات پڑتے ہیں۔ ایک بیرونی اشیا کا اثر اس کے ذریعہ سے۔ یعنی جس ایک ذریعہ ہے جس سے بیرونی اشیا اور دماغ میں تعلق قائم ہوتا ہے اگر کسی میں کوئی حس نہیں تو اس حس کی وجہ سے جو خیال قائم ہوتا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک مادر زاد اندھے کو سرخی کا کوئی خیال نہیں ہو سکتا +

دوسرے اندرونی اثرات جو دماغ خود اپنے تعلق سے جس سے انسان کی شخصیت قائم حاصل کرتا ہے۔ یہ سرت۔ غصہ اور خواہش کے ادراک ہیں +

یہ اور اکات معذور اور غیر منقسم ہیں اور تعریف کی حدود میں نہیں آسکتے گویا معرفت طبعی کے انتہائی سالماتہ ہیں جن کے ملنے اور ترکیب پلٹنے سے بڑے شمار مختلف صورتیں قائم

ہوتی رہتی ہیں۔ انہیں اور اکات پر بعض ایسے ابتدائی عقائد کی بنیاد ہے جو بہت عام ہیں اور انسان بہت ابتدائیں انہیں حاصل کرتا ہے۔

علت و معلول کا عقیدہ بھی اسی قسم کا ہے۔ تیز طبعی انسان کو علت و معلول کی تلاش پر ابھارتی ہے۔ کیونکہ اس کی صداقت کا اُسے پورا یقین ہے۔ بغیر اس کے دنیا کی ترقی ناممکن ہے۔ اور دنیا محض اتفاقی نتائج کا مجموعہ نظر آئے گی۔ اور حکمت و سائنس اور علم اخلاق کا مطالعہ بیکار ہوگا۔

علت کے معنی کیا ہیں؟ جس کی وجہ سے کوئی شے وجود میں آتی ہے علت اولیٰ کہلاتی ہے۔ اور بعد ازاں جو اس میں تغیر و تبدل کرتی ہے اُسے علت ثانیہ کہتے ہیں۔ اگر کوئی جسم جو حرکت میں ہے کسی دوسرے جسم سے جو ساکن ہے ٹکرائے اور اسے حرکت دے تو اس کی علت ثانیہ پہلے جسم کی قوت متحرکہ ہے لیکن ساتھ ہی خیال اس طرف بھی جاتا ہے کہ پہلے جسم کی حرکت کی بھی کوئی علت ہے۔ علت ثانیہ ایک سلسلہ علل کا ہے جو علت اولیٰ پر جا کر ختم ہوتا ہے اور انسان فطرتاً علل ثانیہ کے سلسلہ میں اُس مصدر حرکت کو ٹھونکتا ہے۔ جو خود بخود پیدا ہوئی اور جسے وہ علت اولیٰ کہتا ہے۔

علت کا خیال مفرد نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک تو خیال وجود کا ہے اور دوسرے اُس شے کا جو عدم سے وجود میں آتا ہے۔ صرف وجود کا ہونا علت کے خیال کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ اس کے متعلق یہ تصور کرنا ممکن ہے کہ وہ سلسلہ علت و معلول سے باطل الگ ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شے ہے تو اگرچہ ہم صحیح طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان سے کیا مطلب ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہم اُسے پورے طور سے سمجھ لیتے ہیں۔ اب اگر ہم اُن تمام اشیاء کو جو نہیں ہلا الگ کر دیں۔ خیر نہ ہم یہ فرض کر لیں کہ کوئی اور ایسی شے نہیں ہے جو اس کے پیدا کرنے والی ہو یا ان کے پیدا کرنے میں اس نے حصہ لیا ہو۔ تو عدم سے وجود میں آنے کی حالت ہمارے لئے باطل ناقابل

نقص ہوگی بہم دیکھتے ہیں کہ عدم سے وجود میں آنے کی حالت کا خیال بالکل ناممکن ہے جو عدم کی حالت سے وجود میں آتا ہے تو اسے اس حالت کے پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی شے کی ضرورت ہے جو اس سے بالکل الگ ہو۔ یہ انسان کا ابتدائی عقیدہ ہے جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ جو فلسفی سلسلہ علت و معلول سے انکار کرتے ہیں وہ بھی اپنی زندگی میں ہر وقت اور ہر آن اسی پر عمل کرتے ہیں +  
کیا یہ عقیدہ قابل اعتماد ہے یا محض دھوکا ہے؟

اگر یہ دھوکا ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان علت کا خیال اُس واقعہ سے متعلق کرتا ہے جو دوسرے واقعہ سے وقت میں مطابق یا اس سے قبل ہے۔ چاند کی تبدیلی اور مروج کی ایک ہی وقت میں پائی گئی۔ انسان نے چاند کی تبدیلی کو مروج کی مد کا باعث قرار دیا لیکن یہ کیوں نہیں خیال کیا کہ چاند کی کمی مٹی کی مروج کی مد و جز کی تابع ہے +

ایک کے بعد دوسرے واقعہ کا ہونا ہمیشہ یکساں پایا گیا ہے اس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں پایا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ یکساں ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور تاہم علت کا خیال ان میں سے کسی پر عائد نہیں کیا گیا۔ دن رات کے بعد آتا ہے مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ رات دن کی علت یا سبب ہے +

علت و معلول کا تجربہ تجربہ سے اور تجربہ ہو جاتا ہے۔ تجربہ یقین کا معلم ہے جس طرح احساس تیر طبعی حیوانی کا۔ اگر تجربہ نہ ہوتا تو ہم کبھی نہ سمجھتے کہ کسی علت کا ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ وجود کے خیال میں یہ ضرور نہیں ہے کہ قوت کا خیال بھی ہو۔ قوت کا تصور ہو سکتا ہے لیکن یہ ہم نہیں جان سکتے کہ کوئی چیز حقیقت میں ویسی ہے۔ اس طرح قوت کا خیال تو ہم میں ہے مگر مشاہدہ نہیں کر سکتے +

علت و معلول کا عقیدہ نہ صرف ہماری نشو و نما بلکہ ہماری اعلا ہستی کی حرقی کے لئے بھی ضروری ہے جو ان کو علت کا کوئی خیال نہیں وہ صرف علل ثانیہ کو دیکھتا ہے۔ کو آ

تجربہ سے بندہ دیکھ کر ڈرنے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس نالی میں سے گولی نکلے تو مجھے چوٹ لگے گی یا مر جاؤں گا۔ لیکن وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور اس لئے حیوان کبھی بارود کی ترکیب نہ معلوم کر سکے گا۔ اگر یہ دھوکا ہوتا تو تعجب ہے کہ کیوں لاکھوں آدمیوں کے تجربہ نے اسے غلط ثابت نہ کر دیا؟ اور پھر کیوں انسان اس کی وجہ سے وحشت و جہالت سے نکل کر تہذیب و شائستگی تک پہنچ گیا جس شوق و ذوق سے انسان اسباب کے دریافت کی تحقیق کرے گا اسی قدر اسے ترقی ہوگی۔ حیوان جو حل ثانیا تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ اسی حالت میں ہے +

اوتنے سے اونٹ و باغ بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اُس میں قوت ہے اور اس قوت کا مقام ارادہ ہے اور یہیں سے انسان کے تمام افعال صادر ہوتے ہیں۔ گونا گونا ارادے کی تمام حرکات پر غور نہ کرے لیکن وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ہر قدم اسی پر منحصر ہے۔ جہاں ارادہ رکھا ہم چلنے سے رُک جاتے ہیں۔ انسان کا خیال ہے کہ وہ اپنے ارادے میں مختار ہے اور اُس کے تمام افعال اس مختار قوت پر مبنی ہیں۔ اُس کا یہ خیال کہ اُس کے افعال ارادی بعید اسباب کا نتیجہ ہیں وہ سخت منطقی دلائل سے پیدا کرتا ہے اور ایک مدت کی مشق کے بعد اپنے آپ کو اس خیال کے تابع کرنے پر مجبور کرتا ہے +

عالم مادی میں انسان ایسی اشیاء میں تغیرات دیکھتا ہے جو عقل سے عاری ہیں۔ وہ ایسی حرکات دیکھتا ہے جس کا باعث وہ نہیں ہے اور ایسے نتائج دیکھتا ہے جن میں اُس کا دخل نہیں ہے۔ اس لئے وہ ایک ایسی قوت کے وجود کے اقرار کرنے پر مجبور ہے جس پر اسے کوئی قدرت نہیں۔ جو اُس سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور جو اُس سے زیادہ قوی ہے +

انسان میں قوائے دماغی مادہ پر عمل کرتے ہیں۔ جہاں مادہ بلا توسط انسان حرکت

میں آتا ہے انسان اس کے سبب دریافت کرنے کی ٹوہ میں رہتا ہے اور اُسے وہ ایک دسی قوت میں معلوم کرنے کی توقع رکھنا ہے جو اُس سے باہر ہے اور اسی قسم کی جیسی اُس میں ہے۔ ایک ادنیٰ عقل یا غیر صحیح مشاہدہ چھوٹے چھوٹے اسباب (علل) میں پھنس کر رہ جائے گا۔ لیکن جوں جوں عقل روشن اور وسیع ہوتی مشاہدہ زیادہ قوی اور تیز ہوتا ہے سمجھ قریبی اور درمیانی سلسلہ اسباب سے ہوتے ہوئے خود راہِ حتمہ حرکت تک پہنچ جاتی ہے۔

باصرف ایسی حس ہے جو قدرت نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو عطا کی ہے لیکن سب میں ایک سی قوت بصارت نہیں ہوتی۔ صحیح طور سے دیکھنا آنکھ کی قوت یا غریبی منجمد نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ یہی حالت چشم بصیرت کی ہے بعض معلومات کے ذریعہ سے علل کو زیادہ تیزی اور خوبی سے دیکھتے ہیں لیکن ادنیٰ اسباب یا علل کے غفل سے غفل کر قوت ادنیٰ کے مغز تک پہنچنا تربیت یا تعلیم یافتہ عقل کا کام ہے۔

انسان معلوم سے غیر معلوم کو دریافت کرتا ہے۔ اس لئے اُس نے جو اُس قوت کو جو تجربہ پس پائی جاتی ہے اپنی قوت ارادہ کی مثل سمجھا تو اُس کا ایسا سمجھنا جائز ہے۔ جب اُس نے ایسے معلومات دیکھے جن کی علل کو وہ نہیں بتا سکا تو انہیں ایک ایسی قوت غفل سے منسوب کرنا جو مادہ کے اندر اور باہر ہے بالکل جائز ہے۔ یہی خدا کے خیال کی اصل ہے۔ اب خواہ خدا بہت سے ہوں۔ اور درختوں دریاؤں پہاڑوں بادلوں اور ہواؤں میں ہوں خواہ ایک علت اعلیٰ ہو جو کائنات کا خالق اور قائم رکھنے والا ہے۔ اس مسئلہ میں بہی نفع انسان کے عام اتفاق کو گزشتہ زمانہ کے الہام کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اکثر اقوام ایک ہی صغریٰ کبریٰ سے ایک ہی نتیجہ پہنچی ہیں الہام انسان کی ذات اور اصول علت و معلول کی صداقت کے یقین میں ہے اور یہ الہام ہر فری عقل پہنچتا ہے۔



اب ہم انسان کی دوسری تیز طبعی پر توجہ کرتے ہیں جو انسان کو منتہائے کمال کی طرف لے جاتی ہے +

حجریات و نباتات و حیوانات سب میں قوت انتخاب پائی جاتی ہے۔ ہر شے دوسری اشیاء میں سے اُسی سے ملتی یا اُسے جذب کرتی ہے جو اس کے لئے مفید ہے۔ حجریات اور معدنیات کو دیکھا جائے تو وہ اپنے ارد گرد کی اشیاء میں سے وہی چیزیں اور اسی قدر اپنے میں لیتی ہیں جو ان میں مل سکتی اور ان کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔ ادویہ کی کیسیا دی ترکیب کو دیکھئے بہرہ و داد دوسری سے گھل مل نہیں جاتی۔ اسی طرح نباتات کا حال ہے۔ پودا زمین سے ہوا اور دوسری اشیاء سے وہی اجزاء اور اسی قدر جذب کرتا ہے جو اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ یہی حال دیگر حیوانات اور انسان کا ہے۔ لیکن انسان میں دو حصے ہیں مادی اور غیر مادی۔ کبھی تو وہ اُن چیزوں کو انتخاب کرتا ہے جو اس کی مادی خوشی اور مادی نشوونما کے لئے مفید ہیں۔ اور کبھی وہ اشیاء جو اسے حصہ بغیر مادی کی نشوونما اور مسرت کے لئے ضروری ہیں۔ اور چونکہ اُس میں یہ دو حصے پائے جاتے ہیں اس لئے اُس کی قوت انتخاب ڈانواں ڈول رہتی ہے۔ کبھی تو وہ اُن چیزوں کی طرف جاتا ہے جو مادی خوشی کو بڑھاتی ہیں۔ اور کبھی اُن اشیاء کی طرف جو اُس کی غیر مادی مسرت میں اضافہ کرتی ہیں۔ غرض انسان ان دو کوششوں کے درمیان واقع ہے۔ جدھر زیادہ زور ہوتا ہے اُدھر ہی کھج جاتا ہے۔ ایک طمعہ بھیلیاں دو کوششیں آپس میں ہیں۔ انسان میں یہ تینوں عجیب و غریب ہے۔ حیوانی زندگی کا مقصد خاص اور محدود ہے۔ لہذا تمام تیزات حیوانی اس مقصد کے پورا کرنے میں کوشش کرتی ہیں۔ لیکن اُس میں جو دوسری قوت ہے وہ اُسے بعض اوقات اس دائرہ سے نکل کر ایک دوسرے عالم میں لے جاتی ہے۔ جہاں اُس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوتا ہے +

جس طرح تیزات طبعی مادی زندگی کی فلاح کے لئے انتخاب کرتی ہیں اسی طرح اور اُن

غیر مادی حصہ کی فلاح میں بذریعہ انتخاب مدد دیتا ہے۔ اور یہ انتخاب ایک تیز کرتی ہے جو روحانی زندگی کی فلاح کا خیال رکھتی ہے +

یہ انتخاب اس طرح سے ہوتا ہے کہ چشم بصیرت کے سامنے بہت سی اشیاء احساں آتے ہیں۔ اور ان میں وہ اشیاء انتخاب کی جاتی ہیں جنہیں تجربہ اور تیز طبعی اعلیٰ خیال کرتی تخیل پھر ان سب کو ملاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ باعث مسرت ہیں۔ اور اس مجموعہ سے ایک منتہائے کمال قائم کرتا ہے جو جذبات کے سامنے پیش ہوتا ہے اور پھر انہیں اس طرف متوجہ کر کے ارادے کو اس کے حصول کے لئے چھوڑ دیتا ہے +

دیگر حیوانات میں تخیل بہت اونے درجہ میں ہوتا ہے۔ وہ صرف ان کے سامنے حیرانی خوشی یا خطرہ کو پیش کرتا ہے اور انہیں دونوں کے حالات میں ذرا سا تغیر کر کے ان کی مختلف صورتیں ان کو دکھاتا ہے لیکن انسان کی حالت بالکل مختلف ہے۔ اگر وہ جی شہوانی زندگی تک محدود رہتا تو اس کی بھی یہی حالت ہوتی۔ حافظہ سمجھ کے سامنے حقیقی واقعات کو پیش کرتا ہے لیکن تخیل اس سے کہیں آگے نکل جاتا اور نتائج تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو ایک حد تک جو اس کی قائم مقام ہو سکتی ہے۔ اور چاہے تو سامعہ اور باصرہ کا کام دے سکتی ہے۔ اور اس کی مدد سے غیر مادی حصہ اپنی سماعت اور اجازت کو بلا قید مکان و زمان اُن غیر مادی صورتوں تک پہنچا سکتا ہے جنہیں یہ خیالی وجود میں ظاہر کرتا ہے۔ اس پر زور قوت کو نہ کوئی محدود کر سکتا ہے نہ کوئی روک سکتا ہے۔ یہ حقیقت اور واقعات کے سامنے اڑتی ہوئی جاتی ہے اور ہاتھ میں اس کے شعل ہوتی ہے جس سے رستہ پر روشنی پڑتی جاتی ہے اور ارادہ اس کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے تخیل اُمید پیدا کرتا ہے لیکن اسے سیر نہیں کرتا۔ یہ تحقیق پر ابھارتا اور قیاس کو تیز کرتا ہے لیکن پھر پرواز سے بچے نہیں اُگرتا۔ اور دوسرے حیوانات میں بھی یہ قوت ہوتی تو وہ کچھ کے کچھ ہو جاتے۔ لیکن چونکہ وہ کسی منتہا کا خیال نہیں کر سکتے لہذا اپنی حالت پر قائم ہیں +

انسان میں یہ عجیب بات ہے کہ کسی خواہش کے پورا ہونے پر وہ چپکا نہیں بیٹھتا بلکہ اور آگے اور آگے بڑھتا ہے۔ واہمہ اس کے سامنے منہائے کمال کی ایک تصویر کھینچ دیتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے کوشش کرتا چلا جاتا ہے +

ممکن ہے کہ ایک انسان یا ایک قوم کا منہا وہی نہ ہو جو دوسرے انسان یا دوسری قوم کا ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ وہ متضاد ہوں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ جزوی ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میلان ایک ایسے کمال کی طرف ہے جو ان سب کو ایک کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص سرخ رنگ کو بہت پسند کرتا ہے۔ دوسرا نیلے کو تیسرا زرد کو۔ ہر ایک ایک جزوی طرف مائل ہے۔ اور اس کمال کا ایک رخ دیکھتا ہے جو ان تینوں کو ملا کر ایک ایسی خوبصورت شے پیدا کر سکتا ہے جو قوس و قزح کی حسن سے کم نہ ہو +

منہائے کمال خواہ وہ عقل کا ہو یا جس کا نیکی کا ہو یا عدل کا ہمیشہ انسان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ اس کے خیال علت و معلول نے اس کی سمجھ یا عقل کو علت انتہائی کی راہ بھٹا ہے جسے وہ خدا کہتا ہے۔ اور اس علت انتہائی میں وہ اپنے تمام ادراکات کمال کو جمع کرتا ہے اور اس طرح خدا کو قوی و قادرِ عظیم و بصیر اور کمال عدل و خیر و حسن سمجھتا ہے +

کیا تجل و صو کا ہی دعو کا ہے؟ کیا عدل و حسن و خیر کی جس جو ہم میں پائی جاتی ہے وہ کچھ بھی نہیں؟

اگر ایسا ہوتا تو انسان کی قسمت بہت بڑی ہوتی۔ اسے اس کا پختہ یقین ہے کہ جس طرح اس کا جسم بڑھتا اور نشو و نما پاتا ہے اسی طرح اس میں ایک روح ہے جو نشو و نما پاتی اور ترقی کرتی ہے اور تجربہ سے اسے اس بات کا یقین حاصل ہوا ہے کہ ترقی کے ہر مرحلہ پر اس پر نئی نئی مسرے کا نزول ہوا ہے۔ اگر انسان کے سامنے کوئی منہائے کمال نہ ہوتا تو نہ یہ شام ہوتے نہ صبح ہوتے نہ مغنی +

انسان کو فطرتاً دو ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ایک علم کی دوسری محبت کی۔ علم کا تعلق عقل سے

ہے۔ اور محبت کا جذبات سے عقل چاہتی ہے کہ سب میری تابع ہوں اور میرے اشارے پر چلیں۔ جذبات کہتے ہیں کہ ہم سب کو دبا کر رکھیں اور سن مافی حکومت کریں۔ مذہب کا تعلق ان دونوں سے ہے۔ وہ عقل سے جذبات کی روک تھام کا کام لیتا ہے اور جذبات سے عقل کے ہوش درست کرتا ہے۔

مذہب کیا ہے؟ مذہب درحقیقت ایک خیال کا اظہار ہے۔ انسان ایک علتِ اعلى کا خیال کرتا ہے۔ جذبات کی ہدایت اور قوت انتخاب کی مدد سے وہ ایک منہتائے خیال کا تصور کرتا ہے۔ اور یہ منہتائے خیال اس کی محبت و پرستش کا مرکز بن جاتا ہے۔

جہاں عقل اور جذبات میں اتحاد و اعتدال نہیں رکھا گیا وہ مذہب نہیں بلکہ ایک قسم کا فلسفہ یا کچھ اور ہے۔

جو مذہب محض استدلالی اور قیاسی ہے وہ کوئی مذہب نہیں وہ فلسفہ ہے۔ اور جس میں صرف جذبات ہی جذبات ہیں وہ اکثر تو حیات میں جھپٹ کر رہ جاتا ہے۔ مذہبی جذبات کو جب حد سے بڑھا دیا جاتا ہے تو یا تو وہ پیچیدہ اسرار ہوتے ہیں یا ایک ناداجب خوف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں مضر ہیں۔ ایک کو بڑھا کر دوسرے کو گھسٹانا ٹھیک نہیں۔ دلی جذبات کی عقل سے روک تھام کی جانی چاہئے اور عقلی پرواز کی اصلاح جذبات سے۔

علتِ اعلى کی تلاش میں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک وحدانیت یعنی ایک خدا کی پرستش دوسرے کئی خداؤں کی پرستش۔ سامی قوموں نے ایک قوت کو مانا جو تمام مخلوق کی علت ہے۔ اور آریا اقوام نے اُن قوتوں کو الوہیت کا درجہ دیا۔ جن کا ظہور پھر نہیں ہوتا ہے۔ بعض نے اس جھگڑے کو مار کے چھوڑ دیا اور دنیاوی کھیسے زون میں پڑ گئے۔

## ۵

مذہب انسان کی گھٹی میں بلکہ اُس کی فطرت میں سہے جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو نہیں توڑ سکتا اسی طرح وہ مذہب کو جو ابتداءً آخرت میں سے اس میں جاگزین ہے چھوڑ نہیں سکتا۔ شکوک و شبہات پیدا ہونگے نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہیں گی۔ جدوجہد قائم رہے گی۔ اس کے بعد دو حالات اُس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے۔ لیکن آخر فرخ مذہب کی ہوگی۔ یہ یقین ہے کہ علم بدلتا رہیگا ایک قیاس ترک اور دوسرا اختیار کیا جائے گا۔ تحقیق میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن قدیم مذہب کسی نہ کسی صورت میں اس کے اندر ضرور رہے گا۔ ممکن ہے کہ سائنس و سائنس کے متعلق نئے خیالات پیدا کرے اور خدا کے متعلق پُرانے خیال کو بدل دے۔ لیکن وہ عقیدہ جو اب تک ہے خدا کے متعلق نیا خیال پیدا کرے گا کیونکہ سائنس کا قابو یہاں نہیں چل سکتا۔ وہ اسے نہیں جانتا۔ یہ اس کی حدود سے باہر ہے۔ مذہب کی حالت نقص کی سی ہے۔ پیر فرقت ہو کر وہ اپنے گھونسلے میں اُگ لگاتا ہے۔ مگر انہیں شعلوں میں سے پھر زندگی پاتا ہے جس طرح انسان کی گزشتہ نسلوں نے نئی نئی تبدیلیاں پیدا کیں اور بہت سے رنگ بدلے مگر اپنا پُرانا مذہب خواہ وہ کیسی ہی بے ڈھنگی صورت میں تھائی نسلوں کے سپرد کیا جو پھر نئے رنگ میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح ہمارا زمانہ اس میں اور سفالی پیدا کرے گا اسے اور اعلیٰ کرے گا اور آئین نسلوں کے حوالہ کر بیٹے گا۔ قرن و قرن اور صدی در صدی یہ کام یوں نہیں جاری رہے گا حتیٰ کہ کسی بعید زمانے میں وہ وقت آئے گا کہ سائنس اور مذہب کا تحائف جاتا رہے گا اور نیچر اور انسانی فطرت کا علم خدا کی معرفت پریشی ہو جائے گا۔

اب ہم انسان کی تاریخ پر ابتدا سے نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا مذہب ابتدا سے

آخرت میں سے اس میں دویت ہے یا نہیں +

ایک انگریز لڑکے ایک جاہل مسلمان ایک معمولی ہندو یا افریقہ کے کسی وحشی یا کسی مذہب کے عالم یا فقیہ سے پوچھئے کہ مذہب کیا ہے اور پھر ان کے جوابات کو غور سے دیکھئے تو سب کی تیس ایک ہی بات نظر آئے گی یعنی کسی ایک ذات کی پرستش خواہ وہ کسی صورت اور کسی ڈھنگ سے ہو۔ مسٹر میکڈانلڈ جو مدت تک افریقہ کی وحشی اقوام میں رہے ہیں اپنی کتاب "آفریکنائٹس" لکھتے ہیں کہ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ "کوئی شے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور جسے وہ روح کہتے ہیں۔ اور موت کے بعد وہ روح اس جسم کو چھوڑ دیتی ہے" اس میں کچھ شک نہیں جیسا کہ ہر برٹ اسپنسر اور دیگر فلسفیوں اور محققوں نے ثابت کیا ہے کہ انسان بھوت پریت یا سایہ سے خدا تک پہنچا ہے۔ اگرچہ اس کا ابتدائی خیال خوف کی وجہ سے اُسے اپنے سایہ یا دوستوں اور بزرگوں کی موت یا خواب دیکھنے سے ہوا ہے اور زندگی کے درمیانی مرحلوں میں اس نے پتھروں اور خیل جانوروں اور دیگر مظاہر قدرت کے سامنے سر جھکا یا ہے لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اُسے بادل کی گج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کرایا؟ وہ کیا تھا جس نے اس کا سر پر زور بٹہ دریاؤں یا سر بفلک پہاڑوں کے سامنے جھکا یا؟ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ ڈر ہے۔ ڈر تھا تو بھاگ جاسے؟ چھپ جاسے۔ لیکن بجائے اس سکھانوں نے ایک ایسی قوت کو مانا جو سب سے قوی اور ابدی اور ازیلی ہے۔ موت سے ڈرتھا تو مرنے سے ڈرتے رہتے۔ لیکن کیوں انہیں روح کا خیال پیدا ہوا؟ اور اس سے پھر وہ اور آگے پہنچے۔ یہ خیال ان بچوں تک میں پایا گیا ہے جو الگ رکھے گئے ہنہیں کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی۔ اور نہ صرف بچوں میں بلکہ بہرے گونگول نے بھی اُلٹا وغیرہ صرف اپنے خیال اور اپنے تجربہ سے یہاں تک رسائی کی ہے۔ اور ان میں خدا کا خیال اور روح و جسم کا امتیاز پایا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات انسان میں فطرتاً موجود ہے اور ابتدائے آفرینش سے چلی آرہی ہے۔

یہ کہنا کہ انسان کو خوف سے یہ خیال پیدا ہوا اور خدا کا خیال سایہ بھوت پرست سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ دیگر مظاہر قدرت کی پرستش سے ایک خدا تک پہنچا لہذا خدا کا خیال بے بنیاد ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مختلف مرحلے طے کر کے کسی شے تک پہنچنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ شے بے اہل ہے۔ دنیا کے تمام اعلیٰ خیال فلسفہ اور سائنس کے تمام اصول تمام ایجادات و اختراعات کو اگر نظر غور دیکھا جائے اور ان کی تحقیق کی جائے تو ان کی اہل انہیں وحشیوں تک پہنچے گی جہاں سے ہم نے خدا کے خیال کا سرُخ لگایا ہے۔ یہ چیزیں انسان کو ارثاً ملی ہیں۔ اور اسی طرح ایک سے دوسرے کو پہنچتی رہیں گی۔

۶

علمائے طبیعیات و بعض دیگر فلاسفہ حال و قدیم کا دعوے ہے کہ صرف استقرا ہی علم کی مستحکم بنیاد ہے۔ مگر استقرا کیا ہے؟ تجربہ کے ذریعہ سے نتائج تک پہنچنا۔ لیکن ہمیں کیا حق اس امر کے ماننے کا ہے کہ چونکہ ایک ہی سے حالات میں پانچ ہزار یا دس ہزار سال سے برابر ایک ہی چیز واقع ہوتی آئی ہے تو آئندہ بھی انہیں حالات میں ہی واقع ہوگا۔ یہ ماننا کہ لاکھوں کروڑوں آدمی مرتے آئے ہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ آہم بھی مر جائیں گے۔ اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ نیچر میں اصول یکسانی عالمگیر طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کے اصول ہمیشہ یکساں رہتے ہیں ان میں خلل نہیں آتا۔ یہ ہیں کیونکہ معلوم ہوا؟ تجربہ سے تو گویا یہ استدلال یوں قائم ہوگا۔

ہم کیوں کسی عام یا خاص اصول یا صداقت کو مانتے ہیں؟  
بوجہ تجربہ کے!

تجربہ پر ہمارا یقین کیوں ہے؟

اس لئے کہ نیچر ہمیشہ ایک ہی نقش قدم چلتی ہے اور اس کے اصول میں یکسانی

پائی جاتی ہے !

یہ ہم کس لئے مانتے ہیں کہ اصول نیچر میں یکسانی پائی جاتی ہے ؟

بوجہ تجربہ کے !

تجربہ پر ہمیں کیوں یقین ہے ؟

اس لئے کہ نیچر میں اصول یکسانی پایا جاتا ہے !

اسی طرح استدلال کرتے جانیے اور پھر پھر کے وہی وجوہ آتی جائیں گی۔ تو اس سے

معلوم ہوا کہ کوئی اور شے بھی ہے کہ جس پر انتہائی حالت میں تمام انسانی علوم کا دارومدار ہے۔ وہ شے سب سے نیچی تہ میں ہے اور وہ تمیز فطری ہے۔ بین کا یہ خیال بالکل درست

ہے کہ اُس شے کی مشابہت جو ہمارے تجربہ میں آچکی ہے اُس شے سے جو تجربہ میں نہیں

آئی ہماری نیچر (طبیعت) کے قانون پر مبنی ہے اور وہ قانون اُس خیال کے زور سے

حاصل ہوا جبکہ تجربہ نے ابھی اُسے ثابت نہیں کیا تھا +

لہذا جس طرح مذہب کا خیال طبعی ہے سائنس بھی اس سے نہیں بچ سکتا کیونکہ آخری

بنیاد اس کی بھی تمیز فطری پر ہے جو تجربہ سے مقدم ہے +

صرف ایک قوت ہے جو بلا واسطہ مجھے دی گئی ہے اور جس کا مجھے علم ہے وہ

قوت ارادی ہے۔ باقی جنہی قوتیں ہیں وہ بالواسطہ ہیں اور منطقی استدلال سے دریافت

ہوتی ہیں +

میری قوت ارادی دوسری قوتوں کے دریافت کرنے والی ہے۔ ہر ایک استدلال

کسی ایسی قوت یا قوتوں کے متعلق کیا جاتا ہے جو کائنات میں عمل کر رہی ہیں۔ اصل

مسئلہ جس سے دوسرے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور جس پر ان کے تقینی ہونے کا

دارومدار ہے وہ یہ ہے کہ میں عمل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں

ارادہ کرتا ہوں +



مجھے اپنی ہستی کے متعلق کسی منطقی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی معرفت طبعی ہے جو تمام یقینوں سے بالا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں وہی ہوں جو مختلف حالات اور مختلف اوقات میں سے گزر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں خیال کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں اور کر رہا ہوں۔ یہ تمام امور معرفت طبعی کے متعلق ہیں۔ میں اپنی ہستی کا ثبوت اپنے خیالات یا ارادے سے پیدا نہیں کرتا۔ ڈیکارٹ کا یہ کہنا کہ ”میں خیال کرتا ہوں لہذا میں ہوں“ اس منطق سے باہر ہے۔ کیونکہ جب میں خیال نہیں کرتا اس وقت بھی تو میں ہوں۔ اور میرے ہونے کا علم مجھے اس وقت بھی ہے۔ میں ہوں اس لئے کہ میں ہوں۔ یہ شبہ کرنا کہ آیا میں خیال کر رہا ہوں یا نہیں یا ارادہ کر رہا ہوں یا نہیں کوئی عقلی دلیل نہیں بلکہ بے عقلی کی بات ہے۔ یہ فلسفہ نہیں بلکہ حق ہے۔ میری ہستی کا کوئی ثبوت میری معرفت طبعی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ معرفت میری عقلی اور اخلاقی فطرت کے لئے کافی نہیں تو دنیا کا کوئی منطقی استدلال کوئی دلیل کافی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے شکوک کرنے سے عقل کو بے دست پا کرنا ہے اور یہی شکوک ہیں جو حرج کے متعلق کئے جاتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ ہم میں کوئی شے غیر مادی نہیں۔ ہمارا اولین اور یقینی علم وہ ہے جو اس کی رپورٹ کرتا ہے اور جو اس کے نتائج نہیں۔ لیکن جب حواس کی رپورٹ وصول ہوتی ہے تو عقل اس کی خبر دیتی ہے۔ حواس اور عقل ملکر اور ایک ہی وقت میں کام کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ مادیین کہیں کہ یہ عقل مادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا جبکہ یہی نہیں معلوم کہ مادہ کیا ہے؟

یہ یقینی امر ہے کہ میں ہوں اور جب میں اپنی ہستی کا غم و باعث نہیں تو پھر میں کیسے یہاں آیا؟ یہ کہنا کافی نہیں کہ میرے پہلے اور اسباب اس لئے اور ان سے پہلے اور ان سے پہلے اور اگر وہ سبب ان کے بعد آیا تو میرا سبب نہیں تو میں بے سبب ہوں۔ مگر تمام

نفع انسان یہی ہے۔ تمام ہستی تمام کائنات ایسی ہی ہے یعنی یا تو تمام ہستی اور کائنات ایسے ماسبق اسباب کے بعد ظور میں آئی جن میں قوت تخلیق نہیں یا خود اپنا سبب آپ ہے۔ میں اپنی ہستی کے متعلق اس سے زیادہ خیال نہیں کر سکتا کہ میں ہوں میں خیال کرتا ہوں میں ارادہ کرتا ہوں۔ میں اپنے گرد اوروں میں بھی انہیں تین چیزوں کو پاتا ہوں۔ لیکن ان میں سے کوئی یا سب ل کر بھی میرے یہاں ہونے کا سبب نہیں ہو سکتیں۔ میں یقیناً غیر فانی ہوں۔ میں بے سبب نہیں ہوں نہ اپنا آپ سبب ہوں۔ لہذا میرا سبب کوئی اور ہے۔ جو ان سبب سے بالا ہے۔ سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

ہم جو کارگاہ عالم میں مختلف قوتیں دیکھتے ہیں اور جن کا ہمیں اس قدر یقین ہے کیا ہم کہہ سکتے ہیں وہ کیا ہیں۔ ہم قتل اور خیال سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہم حواس سے ان کا یقین نہیں کر سکتے آخر ان کا اصلی علم ہمیں کیونکر ہو سکتا ہے؟ صرف ایک طریقہ ہے۔ اپنی قوت ارادی سے! ہم اپنے میں ایک قوت دیکھتے ہیں اور اس سے ان قوتوں کو سمجھتے اندازہ کرتے اور یقین کرتے ہیں۔ اور یہ تمام قوتیں ظور میں اس قوت ارادی کا جو خدا میں ہے جس سے ہماری ہستی ہمارا ارادہ اور ہماری زندگی ہے۔

۷

عالم میں ہر آن تغیر ہے۔ ہر شے بدلتی ہے اور بدلنے پر مجبور ہے۔ اسی قانون سے عالم کو رونق اور ترقی ہے۔ انسان بھی اس کا تابع ہے۔ اس میں بھی ہر لحظہ اور ہر آن تغیر و تواتر رہتا ہے یہاں تک کہ سات سال بعد وہ سر سے لے کر پاؤں تک بالکل نیا ہو جاتا ہے۔ اور ایک ذرہ بھی پہلے کا نہیں رہتا۔ لیکن باوجود اس کے وہ پھر وہی ہے۔ پھر وہی رہتا ہے۔ کہ میں وہی ہوں اور باوجود اس کے وہ غور کرتا اور خیال کرتا ہے۔ ہر عضو کے فعل سے اس عضو میں تحلیل واقع ہوتی ہے اور اس تحلیل کے ساتھ ترکیب بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ مادہ کے کون سے سالمہ (جزو بمقرر لمیسی) میں مسلسل غور و فکر ہے۔ اس میں

جو ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے یا اُس میں جاتا ہے؟ کیا آکسیجن یا میڈروجن کا جسم  
 (جزو بقرطیس) معرفت طبعی (کانشس نس) حاصل کرتے ہی چل دیتا ہے؟ اور کیا آنے والا  
 جزو بقرطیس آتے ہی معرفت طبعی حاصل کر لیتا ہے؟ ضرور کوئی شے مستقل ہونی چاہئے  
 جس میں یہ معرفت ہے اور جو غور و فکر کرتی ہے۔ اور جس کا ان سالمات کی مسلسل آمد و رفت  
 پر عمل ہے۔ اور ادراک جس کا آلہ ہے۔ اور جو غیر مادی ہے۔ اور جو روح کہلاتی  
 ہے۔ تمام حیات اس معرفت کے حاصل کرنے سے قبل صرف حرکت اور تبدیلی ہیئت  
 ہے۔ لیکن ہم اس معرفت کو دماغ کے ذرات میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ ہم اعصاب اور دیگر  
 مادی ریشوں سے خاص خاص احساسات منسوب کر سکتے ہیں۔ مگر ان اعصاب اور ریشوں  
 سے معرفت طبعی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ الگ مستقل شے ہے اور یہی ہے جو ہمیں اپنی ہستی  
 کی خبر دیتی ہے اور غیر فانی ہے۔ علاوہ اس کے دماغ کے مختلف حصوں کے مختلف کام  
 ہیں جس طرح مختلف اعصاب کے کام مختلف ہیں۔ لہذا اس معرفت طبعی کا یکساں حالت  
 پر رہنا اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اعصاب اور دماغی اعضا اور اسکے تابع اور کارکن  
 ہوں جو سب کا صدر نشین ہے اور سب پر حاوی ہے۔ علم فریالوجی (علم کا شہ سر جس کی  
 نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مادیت اور دہریت کی طرف مائل کرتا ہے اس پر اگر اس پہلو  
 سے نظر ڈالی جائے تو وہ ہماری اعانت کرے گا۔

مشہور سائنس دان مسٹر ککٹر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص جو تھوڑی دیر  
 کے لئے بوجہ ضرب کے بیہوش ہو جاتا ہے اور اُس میں معرفت طبعی نہیں رہتی تو وہ ہوش  
 میں آکر یہ سوال کرتا ہے کہ وہ غور کرنے والی شے وہ کون کس طرف تھی؟ اور یہ خیال خواہ مخواہ  
 اُس کے دل میں آتا ہے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے مر گیا تھا۔ تھوڑی سی ضرب سے ایک  
 آدمی بیہوش ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ زور سے لگے تو وہ مر جاتا ہے۔ کیا اس وقت بھی اُس  
 میں معرفت طبعی نہیں رہتی؟ اگر ایسا ہے تو کب اور کس طرح وہ معرفت طبعی (کانشس نس)

حاصل کرتا ہے؟ تھوڑی سی ضرب سے وہ بیہوش ہو کر پھر ہوش میں آ جاتا ہے۔ زیادہ ضرب لگنے سے تمام دماغی نظام بگڑ جاتا ہے اور حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ سائنس اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ فی الحال یہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس سے بڑھ کر میں ایک ایسے شخص کی شہادت پیش کرتا ہوں جسے مہ تلج علمائے سائنس کہنا چاہئے اور جو میں اسی زمانہ میں جیکہ ڈارون اپنی مشہور آفاق کتاب (ایریجن آف سپی شیز) لکھ رہا تھا۔ اپنی ذاتی تحقیقات سے انہیں نتائج پر پہنچا جو ڈارون نے قائم کئے تھے اور جب اس نے اپنا رسالہ ڈارون کے پاس رائل سوسائٹی میں پڑھنے کے لئے بھیجا تو ڈارون ڈنگ لگیا۔ وہ اپنی ایک کتاب میں روحانی قوت اور علم پر بحث کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ہمیں کبھی واقعات سے صرف اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ انسانی علم کی ترقی کی تمام تاریخ اور خصوصاً وہ علم جسے ہم روحانی کہتے ہیں یقین دلاتا ہے کہ جب بھی اہل سائنس یا کسی زمانہ کے عام معلمین نے ایسے واقعات جو بہت سے اوسط درجہ کے ایماندار اور ذہین محققین نے خود دیکھے اور بیان کئے ہیں محض اس وجہ سے انکار کر دیا ہے کہ یہ ممکن نہیں یا وہ قانون قدرت کے خلاف ہیں تو یہ منکرین ہمیشہ غلطی پر ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس فاضل عصر نے خود اس بارے میں بڑی بڑی تحقیقاتیں کی اور بعد کمال غور اور چھان بین کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بیشک روحانی قوت موجود ہے اور جو مظاہر روحانی طرح طرح سے تلہد میں آتے ہیں بالکل صحیح ہیں۔ اور نہ صرف اُس نے بلکہ مشہور و معروف ڈاکٹر فوئل سر جان فونز اور ڈاکٹر کاربنٹر اور دیگر علمائے ہند تحقیق کے اس کی اہلیت کو تسلیم کیا۔ فاضل موصوف کا خیال ہے کہ وہ بڑے لوگ جنہوں نے اس کا انکار کیا غلطی پر تھے۔ اور اگرچہ اکثر علمائے سائنس ان شہادتوں کی پرواہ نہیں کرتے اور ذہنی اثراتے ہیں لیکن اس امر کا پورا پورا یقین ہے کہ اسی صدی میں تمام منصف مزاج تعلیم یافتہ لوگوں کو ان باتوں کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اسی فاضل نے اُس کمیشن کا بھی مفصل حال لکھا ہے جو اس امر

کی تحقیق کے لئے بیٹھا تھا اور جسے بالآخر تسلیم کرنا پڑا تھا کہ روحانی قوت بے شک ایک ایسی  
توحید پروردگار سے الگ اور بالا ہے۔ اس کبشن کے ممبر تمام مشہور سائنس دان تھے ۔

۸

انسان جو اپنے نہیں اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سارا عالم یہ ساری کائنات میرے  
ہی لئے ہے جس نے اپنی بساط سے زیان قدم مارا ہے اور سارا عالم کے دریافت میں کئی دقیقہ اٹھا  
نہیں رکھا وہ اگر اپنی اس پاس کی اشیاء پر غور سے نظر ڈالے گا تو ہر چیز نئی اور ہر سارا معلوم ہوگی اور  
ایک فنے تک کی حقیقت سے وہ اپنے آپ کو ایسا ہی بخیر پائے گا جیسے اس کائنات کی  
حقیقت سے۔ جب ہم اس کرہ پر نظر ڈالتے ہیں جس پر ہم آباد ہیں تو بے شک یہ بہت وسیع نظر آتا  
ہے اور اس قدر وسیع کہ باوجود اس ترقی اور تحقیقات کے ابھی تک ہم اس کے علم پر جا ہی نہیں سکتے  
لیکن نظام شمسی کے مقابل میں یہ بہت ہی چھوٹا ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کے اور  
نظام موجود ہیں اور یہ عالم سارے گان کے مقابل میں ایک نقطہ کے برابر ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات  
کے سامنے اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ اسی طرح وقت پر نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ شک  
نہیں کہ زمین کی نشو و نما میں جو وقت صرف ہوا وہ بے انتہا زیادہ ہے اس وقت سے  
جو ایک درخت کے بڑھنے اور بننے میں صرف ہوا لیکن اگر اس وقت کا مقابلہ نظام شمسی کے  
زمانہ نشو و نما سے کیا جائے تو بہت ہی لم ہے اور بمقابلہ عالم سارے گان ایک لمحہ کے  
برابر ہے اور اب الہ آباد کے مقابل میں بیچ۔ زمین کی ساخت کو دیکھ کر بہت سے ایسے ثبوت  
ملنے میں جن سے اس کی گزشتہ حالت پر ایک گونہ صحیح رائے قائم ہو سکتی ہے۔ یہ ظاہر  
ہے کہ ایک زمانہ میں یہ بے انتہا گرم تھی۔ اور مختلف زمینوں کے سرد ہونے کے متعلق  
جو تجربے اور تحقیقات کی گئی ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس آتشیں مزاج کرہ  
خندہ آگرنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس لگے ہونگے۔ جب نظام شمسی کے ایک بہت  
چھوٹے سے کرہ کی حالت درست ہونے میں اس قدر عرصہ دراز لگا تو خیال کرنا چاہئے

کہ ان کروں کے لئے جو اس سے سینکڑوں درجے بڑے ہیں کس قدر عرصہ درکار ہوا ہوگا جب انسان یہ سوچنا ہے کہ سوج سے بھی بڑے بڑے ستارے موجود ہیں اور نظام شمسی جیسے دوسرے نظام بھی ہیں اور اس سے پرے اور نظام ہیں اور اس کے آگے آؤر اور ان کے بعد اور یہ سلسلہ نامتناہی یونہی چلا جاتا ہے تو خلائے بسیط کا خیال حد و حسم سے گزر جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ زمانہ کا خیال کرتا ہے کہ ایک اونٹ اور حیر کر کے درست ہونے میں لاکھوں کروڑوں برس لگ گئے ہیں تو اس کل نظام اور دیگر نظامات میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا تو انسان مارے حیرت کے واسطے بانٹتا ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ عجیب و غریب حیرت انگیز کارخانہ کس ترتیب اور ناعن سے برابر چل رہا ہے اور تمام نظامات ایک ہی اصول پر حرکت کر رہے ہیں اور کیا مجال کہ اپنی حد سے تجاوز کریں تو اس حکیم مطلق کی حکمت و قوت کی عظمت عقل و دہم میں نہیں سماسکتی جو اس کارخانہ کا چلانے والا ہے ۛ

مکن ہے کہ ایک سائنس دان یہ کہے کہ یہ سب دہم ہے کائنات میں سوائے مادہ اور سالمات کی حرکت اور کشش کے کچھ نہیں ہے۔ تمام عالم اور آسانی خلا میں مادہ ہی وہ منتشر ہے جن کی ابتدائی حالت ٹھوس ذرات کی ہے جو مختلف جسامت کے ہیں جن کی آپس کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس میں سے گیس نکلتی ہے جو ٹھوٹا (ضبابہ) کی شکل پکڑ لیتی ہے۔ یہ ضبابہ نظام شمسی کے احاطہ کشش کے اندر آکر سوج کی مدور راہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اگر بعض ان میں سے ہمارے کرہ کے پاس سے گزرتے اور اس میں داخل ہوتے ہیں تو رگڑ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور ان سے شہاب پیدا ہوتے ہیں جو اکثر زمین پر گرتے ہیں یہی اجسام بے انتہا اصلی سیارے اور شمس ہیں ان کی ترکیب انہیں عناصر سے ہوتی ہے جو منجمد ہو کر بڑے بڑے ٹوٹتے کو بناتے ہیں۔ ان شہابوں سے جو بعض اوقات ہماری زمین پر گرتے ہیں انہیں اس مادہ کا نمونہ ملتا ہے جو تمام خلائے

عالم سلیکٹاں میں منتشر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ بے انتہا اور کثیر ششابی مادہ جس کی قوت خیال سے باہر ہے کہاں سے آیا؟ اس کی حالت مابقی کیا تھی؟ یہ مادہ جو ابتدا میں بالکل سادہ اور اجزائے لائیجر کے کی حالت میں تھا۔ اس صورت میں کہے آگیا جسے ہم عناصر سے تعبیر کرتے ہیں؟ مگر ہماری رسائی ابتدائی جزا کے عالم تک ہو بھی جائے تو بھی یہ مشکل حل نہیں ہوتی۔ کیونکہ پھر ہیں ان قوتوں کی اصلیت پر غور کرنا ہو گا جن کے زور سے یہ اجزائے لائیجر اترے اور عوالم کی صورت میں چھیدا ہوئے اس سادہ سے سادہ قوت میں کہاں سے انقباض پیدا ہوا؟ یہ کیا ہی قوتیں کدھر سے آئیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ پر اسرار قوت ثقل کہاں سے آتی جو غیر مادی و غیر متبدل اور تمام عالم کی رونق کی اصل ہے؟ ان مسائل سے بھی بڑھ کر اہم اور لائجل مسائل ابھر رہے ہیں۔ ابھر کیا ہے اور مادہ سے اس کے کیا تعلقات ہیں؟ وہ قوتیں کہاں سے آئیں جو ابھریں کپکپا ہٹ پیدا کرتی ہیں اور جو حرارت۔ روشنی الکترونیکی مختلف صورتوں میں تمام تبدیل ہنیت۔ حرکات سالمات اور مادہ کی ان بے انتہا تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہیں جو حیات کی نشو و نما کا اصل باعث ہیں؟ ان تمام سوالات کا کوئی قطعی جواب نہیں اور غالباً نہ کبھی ہو +

قدیم سے قدیم نظریہ مادہ سے لیکر جدید سے جدید نظریہ پر غور کرو۔ ہر ایک میں ہی غلغل سوالات پیدا ہوتے ہیں + اور کوئی اس کائنات کی علت العلل کے قریب نہیں پہنچتا۔ اور زیادہ سے زیادہ بقول ہر برٹ سپنر تمام مظاہر میں ایک نامعلوم اور ماقابل دریافت قوت کے تصور کا اور اک "ہوتا ہے" جیسا کہ اسی علامہ دہرنے اپنی موت سے کچھ حصہ قبل لکھا تھا "ہستی کی یہ خالی صورت جسے خیال نے ہر طرف اپنی بساط کے موافق تحقیق کیا ہے اور پھر اس سے پرے جاں و ہم و خیال کے پڑ جلتے ہیں۔ جب اس معلوم کا اس نامعلوم اور غیر محقق وسعت سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو خیال کی یہ ساری تحقیق بیچ دو حقیقت ہو جاتی ہے۔ یہ خیال اور پھر اس خلائے بسیط کا خیال جس کے مقابلہ میں ہمارے

سب انتہا نظامات کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایسا ہے کہ اس کے ذکر کرنے کی ہمت نہیں پڑتی کچھ عرصے سے طبیعی اور اک کہ یہ غیر محدود و مطلق کسی اصل اور سبب کے موجود ہے اور موجود رہے گا۔ میرے دل میں ایک ایسا خیال پیدا کرتا ہے کہ اس کے سامنے میں سما جانا ہوگا۔

## ۹

مادین کا یہ خیال ہے کہ مادہ ہی سب کچھ ہے اور مظاہر عالم کی گتھی سلجھانے کے لئے کافی ہے۔ روحانی یا آتشی اثر سب فنا ہے۔ دیا قریب سے لے کر اس وقت تک اس کے ماننے والے موجود ہیں اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے اس مذہب کو اور بھی قوی کر دیا ہے۔ ہر زمانہ میں تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فلاسفہ اور علمائے علوم طبیعیات کو اس کا شوق رہا ہے کہ کوئی نظریہ ایسا قائم کریں کہ جس سے تمام اشیاء اور مظاہر کی کثرت دریافت ہو جائے اور اس خیال نے لوگوں کو مادیت کی طرف مائل کیا ہے۔ کیمیاوی تحلیل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادہ خواہ کسی صورت میں ہو اور کسی ہی تبدیلی اس میں کیوں نہ واقع ہو جائے نہ وہ فنا ہو سکتا ہے اور نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح علم طبیعیات کی رد سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوت خواہ کسی شکل و صورت میں ہو اور کیسے ہی مختلف حالات اختیار کر لے وہ نہ قوت فنا ہو سکتی ہے اور نہ پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر علم کیمیا کی رد سے ایسے مرکبات ترتیب دیئے گئے جو اب تک بغیر قوت حیوانیہ کے دشوار سمجھے جاتے تھے اور آخر بڑے بڑے اول مادہ کے متعلق نظریہ اجزائے دقیقہ طبعی قائم ہوا اور سب سے آخر نظریہ اجزائے لائیجے نے۔ ان سب تحقیقوں اور نظریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان و ہریت اور نبات کی طرف ڈھلتا ہوا چلا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر عالم کا باعث ہے؟ اور کیا اس کے ساتھ کوئی اور شے ایسی نہیں ہے جو اس سے مختلف ہے؟ اب ہمیں تحقیق یہ کرنا ہے کہ جب ہم کسی مظہر کو دیکھتے ہیں تو مادہ کا اس میں کہاں تک دخل ہوتا ہے۔ اور ان کا باہمی کیا تعلق ہے؟ دوسرے اگر کوئی مظہر ایسا ہے جو مادے



سے باطل آزاد ہے۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ مادہ اس کا باعث نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ اگر ہم کسی مظہر کو بغیر مادہ سے کے نہیں پاتے تو کیا صرف مادہ ہی اس کا کافی اور دافی باعث ہے؟ فرض کرو کوئی مظہر معلوم ہے۔ اس کے ہم چند اسباب قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ یقین نہیں کہ آیا یہ اس کے کافی باعث ہیں نہیں؟ تو ہم ان اسباب کے نتائج پر غور کریں گے۔ اگر یہ نتائج پورے اترے تو ہم سمجھیں گے کہ وہ اسباب کافی ہیں اور اگر نہیں تو ہم اس شے کو تلاش کریں گے جو ان نتائج کا تکملہ کرتی آئے۔ جواب تک سبب نامعلوم تھا۔ مثلاً جب سیارہ یورنیس دریافت ہوا۔ تو بعض مہندسوں نے یہ دیکھا کہ جس طور پر وہ سوچ کے گرد گردش کرتا ہے اور جو دائرہ وہ بناتا ہے اس کے لئے صرف سوچ کی اور بعض اندھ چھوٹے سیاروں کی کشش جو یورنیس سے چھوٹے ہیں اور اس کے اور سوچ کے درمیان واقع ہیں اس گردش اور دائرہ کی کافی باعث نہیں۔ مگر صرف یہی کشش ہوتی تو وہ ایسا دائرہ نہ بناتا بلکہ اس کی صورت اور ہوتی۔ ان مہندسوں نے محض ریاضی اور ہندسہ کے زور سے یہ قیاس قائم کیا کہ ہونہ ہو خلا مقام تک کوئی اور ستارہ یورنیس سے پرے واقع ہے جس کی کشش کا اثر اس پر پڑتا ہے چنانچہ بعد میں اس مقام پر دورین کے ذریعہ سے وہ سیارہ دریافت ہوا جسے اب بچوں کہتے ہیں۔ اسی طور پر ہم اس عالم کو سمجھتے ہیں اور مادہ کو جہاں تک اس کا دخل اور صفات و اثرات ہیں پوری پوری آزادی دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا وہ اس کا کافی باعث ہے یا کوئی اور شے بھی ہے جو اس کا تکملہ کرتی ہے اور مادہ سے خلیج ہے؟ پس اگر کوئی ایسی شے ہے تو یہ نتیجہ نکالیں گے کہ مادہ اس عالم کا کافی باعث نہیں ہے اور اس کے بعد مادہ کی حقیقت پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا وہ بذات خود قائم اور کافی ہے۔

ملاحظہ کائنات جن پر ہم بحث کریں گے ان کی تقسیم سرسری طور سے

۱۔ قوت۔ جو حرکت۔ اتصال اجزائے لایہ تجزئے اور کشش کی مادی سے ظاہر ہوتی ہے

۲۔ حیات۔ حیوانی یا نباتی +

۳۔ قوت۔ مدرک

۴۔ اوراک طبعی (کانشس نس)

۵۔ جذبات اخلاقی مثلاً محبت رحم وغیرہ

ہماری سب سے اول تحقیق یہ ہے کہ کیا ہم کسی ایسے منظر کو بھی دیکھتے ہیں جو مادہ سے اس قدر الگ ہوں کہ مادہ ان کا باعث نہ ہو یا باعث جزوی ہو؟ قوت اور حیات کے متعلق ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم انہیں سوائے مادہ کے تعلق کے کسی اور طرح نہیں جانتے۔ اب یہی قوت مدرک اس کے متعلق مختلف خیال ہیں۔ بعض کا یہ مذہب ہے کہ وہ مادہ سے آزاد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ دماغ کا نتیجہ ہے۔ اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ نظارہ اخصابی قوت مدرک کا آلہ ہے اور وہ اس طور پر کہ تمام افعال اور اکی کا تعلق اس نظام کی ساخت اجزائے لایہ تجزئے کی حرکت سے ہے۔ اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات رہ جاتی ہے کہ آیا وہ اس کا باعث کافی ہے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ قوت بلا شرکت مادہ ہمیں کیس نظر نہیں آتی +

مگر اس میں شک نہیں کہ اوراک طبعی (کانشس نس) یعنی خالص قوت مدرک کا قوت مدرک پر غور کرنے کا فعل مادہ سے باطل بے تعلق ہے۔ اور بلاشبہ وہ جذبات جن میں غرض کا مطلق لگاؤ نہیں ہوتا مثلاً محبت یا رحم بھی مادی تعلقات سے بری معلوم ہوتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں مادہ سے کچھ واسطہ نہیں۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اوراک طبعی (کانشس نس) کو ان دیگر اور اکی افعال سے الگ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جن کا تعلق دماغ کے تغیرات اجزائے لایہ تجزئے سے ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے جذبات سے ہمارے جسم اور

دلغہ پر کس قدر اثر پڑتا ہے مثلاً دفعتاً سر میں درد ہونا۔ چہرہ کا سرخ ہو جانا۔ نبض اور سانس کا تیز ہو چلنا۔ تو انہیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم مان کی شرکت سے بری نہیں ہو سکتے اور اسی اعتراف سے مادین کی بن آتی ہے۔ کیونکہ مظاہر عالم کہیں بلا تعلق مادہ نہیں پائے جاتے۔ اس کا لگاؤ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ ضرور نہیں کہ صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر کا باعث کافی و دانی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے تو کون سی شے ہے جو اس کا تکمّل کرتی ہے +

مثلاً یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن بہر حال یہ باور کرنا چاہئے کہ مادہ کے وجود کی شہادت سوائے قوت مدرک کی اطلاع کے اور کوئی نہیں ہے یعنی مان کا وجود خود قوت مدرک کا نتیجہ ہے جو وہ بعض واقعات سے اخذ کرتی ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف حواس کا یقین کرنا چاہئے اور قوت مدرک کے نتائج کا اعتبار نہ کرنا چاہئے انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ مادہ حس سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق قوت مدرک سے ہے جو حواس کے واقعات سے نتیجہ نکالتی ہے۔ اس امر کو مشہور فلسفی بشپ بارکلی سلسلے نہایت خوبی کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ میں یہاں اس کے فلسفہ کو بالتفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا بلکہ اسی قدر اشارہ پر کفایت کرتا ہوں جو

مادہ کی تین حالتیں ہیں جو قدیم سے اب تک تسلیم کی گئی ہیں ٹھوس جیسے برتن سیال جیسے پانی اور اخائی جیسے آکسیجن یا میٹروجن۔ بعض اہل سائنس نے ایک اور حالت بھی انفاذ کی ہے جو گیس سے بھی زیادہ لطیف ہے اور وہ شعاعی کہلاتی ہے +

مادہ کی نسبت یہ خیال کیا گیا ہے کہ وہ اجزائے لایتجزئے سے بنا ہے۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے اجسام ہیں جن میں مادہ کے تمام خواص موجود ہیں اور ان کے باہمی تعلق کو قوت اجزائے لایتجزئے کہتے ہیں۔ اور ہر جزو دیگر جیسی کسی نہ کسی کیبیامدی عنصر کے ایک یا ایک سے زائد اجزائے لایتجزئے سے بنا ہے اور ان مختلف عناصر کے

اجزائے دیمقراطیسی میں جو تناسب پایا جاتا ہے وہ کیمیادی اتصال کے قوانین کی رو سے  
محل میں آتا ہے +

یہ اجزائے لایتجزئے اور اجزائے دیمقراطیسی کیا ہیں؟ انسان کی آنکھ نے ان میں  
سے کسی کو نہیں دیکھا ہے اور ان کے وجود کا علم ہمیں اسی طح استدلال اور قیاس سے  
حاصل ہوا ہے جیسے روح کا ہے جنہ لایتجزئے میں چند خاص و صفات مانی گئی ہیں +  
اول قوت اتصال یا کشش اجزائے لایتجزئے - یہ وہ قوت ہے جو ہر شے کو جو  
جزو لایتجزئے سے جڑی ہے مجتمع رکھتی ہے - یہ قوت ٹھوس حالت میں زیادہ - حالت  
سیال میں کم اور حالت بخانی میں باطل نہیں ہوتی +

دوم - یہ خیال کیا گیا ہے کہ ہر جزو لایتجزئے ایک انتعاشی حرکت سے بیچین رہتا  
ہے اور اس حرکت کے مختلف نتائج سے مادہ کی ٹھوس سیال و دھاتی اور شعاعی حالتوں  
میں فرق پیدا ہوتے ہیں +

سوم - ہر جزو لایتجزئے میں نہ صرف بیرونی حرکت ہوتی ہے بلکہ ایک حرکت اندرونی  
بھی ہوتی ہے - بیرونی حرکت کل جسم یا نظام کی ہے اور اندرونی حرکت ایک حصہ  
جنہ لایتجزئے کی دوسرے حصہ پر مگر اس حرکت سے اس کی اجتماعی حالت زائل نہیں  
ہوتی یعنی یہ نہیں ہے کہ اس کا ہر حصہ الگ ہو جائے - اس حرکت میں کپکپاہٹ پائی  
جاتی ہے +

چہارم ہر شے کے اجزائے لایتجزئے ایک ہی جماعت کے خیال کئے گئے ہیں  
اور یہی وجہ ہے کہ ایک شے کا ہر حصہ ایک سا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک گیس  
کی دو قسمیں پیدا کرنا جو مختلف جماعت کے اجزائے لایتجزئے سے بنی ہوں ناممکن  
ہے +

اس سے مفصلہ ذیل نتائج نکلنے ہیں :-

۱۔ ایک شے کے اجزائے لایتجزئے باصل ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ مگر وہ  
اشیا کے اجزائے مختلف ہوتے ہیں +

۲۔ مختلف اشیاء کے اجزائے لایتجزئے جسامت میں مختلف ہوتے ہیں اور ان  
میں کامل تدریجی ترقی نہیں ہوتی +

۳۔ ایک شے کے اجزائے لایتجزئے اپنی اندرونی حرکت میں توافقی رکھتے ہیں اور  
اسی لئے اس روشنی میں بھی جو ان سے نکلتی ہے +

۴۔ کسی جنطایتجزئے میں کسی عمل سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی +  
مان کی صحیح تعریف کرنا نہایت مشکل ہے اور نہ طبعیات کی کسی کتاب سے اس تعریف  
کا پتہ لگتا ہے۔ لیکن نظریہ اجزائے لایتجزئے کا (جو مان کے متعلق جدید نظریہ ہے)  
صحیح بیان مختصر طور پر کر دیا گیا ہے۔ اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور ان میں  
سے ایک جزو لایتجزئے لیتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے چھوٹا جزو مادہ کا ہے جس میں  
تمام صفات و خواص مان کے موجود ہیں۔ یا تو یہ سادہ یعنی مفرد ہے جیسے آکسیجن  
کا جزو لایتجزئے یا مرکب جیسے پانی کا جس میں دو اجزائے ویتھریٹھسی ہائی ڈروجن  
کے ہیں اور ایک آکسیجن کا۔ اس صورت میں جزو ویتھریٹھسی ایک مرکب شے  
ہے کیونکہ از روئے علم کیمیا اس زمین پر تخمیناً ستر اشیاء ایسی ہیں جو مفرد یا سادہ حالت  
میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں دوسرے سے ترکیب پانے کی (بشرطیکہ وہ ترکیب  
پائے) مختلف مقدار کا لحاظ ہوتا ہے۔ وہ بعض کو بعض شرائط پر اپنے ساتھ ملائی ہے  
اور بعض کو روک دیتی ہے۔ غرض ہر ایک دوسرے سے بوجہ کیمیاوی کشش واذدفاع  
الگ اور مختلف ہے۔ ہم نے اجزائے لایتجزئے اور اجزائے ویتھریٹھسی دونوں کو  
دیکھ لیا۔ ان میں کائنات کی ساخت کا اصل مسلا نہیں پایا جاتا بلکہ ساتھ ستر اشیاء  
ایسی ہیں۔ جو اپنی صفات کے لحاظ سے الگ الگ ہیں اور جن کی ترکیب سے دنیا

ایسا مواد تیار ہو سکتا ہے جو اجزائے لایتجزئے کے گدام کے لائق ہے۔ جنہاں تجزئے  
 کیسا وہی ساخت کے لحاظ سے اکثر مرکب ہوتا ہے۔ لیکن وہ طبعیات کی رو سے بھی  
 مرکب ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس میں ایک اندرونی حرکت بھی ہوتی ہے یعنی اس  
 کے ایک حصہ کی حرکت دوسرے حصے پر جس سے کہ اس پاس کے ایشیروں روشنی پیدا  
 ہوتی ہے اور یہ حرکت مختلف قسم کے اجزائے لایتجزئے میں مختلف ہوتی ہے۔ لہذا  
 اجزائے لایتجزئے اصل سالانہیں ہیں بلکہ بذات خود ایک کامل اور عجیب شے بنائی  
 گئی ہے۔ جسے آنکھ نے نہیں دیکھا بلکہ قیاس نے سوچ کر نکالا ہے۔

اب ایک طرف تو ہم اجزائے لایتجزئے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف سادہ اور  
 مفرد عناصر جن سے اجزائے لایتجزئے بنے ہیں لیکن کہیں اصل سالاجو تمام اشیاء  
 کی اصل ہے نہیں ملا۔ مگر باوجود اس کے ہر طرف ہم انتظام و ترتیب عقل و حکمت  
 کی بین شہادتیں دیکھتے ہیں بلکہ ہر قدم پر وہ اور قوی ہوتی جاتی ہیں۔

یہ ہے وہ مان جسے عالم علوم طبعیات دیکھتا تمام مظاہر کا باعث بناتا ہے۔  
 اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طبعی اجزائے لایتجزئے سے وہ صفات منسوب کرتا ہے۔  
 جن کا وجود ہونا قوی پاتا ہے لیکن اجزائے لایتجزئے میں نہیں کیونکہ اس نے اسے  
 کبھی نہیں دیکھا بلکہ بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا ہے اور اس لئے اس کا خیال  
 ہے کہ یہ صفات اجزائے لایتجزئے ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک عالم علم  
 کیسا اجزائے دیمقراطیسی سے وہ صفات منسوب کرتا ہے جن کا ہونا تو اسے معلوم  
 ہے لیکن اجزائے دیمقراطیسی میں نہیں۔ کیونکہ اس نے کبھی ایک خود دیمقراطیسی کا  
 تجربہ کا نہیں کیا بلکہ انہیں بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا۔ وہ مادی ذروں کے  
 حقد دیمقراطیسی میں آکسیجن سے دو اور ایک کی نسبت سے ملنے کی قوت دیکھتا ہے  
 جسے وہ درحقیقت مادی ذروں کے بڑے بڑے مجموعوں میں پاتا ہے۔ طبعیات

وکیما کے واقعات اجزائے لائیجر نے اور اجزائے دیمقراطیسی میں ادا ہوتے ہیں اور اجزائے لائیجر نے اور اجزائے دیمقراطیسی از روے تعریف کافی سبب ہیں اُن تِلْج کے جن سے کہ درحقیقت یہ اسباب استخراج کئے گئے تھے +

ان کے علاوہ دوسرے علوم بھی ہیں جو واقعات سے بحث کرتے ہیں۔ لیکن وہ ۹ حلات اجزائے لائیجر نے اور اجزائے دیمقراطیسی میں ادا ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس لئے وہ اس نظریہ پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ نظریہ بھی اُن واقعات پر جن سے وہ بحث کرتا ہے کچھ روشنی ڈالتا ہے یا نہیں +

کیا نظریہ اجزائے لائیجر نے اس اہم اور عظیم واقعہ یعنی حیات پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے؟ جدید تحقیق کی رو سے یہ ثابت ہوا ہے کہ حیات کو خواہ نباتی ہو یا حیوانی کلمۃ الاولیٰ (پروٹوبلیزم) سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ بغیر اس کے وہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ اور اگرچہ کلمۃ الاولیٰ کے کیما وی اجزا بھلی معلوم ہیں اور افسانہ انہیں اپنے ہاتھ سے ایک جگہ جمع کر سکتا ہے لیکن نہ تو کلمۃ الاولیٰ پیدا کر سکتا ہے اور نہ حیات جب تک کہ پہلے سے حیات موجود نہ ہو۔ اگر ہم اُن صفات کو لیں جو از روئے جدید سائنس اجزائے لائیجر نے میں پائی جاتی ہیں اور اُن کو ہزار ملائیں ہزار الٹ پلٹ کریں کبھی حیات تک رسائی نہیں ہو سکتی کیشش اجزائے لائیجر نے کی حرکت دہامی اور ان اجزا کی لپکاپائی ہونی حرکت کا سبب ل کر بھی اس نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے جسے حیات کہتے ہیں اور جو خیال کی اہل بنا اور ساخت کائنات کی جزو اعظم ہے۔ سائنس نے جہاں تک تجزیہ کیا ہے یہ امر بالتحقیق ثابت ہوا ہے کہ محض مردہ مادہ سے کوئی زندہ شے نہیں پیدا ہو سکتی +

جب حیات صرف اجزائے لائیجر نے یا مردہ مادہ سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ تو پھر

قوت مدرک تو کہاں ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اکثر اہل سائنس کا یہ قیاس ہے کہ قوت مدرک مادہ کا نتیجہ ہے لیکن اب تک کسی نے یہ ثابت نہیں کیا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ جب قوت مدرک کا یہ حال ہے تو کائنات جس یعنی معرفت طبعی تو اس سے بھی کہیں پرے ہے۔ کیونکہ معرفت طبعی کے معنی میں قوت مدرک کا اپنے باطن پر غور کرنا۔ اور یہ اجزائے دیمقرطیس کے ترتیب دینے والے اور الٹ پلٹ کرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ایشاد و محبت و ہمدردی کے جذبات ہیں۔

مکن ہے کہ ادین میں سے کوئی یہ کہے۔ کہ یہ سب کچھ سہی لیکن سائنس ترقی پزیر ہے۔ اور جوں جوں اسے ترقی ہوگی مادہ کی تعریف میں وسعت ہوتی جائے گی یہاں تک کہ کسی روز وہ ان تمام مظاہر کو بیان کر سکے گا جو اس وقت مافوق فطرت معلوم ہوتے ہیں اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر مادہ کی تعریف میں وسعت ہو جائے گی تو اس کے نتائج ہی یہ دلیل بھی کہ خود مادہ اس امر کی شہادت ہے کہ قوت مدرک اس سے قبل موجود تھی اور زیادہ قوی ہو جائے گی جس قدر اجزائے لایتجزے کی تحقیق میں زیادہ تہ کے اندر جاؤ گے اسی قدر اجزائے لایتجزے کے پیدا کرنے کے لئے قوت مدرک کی زیادہ ضرورت معلوم ہوگی۔ اگر نباتات اجزائے لایتجزے کا نتیجہ ہیں تو اجزائے لایتجزے کے وجود کے لئے بے شک قوت مدرک کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ عرض اس مشکل کو جس طرح چاہو حل کرنے کی کوشش کرو ایک چیز ایسی مانتی پڑے گی جو مادہ نہیں ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہم اس چیز کو مادہ سے الگ نہیں پائے۔ کیونکہ جس عالم کا ہمیں تجربہ ہے اس میں یہ سنگت ضروری ہے۔ لیکن یہ تجربہ محض یک طرفہ ہے۔ کائنات میں اور خود ہم میں اس امر کے اشارات اور شہادتیں موجود ہیں کہ یہ شے جو مادہ نہیں ہے عقل اور قوت مدرک سے تعلق رکھتی ہے اور اس سے اپنے ساتھ مادہ پر فضیلت ہے۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ روح جسم کی قید سے الگ ہو کر بھی قائم رہ سکتی ہے۔



اور اس میں شبہ نہیں کہ مان کا جو نظریہ اجزائے لایتجزئے اور اجزائے دیمقراطیسی کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے وہ خود ایک ایسی خالق اور منظم قوت مدرکہ کی شہادت دیتا ہے جس کی ہستی اس سے قبل ہے اور اس سے افضل ہے +

۱۰

نظام کائنات پر نظر ڈالنے اور اپنے باطن پر غور کرنے سے ہم یہاں تک پہنچے ہیں کہ کوئی ایسی شے ضرور ہے کہ مادہ سے بالا ہے جسے ہم روح کہتے ہیں اور کوئی ایسی قوت ابھی ایسے جو اس سے بھی بالا اور افضل ہے اور ساری کائنات پر حاوی اور ساری ہے۔ مذہب کی اہل یہیں سے پیدا ہوتی ہے جس سے سائنس بے خبر ہے اور اس بے خبری میں اس پر حملہ کرتا اور مضحکہ اڑاتا ہے پچھلی صدی میں جبکہ سائنس کی ترقی معراج کمال پر نظر آتی تھی۔ اکثر مذہب پر حملے کرنا۔ اس کی نہی اڑانا اور اس سے نفرت اور حقارت ظاہر کرنا اہل سائنس و فلاسفہ و حکما اور اکثر بڑے بڑے مصنفین کا عام دستور ہو گیا تھا اور یہ دستور رفتہ رفتہ فیشن ہو گیا۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا اور اب بھی اکثر سمجھا جاتا ہے کہ مذہب بڑھویوں کی کمائی اور بچوں کا کھیل ہے۔ یا ایک بیچا ہے جس کا ذرا زمانہ طفلی سے بیٹھا ہوا ہے۔ یا بھوت پریت کا سایہ ہے جواب تک اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ سائنس کے پر زور اور بیجا حملوں اور اس کی حیرت انگیز ترقی سے یہ یقین ہو چلا تھا کہ مذہب کوئی دن کا همان ہے۔ دنیا پر اب حکومت سائنس کی ہوگی وہ ان بچپن مسائل اور گنہیوں کو سلجھائے گا جواب تک لا بخل بھی جاتی تھیں۔ لیکن غم اسی کے زور سے اُسے کمزور کر دیا۔ اور وہ نشہ جس سے اہل سائنس محو رہتے آ رہے لگا اور بادیو حیرت انگیز ترقی اور عروج کے معلوم ہوا کہ وہ بے بس ہے اور اپنی حد سے آگے نہیں چل سکتا، انگر سال امدید لڑا جیسے امدائے مذہب سے وقت ہونے جلتے ہیں اور ان کی ہفوات پر کچھ توجہ نہیں کی جاتی۔ فرقہ ایک ناسک (لا اور یہ) کے بانی تھے

کھلی کے پرزور دلائل میں اب وہ قوت نہیں رہی اور ان کے سپرد بھی اب دھیمے چلنے ہیں۔ وہ نظام جو ابتدا سے انسان کے ساتھ ہے جوں جوں انسان بڑھا وہ بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا۔ اس نے دنیا میں بڑے بڑے تغیرات اور عظیم الشان انقلابات پیدا کئے اور اس کی ترقی میں پیش پیش رہا۔ اور یہ اب بھی انسان کی معاشرت اور تمدن کے ہر پہلو اور ہر روش میں نظر آتا ہے۔ اس کی حکومت انسان کے دل پر اب بھی ویسی ہے جیسی پہلی تھی اور آئندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ اہل سائنس نے اس کی طرف سے نہ صرف بے توجہی کی بلکہ حقارت کا اظہار کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس متم بالشان اور عجیب و غریب نظام پر جس کی قوت ابتدا سے اب تک برابر چلی آ رہی ہے اور جس کی حکومت سے باوجود انکار کئے بھی انسان نہیں بچ سکتا غور کرتے اور دوسرے پہلو سے نظر ڈالتے انہوں نے اس کے بھترے میں اس سے منہ موڑ لیا۔ صرف ایک پہلو دیکھ کر سمجھ لیا کہ دوسری طرف کچھ نہیں۔ حالانکہ اگر مذہب کے پہلو سے انسانی ترقی پر نظر ڈالی جاتی تو منظر بیاں وسیع اور کمال ہو جاتا۔ لیکن یہ اہل سائنس کی کوتاہ نظری ہے کہ انہوں نے انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن کا انحصار محض سائنس پر رکھا۔ حیات کی ہر حرکت اور روش کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہیں۔ جب کوئی چیز دنیا میں اتفاق سے نہیں آتی۔ تو کیا مذہب جنہیں انسان کی تاریخ و معاشرت میں اس قدر دخل تصرف اور قوت سے ممل اور لغو ہیں؟ کیا انہیں انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن میں کچھ بھی دخل نہیں؟ یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جس پر اہل سائنس اور فلاسفہ کو غور کرنا چاہئے تھا مگر افسوس ہے کہ ان کی تنگ نظری اور ہٹ نے انہیں کبھی اس طرف متوجہ نہ کیا۔ سائنس کی نظر ہمیشہ مذہب کی طرف سے پھری رہی۔ اور ابتدا سے جو اس نے مذہب کی مخالفت میں کرنا بدھن تو اب تک وہی مخالفت چلی آتی ہے لیکن کبھی اس نے یہ غور نہ کیا کہ آخر یہ مخالفت کیوں ہے۔ بلکہ بجائے

تحقیق کے جو اس کا شیوہ ہے اس نے اس حلقہ کی آگ میں اور تیل ڈالا۔  
ہم دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انسان ابتدا سے برابر ترقی کرتا  
چلا آتا ہے اور ایک ذہین سے دوسرے ذہین پر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور جب ہم  
اس ترقی پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو یہ ایک ایسی عجیب و غریب اور عظیم الشان حقیقت  
نظر آتی ہے کہ خود انسانی خیال بھی اس کے سامنے جھک کے رہ جاتا ہے سب سے  
اول اُسے حیوانات اور وحشی جانوروں سے سابقہ پڑا۔ اور ان پر غالب آکر وہ آگے  
بڑھا اور رفتہ رفتہ برابر ترقی کرتا رہا مگر اس رستہ میں اُسے بڑی بڑی مصیبتیں اور فتنیں  
بھیلنی پڑیں۔ بڑی بڑی ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا ہوا۔ اور اب تک ترقی کے  
میدان میں اُسے وہی ہفتخاں طے کرنے پڑتے ہیں۔ اور اُسے اپنے بنی نفع کے ساتھ  
ہر دفعہ اور ہر لحظہ وہی لڑائی لڑنی پڑتی ہے جو وہ اب تک لڑتا آیا ہے۔ یہی لڑائی  
مقابلہ منافضہ اور جدوجہد ترقی اور تہذیب و تمدن کی جان ہے۔ ہر شے جس میں حیات  
ہے اور تمام امور اور خیالات میں جن کا حیات سے تعلق ہے یہی جدوجہد  
پائی جاتی ہے۔ تمام اغوال و حرکات میں۔ تمام ارادوں اور نیقوں میں۔ اندرونی اور بیرونی  
زندگی میں ہماری زندگی کے اعلیٰ اور نازک موقعوں میں ہمارا بڑا منشا یہ ہوتا ہے کہ  
کامیابی حاصل کریں اور ناکامی سے بچیں۔ ہماری ساری طاقت اور دشمنی اسی  
میں صرف ہوتی ہے۔

انسان اور دیگر تمام حیوانات میں ایک خاص فرق ہے اور وہ یہ کہ انسان میں  
دو ایسی خصوصیتیں جمع ہیں جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں اور اس لئے اس کا ارتقا  
دوسرے حیوانات کے ارتقا سے مختلف ہے۔ ایک تو عقل ہے اور اس ترقی میں اس کا  
بڑا حصہ ہے لیکن عقل انسان کو دو باتیں سکھاتی ہے ایک تو یہ کہ اس کا ذاتی فائدہ  
سب سے ضروری اور سب سے مقدم ہے دوسرے موجودہ وقت بڑی چیز ہے

ہمارا سارا فائدہ اسی سے وابستہ ہے اور اسی میں ہونا چاہئے۔ دوسری خصوصیت انسان میں مدینیت کی ہے یعنی وہ قابلیت جس کے اثر سے وہ اپنے بنی نوع سے مل جل کر جماعتوں میں رہ کر کام کرتا ہے۔ یہ دو خصوصیتیں ایک دوسرے کی مخالف ہیں اور آپس میں ان کی مصالحت ممکن نہیں معلوم ہوتی عقل کا کلام تفرقہ، انفعال اور فناء ہے۔ تمدن کی ترقی کے لئے ایثار اور سوسائٹی کے فائدہ کو اپنے فوائد پر مقدم سمجھنا اپنے اغراض و فوائد کو دوسروں کے لئے اور خصوصاً ان نسلوں کے لئے جواب تک وجہ میں نہیں آئیں۔ قربانی کرنا ہے۔ یہ ایثار اور قربانی سائنس اور عقل نہیں سکھا سکتی۔ اس کی ہدایت عقل اور سائنس سے بالاسے اور یہ ہدایت مذہب سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے انسانی تمدن و ترقی مذہب پر مبنی ہے۔ ارتقا کا مقصد جدوجہد اور قربانی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ صرف مذہب میں پایا جاتا ہے جس کی ہدایت عقل سے بالاسے عقل اس کی مخالف ہے۔ اور اس لئے ضرور ہے کہ عقل مذہب کے تابع رہ کر جدوجہد کرے۔ ورنہ اگر ان غالب آجائے گی تو شیرازہ نظام تمدن بکھر جائے گا۔ ارتقا نے عالم میں افراد و سوسائٹی کے لئے قربانی کر دینے جاتے ہیں عقل افراد کو اپنے فوائد کے لئے سعی کرنا سکھاتی ہے اور انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ مذہب ہمیں ذاتی اور شخصی قربانی اور سکھاتا ہے۔ نہ صرف ان لوگوں کی خاطر جو ہمارے اس پاس زندہ موجود ہیں بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی جو آئندہ زمانہ میں آئیں گے اور ابھی وجود میں بھی نہیں آئے۔ حالانکہ یہ امر ذاتی فوائد کے خلاف ہے۔ معرض انسانی تمدن میں دو مخالف رجحانات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہے جس میں افراد کو سوسائٹی کے تابع ہونا پڑتا ہے اور دوسرا رجحان عقلی ہے جسے اس اتباع میں جس میں اس کا مطلق فائدہ نہیں بلکہ زیادہ تر ایسے لوگوں کا فائدہ ہے جو ابھی وجود میں نہیں آتے تامل اور غور ہے۔ لیکن ترقی دہی قوم کر سکتی ہے۔ میں دوسرا رجحان پہلے رجحان کے تابع ہے۔ مگر اس اتباع کے

عقل یا سائنس کی کتاب میں کوئی فتویٰ نہیں ملتا۔ اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں کہ وہ کس قدر  
 ناپائدار اور کس قدر بے بنیاد ہے تو عقل صرف ایک فرض پر بہت زیادہ زور دیتی ہے  
 جس کے سامنے باقی تمام خیالات بیچ ہیں۔ اس کی ہدایت یہی ہے کہ جہاں تک ممکن  
 ہو عمر کے ان چند لمحوں کو کام میں لایا جائے اور حتیٰ الوسع ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔  
 انسان تکلیف سے بچنے کی راحت حاصل کرے اور یہ چند دم جو ہمیں مستعار ملے ہیں آرام  
 سے بسر ہو جائیں۔ اور اسی خیال سے انسان دولت کماتا ہے شہرت اور قوت حاصل  
 کرتا ہے اور طمع طمع کے لیے کام کرتا ہے جن سے عیش و راحت اور لطف نصیب  
 ہو۔ اگر یہ رجحان بے روک ٹوک ترقی کرتا رہے تو انسانی ترقی رک جائے۔ اس لئے  
 اسے ایک دوسرے رجحان کے تابع ہونا پڑتا ہے جس کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں۔  
 دنیا میں جہاں کہیں اصل ترقی ہوئی وہاں اخلاقی اور مذہبی رجحان غالب رہا اور عقل  
 اس کے تابع رہی۔ عقل بے شک ہماری رہبر و رہنما ہے لیکن اس کا احاطہ محدود  
 اور اس کی نظر تنگ ہے۔ اور اس لئے ضرورت ہے ایک ایسی ہدایت کی جو اس سے  
 آگے ہمیں لے جائے۔ اور یہ کسی مذہب سے پوری ہوتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ  
 جو لوگ مذہبی اور اخلاقی نظام کے باطل قائل نہیں وہ باوجود اس کے نیک نیت اور  
 محیر اور نیک چلن ہوتے ہیں لیکن یہ امر ماننے یا نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے۔ انسانی  
 تمدن یا انسانی ترقی چند اشخاص یا ایک آدمی کا کام نہیں ہے۔ قرون اور نسلاں  
 کی جدوجہد کے بعد حالت درست ہوتی ہے۔ جو شخص کسی اصول اخلاق و مذہب کا قائل  
 نہیں ہے وہ بھی اسی سلسلہ تمدن کی پیداوار ہے۔ اس کی نشست و برخاست بات  
 چیت۔ طرز خیال غرض کل حرکات و افعال اسی سانچے میں ڈھلے ہیں اور اسی سوانحی  
 سے ارتقاء تعلیم سمجھ لے ہیں۔ وہ ہزار زبان سے انکار کیا کرے مگر جو روش و رجحان طبیعت  
 اس میں پیدا ہو گیا ہے وہ اسے زائل نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ اپنے آپ سے باہر نہیں

نہی کر سکتا۔ وہ مجبور ہے۔ اور بات بات میں اُسی نظام اخلاق و مذہب کا تابع ہے جس کو وہ انکار کرتا اور جس کی وہ قہقہہ کرتا ہے۔

یونان کی عقلی ترقی دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ اور بڑے بڑے اہل آراء کی رائے ہے کہ باوجود زمانہ موجودہ کی حیرت انگیز ترقی کے ہم ابھی تک اس درجہ کو نہیں پہنچے اور ہم اب بھی سقراط افلاطون ورسطو و فیثا اس جیسے لوگ پیدا نہیں کر سکے۔ لیکن باوجود اس زبردست عقلی ترقی کے وہ ایسا نیست و نابود ہوا کہ گویا کبھی پتا ہی نہیں ہو سکتا کہ اس ترقی میں عقل غالب آگئی تھی اور اخلاقی و مذہبی اصول تابع عقل کر دیئے گئے تھے۔ اسی بد اخلاقی اور بد مذہبی نے روما کو تباہ و برباد کیا۔ لیکن یہودی اور ہندو باوجود وہ صدیوں سے محکوم اور غلام ہیں اب تک باقی ہیں ان میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے۔ روما و یونان کے زوال کی تاریخیں پڑھنے سے حیرت و عبرت ہوتی ہے اور یہ بہت بڑا سبق ہے اُن اقوام کے لئے جو دنیا میں بڑھنا اور ترقی کرنا چاہتی ہیں۔

انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔ ایک چیز کے حامل ہونے پر دوسری اور دوسری سے تیسری کی طرف پھرتا ہے جب بھوک لگی تو کھانے کی تلاش ہوئی رفتہ رفتہ جب روٹی پیٹ بھر کے ملنے لگی تو بھوک تو ایک طرف رہ گئی کھانے کا مدار ذائقہ پر آ پھیرا۔ اور اس چاٹ میں اس نے وہ ترکیبیں اور نزاکتیں پیدا کیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ کپڑا بدن کی حفاظت اور راحت کے لئے تھا اُسے اس نے وجہ زیبائش و آرائش بنالیا۔ وہ حقیر جھوپڑا جو سر چھاننے کے لئے بنایا تھا اب ایک شاندار محل بن گیا ہے۔ جس میں تمام سامان آرائش و حسن جمع ہیں۔ اسی طرح اس نے دولت حکومت قوت حاصل کرنے کی کوشش کی اور جوں جوں اس کے دل کا مدعا حاصل ہوتا گیا اس کی ہوس اور بڑھتی گئی۔ اور اس کے خیال کی جولانی میں اور وسعت ہوئی گئی۔ اور ہر شے میں نئی نئی نزاکتیں اور لطافتیں پیدا

ہوتی گئیں اور وہ ان میں ایسا محسوس ہوا کہ بالآخر یہی اس کے زوال کا باعث ہوئیں اصل یہ ہے  
 کہ انسانی ترقی باطن سے شروع ہوتی ہے اور انسانی تنزل بھی باطن ہی کی طرف سے ہوتا  
 ہے۔ جو لوگ جسمانی آرام اور مادی راحتوں میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی کو اصل ترقی  
 سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ درجہ اسفل میں رہتے ہیں اور کبھی درجہ اسفل کو نہیں پہنچتے جو ہمیشہ  
 باطن کی ترقی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ جسم عارضی اور فانی ہے اور اس کے ساتھ اس  
 کی ساری خواہشیں اور راحتیں اس کی ساری حکومت اور قوت بھی فنا ہونے والی  
 ہے جسم کے چھوڑنے کے بعد روح رہ جائے گی اور وہ ہمیشہ رہے گی جس نے اپنی  
 نفسانیت اور خود غرضی کو دبا کر ایثار کو ترجیح نہیں دی جس نے اُس ہدایت کے نور  
 سے جو مذہب کے ذریعہ سے ہوتی ہے اپنے آپ کو منور نہیں کیا اور اپنے باطن  
 اور روح کو صفائی کی طرف توجہ نہیں کی تو اُس کی روح عالم ارواح میں بھی اونٹ  
 حالت میں رہے گی۔ ڈارون کا اصول ارتقا صرف جسم اور اس کے علاقے تک ہے  
 جب جسم کا خاتمہ ہو گیا تو اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس اصول کے ماننے والوں کو اور  
 خدا دوسری طرف بھی توجہ کرنی چاہئے جو اصل ترقی ہے اور جس کا سلسلہ ابد الابد تک  
 رہنے والا ہے۔ جسم کے چھوڑنے کے بعد روح جس حالت میں یہاں تھی اُسی حالت  
 میں عالم ارواح میں پہنچی ہے۔ اگر وہ یہاں اونٹ حالت میں تھی تو وہ وہاں اونٹ  
 حالت میں رہ کر پھر ترقی کرے گی اور یہاں کی جسمانی خواہشات غالباً اس کی تکلیف کا  
 باعث ہوں گی اگر اس نے یہاں ترقی کی ہے تو ترقی یافتہ حالت میں پہنچے گی اور  
 وہاں سے ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ دوسرے عالم ارواح میں جائے گی اور  
 اسی طرح ترقی کر کے اس سے بھی اعلیٰ عالم میں پہنچے گی۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ  
 جاری رہے گا۔ کیونکہ جس طرح سیاروں کے نظام لا قدو لا تحسب ہیں اسی طرح نظامات  
 روح بھی بچہ و بزرگ ہیں۔ یہ ہے اصل اور صحیح اصول ارتقا جس کا سلسلہ ناقص ہی ہے

اور لازوال ہے۔ اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے خیالات کو چھوڑ کر درجہ سفل سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرے جس کی ہدایت ہمیں مذہب کرتا ہے ۛ

۱۱

غرض سائنس انسان کا کامل تعلق کائنات سے اس طور پر ظاہر نہیں کر سکتا جیسا کہ مذہب کرتا ہے۔ کیونکہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ اس کی رسائی صرف مادی اشیاء تک ہے۔ لیکن مذہب کی حکومت بہت وسیع ہے۔ وہ مادی اور غیر مادی دونوں ملکوتوں پر حاوی ہے اور اس کے اصول دور دور تک پہنچتے ہیں۔ جہاں سائنس کے پڑ جلتے ہیں۔ مذہب نہ صرف ان فرضوں کو ادا کرتا ہے جو متعلق انسان کے نفس سے ہیں یا جو دوسروں سے متعلق ہیں۔ بلکہ وہ ان فرضوں کا بھی خیال رکھتا ہے جو ان لوگوں کے متعلق ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئے نہ صرف یہی بلکہ وہ اس عالم سے بھی متعلق ہے جہاں ہمیں اس دنیا سے کچھ کرنے کے بعد جانا ہے سائنس انسان کی روح اور روحانی عالم اور عقیدے کا انکار کیا کرے کیونکہ وہ کوئی نظر ہے۔ لیکن اس کے انکار سے کسی شے کی ہستی زائل نہیں ہو سکتی۔ اہل سائنس اپنے بھرے برابر علم پر اس قدر نازاں اور مغرور ہیں کہ جو بات ان کے علم میں نہیں اس سے وہ جھجھٹ انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اور چند قانون قدرت جو انہیں معلوم ہوئے ہیں ان پر اس قدر بھروسہ ہے کہ جو بات ذرا ان کے خلاف نظر آئے فوراً کھینچتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے یہ خلاف قانون قدرت ہے۔ گویا یہ کائنات کے تمام قوانین قدرت پر حاوی ہیں۔ جو ذرا ہوشیار ہیں انہوں نے ایک دوسری ترکیب نکالی ہے ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم نہیں جانتے یا ہمیں اس کا علم نہیں لیکن یہ جواب خود ان سائنس دانوں کے لئے جو تلاش اور تحقیق رکھتا ہے تحقیق سے اعراض کرنا سائنس کی ذات ہے نہ خلاف ہے لیکن اہل سائنس کی یہی ہمیشہ کی عادت رہی ہے۔ جو امر ان کی تحقیق اور ان کی حد و حد سے باہر ہیں ان کے تو منکر ہی ہیں لیکن



سائنٹفک تحقیقات کو بھی انہوں نے ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر ڈیرپرنے اپنی کتاب میں اہل مذاہب پر توجہ باجاطن و تشنیع کی ہے کہ انہوں نے سائنس کی مخالفت کی لیکن انہیں یہ بھی ضرور معلوم ہو گا کہ خود اہل سائنس نے تمام سائنٹفک تحقیقات کی ابتدا ابتدا میں کس قدر مخالفت کی ہے۔ اور جب کبھی اور جہاں کہیں سائنس میں کوئی نئی دریافت یا تحقیقات ہوئی تو سب سے اول اس کی مخالفت میں اہل سائنس آستینیں پڑھا کر آئے۔ کوپرنیکس۔ گلیلیو اور ہاروے کے نام سے کون واقف نہیں انہوں نے سائنس میں ایسے ایسے انکشافات کئے ہیں جو تاقیامت یا دوکار رہیں گے۔ لیکن ان کی مخالفت سب سے اول نہایت شد و مد کے ساتھ ان کے ہم عصر اہل سائنس نے کی جب جیمز فرینکلن نے رائل سوسائٹی کے سامنے برقہ کی بحث کی تو تمام اہل سائنس نے اسے بے وقعت بنایا اور رسالہ فلاسوفیکل ٹرنزیکشنس نے اس مضمون کو درج کرنے سے انکار کیا۔ حالانکہ وہی چیز آج کل کس قدر مفید اور کارآمد ثابت ہوئی اور اس کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ جب نیوٹن نے روشنی کے نظریہ انتعاشیہ کے عجیب و غریب ثبوت پیش کئے تو سائنس دانوں نے اس کی خوب ہنسی اڑائی۔ سر ہنری ڈیوی نے جب یہ خیال ظاہر کیا کہ لندن میں گیس کی روشنی ہو سکتی ہے تو اہل سائنس نے اس کا مضحکہ اڑایا۔ اسٹیون۔ نے جب یہ تجویز کی کہ لارپل اور مائیکروٹر کے ریوے روڈ پر انجن گاڑی چلائی جائے تو اس وقت کے بڑے بڑے اہل سائنس نے شہادت میں بیان کیا کہ نیا ممکن ہے کہ اس کی رفتار بارہ میل فی گھنٹہ بھی ہو سکے۔ جب نامور اور مشہور منجم آسے گو نے برقی ٹیلیگراف کے متعلق بحث کرنی چاہی تو فریخ اکاڈمی آف سائنس نے اس کی خوب ہنسی اڑائی اور اسے بحث نہ کرنے دی۔ یہ چند عام اور معمولی نظریہ پیش کی گئی ہیں ورنہ سائنس کی ہر شاخ کے متعلق سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ جب کسی نے کوئی نئی تحقیقات کی تو سب سے اول اہل سائنس نے اس کی مخالفت کی۔

جب سائنس کے متعلق اہل سائنس کا یہ حال ہے تو روحانیات کے متعلق وہ جس قدر شدت و مد کے ساتھ مخالفت کریں کم ہے لیکن وہ اسوجہ کی وہ مخالفت کرتے ہیں اور جن کے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں ایک روز مسلم ہو جائیں گے اور انہیں اپنی مخالفت پر خود افسوس کرنا پڑے گا۔ کیونکہ انہوں نے ویدہ و اہستہ اپنے ہاتھوں اپنے علم کو محو کر رکھا اہل سائنس اہل مذاہب کو تعصب کا الزام دیتے ہیں لیکن ان کی ضد اور ان کا تعصب ان سے کچھ کم نہیں۔ ان کے ذرا سے علم نے انہیں اندھا کر دیا ہے تحقیقی تجسس جس پر انہیں ناز ہے وہ صرف ایک نہایت تنگ دائرہ تک محدود رکھتے ہیں۔ اس کے آگے دیکھنے سے وہ صاف انکار کرتے ہیں اور محض تعصب کی وجہ سے اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کرنا نہیں چاہتے لیکن وہ وقت آتا ہے جب انہیں مجبوراً اس غول کو نور باہر نکلنا پڑے گا۔

غرض اگر ہم روح کی ہستی اور اس کی قوت سے جس کے متعلق بے انتہا واقعات اور بہت قوی لائل موجود ہیں انکار کر دیں اور مذہب کو جس کے اصول کی زیادہ تر بنیاد اسی پر ہے انسانی تمدن سے خارج کر دیں تو انسان کی زندگی محض بے سود و بیکار اور بے برگ و ثمر رہ جاتی ہے۔ اگر انسان صرف اسی مادی دنیا کو اور اس چند روزہ زندگی کو اپنا منہا سمجھ لے تو کیا ان انسانی تناؤں کے لئے ہوا اس کے دل میں موجیں مار رہی ہیں یہ دنیا کافی ہو سکتی ہے؟ کیا انسانی حیات کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ وہ یہاں آئے اور چند روز بڑی بھلی طرح کاٹ کر چل دے؟ کیا علوم طبعیات سچے اخلاق اور سچے اشار کی ہدایت دے سکتے ہیں؟ اگر صرف مادہ ہی اصل حقیقت ہے اور طبعیات و ریاضیات کے قانون اس کے فراموش واپس تو انسان محض ایک چلتی پھرتی کل ہے۔ اور اس کے بعد دنیا میں کوئی قوت ہے تو ایک متناہی قوت ہے جو سب پر غالب آ جائے گی۔ خیر و شر برابر ہی بھلائی و شر ہے یہ نہیں ہے

کہ وہ ہمارے ذاتی یا تمدنی ذلیل و حقیر اغراض کے مطابق یا غیر مطابق ہے۔ بلکہ اس کا تطابق یا غیر تطابق اس قانون سے ضروری اور لازمی ہے جو ہم سے بالا اور آگے قانون ہے۔ انسان کے دل سے اس قانون کے خیال کو مشادو۔ اور خدا۔ حیات جاوید۔ نصیحت و محبت اور عذاب و ثواب کے خیالات نکال دو تو انسان کیا رہ جاتا ہے۔ صرف ایک وحشی جانور بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اس میں سے ترقی کا مان سب زائل ہو جائے گا اور مادیت کے زہر سے سچے اور پاکیزہ اخلاق مرجھا جائیں گے۔ افسوس اُن بچاروں پر جو ہوش سنبھالتے ہی محنت و مشقت میں جُٹ جاتے بجائیں سستے اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ کس لئے؟ اس لئے کہ چند غافل ناکسوں کی عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچائیں۔ افسوس اُن پر جن کی ساری عمر اس فکر و تردد میں کٹ گئی کہ کسی طرح دولت ملے جو اصل مسرت ہے۔ دولت ملی۔ اُس وقت جب کہ آفتیں سستے سستے اور بلائیں جھیلنے جھیلنے مچھک گئی۔ آنکھوں کی روشنی مدھم ہو گئی۔ ذہنی سی سکت رہی نہ پہلا سا جوش۔ قوے میں ضحلال اور عناصر میں اختلال آگیا۔ اب معلوم ہوا کہ صرف دولت مسرت کا باعث نہیں۔ یا اُس وقت بے مانگے بلا محنت مشقت کے ملی جبکہ جوانی کا بھوت سر پر سوار تھا۔ اور بجائے مسرت کے زحمت اور آفت کا باعث ہوئی۔ -

کاش ضبط نفس ہوتا۔ تھوڑی سی قناعت اور اعتدال پر نظر ہوتی۔ دولت اور دولت سے جسمانی عیش انتہائے مسرت کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے لیکن حصول دولت و عیش کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوکا تھا۔ خود اس میں اس قدر بلائیں اور آفتیں بھری ہیں کہ خوشی مفقود ہو جاتی ہے اصل خوشی اعتدال قناعت اور ضبط نفس میں ہے۔ -

بشرطیکہ انسان کسی مقصد غلط کے حصول میں مشغول ہو۔ اور یہ اُسی وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ باطن کی روشنی کی جھلک سے بیرونی حالات پر اثر پڑے۔ بیرونی حالات کے موافق کر لینے اور مادی سامان کے حصول سے جو لوگ دل کو مطمئن اور بامسرت

بنانا چاہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ دل کی خواہشات کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ اُس کی گہرائی کی کوئی تھاد ہے۔ بلکہ کام دوسری طرف سے شروع کرنا چاہئے۔ اپنے ارادے میں قوت نفس پر جبر اور ضبط حاصل کرنا اور خواہشات نفسانی کو اس کے تابع بنانا چاہئے تاکہ قلب کا اثر مادی حالات و خواہشات پر پڑے اور وہ اس کے لطف و مسرت کا باعث ہوں۔ اُسی وقت اعتدال و قناعت نصیب ہوگی اور کام میں سہولت و استقلال پیدا ہوگا۔ لیکن اس سے بھی اعلیٰ مسرت انسان کو اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ بے نفسی اور بے غرضی سے کام لیتا ہے۔ حیات انسانی کی زندگی میں سچ و الم ہے۔ انسان ہر طرف سے خطرے اور بے اطمینانی سے گھرا ہوا ہے۔ اور زیادہ تر جو وہ کھیل اور تفریح اور دیگر اشغال میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنے آپ کو بھلائے رکھے اور دلی کاوشوں کی طرف اس کا خیال نہ جائے۔ انسانی فطرت کا ایک یہ بھی اصول ہے کہ انسان خوشی کی تلاش اور حصول سے نہیں بلکہ اپنی مصروفیت سے آرام زندگی کا مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہ عام مصروفیت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اعلیٰ درجہ اس کا اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ بے غرض اور بے نفس ہوتا ہے اور دوسروں کو مسرت اور خوشی پہنچانے کے لئے اپنے تئیں بھلا دیتا ہے۔ مذہب کی زبان میں اسے ثواب کا کام کہتے ہیں۔ وہ ایک تنگ دائرہ سے نکل کر انسانی ہمدردی اور اخلاق کے اعلیٰ طبقہ میں جا پہنچتا ہے اور دوسروں کو راحت پہنچانے کے خیال میں وہ اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے سچے مذہب کی تعلیم ہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مذہبی آدمی کی خوشی زیادہ پائدار اور مستقل اور بے غل و غش ہوتی ہے اور اُسے اپنے کام پر زیادہ اطمینان ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ کا شکر اور حال پر قناعت کرتا اور آئندہ کی توقع رکھتا ہے۔ اُس کو اہوس دولت کے بندے کے جو گزشتہ پہنچتا اور حال میں مذہب بے اطمینان

رہتا ہے اور آئین زمانہ اُسے تاریک نظر آتا ہے +

۱۲

ہم نے جو گزشتہ اوراق میں انسان کی مذہبی اور روحانی قوت پر بہت زیادہ زور دیا ہے تو اس کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ عقل یا سائنس و فلسفہ بیکار یا گمراہ کرنے والے ہیں۔ بلکہ اس تنج پر زیادہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ آج کل سائنس کی چکا چوند سے لوگوں کی نگاہ اس قدر خیرہ ہو گئی ہے کہ وہ دوسرے مخ پر نظر نہیں ڈالتے۔ ورنہ سائنس و فلسفہ کے کارآمد ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اور مادی ترقی سے اس نے انسانی تمدن کو جو مدد دی ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ محض سائنس کی ترقی انسانی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اُسے اس رتبہ پر پہنچا سکتی ہے جو اس کا اصل منشا و مقصد ہے +

پھر سائنس اور مذہب میں اختلاف و مخالفت کیوں ہے؟ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ اس اختلاف و مخالفت کی کوئی وجہ نہیں۔ محض غلط فہمی پر مبنی ہے +

مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہے اور سائنس کی بنیاد عقل پر اہل مذہب سائنس اس لئے درمے ہیں کہ سائنس کے اصول اور ان کے انکشافات مذہب کو کمزور و زائل کر دیں گے حالانکہ یہ خیال محض باطل ہے۔ سائنس صد سال سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے لیکن وہ مذہب کی بنیاد کبھی نہ ہلا سکا۔ مذہب کی قوت ابھی تک ویسی ہی قائم ہے اور قائم رہے گی۔ اس لئے کہ جس شے پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس سے باہر ہے۔ خیال مافوق العادۃ عقل سے باہر ہے اس لئے کہ اس کا تعلق دل سے ہے و باطن سے نہیں۔ اور یہ ایک ایسا وجدان قلب ہے جس میں غیر محدود کے محسوس کرنے کی قوت ہے۔ حالانکہ عقل بذاتِ محدود ہے۔ غیر محدود یعنی خدا کا دیکھنے اور پہچاننے والا دل ہے عقلی استدلال سے اس کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اولہ و براہین اسی کیلئے مفید ثابت

ہو سکتی ہیں جس میں پہلے سے یہ وجدان ہے اور خدا کو مانتا ہے۔ جو نہیں مانتا اس کے لئے تمام دلائل بیکار ہیں۔ لہذا اہل مذہب کو سائنس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر زمین گردش کرتی ہے تو اور آسمان پھرتا ہے تو مذہب کو اس سے کیا تعلق؟ اگر کوئی نیا ستارہ دریافت ہو تو مذہب پر اس کا کیا اثر؟ اگر زمین کے اندر سے نئے نئے گاما متحجر نکلیں اور ان سے انسان کی قدامت پر روشنی پڑے تو مذہب کو اس سے ڈرنے کی وجہ؟ اگر کشش ثقل نے سائنس میں انقلاب پیدا کیا اور بہت سے مسائل عالم کو حل کیا تو بہت مبارک۔ مذہب اس سے کیوں خائف ہو؟ اور نظریہ ارتقا انسان کی ترقی کے اصول کو بتاتا ہے تو بتائیے مذہب کیوں اس سے گھبرائے؟

جب مذہب کی حالت ایسی متحکم اور قوی ہے تو پھر اہل مذہب کیوں اہل سائنس سے لڑتے اور بھگڑتے اور ان پر اتنا دوا و کفر کے فتوے لگاتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف ایک معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ چونکہ مذہب انسان کے ساتھ اس وقت سے ہے جب سے اس نے ہوش بینچالا اور جبکہ سائنس کا نام و نشان بھی نہ تھا اس لئے مذہب کو علاوہ روحانیات و معاشریات کے وہ کام بھی کرنا پڑا جو سائنس سے مخصوص تھا۔ غرض ابتدا میں مذہب روحانی اخلاقی معاشرتی سیاسی اور سماجی تفکرات تمام انسانی شعبوں پر حکومت کرتا رہا اور مذہب کا بادی معلم بھی تھا فلاسفر بھی تھا اور حاکم بھی تھا۔ لیکن مذہب و اخلاق کو چھوڑ کر باقی امور ضمنی تھے اور وہ مجبوراً مذہب میں داخل کر لئے گئے تھے۔ انسان نے جب ترقی کی اور اس کا تجربہ اور تمدن وسیع ہوا تو ہر شعبہ الگ ہونا شروع ہوا۔ اور ان میں نئی نئی باتیں اور نئے نئے انکشافات شروع ہوئے۔ اہل مذہب نے جب یہ دیکھا تو انہیں یہ امر ناگوار گذرا اور وہ یہ سمجھے کہ ان کی یہ ترقی ہماری مخالفت میں ہے۔ جو امور ابدان و حفظان صحت کے متعلق تھے وہ علم طب نے سنبھال لئے۔ جو ملکی تھے وہ علم سیاست نے لئے۔ اور جو نجوم و

شمس واقار کے متعلق تھے وہ فلکیات کے تحت میں آگئے۔ مگر ازل مذہب ایک تہ تک انہیں باتوں پر جمے رہے جو ابتدائیں ضمناً ان علوم کے متعلق مذہب کی ذیل میں آ گئی تھیں اور علمی ترقی سے انکار کرتے رہے اور اس ترقی کو مذہب کی مخالفت اور استیصال کا باعث سمجھتے رہے لیکن درحقیقت ان امور کو نہ پہلے مذہب سے تعلق تھا اور نہ اب ہے اور نہ ان کی ترقیاں مذہب کے رستے میں حائل ہو سکتی ہیں۔ اور نہ اسے کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ کیونکہ سائنس مذہب پر کسی طرح نہ حملہ کر سکتا اور نہ اسے نقصان پہنچا سکتا ہے اس لئے کہ جس پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس اور رسائی سے باہر ہے۔

اب رہی سائنس کی مخالفت مذہب سے۔ سو یہ بالکل بیجا اور محض ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی ہے۔ کیونکہ سائنس مذہب کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ سائنس ہدلال عقلی پر مبنی ہے اور سب چیزوں کو اسی سے پرکھتا ہے۔ جو چیزیں اس کے اصول پر پوری نہیں اُترتیں ان کے ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ صرف عقل ہی ایک خصوصیت انسان کی نہیں بلکہ اس میں دوسری قوتیں بھی ہیں اور احقاقِ حق میں صرف عقل ہی پروار و مدار نہیں ہوتا بلکہ اور قوتیں بھی کام میں آتی ہیں۔ انسان کی اخلاقی اور روحانی قوتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ مثلاً حسن کی دریافت کے لئے فوق ایسا ہی ضروری ہے جیسی عقل۔ احقاقِ حق میں عقل وہیں تک کامی رہے جہاں تک سلسلہ علت و معلول کا تعلق ہے لیکن جہاں اس کے سوا کچھ اور بھی ہے تو وہاں روحانی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جب معمولی باتوں کی تحقیق میں عقل حالات و عادات و اغراض سے ہشک جاتی ہے تو ان معاملات میں اس کی کیا پیش جاسکتی ہے جن کا زیادہ تر تعلق تیز و جدائی پر ہے۔ چونکہ مذہب کی بنیاد مافوق العادہ پر ہے جو عقل سے بالا ہے اس لئے سائنس وہاں نہیں پہنچ سکتا اور اپنی نادانی اور نامفہمی

سے اس پر حملہ کرتا اور اس کے ماننے سے انکار کرتا ہے۔ ایک بات اُسے اور  
 ہاتھ لگ گئی ہے جب اس کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو وہ صاف کہہ اٹھتا ہے  
 کہ یہ خلاف قانون فطرت ہیں۔ گویا تمام قوانین فطرت اس کے دیکھے بھالے میں  
 اور وہ اُن سب پر حاوی ہو چکا ہے۔ اول تو اس کُرہ کی جس پر ہم آج بھی بساطِ ہی  
 کیا ہے دوسرے جو چند قانون فطرت ہمیں معلوم ہیں باطل محدود ہیں اور وہ صرف  
 مادی حالت سے متعلق ہیں عقل خود محدود ہے اور سائنس جس کی بنیاد اس پر ہے  
 اور بھی محدود ہے۔ اُسے غیر محدود کا علم یا معرفت کیسی ہو سکتی ہے۔ وہ مادی سے  
 آگے نہیں بڑھ سکتا ہے اگرچہ اس کے متعلق بھی اس کا علم بہت محدود ہے۔ پھر  
 اس محدود علم اور یک طرفہ علم پر اس کے یہ دعوے بیج ہیں۔ اور بغیر اس کو چہ میں  
 قدم رکھے جو مادہ سے بالا ہے اور بغیر اس تحقیق و معرفت کے جو اس دائرہ میں داخل  
 ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی اس کا انکار ناقابلِ سماعت ہے۔ ایسی صورت میں سائنس کا  
 مذہب کا منکر یا مخالف ہونا سراسر نادانی و نافرمانی ہے۔ اہل سائنس کو زیادہ عالمی فنی  
 زیادہ وسیع النظری زیادہ حوصلہ و تحمل اور زیادہ تحقیق و تجسس سے کام لینا چاہئے۔  
 اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہ کہہ دینا کہ آفتاب کا وجود ہی نہیں اور جب دوسرے  
 اس کے ہونے کی شہادت دیں تو انہیں جھٹلانا سائنس اور فلسفہ کے اصول کے  
 خلاف ہے۔ مگر باوجود کثرتِ واقعات و دلائل وہ اپنے انکار پر مصر ہیں اور اس  
 سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا تعصب اور اُن کی ہٹ دھرمی مذہبی تعصب اور فہم سے  
 کہیں بڑھی ہوئی ہے +

جس طرح علمائے طبیعیات و مریدان ارتقا کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ چاؤ  
 دیکھ کر باؤں پھیلائیں اور اپنی حدود سے آگے نہ بڑھیں۔ اسی طرح اہل مذاہب کو  
 بھی چاہئے کہ وہ احتیاط سے کام لیں اور اپنی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ایک حد ہے



جہاں مذہب کو رک جانا چاہئے۔ اور ایک حد ہے جہاں سائنس کو ٹھہر جانا چاہئے اور یہاں پہنچ کر سائنس اور مذہب نہ صرف اپنے اپنے قصے قضیئے اور عداوتوں کو بھلا دیں بلکہ دور و روٹھے ہوئے بھائیوں کی طرح من جائیں۔ عالم طبعیات کو ابھی کچھ کرنا باقی ہے قبل اس کے کہ وہ کائنات کا مسئلہ کو حل کرے۔ اور اسی طرح اہل مذاہب کو بھی۔ ان کا نشانہ ایک ہے یعنی انسان کی ترقی اور بہبودی۔ لیکن ایک کا مقصد مادی اور ظاہری ترقی ہے اور دوسرے کا مقصد باطنی اور روحانی ترقی۔ ایک استدلال عقلی اور استقرا کے رستہ اپنی منزل مقصود کو پہنچتا ہے اور دوسرا جذبات اور تخیل کی راہ سے۔ لیکن کسی کو حق نہیں کہ وہ دوسرے کو خارج کر دے۔ کائنات کی انتہائی صداقت کا معلوم کرنا کوئی بری بات نہیں اور جو کوئی اس میں کوشش کرتا اور مدد دیتا ہے بہت اچھا کرتا ہے۔ اگر خدا کا خیال ہمارے دل و دماغ میں جاگزیں ہے تو پتھر اسے نکال نہیں سکتی۔ رُوح اُسے ضرور دیکھیں پائے گی۔ اور جو شخص اس کوشش میں ہے کہ اس خیال کو نکال دے اور خدا کو کائنات سے خارج کر دے وہ بڑا ظلم کرتا ہے +

جھگڑے تنازع اور جدوجہد سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ صداقت اختلاف کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ اہل مذاہب کا ضعف اس میں ہے کہ وہ سائنس سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ڈرنے کی چیز نہیں بلکہ اُس سے مدد لینا اور اُسے معاون بنا کے رکھنا چاہئے۔ اگر اُس کے کہیں دشمن ہیں تو اُن سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ بھاگنے سے شکست بہتر ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ شکست سے فتح ہو جائے۔ مگر بھاگنے سے گمنامی کا احتمال ہے۔ اور گمنامی سے موت کا ڈر ہے۔ اور یاد رکھنا چاہئے کہ اگر مذہب میں ہم زیادہ ترقی اور روشن خیالی کو دخل دیں گے اور اُسے توہمات باطلہ اور تمام غیر ضروری کٹافوں سے پاک کر دیں گے تو اس کی فتح ہی فتح ہے۔

اسی طرح سائنس کا ضعف اس میں ہے کہ اپنے محدود علم پر تکیہ کر کے بے سوچے سمجھے اور بغیر تحقیق کے اصول مذہب پر حملہ کرتا اور اس کے خیالات سے انکار کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ انسان کے اُس پہلو پر بھی نظر ڈالے جس سے مذہب بحث کرتا ہے تو اُس کی نظر اور وسیع ہوگی اور وہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنی آنکھیں بند کرے گا اور اپنے دل و دماغ میں روشنی نہیں پہنچنے دے گا تو بلاشبہ اُس کی قسمت میں ہار ہے۔ یہ وقت ہے اس کی ہمت آزمائی کا تحقیق و تجسس اس کے اصل اصول ہیں۔ اُسے چاہئے کہ وہ انہیں اپنے محدود دائرے سے اور آگے بڑھائے اور قدرت حق کا تماشا دیکھے۔ اُسے اب صداقت کے ماننے کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ اور زیان عالی ظرفی اور روشن خیالی سے کام لینا چاہئے اور خدا و نفسا سے دست بردار ہونا چاہئے +

بقول پروفیسر ٹیٹ و بالفور اسٹیوارٹ جو اس زمانہ میں سائنس کے بہت بڑے عالم ہیں اس کائنات میں ایک قانون قوال یا عدم انقطاع موجود ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے تو تمام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اور یہ سستی محض بیکار اور ہرجل ہو جائے گی۔ یہ مادی عالم صرف مادہ ہی سے نہیں بنا بلکہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جس پر اس کا دار و مدار ہے۔ اور وہ قوت ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہ قوت اُسی وقت کار آمد ہے جبکہ یہ تبدیل ہیئت کرتی ہے۔ لیکن تجربہ سے یہ ثابت ہے کہ قوت کی تبدیلی اسے کمزور کر دیتی ہے۔ یہ بیشک ممکن ہے کہ قوت کو ہم حرارت میں تبدیل کر لیں اور اس سے کام لیں۔ لیکن ہر ایسی تبدیلی قوت کو کمزور کرے گی اور رفتہ رفتہ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ سوچ ہمارے نظام کا منبع حرارت اعلیٰ ہے اور وہ قوت جس پر ہماری حیات کا دار و مدار ہے اُس حرارت سے اخذ کی جاتی ہے جو سوچ سے نکلتی ہے۔ جبکہ سوچ ہمارے لئے قوت ہیا کرتا رہتا ہے تو خود وہ سرد

ہوتا جاتا ہے۔ اور آخر کار اس طرح خلائے بسیط میں حرارت نکالتے نکالتے اس میں سے وہ حیات قائم رکھنے والی قوت زائل ہو جائے گی جو اس وقت اس میں موجود ہے۔ علاوہ سورج کے سرد ہونے کے ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ایٹری گز کی وجہ سے ہمارے زمین اور ہمارے نظام کے دوسرے کُرے بالتفاف سورج کے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ ہر ایسی حالت میں تصادم سے حرارت پیدا ہوگی اور عارضی طور پر سورج کی بجلی ہوئی قوت پھر بحال ہو جائے گی۔ اور آخر ایک روز یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور پھر بجھ بجھا کے رہ جائے گا۔ یہاں تک کہ ازمنہ میثار کے بعد اس کے پھر کئی کئی کُرے سے مٹ بھیڑ ہو۔ اور اس کی جان میں جان آئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حرارت کا یہ ازالہ ایک روز ہمارے نظام کا خاتمہ کر دے گا۔ تو پھر کیا اس سے وہ قانون عالم جسے قانون توال یا عدم النقطاح سے تعبیر کیا گیا ہے نہیں ٹوٹ جائے گا؟ ایسی حالت وہ بتسل جو برابر جاری رہنا چاہئے کہاں رہا؟ لیکن اگر صرف یہ عالم ظاہر ہی سب کچھ ہوتا تو بیشک یہی صورت واقع ہوتی۔ لیکن اب سائنس نے اپنے کھرورے لہجے سے ٹول ٹول کے اور اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ایک ایسے عالم کو بھی محسوس کیا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ان قوانین کی تکمیل کے لئے جو اس نے دریافت کئے ہیں ایک غیر مرنی روحانی دنیا کا ہونا ضروری ہے۔ اسی قانون توال سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ غیر مرنی عالم سے قبل ہوگا۔ کیونکہ مرنی عالم کی کوئی ابتدا ہونی چاہئے۔ اب یہاں مذہب یا الہام اور سائنس کی سرنوشیاں شروع ہوتی ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ عالم ایک وقت میں خلق کیا گیا تھا۔ سائنس کہتا ہے کہ جس طرح یہ عالم اس وقت ہے ہیشہ سے یہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مذہب کہتا ہے کہ دنیا اور اس کی کائنات سب مل کے خاک ہو جائے گی۔ سائنس ان قوانین کی رو سے جن کی حکومت اس دنیا پر ہے یہ استدلال کرتا ہے کہ موجود نظام کا انجام

یہی ہونے والا ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ ایک روحانی دنیا بھی ہے جس کا اس دنیا سے گہرا تعلق ہے اور ہماری حالت پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ سائنس بھی اب دینی زبان سے کہنے لگا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو یہ انسانی قانون یسائیٹ ہو جائیں گے اور اپنے ہاتھوں آپ اپنی قبر بنائیں گے۔ کیونکہ قانون تو ال یا عدم انقطاع کا مقتضی یہ ہے کہ اگر یہ موجود کائنات برباد و تباہ ہوگی تو اس غرض سے کہ وہ دوسری جگہ ایک جداسلسلہ قوانین کے تحت میں اپنی ہستی حاصل کرے اور نئے قانون نشوونما میں پھولے پھلے۔ اور یہی اصول افراد پر بھی صادق آتا ہے اور اس لئے بلا کسی مذہبی خیال کے روح کے غیر فانی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو موت ہنسانی ترقی کی حائل اور مانع نہیں ہو سکتی۔ اور یہی آخرت یا عقبی ہے +

یہاں سائنس و مذہب کا وہ عناد و مخالفت جس کا اس قدر شور و غلغلہ مچا ہوا ہے اور جس پر ڈاکٹر ڈیرپرنے فصاحت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ کا فور ہر جاتی ہے سائنس اب تک ایک گنبد بے دریں چکر لگا رہا تھا۔ اب ادھر کی عقوڑ سی سی جھلکتی ہوئی شمع شمع ہوئی ہے۔ وہ آنکھیں مل ل کے دیکھ رہا ہے کہ یہ نئی شے کیا ہے۔ وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کی بصارت روشن اور اس کی بصیرت منور ہو جائے اور مذہب سے آکر بیعت کرے +

غور سے اگر دیکھا جائے تو سائنس اور مذہب کی مخالفت محض غلطی اور غلط فہمی پر ہے اور طرفین نے اس میں اس قدر مبالغہ کیا ہے کہ بجائے سلجھانے کے اور الجھن پیدا کر دی ہے۔ سائنس کے جدید اور عجیب انکشافات اور ان کے قدما سے امتداد و نظریات سے جن پر ال سائنس کو بڑا فخر ہے۔ اہل مذاہب گھبرا گئے کہ سائنس ہمارا جانی دشمن ہے کیونکہ وجہ یہ ہے کہ سائنس کے ہر جدید انکشاف کا یہ ناگزیر نتیجہ ہوا کہ دونوں آپس میں ٹکرائے گئے۔ اور ان جدید انکشافات سے اسے اس حالت میں تزلزل پیدا ہو گیا جس پر پہلے

سے ایمان لائے بیٹھے تھے۔ لیکن ہے کہ اس حالت کو مذہب سے تعلق نہ ہو۔ لیکن چونکہ اُسے قطعی اور یقینی سمجھ چکے تھے لہذا مذہب اور الہام کو بھی اُسی پر ڈھال لیا تھا اور جب اسے شیس لگی تو شور و غل مچانا شروع کیا اور مخالفت کی ایک نئی بنیاد قائم ہو گئی۔ اور یہ سمجھ لیا کہ یہ مذہب کی عین مخالفت ہے۔ حالانکہ اُسے مذہب سے کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ اہل مذہب کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور الہام ربانی کو ہمیشہ گمراہ کر دیتے ہیں۔ اور جہاں ان کی رائے پر بھی حملہ ہوا تو اُسے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مذہب پر حملہ ہے +

لیکن صرف اہل مذہب ہی غلطی پر نہیں ہیں بلکہ اہل سائنس بھی اسی غلطی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اہل سائنس اہل مذہب کے اجتہادات اور رائوں کو الہام ربانی سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے ان رائوں کی غلطی ثابت کر دینے سے وہ سمجھتے ہیں کہ الہام ربانی کو غلط ثابت کر دیا۔ زیان تر خطرہ ”نیم حکیم“ اہل سائنس سے ہے جنہوں نے کبھی آنکھ اٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھا۔ اور جو سائنس کے قیاسات کو بھی یقینات سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب سائنس کے سلسلے میں ٹھہر سکتا۔ اور ان میں ہمیشہ مخالفت رہے گی۔ اگرچہ بعض اہل سائنس جنہیں خدا نے اعلاٰ و باغ عطا کیا ہے یہ سمجھتے جاتے ہیں کہ مذہب و سائنس میں کوئی مخالفت نہیں اور ان اس مادی عالم کے پرے ایک اور عالم کے بھی قابل ہونے جاتے ہیں۔ جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے +

ڈاکٹر ڈریپر کی یہ کتاب ”کان فلکٹ بیوین سائنس اینڈ ریلیجین“ (مذہب و سائنس) درحقیقت سائنس کی پرزور حمایت ہے۔ لیکن فاضل ڈاکٹر نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے۔ وہ یہ کہ جسے مذہب کہتے ہیں وہ درحقیقت مذہب نہیں بلکہ رومن ازم ہے اور جتنے حملے انہوں نے مذہب پر کئے ہیں وہ بلاشبہ رومن ازم

پرہیں مذہب پر نہیں ہیں۔ بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ عام مذہب تو کیا خود مسیح کے مذہب پر بھی ان حلوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جب یہ بنیاد ہی غلط ہے تو وہ شاندار عمارت جو انہوں نے اس بنیاد پر قائم کی متزلزل ہو کر دھڑام سے گر پڑتی ہے۔

سائنس و مذہب کا یہ اختلاف اور ان کی باہمی بظنی و بدگمانی ابھی مدت تک رہے گی۔ اور اسے سہنا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی اسے رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس کی بنیاد غلط فہمی اور ہٹ دھرمی پر ہے۔ اہل مذہب کو سائنس کی صداقت پر اور سائنس کو مذہب کی صداقت پر ایمان لانا چاہئے۔ اور ایک روز آنے والا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اپنی نادانی پر پتھرائیں گے اور اپنی حرکات سے شرارِ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائیں گے پھر سائنس کو مذہب سے اور مذہب کو سائنس سے کچھ عناد نہ ہو گا۔ اور یہ تو ام بھائی ایک جان دو قالب ہو جائیں گے۔

۱۳۱

لیکن ایک مشکل اور ہے۔ سائنس کے اصول میں تو کیا فروع میں بھی بہت کم اختلاف ہے سوائے ان امور کے جو قیاسی ہیں۔ کیونکہ وہ مشاہدے تجربے اور استقرا پر مبنی ہیں۔ حالانکہ مذہب کا یہ حال ہے کہ ہر ایک نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ ان بچہ اور بیشمار اختلافات میں یہ مشکل آپڑی کہ سچا کسے سمجھا جائے۔ اور صداقت کا پتہ کہاں ملے۔

پروفیسر میکس مولر نے ایک جگہ دنیا کی زبانوں کے متعلق بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے لیکن تاہم انسان کی تاریخ میں کوئی زبان اب تک نئی نہیں بنی۔ قدیم سے جو الفاظ چلے آتے ہیں وہی اب تک چلے

آتے ہیں۔ انہیں میں کچھ ہیر پھیر اور رد و بدل کر لیا جاتا ہے۔ بعینہی حال مذاہب کا ہے۔ ہمیشہ نئے نئے بنتے رہتے ہیں۔ نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن غور سے دیکھو تو اصل وہی ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے البتہ کچھ رد و بدل کر لیا گیا ہے۔ اختلافات صرف اُن ممالک اور اُن اقوام کی وجہ سے ہیں۔ جن میں مذاہب رائج ہوئے یا اُس زمانہ کی وجہ سے جبکہ مذاہب کی اشاعت ہوئی۔ اگر ابتدا سے لیکر تمام مذاہب کو سلسلہ وار جایا جائے تو یہ اختلاف کا مسئلہ صاف طور سے سمجھ میں آجائے گا۔ ملک اور قوم اور زمانہ کی وجہ سے جو خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں وہ اگر نکال دی جائیں تو پھر شکل سے کوئی اختلاف باقی رہتا ہے اور اگر اختلافات ہیں بھی تو وہ انسانی خیال کی ترقی کے مراحل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس لئے وہ رد کرنے یا خارج کرنے کے قابل نہیں بلکہ ایک منظم سلسلہ میں آنے کے قابل ہیں۔ اس وقت کسی جدید مذہب کے قائم کرنے یا جدید صداقتوں کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل حق ظاہر کرنے کے لئے صداقت کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب کی ضرورت ہے۔ ہماری رائے میں اس کام کو اسلام نے خاطر خواہ انجام دیا ہے +

مذہب کے لئے سب سے بڑی آفت مبالغہ ہے۔ ایک مذہب نے کس ایک خوبی کو لیا اور اُسے آسمان پر چڑھا دیا اور دوسری خوبیوں کو باطل نظر انداز کر دیا دوسرے نے کسی دوسری خوبی پر اس قدر زور دیا کہ باقی خوبیوں کی کچھ حقیقت مذہبی۔ یہودی مذہب نے ظاہری ارکان کی پابندی میں اس قدر مبالغہ کیا کہ باطنی صفائی پس پشت جا پڑی۔ اس کے خلاف عیسائی مذہب نے باطنی صفائی پر اس قدر زور دیا کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دنیا اور دنیاوی تعلقات سب بیخ رہ جاتے ہیں۔ غرض مختلف مذاہب نے صداقت کے مختلف پہلوؤں کو خاص نظر

سے دیکھا اور باقی پہلو پر نہیں رہ گئے۔ اس مبالغہ سے مذاہب میں انحطاط اور تنزل پیدا ہوا۔ حالانکہ وہ بات جو باعث انحطاط ہوئی بڑی خوبی کی تھی۔ لیکن اس میں مبالغہ اس قدر کیا کہ وہ خود تو عیب ہو گئی۔ اور دوسری خوبیاں اس مبالغہ کی وجہ سے کمزور ہو گئیں جس طرح کسی خاص عضو کی ورزش کرنے سے دوسرے اعضا کمزور ہو جاتے ہیں اسی طرح اخلاقی اور روحانی قوتوں کا بھی حال ہے کہ ایک پرزور دینے سے دوسری کمزور ہو جاتی ہیں۔ مذہب کی کامل صداقت اور اہل کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ سب میں اعتدال قائم رکھے +

انسان کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حیوانی دوسری روحانی۔ اور ان دونوں میں آپس میں اختلاف اور عناد ہے +

پھر روحانی حالت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک عقل دوسری جذبات۔ اور یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں +

اخلاق و تمدن کا تنہا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تعلق نہیں بلکہ یہاں دونوں (یعنی عقل و جذبات) گڈنڈ ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی بھی دو صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان کی ذاتی ضرورتیں دوسرے سوسائٹی کی ضرورتیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ اور باہم ایک دوسرے سے جدوجہد رکھتی ہیں۔ کیونکہ انسان شخصی حیثیت سے حقوق رکھتا ہے۔ اور بحیثیت رکن سوسائٹی اس پر فرائض عاید ہیں۔ بحیثیت انسان ناطق کے لئے کامل آزادی چاہتا ہے سوسائٹی اس آزادی کی مانگ ہے شخصی ترقی کے لئے کامل آزادی کی ضرورت ہے۔ لیکن تمدنی ترقی کے لئے حکومت کی ضرورت ہے جو اس قسم کی آزادی کو روکتی ہے۔ اس لئے آزادی اور حکومت میں ہمیشہ جنگ و جدل رہتی ہے +

غرض انسان اپنے تمام خیالات و تعلقات میں اختلافات سے گھرا ہوا ہے +



اور یہ اختلافات رفتہ رفتہ عداوت تک پہنچ جاتے ہیں جو مذہب و تمدن کی  
تخریب کا باعث ہوتے ہیں۔ اور اس لئے انسان اور انسانی تمدن کی بہبودی کے  
لئے ضرور ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مختلف زمانوں میں مختلف بنی آئے  
اور اپنے اپنے عہد میں انہوں نے اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن نقص یہ رہا کہ وہ  
اصلاح صرف اسی زمانہ کے متعلق تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مبالغہ مذہب کے  
لئے سب سے بڑی آفت ہے۔ ایک زمانہ میں کسی ایک صداقت یا نیکی میں  
مبالغہ تھا۔ نبی نے اسے توڑنا چاہا۔ اور اس کے مقابل میں کسی دوسری صداقت  
یا نیکی میں مبالغہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کامل اصلاح نہ ہو سکی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ صداقت  
کے تمام پہلوؤں کا کامل طور سے اظہار ہو۔ لہذا اس کی کامل اصلاح کے لئے  
ایک انسان کامل کی ضرورت تھی جو ملک عرب میں مبعوث ہوا۔ اُس نے انسان  
کی مختلف حیثیتوں اور صداقت کے مختلف پہلوؤں پر ایسی غائر نظر ڈالی کہ جو اختلافات  
اب تک چلے آ رہے تھے مٹ گئے۔ اور ایک ایسے مذہب کا سلسلہ قائم ہو گیا  
جو انسان کی مادی اور دینی نجات کا باعث ہوا۔ پیغمبر خدا صلعم ان اختلافات کی  
لم اور اصلاح کے اصلی راز کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اس لئے انہوں نے مبالغہ سے  
احتراز کیا اور اعتدال کو مد نظر رکھا۔ اور ان اختلافات میں ہمیشہ کے لئے مصالحت  
پیدا کر دی۔ یہ وہ رستہ تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ بال سے باریک اور تلوار  
سے تیز ہے پیغمبر خدا نے اس معنی کو حل کیا۔ اور انسان کی کامل بہبودی اور  
اصلاح کی بنیاد ڈالی جس کا احسان اس عالم پر ہمیشہ رہے گا۔

جس طرح مبالغہ انحطاط و زوال کی علامت اور تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔  
اسی طرح اعتدال تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ انسان کی حالت ایسی کش مکش میں ہے  
کہ وہ مبالغہ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر ایک طرف جاتا ہے تو دوسری طرف سے

محروم رہا جاتا ہے اس لئے ایسی تعلیم کی ضرورت تھی جو اعتدال پر رکھے اور اس کی کسی قوت میں زوال نہ آنے پائے۔ اعتدال نہ صرف انسانی معاملات اور اس دنیا کے امور کی اصلاح کے لئے ضروری ہے بلکہ تمام اخلاق دینی اور اہل کائنات کا درار و مدار اسی پر ہے۔ یہ زمین یہ سیارے یہ نظامات جو گردش میں ہیں اگر بال برابر اپنی حد اعتدال سے تجاوز کریں تو ایک عالم میں قیامت برپا ہو جائے اور یہ سارا کارخانہ خاک میں مل جائے۔ یہی حال کائنات کی ہر شے میں ہے۔ نیکی و بدی کیا ہے؟ اخلاق کیا ہے؟ صحت کسے کہتے ہیں؟ ذوق کس چیز کا نام ہے؟ اگر ان سب باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان سب کا مدار اعتدال پر ہے۔ جہاں یہ نہیں ہے وہاں قیام اور استحکام کی صورت نہیں۔ اسی عالم گیر اور پر معنی اصول پر پیغمبر اسلام کی تعلیم مبنی ہے۔ اور اسی اصول پر نظر نہ رکھنے سے قدیم مذاہب میں انحطاط و زوال پیدا ہوا۔ اسلام نے اس کمی کو پورا کیا اور اپنی تعلیم سے ہمیشہ کے لئے ایسی بنیاد قائم کر دی جس میں انحطاط و زوال نہیں آسکتا۔

اگرچہ رہبانیت کو اسلام نے خارج کیا ہے اور حسن معاشرت کے متعلق احکام دیئے ہیں۔ لیکن تاہم یہ بھی ہدایت کی ہے کہ بالکل دنیا ہی میں منہمک نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ دنیا کی زندگی و سعادت کی ٹیٹی ہے۔ نماز روزے حج کی تاکید کی ہے۔ ظاہری ارکان پر بھی ایک حد تک نظر رکھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا ہے کہ نیکی کے یہی معنی نہیں کہ نماز کے لئے پورب پچیم کو منہ پھیر دیا بلکہ اللہ کی محبت میں غریب و اقارب یتیموں محتاجوں مسافروں کو اپنا مال دینا۔ غلاموں کو آزاد کرنا۔ زکوٰۃ دینا۔ نماز پڑھنا۔ اپنے عہد کو پورا کرنا۔ سختی اور تکلیف میں ثابت۔

لے رہبانیت فی الاسلام +

لے ونا الخیوة الامت مع الغرور

قدم رہتا۔ اس سے بڑھ کر نیکی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ اس کا مدار محض ظاہری ارکان پر ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی سچی محبت اور انسانوں کے ساتھ سچی ہمدردی اور ایثار میں ہے۔ اسلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دنیا و آخرت - مادی اور دینی عالم دونوں کی رعایت رکھتا ہے۔ اور جب انسان ظاہری ارکان اور اصول کا پابند ہو گیا تو پھر نیکی کے معنی اس کے لئے وسیع ہو جاتے ہیں اور وہ آگے قدم رکھتا ہے۔ اور اس کا روحانی احساس قوی ہونے لگتا ہے۔ خود آنحضرتؐ کی زندگی اس کی سچی مثال ہے۔ جابؓ صحابی آنحضرتؐ صلعم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر کے نیچے کھلی رکھے ہوئے کعبہ کے سانے میں لیٹے ہوئے تھے۔ آپؐ نے مشرکوں سے بہت کچھ ایذا اور تحریف پائی تھی۔ میں نے آپؐ سے عرض کیا کہ آپؐ کفار پر بددعا کیوں نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپؐ اٹھ بیٹھے اور آپؐ کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور فرمانے لگے۔ اگلے لوگوں میں ایسے ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ بے دین لوگ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر کھڑا کر دیتے تھے اور اُس کے سر پر ارہ چلا کر اُسے دو ٹکڑے کر ڈالتے تھے لیکن اس قدر تحریف بھی اس بندے کو دنیا سے نہ پھیرتی تھی اور کسی پر لوہے کی کنگھی اس سختی سے کھینچتے تھے کہ وہ اس کے گوشت کو طے کر کے پٹھے اور ہڈی تک پہنچتی تھی مگر یہ سختی اُسے دین سے نہ پھیرتی

لَا يَسْأَلُ الْإِبْرَءَانُ أَنْ تَوَلَّوْا قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْإِبْرَءَانَ آمَنَ بِاللَّهِ  
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى  
حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَ  
فِي الرِّقَابِ وَأَتَا الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوقُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا  
عَاهَدُوا وَالصَّادِقِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالصَّرَءَاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ  
الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝

تھی۔ سچ پر ثابت قدم رہنے کی اس سے بڑھ کر اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے ؟  
 اسی طرح اسلام نے تمام تعلیم میں اعتدال کو مدنظر رکھا ہے خواہ عبادات میں ہو یا اخلاقیات میں۔ مثلاً یہ فرمایا ہے کہ بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے۔ بدلاؤ تو اس کے بدلے میں اسی قدر تکلیف دو جتنی تمہیں پہنچی تھی۔ لیکن اگر صبر کرو درگزر کرو معاف کرو اور بخش دو تو اللہ تمہیں دوہرا اجر دے گا اور اللہ ایسے لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور اس کو بار بار مختلف مقامات میں تاکید سے بیان کیا ہے اور بدلے کے مقابلہ میں عفو کا ذکر بہت بڑا بتایا ہے۔ آخر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تم گنہگاروں۔ خطاکاروں اور دشمنوں اور مخالفوں سے شیوہ عفو و غفران اختیار کرو گے تو خدا بھی تمہاری خطاؤں سے درگزر کرے گا۔ یعنی بدلا لینا اگرچہ انسان کی عادت میں داخل ہے اور مقتضائے عدالت ہے لیکن اخلاق کریمانہ کا یہی مقتضا ہے کہ بُرائی کے عوض بھلا کر دو اور مخالفوں کی خطاؤں اور بُرائیوں کو معاف کرو اور عموماً درگزر کرو۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ بُری بات کا جواب ایسا کہو جو سب سے بہتر ہو۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی۔ بُرائی کا دغیہ ایسے بتاؤ سے کرو کہ وہ بہت ہی اچھا ہو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم دیکھ لو گے کہ تم میں اور کسی شخص میں کتنی تو اب ایک دم بے گویا و متہار اول سوز و دست ہے۔ اور حسن مدارات کی توفیق

لَهُ وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد - ۲۰)  
 وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٍ مِنْهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (شورہ - ۳۸)  
 وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَمَا قَبُولًا مِّثْلَ مَا عُوِّقِبْتُمْ بِهِ وَلَٰئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ  
 فَأَعْفَ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (نمل - ۸)  
 ۱۰ وَلْيَعْمُوا وَالْيَصْطَفُوا الْآخِثِينَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ (نور - ۶۳)  
 ۱۱ إِذْ قَعِبَ بَاتِلِي هِيَ أَحْسَنُ (مومنون - ۴۸)

انہیں لوگوں کو دی جاتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ انہیں کو دی جاتی ہے جن کے بڑے نصیب ہیں۔ پھر یہ بھی سمجھایا ہے کہ کسی قسم کی عداوت تم کو عدل کرنے سے باز نہ رکھے اور کسی جماعت کی دشمنی تم کو انصاف کرنے سے نہ روکے۔ تم اپنے دشمن اور دوست سب سے عدل و احسان و انصاف کا برتاؤ کرو۔ چنانچہ فرمایا ہے اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے لئے گواہی دینے کو انصاف کی۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل نہ چھوڑو۔ تقویٰ کی بات یہی ہے کہ تم عدل کرو۔ اس سے بڑھ کر حسن معاشرت اور نیکی کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے ؟

اسی طور پر روپیے پیسے کے کمانے اور اس کے صرف میں اعتدال کی ہدایت ہے۔ کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو۔ اللہ مسرفوں کو پسند نہیں کرتا۔ خرچ کرنے والے فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگدستی کریں۔ ان کا خرچ دونوں کے بین بین ہو۔ رشتہ دار غریب اور مسافر کے حقوق دیتے رہو۔ اور دولت کو بچا نہ اڑاؤ۔ دولت کے بچا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔ اگر تم کو اپنے پروردگار کے فضل کے انتظاریں جس کی تم کو توقع ہے ان سے

لہ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِذْفَعْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا يُلْقِهَا اِلَّا ذُو حِظٍّ عَظِيمٍ (تم نبیؐ)  
 ۱۰ یٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا حِرْمَ مِنْكُمْ شَيْءٍ قَوْمٍ عَلٰی اَنْ لَا تَقْدُلُوْا اَعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی  
 ۱۱ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا

۱۲ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (سورہ انفاس رکوع ۱۰)  
 ۱۳ وَالَّذِيْنَ اِذَا نَقَعُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوّٰمًا (سورہ فرقان

رکوع ۱۶)

منہ پھیرنا پڑے تو نرمی سے ان کو سمجھا دو۔ اپنا ماتھ نہ اتنا سکیڑو کہ گردن میں بندھ جائے اور نہ باطل اسے پھیلا ہی دو کہ تم تہید ست ہو کر لوگوں کی ملامت سننے بیٹھو۔

پھر اسلام نے ایک دوسری اعلیٰ تعلیم دی ہے جو تمدن کی جان اور ترقی عالم کی روح روان ہے۔ فرمایا ہے کہ رَأْتُمَا الْمَوْصُوفَاتِ اخَوًا یعنی مسلمان سب

بھائی بھائی ہیں۔ یہ بات صرف اسلام میں پائی جاتی ہے کہ ایک اونے غلام اور

ایک شہنشاہ برابر ہے۔ اور صرف یہ قول ہی قول نہیں بلکہ ابتدائے اسلام سے

اب تک اس پر عمل جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے غلام بھی بڑے بڑے

شہنشاہ ہو گئے ہیں۔ اسلام کی حدود میں داخل ہوتے ہی غیر شخص برادری کا بھائی ہو جاتا

ہے اور اُس کے حقوق سب کے برابر ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم جادو کا اثر رکھتی

ہے اور اس نے اشاعت اسلام میں بہت مدد دی ہے۔ دنیا میں جتنی اقوام ہیں

ان کی تقسیم محض حدود جغرافیہ کی رو سے ہے۔ لیکن مسلمانوں کی قوم اس تنگ اور

اونے امتیاز سے بالا ہے۔ مسلمانوں کی راہ میں ملکی حدود۔ آب و ہوا۔ رنگ اور

نسل حائل نہیں۔ وہ سب ایک ہیں خواہ کہیں ہوں۔ افریقہ کا حبشی عرب کا بدو۔

ہندوستان کا برہمن۔ یورپ کا فرنگی مصر کا قحط غرض دائرہ اسلام میں داخل ہونے

ہی یہ سب کمزور اور عارضی امتیازات اٹھ جاتے ہیں اور وہ ایک ہو جاتے ہیں

مسلمان کہیں ہو اور کوئی ہو مسلمان ہے اس کا وطن سارا عالم اور اس کی برادری سب

مسلمان ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے کہ سب لکھنؤ صوبہ سے اللہ کا ذریعہ پکڑے رہو اور ایک

دوسرے سے الگ نہ ہو اللہ کا وہ احسان یا ذکر کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اب

نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اس کے فضل سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔

لَهُ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ  
كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا

اس سے بھی بڑھ کر اعلیٰ اور فضل ایک اور تعلیم اسلام کی ہے جو درحقیقت تمام عالم کے لئے صلائے عام ہے۔ یعنی پیغمبرؐ نے فرمایا ہے "مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَدَخَلَ الْجَنَّةَ" اس سے بڑھ کر کمال وسیع اور عالمگیر اصول کسی دین میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام نے اپنا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا ہے کہ اس سے زیاہ وسیع ہونا ممکن نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کا ہمیشہ بول بالا رہے گا اور دنیا پر اس کی حکومت ہوگی۔ گویا اسلام نے مذہب کی تکمیل کر دی اور خدا کی نعمت کو سارے عالم پر پھیلا دیا۔ اس کا مشرب اس قدر ہمہ گیر اس کے اخلاق اس قدر پاکیزہ اور اس کی تعلیم اس قدر اعتدال پر مبنی اور انسانی طبائع کے مناسب اور انسان کی ترقی کی مدد ہے کہ دنیا کی مادی اور روحانی ترقی کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔

یہ محض اقوال نہیں ہیں بلکہ خود پیغمبرؐ اور پاک باطن خلفا اور تابعین نے اپنے عمل سے اخوة اسلامی اور مسالمت اور ایثار کا سچا سبق دیا ہے جس کی شہادت میں تاریخیں بھری پڑی ہیں۔

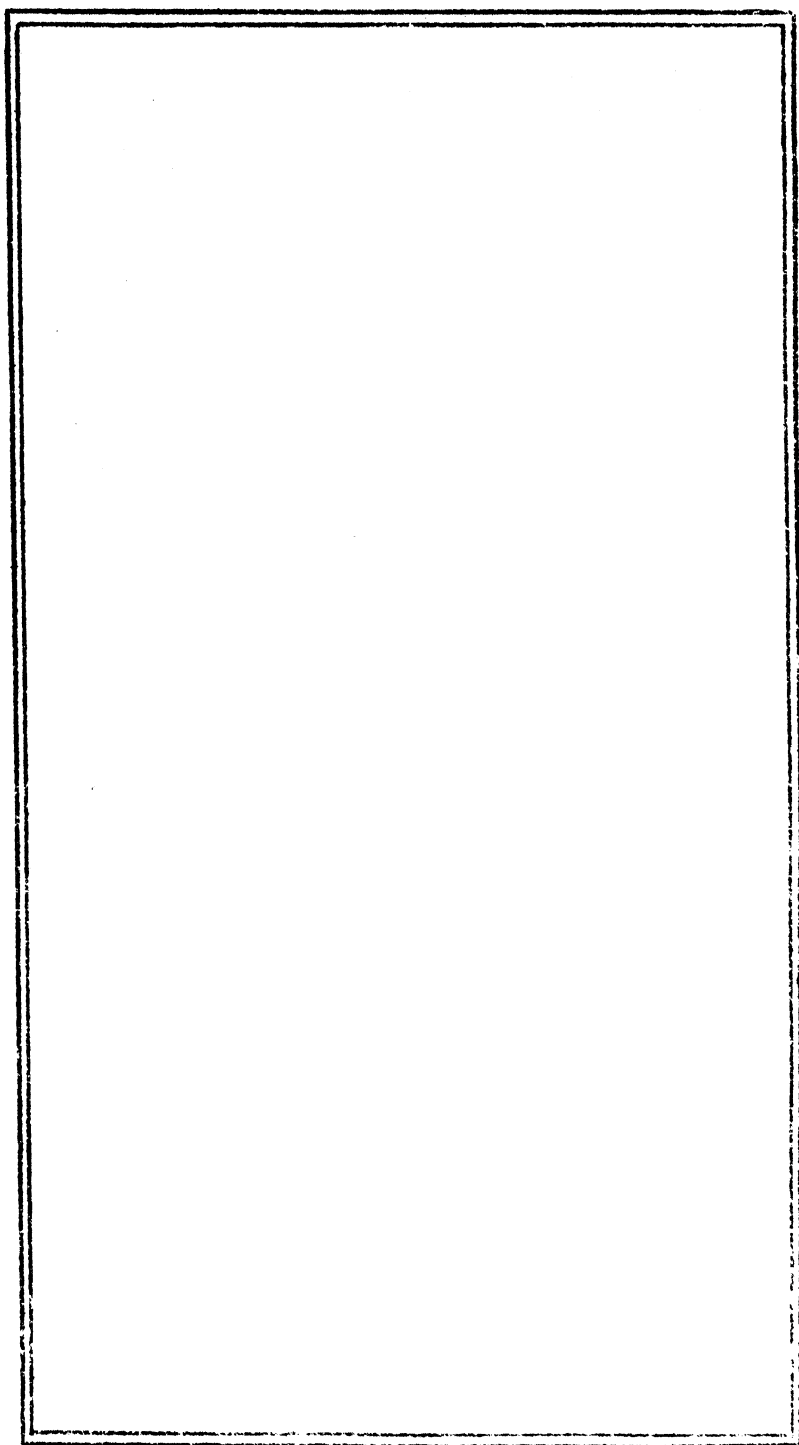
خود ڈاکٹر ڈیرپراس امرکا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح مسلمان پولیس حیثیت سے عالم پر چھا گئے۔ اسی طرح انہوں نے میدان علوم و فنون میں بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور نہ صرف یونان کے مروجہ علوم کو زلف کیا بلکہ نئے علمی انکشافات و ایجادات اور اپنے انوکھے بے بہا خیالات سے دنیا کو مالا مال کر دیا۔ اور صبح جوئی آزادی اپنے بعضی اور مسالمت میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ اور یورپ کے اندھیرے گھب میں دن مثل دکھائی جس کے نور سے وہ اب تک جاگ جاگ کر رہا ہے۔ غرض اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مادی اور روحانی ترقی۔ دنیاوی تمدن اور اخروی راحت عقل اور جذبات مذہب و سامن میں توافقی اور توازن قائم رکھنے

والا ہے۔ اب تک قدیم مذاہب میں کسی نے صداقت کے ایک پہلو پر بھی زور دیا  
 تھا اور کسی نے کسی دوسرے پہلو پر۔ مگر اسلام نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو  
 کو نظر انداز نہیں کیا اور ان سب کو اس اعتدال اور خوبی کے ساتھ ترتیب دیا کہ اس  
 کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ خاتم المذاہب اور اکمل الاولیاء ہے۔ اور انسان  
 کی ترقی اور نجات کا سچا اور صحیح راستہ ہے +

عبدالحی

حیدرآباد دکن





بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہرگز نہیں رو آئکہ دلش زرق شد بسم

ثبت است جبرئیل عالم دوام او

## ڈاکٹر جان ولیم ڈریسپر ایم ڈی ایل ایل ڈی

ڈاکٹر ڈریسپر مصنف کتاب معرکہ مذہب و سامنس مغربی دنیا کے ان مشاہیر میں سے ہیں جن کا نام ہوجہ ان کے علمی کارناموں کے لحاظ روزگار پر سنہرے سرفروں میں ابلا آباد تک لکھا رہے گا۔ ان کی ذات انگلستان کے لئے جو ان کا جنم بھوم تھا اور امریکہ کے لئے بھی جہاں وہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ سرمایہ افتخار و نازش ہے۔ اور ان کا نام دنیا کے علوم و فنون میں ہر جگہ ادب و احترام سے لیا جائے گا۔

جان ولیم ڈریسپر ۱۸۱۷ء میں بمقام سینٹ ہیلن پیدا ہوئے جو لورپول کے فوج میں واقع ہے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے لورپول ہی میں پائی۔ اور جب لندن یونیورسٹی کا افتتاح ہوا تو آپ فن کیسیا کی تحصیل کی غرض سے اس یونیورسٹی میں بھیج دیئے گئے۔ ۱۸۳۲ء میں آپ نے امریکہ کا عزم کیا۔ اور پنسلوانیا کی یونیورسٹی میں بغرض اکتساب فن طب داخل ہو کر ۱۸۳۶ء میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی کچھ دنوں کے بعد اپنی غیر معمولی علمی قابلیت کی وجہ سے آپ ورجینا کے ہیمپٹن سٹڈی کالج میں کیمسٹری کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور ۱۸۳۷ء میں نیویارک کی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر ڈریسپر کی سب سے پہلی علمی تصانیف کا موضوع یہ مسئلہ تھا کہ روشنی کا مولیہ ثلاثہ پر

کیسیا وی اثر کیا ہوتا ہے اس موضوع پر آپ کی تقریباً ۴۰ تصنیفات موجود ہیں۔ روشنی کے کیا  
 اثرات میں سب سے زیادہ مہتمم بالشان اثر کاربانک ایسڈ (حموضۃ الفحم) کی تحلیل ہے  
 جو درختوں کے پتوں پر دھوپ کی شعاعوں کے پڑنے سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اسی  
 واقعہ پر نباتات کے نشوونما کا انحصار ہے۔ اور اسی کی بدولت حیوانات کو بالواسطہ یا  
 بلا واسطہ غذا ملتی ہے۔ اس تحلیل کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ بالفاظِ خود  
 اُسے نشر اکسا یعنی آکسیجن کے اجزا کی علیحدگی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ روشنی کا جب  
 بذریعہ قیاس الوان نور منشور تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سات رنگ کی شعاع  
 سے مرکب ہے یعنی (۱) بنفشہ (۲) سرمئی (۳) ارزقی (۴) اخضر (۵) اصفری۔ (۶)  
 نارنجی (۷) احمری بنفشہ ایک علمائے سائنس کا یہ خیال تھا کہ عمل نشر اکسا و بنفشہ  
 شعل کی وجہ سے واقع ہوتا ہے اور اسی لئے اس کا نام شعل نشر اکسا درکھ دیا  
 تھا لیکن یہ محض قیاسی نظریہ تھا۔ جو کسی تجربہ سے قطعی طور پر ثابت نہ کیا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر  
 ڈیرسپر کو خیال ہوا کہ اس مسئلہ کے قطعی تصدیق کی صرف ایک شکل ہے۔ اور وہ یہ کہ تحلیل خود  
 الوان نور منشور کے ذریعہ سے کی جائے یعنی نباتاتی مان کو ہر رنگ کی شعل کے زیر عمل لا کر دیکھا  
 جائے۔ کہ نشر اکسا و کس شعل سے ہوتا ہے۔ اس لطیف و دلکش تجربہ میں ڈاکٹر ڈیرسپر کو پوری  
 کامیابی ہوئی۔ اور انہوں نے یہ اکتشاف کیا کہ عمل تحلیل میں شعل بنفشہ مطلق حصہ نہیں لیتی بلکہ  
 یہ کام شعل اصفری سے متعلق ہے اس نتیجہ کا تمام علمی دنیا میں نہایت دلچسپی کے ساتھ خیر  
 مقدم کیا گیا اور علمائے کیسیا کی معلومات میں اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا انقلاب پیدا  
 ہو گیا۔ ڈاکٹر ڈیرسپر نے نور کی قوت کیسیانی کے اندازہ کرنے کا ایک آلہ بھی ایجاد کیا جس  
 سے آج کل کرنامے کی مشین نے بہت کچھ مدد لی۔ چنانچہ منن اور راسکو نے جب ۱۸۵۶ء  
 میں پہلے کیسیانی تجربہ کے متعلق ایک مضمون رائل سوسائٹی لندن کے اجلاس میں پڑھا  
 تو اس میں اعتراف کیا کہ ڈیرسپر کو اس آلہ کی مدد سے نور کے عمل کیسیا وی کے بعض نہایت

ہی اہم نکات کے حل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر ڈیرسپر نے ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا کہ حرارت سے ذرکیوں پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ سے الوان نور منشور کا تجربہ زیادہ کمال و مکمل ہو گیا۔ یہ دریافت کرنا ممکن ہو گیا کہ آفتاب ستارے اور ضبابیۃ النجوم محسوس حالت میں ہیں یا سیال حالت میں۔ اس رسالہ میں ڈاکٹر ڈیرسپر نے تجربہ ثابۃ کر دیا کہ تمام محسوس اجسام یقیناً اور تمام مانع اجسام غالباً ایک ہی درجہ حرارت پر پہنچ کر منور ہو جاتے ہیں +

ڈاکٹر ڈیرسپر پہلے ۱۸۳۹ء میں شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۳۹ء میں انسانی چہرہ کی عکسی تصویر کامیابی کے ساتھ انسانی اور نیز قرقر کا عکس لیا +

یہ چند مثالیں علمی تحقیقات و اکتشافات کی اس طویل فہرست سے اخذ کی گئی ہیں جس کی ترتیب و تدوین کے لئے ڈاکٹر ڈیرسپر نے اپنی نمایاں قابلیتوں کو مرنے دم تک وقف کئے رکھا اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اپنے اپنے اکتشافات حلیہ کو جو بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہو سکتے تھے کبھی آگے بلب منفعت نہ بنایا۔ بلکہ سچا ذوق علمی اور بہرہ رسانی بنی نفع انسان ان کی محرک ہوئی تو آپ کی جلالت قدر کا بے اختیار اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ کا نایاب رسالہ پاپورسائنس منٹھی جس کے جنوری ۱۸۷۷ء کے نمبر سے ان حالات کا اقتباس کیا گیا ہے لکھتا ہے کہ یہ علمی اکتشافات جو ڈاکٹر ڈیرسپر کی سالہا سال کی عرق ریزی اور دماغ سوزی کے نتائج ہیں۔ اپنے گرانبار مصارف کے تکفل کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کی جیب خاص کے ہینا منت ہیں۔ اگرچہ بعض بعض علمی تجربوں پر انہیں ایک رقم خطیر صرف کرنی پڑی۔ لیکن ان کی اولوالعزمی کبھی کسی غیر کی مالی سرپرستی کی روادار نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنی کسی ایجاد کو کبھی پیسٹ نہ کرایا۔ بلکہ جو علمی نکتہ دریافت کیا۔ اور جو ایجاد کی اس کا شرہ اذراہ غایت ایشانفس خلق اللہ کی نذر کر دیا +

ان تصانیف سے جن میں اوق علمی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ قطع نظر کے اگر

ڈاکٹر ڈیرسپر کی دوسری تصانیف کو جن کا موضوع تاریخی اور نظری سباحث ہیں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ ایک مسلم الثبوت ادیب اور انشاپرداز بھی ہیں۔ ۱۸۶۲ء سے لیکر ۱۸۶۷ء تک کا زمانہ آپ کے اسی مہم کی دلچسپ و دلادیز کتابوں کے تصنیف کرنے میں گزارا جانا چاہئے۔  
 کی دماغی ترقی کی تاریخ، تاریخ خانہ جنگی امریکہ، اور معرکہ مذہب و سائنس، اسی دور کی تصانیف ہیں +

ڈاکٹر ڈیرسپر کا انتقال ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ آپ کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں بقید حیات سوجو دیں۔ بیٹے علم و فضل میں اپنے نامور باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ بڑا بیٹا ڈاکٹر ہنری ڈیرسپر نیویارک کے کالج میں علم خواص الاشیاء کا پروفیسر ہے۔ دوسرا بیٹا ڈاکٹر جان ڈیرسپر نیویارک کی یونیورسٹی میں علم حیات حیوانی کا پروفیسر ہے۔ تیسرا ڈاکٹر ڈینیئل ڈیرسپر نیویارک کی رصد گاہ متعلقہ حادثہ الجو کا ناظم ہے +

پروفیسر چرڈر اکثر اپنی تالیف ”لینئر ریڈنگس“ مطالعہ بوقت فرصت میں جو لطیف و دلکش مضامین کا ایک نفیس مجموعہ ہے۔ ”کانفلکٹ بیوین رلیجن اینڈ سائنس“ یعنی کتاب خدا کی نسبت حسب ذیل خیال ظاہر کرتے ہیں۔ ”یہ کتاب ایک اعتبار سے یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ مذہبی تعصب اور عدم مسالمت پر اس میں سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی گئی ہے اور ان وجوہ پر نظر انصاف نہیں ڈالی گئی جو بسا اوقات مذہبی جبر و تشدد کی محرک ہوئیں۔ لیکن باایں ہمہ یہ کتاب ایک صحیح الدماغ اور صائب الرائے شخص کے قلم کا ماحصل ہے اور اگر ان چند مقامات سے قطع نظر کیا جائے جن میں بجا سختی پائی جاتی ہے تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب پڑھنے والوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچا چکی ہے اور پہنچا سکتی ہے“ +

بحیثیت ایک مسیحی ہونے کے پروفیسر پر ڈاکٹر ڈیرسپر کا مذہب و سائنس کی نسبت ایسی رائے ظاہر کرنی چاہئے تھی اور اگر ہم (خدا نخواستہ) مسیحی ہوتے تو اس تعریف

میں جس کی یہ کتاب دوست دشمن سب کے نزدیک مستحق ہے نقصت کے شاید اس سے بھی زیادہ شاخا نے نکالتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سائنس کے مقابل میں نصرانیت پر جو فرو قرار واد جرم ڈر پیہر نے لگایا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ نصرانیت کا بڑے سے بڑا وکیل اُس کے چھوٹے سے چھوٹے نکتہ کا تحلیل کر سکے اور اگر چشم انصاف کھلی رکھے اُن واقعات پر نظر ڈالی جائے جو سائنس اور نصرانیت کی ہزار سالہ جنگ کے محرک ہو کر اُس شکست فاش پرنتی ہوئے جو نصرانیت کو اپنے حریف کے مقابل میں ٹھانی پڑی اور جنہوں نے نصرانیت کی روحانی و اخلاقی قوتوں کا شیرازہ کھیر کر اُسے محض پوٹیکل اغراض کی تکمیل کا ایک مادی آلہ بنا دیا ہے تو خواہی سخاوی اعتراف کرنا پڑے گا کہ جفع سائنس کو بمقابلہ نصرانیت چال ہوئی ہے اُس کی وجہ یہ تھی کہ حق اور قوت دونوں اس کی جانب تھے اور ڈاکٹر ڈیرپہر نے کوئی بات ان دونوں حریفوں کے کارناموں اور ان کی جدوجہد کے متعلق ایسی نہیں بیان کی جس کی تغلیط و تردید ہو سکے البتہ ایک لغزش ڈاکٹر ڈیرپہر سے یہ ہونی ہے کہ انہوں نے مذہب پر اس حیثیت سے نظر ڈالی ہے کہ اس کا الہامی حصہ غیر متحرک اور غیر ترقی پذیر ہونے کے لحاظ سے گویا جہلا کے اودام باطلہ کا ایک لایعنی مجموعہ ہے جس کی ظلمت آفتاب سائنس کی درخشاں شعاعوں کے آگے ایک پل کے لئے نہیں ٹھہر سکتی۔ انہوں نے مذہب کے فلسفہ پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالی اور فطرت انسانی کے اُس زبردست اقتضا کا حکیمانہ تجزیہ نہیں کیا جو مذہبی تجیل کی شکل میں بیسویں صدی عیسوی کے انسان کو بائیں ہمدانش و حکمت انسان اولین سے سلباً بعد نسل ترکہ میں پہنچا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک مقام پر مصنف نے انسان کی دماغی ساخت پر علم حیات حیدانی کے اصول سے بحث کرتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مذہبی خیالات فکر انسان کے اجزائے لاینفک ہیں اور ان سے کسی انسان کو خواہ وہ کیسا ہی تہذیب یافتہ اور روشن دماغ کیوں نہ ہو مفر نہیں لیکن یہ بحث بیچ میں برسبیل

استطرد آجاتی ہے اور اس سے وہ کوئی اہم نکتہ جسے انسان کے معاد سے تعلق ہونا نہیں کرتے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُن کے پیش نظر رومن کیتھولک نصرانیت کے منہزقات لاطائل و شیطیات لایعنی ہیں اور اُنہوں نے اپنی تمام قوت انہیں کے اہمال و ابطال میں صرف کر دی ہے +

رومن کیتھولک مذہب کے پیشواؤں نے کچھ تو اُس تحریف کی وجہ سے دھوکا کھا کر جس نے تورات و انجیل کی سادہ اصیلت کو پایہ اعتبار سے ساقط کر دیا کچھ اُس جلت کے اقتضا سے جو قرنہا قرن تک پادریوں کا سرمایہ امتیاز بنی رہی اور کچھ اُن سیاسی ضرورتوں سے مجبور ہو کر جنہوں نے اُن کے دین کو مبدل بہ دنیا کر دیا اُن باتوں میں بھی دخل دینا شروع کر دیا تھا جن سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا یعنی وہ انسان کو اخلاق حسنہ سکھاتے سکھاتے اور نجات اخروی کی راہ دکھاتے دکھاتے علم و حکمت کے بھی سبق آموز بن گئے اور سائنس کے مسائل پر بھی مہم من الہی کی حیثیت سے رائے زنی کرنے لگے۔ اس غلط محبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقائق فطرت کے متعلق جب انسان کو صحیح صحیح علم ہوا تو ان کے او عادی جنہیں الہام سے کوئی لگاؤ نہ تھا باطل جو گئے اور اُن کے پیروان کو جھوٹا سمجھ کر کفر و الحاد کی طرف جھک پڑے اور مغربی دنیا ایک بڑی حد تک مذہب کی قید سے آزاد ہو گئی۔ ڈاکٹر ڈریپر کو رومن کیتھولک پادریوں کے اس طرز عمل نے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کیا ہے کہ وہ مذہب جو سائنس کے مطابق نہ ہو جھوٹا ہے اور وہ صانف آسمانی جو حقائق فطرت کے مخالف ہوں ایمان پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ یہ عام نتیجہ باطل صحیح ہے اس کے بقول سر سید احمد خاں رحمت اللہ علیہ کے سائنس کی حقیقت خدا کا کام ہے اور صحیفہ آسمانی خدا کا کلام ہے۔ دونوں میں اگر ضد ہو تو ممکن نہیں کہ دونوں سچے ہوں پس جس کی سچائی عقل سلیم کے نزدیک جو معیار یقین ہے مسلم نہ ہو گی وہ باطل ہو گا۔ لیکن ہم کو ڈاکٹر ڈریپر کی بلغ نظری اور نصفت پروری سے اس امر کی توقع تھی کہ وہ صرف یہی نتیجہ نکال

نہ رہ جائیں گے کہ چونکہ فرقہ رومن کیتھولک کے لوگ مسئلہ عصمتِ پاپا کے قائل ہیں۔ اور اُس کو نائبِ خدا سمجھ کر اُس کی ہر بات کو برحق سمجھتے ہیں اس لئے رومن کیتھولک مذہب جھوٹا ہے اور سائنس کے ساتھ توافقی نہیں رکھ سکتا اور چونکہ پرائسٹنٹ مذہب سچائی کی تلاش بائبل کے اوراق میں کرتا ہے اور اصلی سچائی صحیفہ کی فطرت کے اوراق میں مضمر ہے لہذا عقلی بحران جس میں یورپ مبتلا ہوا چاہتا ہے منجربہ ہلاکت مذہب ہو گا۔ ہم کو امید تھی کہ ڈاکٹر ڈیرپیر مذہب اور سائنس کے درمیان ایک خطِ فاصل کھینچ کر اور ایک کو معاد اور دوسرے کو معاش کا منظر قرار دے کر اس مسئلہ پر بحث کریں گے کہ اگرچہ ان کا موضوع جدا جدا ہے۔ لیکن انسان کو اُس جسمانی و دماغی اور روحانی منزل پر پہنچنے کے لئے جس کی طرف انگشت ارتقا اشارہ کر رہی ہے دونوں کی یکساں ضرورت ہے اور تا وقتیکہ سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے مدد و معاون نہ ہوں گے انسان کے قومے ذہنی و روحانی منتہائے بلوغ کو نہ پہنچ سکیں گے۔ ہمیں خیال تھا کہ ڈاکٹر ڈیرپیر موجود مذہب کا مقابلہ کر کے ایک ثالث کی حیثیت سے یہ فیصلہ کریں گے کہ ان میں سے کون سا مذہب سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور اس لحاظ سے سائنس کے دوش بدوش چلنے کے قابل ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری یہ تمنائیں اور توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر ڈیرپیر نے جو فیصلہ کیا ہے وہ یک طرفہ اور یک طرفہ ہونے کی حیثیت سے بھی باطل اور ضابطہ ہے۔ انہوں نے اول تو سائنس کے مقابل کی شخصیت کی تعظیم کو تخصیص سے بدل دیا ہے یعنی علوم کا حریف نصرانیت کو قرار دیا ہے کسی دوسرے مذہب کے سروکار نہیں رکھا اور نصرانیت سے بھی رومانی نصرانیت مراد لی ہے۔ غالباً اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ رومانی نصرانیت ہی نے اپنے آپ کو علوم و فنون کا سب سے بڑا دشمن ثابت کیا ہے جو دنیا میں بحیرہ رومانی نصرانیت کے اور کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو قدیم الایام سے ہر علمی تحریک کے ساتھ اس درجہ معاندانہ برتاؤ کرتا چلا آیا ہو اور جس کے ماتحتوں اہل علم



کو اتنی سخت ایذا نہیں پہنچی ہوں اور غالباً اسی لئے مذہب کو سائنس کا حریف قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر ڈریسپر نے مذہب سے مراد رومن کیتھولک نصرائیت لی ہے اور اپنی کتاب کا نام بجائے "نصرائیت اور سائنس کی معرکہ آرائی" کے "معرکہ مذہب و سائنس" رکھا ہے۔ پرائسٹنٹ نصرائیت کے متعلق اگرچہ انہوں نے ایک مقام پر یہ لکھا ہے کہ اس کا اور سائنس کا میل ممکن ہے لیکن جب انہیں کے قول کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ سائنس پر پرائسٹنٹ مذہب کا ذرا سا بھی احسان نہیں ہے اور اس کی ترقی میں مارٹن لوتھر کی اصلاح نے ذرا بھی حصہ نہیں لیا اور نیز جب یہ امر پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ زمانہ حال کی فلسفیانہ تنقید نے انابیل مقدسہ کو پرائسٹنٹوں کا منہاج ایمان میں تحریف و تدلیس سے ملوث ثابت کر دیا ہے اور ان میں ایسے ایسے تاریخی نزاعوں کا موجود ہونا بدلائل قاطع پایہ ثبوت کو پہنچا دیا ہے جن سے ان کی تنزیل ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے اور جن کا جواب کسی پادری سے بن نہیں پڑا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر یہ دونوں ایک دوسرے کے دلی دوست ہو سکتے ہیں ؟

رومانی اور پرائسٹنٹ نصرائیت میں سب سے بڑا ماہ الافراق یہ ہے کہ رومن کیتھولک فرقہ آیات کتب مقدسہ کی تفسیر اور مذہبی عقائد کی تاویل و تفسیر کا حق صرف پاپائے روم اور اس کے ماتحت پادریوں سے مخصوص سمجھتا ہے اور پرائسٹنٹ فرقہ کے عقیدہ کے بموجب قورات و انجیل کی تفسیر و تاویل کے متعلق ہر لکھے پڑھے شخص کو حق اجتہاد حاصل ہے۔ یہ فرقہ اگرچہ بجائے خود بہت بڑا فرقہ ہے اور اس نے پرائسٹنٹوں کے ہاتھوں سے قسبیت کی بیڑیاں کاٹ کر انہیں برہنہ خود معصوم و غیر خاٹی پاپا کی غلامی سے آزاد کر دیا ہے لیکن اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے کہ قورات و انجیل کی آیات ہر ستورائی مفسر آفریں شان کے ساتھ قائم ہیں جس نے سائنس کے اٹھ میں متنبق بن کر رومانی نصرائیت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اب پرائسٹنٹ نصرائیت کے حلقہ بگوشوں کو اس حد

تک آزاد خیال بنائی جا رہی ہے کہ اُن کے نزدیک خدا کی حکمت اور مان کی قوت از قبیل مترادفات ہیں تاویل کا میدان نہایت وسیع ہے لیکن نہ اتنا وسیع کہ اُن تحریفات کو سائنس کے ساتھ تطبیق دینے میں عقل سلیم کا خون کتے بغیر کامیابی حاصل ہو سکے جن سے تورات و انجیل کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ ایک فرانسیسی بادہچی سے جو اپنے فن کا استاد تھا پیرس کے کسی امیر نے فرمائش کی تھی کہ فن طباطبائی میں جو بے مثل کمال اُسے حاصل ہے اس کا ثبوت سرے ہوئے من کا قلید تیار کرنے سے دے۔ بادہچی نے جواب دیا کہ جناب والا میں سو سال پرانے بوٹ کے تلے کا شور باتیار کر سکتا ہوں لیکن سرے ہونے من کو قابل خورش بنانا میرے امکان سے خارج ہے۔ یہی حال تحریف شع و تورات و انجیل کا ہے۔ اگر کوئی آیت حقیقت میں الہامی ہو اگر کوئی صحیفہ حقیقت میں آسمانی ہو تو اس کی سوتا دلیلیں ہو سکتی ہیں لیکن اُن مہملات کی کیا صیح اور مفید یقین تفسیر ہو سکتی ہے جو انسان ظلم و جہل کے ترشے ہوئے ہوں اور فطرت کے حقائق مسلمہ کی ضد ہوں۔

ڈاکٹر ڈیرپیر اگر اُس مواد کی بنا پر جو اُن کے پاس موجود تھا اور جس نے اس کتاب کی ترتیب میں بقدر ایک سو صفحہ کے حصہ لیا ہے کام لیتے تو وہ آسانی ثابت کر سکتے کہ مذہب اپنی ترقی یافتہ شکل میں انسان کو نہ صرف اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ آزاد تمام اُن حقائق کا اکتشاف کرے جو عقل انسانی کی رسائی کے اندر ہیں اور تمام وہ کوششیں عمل میں لائے جن سے اُس کی طبیعی معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے بلکہ ان کوششوں کو اپنے آخرش عاطفت میں لے کر جہاں انسان کو روحانی اور اخلاقی حیثیت سے کامل بننا اور ابدی زندگی کے تمتعات سے بہرہ مند و رہنا سکھاتا ہے وہاں دنیوی حیثیت سے بھی اُسے اعلیٰ درجہ کے مباح پر پہنچانا چاہتا ہے۔

اسلام کو ڈاکٹر ڈیرپیر نے نصرانیت کی ایک شاخ تصور کیا ہے۔ کوئی مستقل مذہب

لے بڑی کا گشت۔

نہیں سمجھا۔ اسی لئے دھول نے اس کو رومن کی تھوٹک کلیسا کی اصلاح جنوبی اور پشیمت مذہب کو کلیسائے مذکور کی اصلاح شمالی سے تعبیر کیا ہے لیکن اگر ان کے اس خیال کو جس کے ایک حد تک معقول ہونے میں کلام نہیں پوری طرح سے تسلیم کر لیا جائے تو پھر تو ان سے اس امر کی بدرجہ اوٹے توقع تھی کہ وہ اسلام کو مذہبی ترقی کی معراج یا انتہا قرار دے کر اور سائنس کی اس حیرت انگیز ترقی کو پیش نظر رکھ کر جو اسلام کی سرپرستی میں سے میسر ہوئی اور جس نے یونان و مصر، کالدیہ و ایران، ہندوستان و چین کی فرسودہ ہڈیوں میں نئی برج پھونک کر علوم جدید کی بنیاد قائم کی اس نتیجہ پر پہنچے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو فطرت الہی و سنت ایزدی سے تطابق کلی رکھتا ہے۔ بانفاذ دیگر مذہب سائنس میں اگر وفاق پیدا ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ مذہب سے مراد اسلام لی جائے۔ اور یہ تعبیر نادرست بھی نہ ہوگی اس لئے کہ اگر کوئی مذہب دنیا کے تمام مذاہب کے حسنات کے شیرازہ بند ہونے کی وجہ سے ہم گیری کا ادعا کر سکتا ہے اور احسنیت سے تمام مذاہب کا یکجہتم انصاف قائم مقام بن سکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔

یہ دعویٰ ہم کچھ اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں بلکہ اسلام کے دینی و دنیوی کارناموں کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں جن کا ذکر کھنڈ و ڈاکٹر ڈیرپیر نے اس کتاب میں شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے اسلام کے اس اصولی عقیدہ کا ذکر کرنے کے بعد جس کا راز لا الہ الا اللہ میں چھپا ہوا ہے اور جو ہر قوم کے ترقی یافتہ مذہبی جذبات کا نصب العین ہے۔ اور ان روحانی و اخلاقی حقائق کا بالا جمال اعادہ کرنے کے بعد جن کی تکشیف حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی ڈاکٹر ڈیرپیر نے جہاں اسلام کی قدیم النظر ملکی فتوحات اور قابل رشک تمدن کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ اسلام نے خود اپنے اگھتوں سے سائنس کے اس پودے کو سینچا جسے عجائب خانہ اسکندریہ کے نزع جاوید بانی بطلمیوس سورش نے لگایا تھا لیکن جو نصراہنت کی نجر زمین میں خشک ہو چکا تھا

اور یہ اسی آبناری کا صدقہ تھا کہ علوم و فنون حکمت و فلسفہ صنائع و مہارت کا وہ لہلہاتا بحر  
 چمن عقل و ادراک کی سیر کے لئے تیار ہو گیا جس کے پھول یورپ و امریکہ میں آج بھی خوشگلی  
 کے ساتھ مہک رہے ہیں۔ علوم جدید کا دور سو پلوں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ نہمور  
 اسلام پچھٹی صدی میں ہوا یہ ہزار سال کا زمانہ اُن مسلسل و متوالی کوششوں سے بھر پڑا  
 ہے جو علوم قدیمہ کے احیا اور علوم مروجہ کی بقا کے متعلق دنیا نے اسلام کے طول و  
 عرض میں ظاہر ہوتی رہیں اور یہ امر روز روشن کی طرح عیان ہے کہ سائنس نے جو ترقی کر  
 تین سال میں کی ہے اُس کے لحاظ سے وہ اسلام ہی کا شرمندہ احسان ہے۔ گویا اسلام  
 نے ایک دُعا خراج قائم کر لیا تھا جس پر یورپ نے گوشت و پوست چڑھالیا۔

تم نے قندیل سخن کو ہنڈھ لیا تو کیا ہوا

دُعا خراج میں تو ہیں مہی اگلے برس کی سیلیل

ایسی حالت میں جبکہ اسلام یا بقول مصنف نصرانیت کی جنوبی شاخ نے جس کے ہنڈھ  
 والے روئے زمین پر قبضے کر ڈٹے نفوس کے موجود ہیں سائنس کی ہم آہنگی و مصفیری کا مائل  
 دم بھرا ہو۔ ایسی حالت میں جبکہ ہادی عرب کے جانشینوں نے جاہلوں کو عالم نامیو لیا  
 کو فلسفی اور فلاسوف کو شہنشاہ بنا دیا ہو۔ ایسی حالت میں جبکہ ہادی بطحا سے ایک ابر حمت  
 نے اُٹھ کر مغرب و مشرق میں خیر و برکت کے ن موتی برسائے ہوں۔ گویا دنیا ابھی تک  
 رول رہی ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ کل مومنین اخوة کی منادی نے ازل و اقصیٰ اقوام کو  
 مسند نشینان بزم شرافت کے پہلو میں جگہ دے کر حریت اخوة اور مرادات کے ن سحر  
 اصول قائم کر دیئے ہوں جن پر جمودیت کے ساتھ عمل کرنا صرف دنیا نے اسلام ہی میں ممکن  
 ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ لکم و لکم ولی بین کافران واجب الاذعان مسالمت اور رواداری  
 کے ن حقوق ادا کرتا ہو جن کا یہود و نصاریٰ مجوسی و ہنود کو یکساں اعتراف ہے۔ ایسی حالت  
 میں جب کہ رب زونئی علما کی نص صیح نے جس میں لا اکراہ فی الدین نے شان تاسیس پیدا کر دی

ہے الحکۃ ضلالت المؤمن فحیث وجد ما فوات حق بہا کی وجہ منطوق کے ساتھ ملکر علم حکمت کو خواہ اس کا  
 ماخذ کچھ ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کی سیراٹ قرار دیا ہو یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ مذہب اور علم  
 کی سائی ایک اقلیم میں نہیں ہو سکتی اور یہ دونوں ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہیں جس میں بالآخر  
 مذہب کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔

بہر حال ڈاکٹر ڈبیر پر نے یہ کتاب لکھ کر ہم پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے کہ تلاش  
 حق کا دروازہ کھول دیا ہے اس دروازہ کے اندر داخل ہو کر ہر شخص علی قدر توفیق گوہر  
 مقصود سے اپنی جیب و دامان بھر سکتا ہے اور اگر اُسے مبداء فیاض سے ذوق سلیم ہے  
 دوسرے لفظوں میں ایمان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے عطا ہوا ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچ  
 ہے کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ حلیف ہیں۔

ظفر علی خاں

کرم آباد - پنجاب  
 ۱۹۱۰ء

## دیباچہ مصنف

جس شخص کو یورپ اور امریکہ کی روشن خیال جماعتوں کی ذہنی حالت کے واقف ہونے کا موقع ملا ہے اُس کو معلوم ہوا ہوگا کہ لوگ جاذبِ مذہب کے جلد جلد اور بہ نقد اور کثیر منحرف ہو رہے ہیں۔ اور اگرچہ اُس جماعت نے جو راست گفتاری اور صاف گوئی کے اوصاف سے متصف ہے اس انحراف کو مخفی نہیں رکھا۔ لیکن ایک بہت بڑی جماعت ایسے شخص کی ہے جن کی بد اعتقادی بہت زیادہ خطرناک ہے اس لئے کہ اخلاقی جرأت کے فقدان کی وجہ سے یہ جماعت اپنے اعتزال کو علانیہ نہیں ظاہر کرتی +

یہ اعتزال اس قدر عظیم الاثر اور اس درجہ زبردست ہے کہ اس کو نہ تحقیق دیا جاسکتا ہے نہ تقریر بنا سکتی ہے۔ اس کا سد باب نہ استحقاق و استہزا سے ہو سکتا ہے نہ سب و شتم سے نہ جبر و قہر سے۔ دن ساعت جلد جلد قریب آرہی ہے جب کہ اس سے نہایت خطرناک سیاسی تلخ پیدا ہو کر رہیں گے +

دنیا کی حکمت علی کے جسم سے قیسمیت کی روح نکل چکی ہے۔ وہ جنگی جوش جو کبھی مذہب کی حمایت میں سرکھٹ نظر آتا تھا بھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔ اور اس کی بجلی کچھی یادگاریں حروبِ صلیبیہ کے ان سوراٹوں کے مرمری مجسموں میں باقی رہ گئی ہیں جو گر جاؤں کے زمیں دوز مدفون میں محو آرام ہیں +

دول غلطی نے پاپائیت کے مقابلہ میں جو روش اختیار کی ہے۔ وہ اس خطرہ کی آمد آمد کا پتہ دے رہی ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ وہ طاقت جس کا منظر پاپائے روم ہے یورپ کی دوشنٹ آبادی کے خیالات اور تئناؤں کی فکیل ہے۔ اس طاقت کو مشوب الی اسما اور مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ ہے اور اسی دعوے کی بنا پر وہ یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اس کی سیاسی فوئیت بتقابلہ دول یورپ تسلیم کر لی جائے۔ اس کو اس جہالت کی تجدید و احیا پر اصرار ہے جو قرون وسطیٰ میں پائی جاتی تھی۔ اور وہ بانگ دہل اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ اس کی اور تمدن جدید کی ایک اقلیم میں سائی نہیں ہو سکتی +

یہ منافقت جو ہمیں مذہب اور سائنس کے درمیان نظر آرہی ہے اس کشمکش کا تسلسل ہے جو اس وقت سے چلی آئی ہے جب کہ سیاسی اقتدارات کی باگ نصرائیت کے ہاتھ میں اول اول آئی۔ الہام ربانی ترویج کا روادار ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ اپنے آپ کو کامل و بے عیب سمجھ کر مستوجب الترمیم ہونے سے سختی کے ساتھ ابرا کرے اور اس ترمیم کو جو انسان کے نشوونما کے عقل کی مقننات میں سے ہو۔ اذراہ حقارت رد کر دے لیکن انسانی علم کی اہل ترقی معلومات انسانی کے ہر شعبہ کے متعلق ہمارے مسلمات میں تبدیلی پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتی +

کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ایک ایسی بحث کی اہمیت کے انہار میں مبالغہ سے کام لے سکیں جس میں ہر فردی شعور انسان حصہ لینے پر نحوہی نحوہی مجبور ہے؟ مذہب سے زیادہ ہم بالشان حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ بجز ان اشخاص کے جن کی دنیوی اغراض سوجن مذہبی عقاید کے قیام کے ساتھ وابستہ ہیں باقی تمام اشخاص کی صدق دل سے یہی خواہش ہوگی کہ حق کی تلاش کریں۔ وہ مسائل مابالبحث کے متعلق پوری وقنیت پیدا کرنی چاہیں گے اور اس امر کے خواہش مند ہوں گے کہ مباحثہ کرنے والوں کے طہیر اور روش پر روشنی ڈالی جائے +

سائنس کی تاریخ کو انفرادی اکتشافات کے ایک بے ربط مجموعہ کی کمانی نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ ان دو مختلف طاقتوں کی زور آزمائی کی داستان ہے جن میں سے ایک تعقل انسانی کی انشراحى قوت ہے اور ایک روایتی ایمان اور انسانی اغراض کی متفقہ انقباضی قوت ہے۔ کسی مصنف نے اب تک اس مسئلہ پر اس پہلو سے نظر نہیں ڈالی لیکن یہی وہ پہلو ہے جو سب سے زیادہ نکتہ آموز سب سے زیادہ نتیجہ خیز اور سب سے زیادہ مہتمم بالشان ہے۔

آج سے کچھ سال پہلے مصلحت اور صدا بدیدہ اسی میں سمجھی جاتی تھی کہ اس بحث کی طرف اشارہ تک نہ کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس بھگڑے سے الگ ہی رہنے کی کوشش کی جائے۔ جماعت انسانی کا سکون نفس و اطمینان قلب اس کے مذہبی عقائد کے ثبات و قیام پر اس درجہ منحصر ہے کہ کوئی شخص بلا وجہ و وجہت کافی ان عقائد میں خلل انداز ہونے کے کا ڈر سے حق بجانب نہیں سمجھا جاسکتا۔ لیکن چونکہ ایمان بالطبع غیر متغیر و غیر متحرک اور سائنس بالطبع متبدل اور ترقی پذیر ہے لہذا ان دونوں میں اُس افتراق کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے جو چھپانے سے چھپانیں سکتا۔ ایسی حالت میں اُن لوگوں کا جو عقل کے دونوں طریق سے آشنا ہیں فرض ہو جاتا ہے کہ اپنی رائے کا اظہار فروتنی لیکن مضبوطی سے کریں اور سائنس کے حریفانہ دعاوی پر متانت و خجندی کے ساتھ بلا رور رعایت فلسفیانہ انداز سے نظر انتقاد و ڈالیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو انسان کو وہ تمدنی و عمرانی تباہیاں آگھیریں گی جن کا سلسلہ گونا گون مصیبتوں کے ساتھ مدتوں قائم رہے گا۔ جب یورپ کی قدیم بت پرستی اپنے ہی ذائقہ کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی تو نہ تو قیصران روم ہی لوگوں کے روحانی پیشوا بن سکے اور نہ اُس زمانہ کے فلاسفہ ہی نے عقائد کا کوئی مضابطہ مرتب کیا۔ بلکہ انہوں نے مذہب کو بحال خود چھوڑ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب جاہل اور غیظ آلود پادریوں۔ کٹر گروں زنجوں اور غلاموں کے ہاتھ میں پڑ گیا۔



اس غفلت کبرئے کے باعث جو عقلی تاریکی یورپ پر چھا گئی وہ اب زائل ہو رہی ہے اور ہماری آنکھیں فہم و شعور کی صبح صادق کے نور سے منور ہونے لگی ہیں۔ جماعت انسانی طلوع آفتاب کا شوق سے انتظار کر رہی ہے تاکہ اس کی روشنی میں اسے نظر آجائے کہ وہ بھٹکتی ہوئی کہ صحرانگلی ہے اس کو صاف دکھائی دینے لگا ہے کہ تمدن جس شاہ راہ پر اب تک سفر کرتا چلا آیا تھا اسے چھوڑ کر اب وہ ایک نئی ڈگر پر پڑ لیا ہے جو اسے ایک غیر معلوم سرزمین کی طرف لے جا رہی ہے۔

اگرچہ ان خیالات نے میرے دل پر نہایت گہرا اثر ڈالا تھا لیکن اس کتاب کے لکھنے اور جو خیالات اس میں ظاہر کئے گئے ہیں انہیں ملک کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت مجھے پھر بھی نہ ہو سکتی تھی۔ بائیں ہمہ اگر میں نے یہ کتاب لکھی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے موضوع پر میں نے مدتوں غور کیا ہے اور سالہا سال تک اس کے مباحث کی تنقید میں خلوص نیت اور صدق دل سے کام لیا ہے۔ ایک اور بڑی وجہ جو شاید اس کتاب کی اشاعت کی یہ ہوئی کہ یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ، جو میں نے کچھ سال پہلے شائع کی تھی یورپ اور امریکہ میں ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ چنانچہ یہ تاریخ نہ صرف امریکہ ہی میں کئی بار چھپ چکی ہے بلکہ انگلستان میں مکرر طبع ہونے کے علاوہ فرانسیسی جرمن روسی پولش جرمن وغیرہ متعدد دیورپین زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ”تاریخ خاندانگی امریکہ“ کے نام سے جو کتاب میں نے بہت بڑی محنت شاقہ اٹھا کر شائع کی تھی اس کے مواد کی فراہمی کے دوران میں مجھے متخالف بیانات کے مقابلہ اور متخالف وعادی کے تصفیہ کا موقع بار بار ملا تھا۔ اہل امریکہ نے جن کی وقت نظر و اوقات زیر بحث کے انتقاد کے متعلق ممتلج ایضاح نہیں قبولیت عام کی جو سند اس تاریخ کو عطا کی وہ میرے لئے مزید حوصلہ افزائی کا باعث ہوئی ہیں۔ نے مظاہر قدرت کی عملی تحقیقات پر بھی بہت کچھ توجہ صرف کی تھی اور متعدد مشہور و معروف رسائل ان مضامین پر شائع کئے

تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو ان مشاغل کی نذر کر دے اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ سائنس کا درس دینے میں گزارے وہ عدم پاسداری اور حق پرستی کے ان اصولوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو فلسفہ کی نکتہ آمیزی کا حاصل ہیں۔ فلسفہ ہم میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اپنا نئے جنس کی بھلائی کے لئے وقف کر دیں تاکہ جب ہماری مشعل زندگی کے گل ہونے کی گھڑی قریب آئی تو ہم اس کی عثمانی روشنی میں گزشتہ واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے حسرت کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرنے پر مجبور نہ ہوں کہ وہ مشاغل جن میں ہم عمر بھر مصروف رہے پادریوں اور دور از کار محض تھے +

اگرچہ کوئی ایسی محنت نہیں جو اس کتاب کے لکھنے میں میں نے برداشت نہ کی ہو لیکن جس موضوع پر میں نے قلم اٹھایا ہے اُس سے عہدہ برانہ ہو سکنے کا مجھے پورا پورا احساس ہے۔ اس لئے کہ یہ موضوع ہے جس کا حق ادا کرنے کے لئے مصنف کو سائنس، تاریخ، اکلیات اور سیاسیات میں دسترس ہونی چاہئے اور اُس کی تصنیف کا ہر ورق معارف کا گنجینہ اور حقائق کا سفینہ ہونا چاہئے لیکن میں نے اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دے لی ہے کہ یہ کتاب ان تصانیف کا محض ایک دیباچہ یا مقدمہ ہے جو زمانہ موجود کے واقعات اور ضرورتوں کے اقتضا سے سپرد قلم ہو کر رہی گی۔ ہم نے ایک بہت بڑے عقلی انقلاب کی دادی میں قدم رکھا ہے۔ آج کل جو لغو اور منفرغ کتابیں پڑھی جاتی ہیں ان میں سے اکثر کا قائم مقام وہ دماغ آژنا اور دانش آموز لٹریچر ہو جائے گا جس میں ہمارے روحانی مقاصد کے خطرات ایک نئی روح پھونک دیں گے اور مذہبی جذبات ایک نیا جوش پیدا کر دیں گے +

میں نے اس کتاب میں فریقین کے افعال و آرا کو بصراحت اور بلارو و رعایت و بیج کر دیا ہے۔ ایک لحاظ سے میں نے دونوں کے طرفدار بننے کی کوشش کی ہے۔

تا کہ ان میں سے ہر ایک کی وجہ تحریک کا اندازہ اچھی طرح سے کر سکیں لیکن ایک اعتبار سے جس کا مفہوم بہت کچھ ارتق و اعتلا ہے میں نے اپنی مساعی کے دامن کو پاسداری کے دھند سے بچایا ہے اور دونوں کے کارنامے ہو ہو بیان کر دئے ہیں +

پس مجھے یقین ہے کہ جو حضرات اس کتاب پر نکتہ چینی کرنا چاہیں گے وہ اس امر کو ضرور پیش نظر رکھیں گے کہ اس کا مقصد فریقین میں سے کسی ایک کے آراء و عادی کی حمایت نہیں ہے بلکہ دونوں کے آراء و عادی کو برضاحت و صراحت اور بلا ڈرنے یا جھکنے کے صاف صاف بیان کر دینا ہے۔ میں نے ہر باب کی ترتیب میں عام طور پر یہ خیال رکھا ہے کہ اول مذہب کا خیال پیش کر دیا جائے اور اس کے بعد اس کے حریف کا +

مضمون زیر بحث پر اس طور سے نظر ڈالتے وقت میں نے معتدل یا متوسط آرا کو معرض بحث میں لانا ضروری نہیں خیال کیا اس لئے کہ اگرچہ فی نفسہ ان کے قیسی و گرفتار ہونے میں شک نہیں لیکن اس قسم کے مباحث میں غیر طرفدار اور انصاف پسند ناظرین کو اعتدال پسندوں سے نہیں بلکہ انتہا پسندوں سے بحث ہوتی ہے اور انتہا پسندوں کی افراط و تفریط ہی سے نتائج مترتب ہو سکتے ہیں +

یہی وجہ ہے کہ میں نے سیاحت کی دو بڑی شاخوں یعنی کلیسا سنے پر اسٹنٹ و کلیسا یونان کا بہت کم ذکر کیا ہے۔ ثانی الذکر نے سائنس کے ایجاد کے وقت سے ترقی علوم و فنون کی کبھی بھی مخالفت نہیں کی بلکہ اُنہا اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ سچائی کو خواہ اس کا ماخذ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس نے ہمیشہ بنظر استحسان و احترام دیکھا ہے۔ حقائق الہامی کی جو تعبیرات اس نے کی ہیں ان کو سائنس کے اکتشافات سے بظاہر مناسبت پا کر اس نے ہمیشہ یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس مخالفت و مناقضت کی شافی تاویل ہونے کے بعد فریقین میں مصالحت ہو جائے گی اور اس امید میں اسے ناکامی بھی نہیں ہوئی۔ تمدن جدید کے دن

اچھے ہوتے اگر کلیسائے رومانے یہی روش اختیار کی ہوتی +

سمجھت کا ذکر کرتے ہوئے عام طور سے کلیسائے رومانہ کی حالت اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ عیسوی دنیا کی آبادی کا جزو غالب اسی کلیسا کا پیرو ہے۔ کچھ اس لئے کہ اس کے مطالبات حد سے زیادہ بالغ فی الاذعان ہیں اور کچھ اس لئے کہ ان مطالبات کا نفاذ اس نے عموماً بزور حکومت کرنا چاہا ہے۔ پرنٹنٹ کلیساؤں میں سے کسی کو ایسا خود مختار نہ درجہ نصیب نہیں ہوا اور کسی کا سیاسی رسوخ اس درجہ عظیم الاثر نہیں ثابت ہوا۔ ان کلیساؤں نے اول تو جبر و مزاحمت کو ردو ہی نہیں رکھا اور اگر گنتی کی چند صورتوں میں انہوں نے جابرانہ طرز عمل اختیار کیا بھی ہے تو وہ فتوائے عدت کے صدور کی حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتا +

سائنس کے طرز عمل پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کبھی بھی زور حکومت کو اپنا طرف دار بنانا نہیں چاہا۔ اُس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ کسی انسان کو بوجہ اُس کے عقائد کے بدعتی قرار دے یا اُس کے تمدنی حقوق کو پامال کرے۔ اپنے مسلمات یا خیالات کی توثیق یا اشاعت کی غرض سے اُس نے کبھی کسی شخص کو عقاب روحانی یا عذاب جسمانی میں مبتلا نہیں کیا اور سزا سے موت کا تو ذکر ہی نہیں۔ اُس کے دامن پر قساوت و بے رحمی اور معصیت و جرائم کا دھبہ نہیں کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن جب ہم حکم اعتبار عقائد کے کارناموں کو یاد کر کے پاپائے روا کے قصر ”میٹکین“ کے اندر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ ہاتھ جو اس وقت دعا کے لئے ارحم الراحمین کی جناب میں اٹھتے ہوئے ہیں بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں +

تاریخ تجارتی کے دو طریقے ہیں۔ شاعرانہ و عالمانہ۔ اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ واقعات و حوادث انسان کے تابع ہیں اسی لئے اُن تصانیف میں جو اس طریقہ کے

مطابق لکھی جاتی ہیں کسی سربراہ آوردہ شخص کا انتخاب کر لیا جاتا ہے اور اُس کے تحت دیگر کارناموں کی تصویر کھینچ کر اُسے کسی قصہ کا سورا بنا دیا جاتا ہے۔ طریقہ ثانی الذکر کی رو سے معاملات انسانی ایک مسلسل زنجیر کے مشابہ ہیں جس میں ہر واقعہ کسی واقعہ سابقہ کا معلول اور کسی واقعہ آئندہ کی علت ہے اور اس اعتبار سے واقعات انسان کے تابع نہیں ہیں بلکہ انسان تابع واقعات ہے۔ طریقہ اول الذکر ان تصانیف کا ذمہ دار ہے جو خواہ کیسی ہی دلچسپ اور دل پسند کیوں نہ ہوں لیکن اُن کا درجہ حقیقت میں انسانوں اور قصوں سے کچھ ہی اونچا ہوتا ہے۔ طریقہ ثانی الذکر بالکل ہی رد کھا پھیکا ہے بلکہ شاید موجب استکراہ بھی ہو اس لئے کہ وہ ہم پر اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ قانون کی کھوپڑی اور انسان کی کوشش ناچیز ہے۔ جو منہم بالشان مسئلہ اس کتاب کا موضوع ہے اُس کو خیال آرائی و اعجابِ آفرینی سے کوئی تعلق نہیں۔ اُس شخص کو جسے اس مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ ہو مقرر کہ اُس تسلسل پر اپنی نگاہ جمانے رکھنی چاہئے جو تاریخ عالم میں پایا جاتا ہے اُسے پاپاؤں اور مدبروں اور شنشماہوں کی پرچھائیوں کی طرف سے جو دھلتی پھرتی پچھاؤں کی طرح ہیں ازراہ تحقیق منہ پھیر لینا چاہئے +

اگر شرائع و تاریخوں کے ساقط الاعتبار ہونے کے ثبوت کی ضرورت ہو تو ہمارا ذاتی تجربہ اس کا شاہد ہے۔ ہمارے ہم ذوالوہم بچاؤ دوست بھی بسا اوقات ہمارے روزانہ اعمال کی حقیقی نیتوں سے واقف نہیں ہو سکتے۔ اور اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ارادوں کی غلط تاویل کرتے ہیں پس جب اُن واقعات کی یہ حالت ہے جو روزمرہ ہماری نگاہ کے سامنے گزرتے ہیں تو اُن اشخاص کے کارناموں کی نسبت کوئی قطعی حکم لگانا تو صریحاً ناممکن ہے جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور جن کی ہم نے صورت تک نہیں دیکھی +

مضامین زیرِ غور کے انتخاب و ترتیب میں ایک حد تک قہمیں نے اُس کونسل کی

رونداوسے مدعی ہے جو بصدرت پاپائیکلی مرتبہ روم میں منعقد ہوئی تھی اور ایک حد تک واقعات تاریخی کی ترتیب سے۔ حضرات ناظرین دیکھی کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں گے کہ جن مسائل پر ہم اب غور کر رہے ہیں وہ وہی ہیں جن پر قدیم فلاسفہ یونان نے بحث کی ہے یعنی خدا کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ دنیا کیا ہے؟ دنیا کا انتظام کس طرح چلتا ہے؟ کیا حق کا کوئی معیار ہمارے پاس موجود ہے؟ جو ناظرین ان غوامض کی تہ کو پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ سوال کتنے بغیر نہ رکھیں گے کہ آیا ہم نے ان مسائل کو ان سے بہتر حل کیا ہے؟“

القصد اس کتاب کے مقدمات کی ترتیب حسب ذیل ہے:-

میں نے اول جدید سائنس کا علوم قدیمہ سے مقابلہ کر کے اودیہ دکھا کر کہ نظریات پر بنی ہونے کے بجائے اس کا انحصار مشاہدہ تجربہ اور ہندسہ مباحثہ پر ہے ثابت کیا ہے کہ اس کی ابتدا مقدونی فتوحات کی وجہ سے ہوئی جنہوں نے ایشیا اور یورپ میں تعلق پیدا کر دیا۔ ان فتوحات پر ایک اجمالی نظر ڈال کر اور عجائب خانہ اسکندریہ کے مختصر حالات بیان کر کے میں نے جدید سائنس کی نوعیت اور خصوصیات کی توضیح کی ہے پھر میں نے برہیل ایجاد و ظہور مسیحیت کے مشہور واقعات کا اعانہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نے ترقی کرنے کرنے شہنشاہانہ اقتدارات حاصل کرنے اور بت پرستی کے ساتھ مخلوط ہو جانے کے باعث جو سلطنت روم کا مروجہ مذہب تھی اس کی شکل باطل تبدیل ہو گئی۔ چونکہ اس کو صاف معلوم ہو چکا تھا کہ سائنس کا اور اس کا ہیل نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس نے اسکندریہ کے فلسفیانہ مدارس جبراً بند کر دیئے اور اس کا رروانی پر اس کی سیاسی ضرورتوں نے اُسے مجبور کیا +

نصر اینت اور سائنس کو ایک دوسرے کا حریف ظاہر کرنے کے بعد میں نے ان کی پہلی علانیہ زور آزمائی یعنی اصلاح اولی یا اصلاح جنوبی کی داستان نقل

کی ہے۔ اس تنازع میں امرابہ النزاع ماہیت ذات باری نقلے تھا۔ اس کا نتیجہ طور اسلام ہوا جس نے ایشیا اور افریقہ کا بہت بڑا حصہ اور بیت المقدس اسکندریہ اور کاتبج کے تاریخی شہر مسیحی دنیا سے چھین لئے اور وحدانیت خدا کے اصول کو اس مملکت کے بہت بڑے حصے میں شائع کرویا جس پر کبھی رومہ الکبر نے کا پھر یہ اڑتا تھا +

اس سیاسی واقعہ کے بعد سامن میں نئے سرے سے جان پڑ گئی اور عربوں کے ممالک محروسہ میں دارالعلم مدارس اور کتب خانے جا بجا قائم ہو گئے۔ کشور کشایان اسلام نے جو عقل و ادراک میں بسرعت تمام ترقی کر رہے تھے ماہیت ذات باری کے اُن تجسیمی خیالات کو جو اُن کے عامیانا عقائد میں ملے ہوئے چلے آتے تھے ترک کر دیا اور ان کے بجائے اُس قسم کے کجکٹ و فلسفیانہ عقائد اختیار کر لئے جن کا طور مدوں پہلے ہندوستان میں ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت روح انسانی کے متعلق علم اور مذہب میں دوسری نزاع پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں فلسفہ ابن رشد کو ترقی ہوئی اور مسائل انفصال و انجذاب نے رواج عام پایا۔ ازمندہ وسطی کے انتقام پر حکمہ حساب عقائد یورپ سے ان مسائل کو خارج کرنے میں کامیاب ہوا اور اب وینیکن کو نسل نے باضابطہ طور پر مذہبی رسوم کے ساتھ اُن کی تکفیر کر دی ہے +

اس اثنا میں بہت جغرافیہ اور دوسرے علوم کے کتاب کی بدولت نظام شمسی میں زمین کے مرتبہ اور دوسرے اجرام سماوی کے ساتھ اُس کے تعلق اور ترکیب کائنات کے متعلق صحیح خیالات قائم کئے جا چکے تھے۔ اور چونکہ مذہب کو جو کتب مقدسہ کی آیات کی اُس تاویل پر مبنی تھا جو تعبیر راشدہ و صحیحہ تصور ہوتی تھی اس امر پر اصرار تھا کہ زمین مرکز کائنات ہے اور موجودات میں کوئی شے لمحاظ عظمت و شان اس سے لگتا نہیں کھاتی لہذا تیسری نزاع برپا ہو گئی۔ اس جنگ میں سامن کا علم بردار گلیلیو تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کو شکست فاش ہوئی اس کے بعد ایک ارضی بحث دنیا کی عمر کے بارہ میں چھڑ گئی۔ کلیسا کو اصرار تھا کہ

دنیا کی عمر صرف چھ ہزار سال ہے۔ اس بحث میں بھی اُسے زک اٹھانی پڑی +  
 تاریخ اور سائنس کی روشنی سے یورپ میں بتدریج اُجالا ہو رہا تھا۔ سوٹھویں صدی میں  
 رومانی نصرانیت کا اقتدار اور اثر بوجہ اُن عقلی زکوں کے جو اُسے اٹھانی پڑی تھیں اور  
 نیز باعث اپنی سیاسی اور اخلاقی حالت کے بہت کچھ گھٹ گیا۔ بہت سے ارباب زہم  
 و اتقا کی نظر سے یہ امر مخفی نہ تھا کہ مذہب خود اُن خرابیوں کا ذمہ دار نہ تھا جو اُس میں پائی جاتی  
 تھیں بلکہ ان مفاسد و ذمائم کا باعث وہ رشتہ اتحاد تھا جو اُس نے زمانہ قدیم میں رومانی  
 بت پرستی کے ساتھ قائم کر لیا تھا پس اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ قرونِ اولیٰ  
 کی پاک اور صاف نصرانیت کی طرف حود کیا جائے۔ اس طور پر جو چوتھی نزاع بپا ہوئی  
 جو اصلاح اُخیر نے یا اصلاح شمالی کے نام سے موسوم ہے۔ اس نزاع نے جو خاص شکل  
 اختیار کی وہ معیار حق سے تعلق رکھتی تھی یعنی سچائی کا معیار اصلی کلیسا ہے یا بائبل۔ اس  
 بحث کے تصفیہ میں حریت عقل کا شاخسانہ نکل آیا یعنی امور عقلی میں ہر انسان کو شخصی اجتہاد  
 کا حق حاصل ہے۔ موقوف نے جو اس دور کا سب سے زیادہ مشہور و سربرآوردہ شخص ہے  
 اپنے مقاصد کی تکمیل میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور جب جنگ کے بعد دونوں حریف  
 الگ ہو گئے تو معلوم ہوا کہ شمالی یورپ رومانی نصرانیت کے ہاتھ سے نکل گیا ہے +

اب ہمارے سامنے یہ بحث ہے کہ انتظامِ عالم کس طرح چل رہا ہے آیا اس انتظام  
 کا مکمل خدا کی متسلل و متوالی مداخلت سے متعلق ہے یا اذلی و غیر متغیر قانون سے سیحی دنیا  
 کی عقلی تحریک نشوونما کے اُس نقطہ پر اب پہنچی ہے جس پر عربی و ملغ و سویں اور گیارھویں  
 صدیوں میں پہنچ چکا تھا اور اُن مسائل پر جو اُس زمانہ میں مسلمانوں کے پیش نظر تھے اب  
 مکرر غور ہو رہا ہے۔ مسئلہ ارتقا۔ مسئلہ پیدائش۔ مسئلہ نشوونما سے موالید و مباحث ہیں جو انیسویں  
 صدی کی نصرانیت کو دسویں صدی کے اسلام سے ترک میں ملے ہیں +

میرزا غالب ہے کہ ان عام عنوانات کی ذیل میں اس مہم بالشان مباحثہ کے تمام



اصولی نکات آجائیں گے۔ اور ان جامع ابواب کی تحت میں واقعات زیر غور کو جمع کرنے اور ہر مجروحہ پر جدا گانہ بحث کرنے سے ہیں ان کے ماہی تعلق اور ان کی تاریخی ترتیب کا صحیح صحیح علم ہو جائے گا۔

سائنس اور مذہب کی ان معرکہ آرائیوں کی داستان میں نے حتی الامکان بہ ترتیب زمانی سپرد قلم کی ہے اور بہ نظر تکمیل و اتمام ذیل کے تین ابواب کا اضافہ اس بحث پر کر دیا۔  
(۱) لاطینی نصرانیت نے تمدن جدید کو کیا فائدہ پہنچایا۔

(۲) سائنس سے تمدن جدید نے کیا فیض پایا۔

(۳) مذہب اور سائنس کی عنقریب چھڑنے والی جنگ میں وٹیکن کونسل کے اعلان کے لحاظ سے رومانی نصرانیت کا رویہ۔

حق و راستی کی جستجو میں اکثر اشخاص نے مختلف مذہبی فرقوں کے تنازعات کی خرابیاں پر اپنی توجہ کو اس حد تک صرف کر رکھا ہے کہ وہ یوں کا جھگڑا جس کے تاریخی واقعات سے ان اور اوراق میں بحث ہے لوگوں کو بہت کم معلوم ہے۔ میں نے مستقیم الغرض ہو کر کوشش کی ہے کہ اس کتاب کو بلا رو و رعایت لکھوں اور فریقین کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے حق کو ہرگز نہ چھپاؤں۔ اس امر کا اندازہ کہ اس کوشش میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے میں ناظرین اولوالالباب کے حق پسندانہ فیصلہ پر چھوڑتا ہوں۔

جان ولیم ڈریسپر

نیویارک یونیورسٹی

دسمبر ۱۹۶۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# معرکہ مذہب و سائنس

## پہلا باب سائنس کی ابتدا

یونانیوں کی مذہبی حالت چوتھی صدی قبل مسیح میں سلطنت ایران پر حملہ آور ہو کر وہ قدرت کے نئے نئے مناظر دیکھتے ہیں اور نئے نئے مذاہب سے واقفیت حاصل کرتے ہیں مقدونی فوج کشی سے فن حرب فن انجیری اور سائنس کو جو تحریک پہنچتی ہے اسکندریہ میں ایک دارالعلم کے قیام کا باعث ہوتی ہے۔ یہی دارالعلم جس میں تجربہ پیش ہوا اور ہندو سائنس کے ذریعہ سے علوم و فنون کی ترقی کے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں سائنس یعنی علوم و فنون کا خسرہ قرار پاتا ہے۔

ارباب فکر و دانش کی نظر میں کوئی سامان اتنا دردناک نہیں ہوتا جتنا کسی پرانے مذہب کا زوال اور وہ بھی اوس مذہب کا زوال جس نے اپنے زمانہ میں بنی نوع انسان کی کئی نسلوں

کے لیے تسکین روحانی کا سرمایہ بہم پہنچایا ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے چار سو سال پہلے یونان علم و حکمت میں اتنی جلد جلد ترقی کر رہا تھا کہ قدیم مذہب کی قبا اوس کے قاست پر تنگ ہو چلی تھی۔ وہاں کے فلاسفہ نے جب ماہیت کائنات پر غور کیا تو قوانین فطرت کی عظمت و جبروت کے مقابلہ میں اومپس کے دیوتا اومین سخت حقیر اور ذلیل نظر آئے۔ سورخون نے جب معاملات سیاسی کے انضباط و ترتیب اور افعال انسانی کی مہوار اور باقاعدہ روش پر نگاہ ڈالی اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھا کہ دنیا میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آتا جس کی کوئی سرچشمہ کسی واقعہ سابقہ کی شکل میں موجود نہ ہو تو اومین شبہ ہوئے لگا کہ کہیں وہ مجھ سے اور آسمانی نشانات جن سے عہد عتیق کے سفائن مہمور میں محض من گھڑت قصہ کہانیاں ہی تو نہیں۔ اور جب فوق القدرت واقعات کا ظہور موقوف ہو گیا تو یہ بدیہی سوال پیدا ہوا کہ کیا وجہ ہے کہ کسی دیوتا کے منہ سے اب کوئی پیشین گوئی سننے میں نہیں آتی اور کرامات و عجائبات کا دور وازن مطلقاً سدود ہو گیا ہو۔

قدیم روایات نے جو قریباً قرن سے سینہ بسینہ چلی آتی تھیں اور جنکی صداقت خوش عقیدہ اشخاص کے لئے اصول موضوعہ کا حکم رکھتی چلی آئی تھی جزائز بحر دم اور ارض لطفہ کو فوق العادت عجائبات سے آبا و کر رکھا تھا۔ چنانچہ ان ممالک کی نسبت عام طور سے مٹ ہو رہا تھا کہ وہاں عجیب الخلق ہستیاں مثلاً جادوگر۔ جادوگر نیاں۔ دیو۔ بھوت۔ پریٹمین۔ پردار سانپ کے بالوں والی بلائیں نصف انسان اور نصف گھوڑے کے دھڑواالی آفتیں اور یک چشم عفریت

لے یونان کے مورخ جیسل میں ایک پہاڑ ہے جس کا ارتفاع ۹۰۴۹ فٹ اور حد الشیخ کی بلندی ۹۰۰۰ فٹ ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی پر جو نہایت وسیع و فراخ ہے ہر وقت بادلوں کا ایک گھساٹو پچھایا رہتا ہے۔ ہومر اور اوس کے بعد کے زمانہ کے یونانی شعرا کا یہ عقیدہ تھا کہ اس چوٹی پر مہادیوتا زیوس جس کا دوسرا نام جو پمپٹر تھا دوسرے چھوٹے بڑے دیوتاؤں اور دیویوں کے ساتھ رہتا ہے اور وہاں سے یہ سب جب چاہتے ہیں بادلوں میں پہنچے ہوئے آسمان کو چلے جاتے ہیں۔ مترجم

ہستے ہیں۔ آسمان کی لاجوردی محراب کو متعلق عام خیال یہ تھا کہ یہ بہشت کا حصہ ہے جس میں مہادیوتا زیوس دیوتاؤں اور اون کی بیبیوں اور آستناؤں کے حلقہ میں دربار کرتا ہے۔ ان دیوتاؤں کے مشاغل بھی نوعیت میں انسانی مشاغل پر تفوق نہ رکھتے تھے یعنی آسمان والے بھی زمین والوں کی طرح جذبات بہیمیہ و اغمال سیئہ سے بری نہ تھے۔

یونان کے ساحل کی انتہائی ہیئت نے ایک ایسے مجمع الجزائر کے موزوں موقع کو ساتھ مل کر جس کے بعض جزیرے خوشنما اور دلغیر ہی کے لحاظ سے دنیا بھر میں اپنی آپ نظر میں یونانیوں میں ہزاروں جغرافیائی اکتشافات اور ناکام غیر میں نئی آبادیاں قائم کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔ ان کے جہاز بحیرہ اسود اور بحیرہ روم میں چکر لگانے لگے اور قرب و جوار کے سمندر وں چپے چپے اونہوں نے چھان مارا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہتم بالشان عجائبات جن کی ثنا و صفت سے کتاب ”اڈیسی“ کے اوراق مزین تھے فرضی ڈھکوسلے ثابت ہوئے۔ قدرت کو واقعات کے متعلق جب زیادہ تجسس و تفتیش سے کام لیا گیا تو معلوم ہوا کہ آسمان محض فریب نظر کا نام ہے اور اولپس کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ اگر بین تو ستارے ہیں یا فضاے بیسط و غرض مکان کے ساتھ مکین بھی تشریف لے گئے۔ ”ایونین“ خاندان کے معبود باقی رہے جنکا ذکر ہومر نے کیا ہے اور نہ ”ڈورک“ قبیلہ کے دیوتا جن کے بھیجیہ میسائڈ نے گائے ہیں۔

یہ کتاب ”ایڈ“ کے شہرہ آفاق مصنف ہومر یونانی کی دوسری منظوم تصنیف کا نام۔ ہومر کا زمانہ حضرت مسیح کی ولادت سے نو سو چالیس سال قبل بیان کیا جاتا ہے۔ گویا حضرت یسایا کی ولادت سے کوئی دس بارہ سال بعد۔ ”اڈیسی“ کو ایک لحاظ سے ”ایڈ“ کا یونان کی مہابھارت کی ہی ہمہ گیر گھنٹا چاہئے۔ مترجم ۱۵۰۰ یسایا اولپس کے یعنی جسی دجور سے انکار کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مصنف کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اولپس جو دیوتاؤں کا سکن سمجھا جاتا تھا تحقیقات کرنے پر ایک ڈھکوسلا ثابت ہوا۔ مترجم ۱۵۰۰ ایک قدیم یونانی شاعر جس نے آٹھویں صدی قبل مسیح کا وسطی زمانہ پایا ہے۔ اسکی تصانیف جنکی زبان ہومر کی زبان سوتلی ملتی ہے جرمن میں شایع ہو چکی ہیں۔ مترجم

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اتنا بڑا انقلاب بغیر کسی مزاحمت یا مخالفت کے واقع ہو گیا۔  
 اَوّل اَوّل عوام الناس خصوصاً اہل مذہب نے مشکلیں کے اُٹھتے شہادت پر لاندہی کا فتویٰ  
 لگایا۔ انہوں نے غلطیوں میں سے بعض کا مال و اسباب ضبط کر لیا بعض کو جلا وطن کر دیا اور  
 بعض کو قتل کر ڈالا۔ اون کا دعویٰ یہ تھا کہ جن باتوں کو لوگ ہزار ہا برس سے مانتے چلے آئے  
 ہیں وہ ضرور سچے ہیں ورنہ اتنی مدت تک قائم کیوں رہتیں لیکن جب شہادت مخالفت  
 اس قدر زبردست ہو گئی کہ اوس کا کوئی جواب نہ ہو سکتا تھا تو انہیں مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ یہ  
 عجائبات استعسا سے تھے جن کے پردے میں قدما کی دانش و حکمت نے بہت سے مقدس  
 و پوشیدہ رموز و نکات کو ظاہر کیا تھا۔ اگرچہ خود ان کے دل میں بھی یہ خدشہ پیدا ہو چلا کہ ممکن  
 ہے کہ جن باتوں کی ہم حمایت کر رہے ہیں اون کی حقیقت افسانہ سے زیادہ نہ ہو لیکن چونکہ  
 مذہب کا اثر دل پر قوی تھا لہذا اون کی کوششوں نے یہ صورت اختیار کی کہ اپنے معتقدات  
 کو اپنے عقلی و ادراکی نشوونما کے ساتھ تطبیق دینے لگے۔ لیکن ممکن نہ تھا کہ یہ کوششیں بار آور  
 ہوں۔ اس لیے کہ یہ امر مقدرات سے ہے کہ انسانی رائے خاص خاص مدارج ارتقا طے کرتے  
 بعد ایک خاص نقطہ پر جا کر ٹھہر جائے۔ انسان جس عقیدہ کو حرمت اور توقیر کی نظر سے دیکھتا ہے  
 اول اول اوس کے متعلق اوس کے دل میں شہادت و شکوک ناشی ہوتے ہیں۔ تشکک کے  
 بعد تاویل کا دور آتا ہے۔ تاویل مبدل بہ اختلاف ہو جاتی ہے۔ اور اختلاف کل عقیدہ کو ایک  
 فرضی افسانہ سمجھ کر انکار کی انتہائی اور قطعی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

فلاسفہ اور مؤرخین کے بعد شعرا کے اعتزال کی باری آئی۔ یو ریمپڈیز پر فاسد العقیدہ

سکریوٹائی نے اوس صفت میں جس کا خاتمہ مسرت پر ہوتا ہے یو ریمپڈیز ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔  
 شہرہ آفاق میں ہنرمند سلا مس پیدا ہوا۔ فلسفہ۔ بلاغت۔ طبیعات میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اول اول اس کا  
 پیشہ لکائی تھا۔ اس کے بعد شاموی کی طرف متوجہ ہوا۔ سقراط سے اس نے تعلیم تو نہیں پائی مگر اس کے زمرہ  
 احباب میں شاموی کے ایک تھا۔ فلسفیانہ عقاید۔ کھنے کی وجہ سے اہل ایجنڈا اوس کے (بقیہ مضمون بر صفحہ ۵)

ہونے کا الزام لگایا گیا۔ اس قدر کفر کئے کی پاداش میں سنگسار ہوتے ہوئے بچا۔ لیکن جن لوگوں کی اغراض بے بنیاد باتوں کی حمایت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں ان کی مجنونانہ کوششیں کبھی بار آور نہیں ہو سکتیں۔ اس عقلی بل پل کے آثار ادب و انشا کے ہر شعبہ میں نظر آنے لگے یہاں تک کہ عوام الناس بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

قومی مذہب کے اس انحصار میں اہل یونان کے فلسفیانہ اکتشافات کو ان کی تعلیمات تنقید سے بہت کچھ مدد ملی تھی۔ اسی تنقید کا نتیجہ تھا کہ عقاید مردوبہ کے متعلق جو عام شکوک پھیل گئے تھے ان کی تائید میں ثواب و دلائل کا ایک انبار جمع ہو گیا۔ اور مختلف مذاہب کے عقاید کے باہمی مقابلہ سے اول لواضع کی بنا پر جو ان میں پائے گئے یہ ثابت کیا گیا کہ انسان کے پاس حق اور صدق کا کوئی معیار نہیں نیکی اور بدی کے خیالات اس عالم کون و فساد میں سرے سے موجود ہی نہیں بلکہ طعنا تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں اس لیے کہ ایک ملک میں جو بات بری سمجھی جاتی ہے وہی دوسرے ملک میں اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اچھائی اور بُرائی نیکی اور بدی تھیں چند اعتبارات کا نام جنہیں بنی نوع انسان نے اپنے نواید کے لحاظ سے قائم کر رکھا ہے

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) دشمن جان جو گئے اور اس زمانہ کے مشہور ہر آل آرٹوفیس نے اس کی جو کجی۔

یہاں سے جان بچا کر وہ مقدونیا کے دربار میں جا پناہ گزین ہوا لیکن وہ شاعروں سے وہاں بھی ادس کی چھوٹ ہو گئی اور انہوں نے اس پر کئے جو مضمون نے اسے چیرھیا ڈالا۔ اس کا انتقال شتی ۶ میں ہوا۔

اٹھارہ کتابیں اس کی تصنیف سے ہیں اور ان کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ مترجم نے ڈراما نویسی کے اسی شعبہ کا جس کا اس پر ذکر ہوا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ۵۲ ق ۶ میں یونان کو شہر الیوس میں پیدا ہوا اور ۵ ق ۶ میں بمقام گنگا واقع جزیرہ مائے سسلی وفات پائی۔ اول میر تقی خان کی بیگم۔ اور ۵ ق ۶ میں سال بعد شتی ۶ میں سلس کی تہو پر بحری لڑائی میں شریک ہوا۔ شترانگ اس کی تصنیف سے ہیں جن میں سے صرف سات ہم تک پہنچے ہیں۔ اس کا طرز ادب نہایت دلکش ہے اور عبارت نہایت سلیس سمجھی جاتی ہے۔ ڈراما میں مکالمہ کا طریقہ اسی کا رواج دیا ہوا ہے۔ مترجم

تکسیر میں بعض نصرت تویہاں تک ترقی کر گئے تھے کہ نہ صرف اونہیں اس بات سے انکار تھا کہ کسی ان دیگی ان بھی اور فوق القدرت ہستی کا وجود ہو سکتا ہے بلکہ وہ دنیا کو ایک خواب پریشان ایک خیال سوہوم تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حقیقی وجود کسی شے کا نہیں ہے۔ یونان کی مابیت ارضی وطبعی کا اثر اوس کی پولیٹکل حالت پر بھی پڑا۔ اس نے اہل یونان کو متعدد جماعتوں میں تقسیم کر دیا جن کی اغراض مختلف اور مقاصد جدا گانہ تھے۔ اور یہ بات تاہن ہو گئی کہ اون کی ایک حکومت قائم ہو۔ اون مسلسل خانہ جنگیوں نے جو یونان کی رقیب ریاستوں کو ایک دم چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھیں اس کی ترقی رفتار کو روک دیا۔ ملک کی مالی حالت سقیم تھی اور ملک کے سربراہان و درہ لوگ جادہ تدبیر سے منحرف ہو گئے تھے۔ وہ حب وطن کی بے بہا جنس کو مالک غیر کے سیم و زر کے بدلے فروخت کرنے میں ذرا پس و پیش نہ کرتے تھے اور ایرانی رشوت کی قربان گاہ پر یونانی اغراض کی بھینٹ چڑھانا اون کے لیے سادات ہو گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ فنونِ بُت تراشی و تعمیر کے اون محاسن نے جنگی دلاویزی اور عنانی آج تک دنیا میں اپنی مثال آپ بھی گئی ہے یونان کو حسنِ صورتی کا اس حد تک شیفہ ووالہ بنا دیا تھا کہ اوس میں حسنِ معنوی یعنی سعادت و صداقت کے عملی امتیاز کی قسا بلیرت سب ہو گئی تھی۔

یونان کا جو حقد یورپ میں واقع تھا اوس نے تو خود مختاری و حریت کے اون خیالات کی بدولت جو وہاں پھیلے ہوئے تھے ایران کے باجگزار بننے سے انکار کر دیا لیکن ایشیائی یونان بلا تامل اوس کا حلقہٴ جوش ہو گیا۔ اس زمانہ میں سلطنت ایران رقبہ میں موجودہ یورپ کے نصف کے برابر تھی۔ ایک طرف اس کے ساحلون کو بحرِ روم۔ بحیرہ ایجیئن۔ بحیرہ اسود۔ بحیرہ خزر کی موجیں لہوے دیتی تھیں۔ دوسری طرف اس کی سرحد بحرِ قزح۔ خلیج فارس اور بحرِ ہند سے ملی ہوئی تھی۔ اس کے میدانوں اور دایوں کو دنیا کے سب سے بڑے چھ دریا۔ فرات۔ دجلہ۔ انڈس۔ جیون۔ سیحون اور نیل جن میں سے ہر ایک کا طول ہزار میل سے زیادہ تھا۔

سیراب کرتے تھے۔ اس کی سطح سمندر کی سطح سے کہیں تیرہ سو فٹ نیچی اور کہیں بیس ہزار فٹ بلند تھی۔ اور اسی نشیب و فراز کا نتیجہ تھا کہ اس میں ہر قسم کی بنیادی پیداوار موجود تھی اور معدنی دولت کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ میتھیا اور بابل کا جہاں و جلال اور اسیریا اور کاندہیہ کی عظمت و تمکنت اسے متفقہ طور پر ترکیز میں ملی تھی اور یہ وہ دولتیں تھیں جن کے تاریخی کارنامے میں صدیوں پر پھیلے ہوئے تھے۔

ایران یورپین یونان کو سیاسی پھاؤ سے ہمیشہ تغیر و تہج میرزا تھا اور اس لئے کہ اس کا رقبہ کسی ایرانی صوبہ کے نصف کے مساوی ہی نہ تھا۔ لیکن جو خطہ اسیان اس سرکش علاقہ کو نیچا دکھانے کے لئے ایران نے وقتاً فوقتاً کہیں اون کے اثنائین او سے یونانیوں کی جنگی قابلیت کا اعتراف کرتے ہی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ایرانی افواج کے سب سے زیادہ جاننا اور جری دستے اون یونانی سپاہیوں سے مرکب تھے جنہیں فرمان روایان ایران فریض قرار معاوضے دیکر نوکر رکھ لیا تھا۔ افواج ایران کے سپہ سالار اور ایرانی جہازوں کے بیڑے کے امیر البحر تک بعض یونانی ہوتے تھے۔ ان خانہ جنگیوں کے دوران میں جنہوں نے ایران کو طوایف الملوکی کا موقف بنادیا تھا تخت و تاج کے دعوے داروں کی رقبہ نگاہیں بسا اوقات یونانی سپاہیوں ہی کے مردانہ اوصاف کی شرمندہ احسان ہوئیں۔ ان نبیروں نے ان سے جو نتائج مترتب ہوئے وہ نہایت اہم تھے۔ بہادر اور جنگجو یونانیوں نے جن کے جوہر سپہگرمی کو اب تک ایران کے روپیہ نے خرید رکھا تھا ایک نظر میں معلوم کر لیا کہ سلطنت رو بہ انحطاط ہے اور تلوار کے زور سے تخت تک پہنچ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ کیونکہ

لے اس مقام کا ٹھیک موقع تو معلوم نہیں لیکن زونون نے جو حالات اس جنگ کے جو بیان کے قریب میں ہوئی بیان کئے ہیں اون سے نتیجہ نکال لیا کہ بابل سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر جانب شمال و مغرب دریائے فرات کے بائیں کنارے پر واقع تھا۔ یہ جنگ یخسہ و خسرو ایران اور اس کے بھائی اردشیر میں ہوئی تھی سائرس مارا گیا اور اردشیر فتح یاب ہو کر تخت نشین ہوا۔ مترجم



کے میدان جنگ میں سائرس کے کام آنے کے بعد زونون کا اپنے دس ہزار بھراہیون کو ایران سے صحیح و سلامت لے لکنا ایک ایسا زندہ جاوید واقعہ تھا جس نے اس بات کو قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ بالکل ممکن ہے کہ یونانی فوج قلب ایران پر ترکنا کرے اور وقت آپڑے تو صحیح و سلامت واپس چلی جائے۔

زرکسیس نے ہیلت پانٹ پر پل باندھ کر اور کوہ ایٹخاس کی خاکنا سے کو ابنا سے کی شکل میں بدل کر یونانیوں کے دلوں پر ایشیائی سپہ سالاروں کی جنگی قابلیت کا سکھ بٹھا دیا تھا لیکن سلاسل پلٹیا اور مائیکیل کی لڑائیوں نے نقش محو کر دیا۔ ایران کے مالامال صوبوں کو تاخت و تاراج کرنے کی ہوس کا ایک طوفان اون کے دلوں میں اُمنڈ آیا۔ اسپارٹا کا بادشاہ اگیسیلیس اسی خواہش کے اقتضا سے ایران پر چڑھ دڑا اور کئی نمایاں فتوحات حاصل کیں لیکن ایرانی گورنمنٹ نے اس موقع پر اپنی قدیم حکمت عملی سے کام لے کر اس کی پیش قدمی کو روک دیا یعنی اسپارٹا کی ہسایہ ریاستوں کو رشوت دے کر خود اسپارٹا پر حملہ کر دیا۔ اگیسیلیس کو اب اپنے گھر کی پرگنی اور جب جہاز پر چار ہو کر وہ اسپارٹا کو واپس جانے لگا تو یہ تلخ اور تعریض آمیز جملہ اس کے منہ سے نکلا کہ ”آہ میں مغلوب بھی ہوا تو فقط تیس ہزار ایرانی تیر اندازوں سے“ اس سے اس کی مراد ایرانی سکھ دُراک سے تھی جس پر تیر انداز کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

اس کے بعد فیلقوس شاہ مقدونیہ کو ایک زیادہ ترابھرتہ مدد نے ایک بہت بڑے

مجمع الجبازیر یونان کے ایک جزیرہ کا نام ہے جو ایٹھنر کے قریب واقع ہے۔ اس کا قبہ کوئی دس میل میل ہوگا۔ جس جنگ کی طرف متن میں اشارہ ہے وہ ایک بحری لڑائی تھی جو سنہ ۴۸۰ ق م میں ایرانیوں اور یونانیوں میں ہوئی اور ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ مترجم

یہ یونان قدیم کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو تھیبیز سے ساڑھے چھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ سنہ ۴۸۰ ق م میں یہاں ایرانیوں اور یونانیوں میں ایک سخت جنگ ہوئی جس میں میدان یونانیوں کے ہاتھ رہا۔ مترجم

جنگی چمیانہ پران کو ششون کی تجدید و احیا کا خیال دلایا۔ تمام یونانی ریاستوں کو اوس نے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اوسے یونان کی افواج متحدہ کا سپہ سالار اعظم قرار دیں نہ اس غرض سے کہ صوبجات ایران کو تاخت و تاراج کیا جائے بلکہ اس غرض سے کہ دولت ایران کو مسخر کر کے یونان کا حلقہ گجوش بنالیا جائے۔ ابھی اس عظیم الشان ہم کی تیاریاں مکمل نہ ہوئی تھیں کہ وہ قتل کر ڈالا گیا اور اوس کا بیٹا سکندر جو ابھی بالکل نوجوان تھا اوس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ فیلقوس کے قتل کے بعد یونانیوں کی ایک عام مجلس شوریٰ بمقام کارتھ منتقد ہوئی تھی اور اوس میں بالاتفاق یہ قرار پایا تھا کہ سکندر اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھے۔ انہی دنوں الیریا میں کچھ فساد اٹھ کھڑا ہوا۔ سکندر کو اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے اپنی فوج لے کر شمال کی جانب دریائے ڈیوب تک جانا پڑا۔ اوس کی غیبت میں اہل تھیبز نے دیگر قبائل کے ساتھ مل کر اوس کے برخلاف سازش کی۔ واپس آکر اوس نے تھیبز کو ایک دھاوے میں سر کر لیا اور اہل شہر میں سے چھ ہزار کو قتل کیا تیس ہزار کو لونڈی غلام بنا کر بیچ ڈالا اور شہر کو سہارا کر دیا۔ یہ خبر تشدد اوس کی فوجی مال اندیشی کی بہت بڑی دلیل ہے اس لئے کہ جب وہ ایشیا کی تسخیر میں مصروف تھا تو اوس کی غیبت میں کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

۳۳۵ ق م کے موسم بہار میں سکندر بیت پانٹ کو عبور کر کے ایشیا کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ اوس کی فوج تعداد کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ چونتیس ہزار پیادے تھے اور چار ہزار سوار۔ خزانہ بھی اوس کے ہمراہ داجبی ہی تھا یعنی کلہم ستر ٹیلنٹ لے کر گھر سے نکلا تھا۔ ایرانی فوج دریائے گرینیٹکس کے اوس پار ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔ سکندر نے سیدھا غنیمت کا رخ کیا اور

۱۔ ابتدا میں ایک یونانی مقدار وزن کا نام تھا جو مختلف ریاستوں میں مختلف تھی۔ یعنی کہیں ۳۸ سیر تھی اور کہیں ۴۷ سیر۔ بعد میں اس لفظ کا اطلاق نفوذی سکھ رائج اوقت کی مساوی مقدار پر ہونے لگا۔ اگر ٹیلنٹ کی مقدار ۴۷ سیر بھی فرض کی جائے تاہم سکندر کے خزانہ میں اس ٹیم پر دراندہ ہونے کے وقت آج کل کے ارز نفرو کے حساب سے ایک لاکھ نوے ہزار روپیہ سے زیادہ رقم موجود نہ تھی۔ مترجم

دیریا کو چیرتا ہوا حریف سے جا بھٹرا گھسان کی لڑائی ہوئی۔ ایرانی اگرچہ جان توڑ کر لڑے لیکن سکندر کی بہادری اور قواعد دان فوج کے آگے اون کی ایک پیش نہ گئی۔ شکست فاش کھا کر اونہوں نے راہ فرار اختیار کی اور کل ایشیائے کوچک مع بے شمار خزانوں کے سکندر کے قبضہ میں آگیا۔ سال کا باقی حصہ سکندر نے ممالک مفتوحہ کے فوجی نظم و نسق میں گزارا۔ اس وقت میں دآرا فرما کر اسے ایران چھ لاکھ کاٹھڑی دل لے کر آگے بڑھاتا کہ مقدونی فوج کو شام کی طرف پیش قدمی کرنے سے روکے۔ کوہستان ایلس کی گھاٹیوں میں دو دن فوجوں کا سامنا ہوا۔ ایرانیوں کو اس دفعہ بھی شکست ہوئی۔ اس خونریز جنگ میں جانوں کا جس قدر نقصان ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سکندر اور اس کا ایک جرنیل بلیسوس جب ایک گھاٹی میں سے گزرے تو اسے کشتوں کے ایک عظیم الشان پستے سے اٹا ہوا پایا اور دو دنوں کو اس گنج قیمتی لمان کے اوپر سے ہو کر گزرنا پڑا۔ سکندر کے ہمراہ جو وقایع نویس تھے اونہوں نے حساب لگایا ہے کہ اس جنگ میں ایرانی فوج کا نقصان بقدر نوے ہزار پیادوں اور دس ہزار سواروں کے ہوا۔ شاہی حرمسرا کا خیمہ دارا کی بی بی اور اس کے کئی بچوں سمیت فاتح کے قبضہ میں آیا۔ اس طور پر ملک شام بھی یونانی فتوحات کی سلک میں منسلک ہو گیا۔ دمشق میں دآرا اور اس کے اعیان دولت کی کثیر تعداد خواصین مع بیٹہ خزانہ کے سکندر کے ہاتھ آئیں۔

مسوٹیمیا کے میدانوں کی جانب اخیر جنگ کے لئے پیش قدمی کرنے سے پہلے سکندر نے اون ممالک کی حفاظت کے خیال سے جنہیں وہ فتح کرتا ہوا پیچھے چھوڑ آیا تھا اور نیز اس غرض سے کہ اس کے اور ہمسند کے درمیان غنیمت کو سبیل ہونے کا موقع نہ ملے بحر روم کے ساحل کو کنارہ سے کنارہ سے جنوب کا رخ کیا اور رستہ میں جو جو شہر پڑے اونہیں فتح کرتا گیا۔ ایلس کی لڑائی کے بعد جو بلیس شوری منقہ ہوئی تھی اس میں سکندر نے ایک تقریر کرتے ہوئے اپنے افسران فوج سے کہا تھا کہ ایسی حالت میں جبکہ <sup>اٹلی</sup> ٹائر مسخر نہیں ہوا اور مصر و قبرس سے تہذیب و دولت نیشیا کا ایک بہت بڑا شہر جو اپنی جنگی قوت اور تجارتی عظمت کی وجہ سے (بقیہ مضمنہ بر مفادینہ)

ایران کے قبضہ میں ہین دآرا کا تعاقب کرنا کسی طرح قرن مصلحت نہیں اس لئے کہ اگر ایران بندرگا ہوں پر کمر قابض ہو گیا تو مرکز جنگ یونان میں منتقل ہو جائے گا۔ پس بحر اس کے چارہ ہین کہ سمندر کے قبضہ میں ہمارا کوئی شریک و بہیم نہ ہو۔ سکندر اچھی طرح جانتا تھا کہ مقصود اور قبرس پر قبضہ کر لینے کے بعد اوسے یونان کی طرف سے کوئی کھٹکا نہیں ہو سکتا۔ تاثر کے محاصرہ میں اوسے چھ مہینے کی مدت لگی۔ اس تاخیر کی پاداش میں اوس نے اہل تاثر میں سے دو ہزار کو سولی پر لٹکا دیا۔ یورشلم نے بلا مزاحمت ہتھیار ڈال دئے اور اس لئے اوس کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا گیا لیکن غارہ کے ایرانی گورنر بیطیس نے مقدونی فوج کو رستہ میں جاننا زائد مقابلہ سے دو مہینے تک روڑا اٹکا ڈرکھا۔ آخر ایک سخت حملہ کے بعد اس شہر کو بھی سکندر کی کشاکش تلوار نے سخر کیا۔ شہر کے دس ہزار باشندے تیرتغ کئے گئے۔ اور باقی اپنے بی بی بچوں سمیت لوندی غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے۔ خود بیطیس کو فاتح کے رنجھ کے پہیوں کے ساتھ

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) مشہور تھا۔ اور بیروت سے ۴۴ میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب کی سمت میں واقع تھا۔ اس کا کچھ حصہ ایک جزیرہ پر جو ساحل سے کوئی پون میل ہو گا اور کچھ حصہ ساحل پر آباد تھا۔ دسویں صدی قبل مسیح میں حضرت ملیحان کے دوست شاہ ہیزام نے اسے اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ اور موقع کی موزونی کے لحاظ سے اس کی دولت و قوت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ بادجو دیکھ متعدد حملہ آوروں نے اس پر چڑھائی کی اور یہ شہر کئی مرتبہ لٹا اور برباد ہوا لیکن یہ تباہی ہر دفعہ عارضی ثابت ہوئی وہ بکڑا بکڑا کر بنا اور اڑاڑا کر رہا۔ اور ہر دفعہ پہلے سے بھی زیادہ رونق کے ساتھ آباد ہوا۔ اوس کی یہ رونق و عظمت حد درجہ عجیبہ کے زنا تک قایم رہی۔ ۹۱۰ء میں فیچر مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ نہر تیر کے افتتاح سے اس کی تجارتی اہمیت بالکل کم ہو گئی۔ آج کل اس کا نام متوری اور اس کی آبادی ۵۰۰۰۰ ہے۔ مترجم

۱۱۰۰ء میں کھان کا سب سے قدیم شہر اس کی اہمیت اور عظمت کا راز اس کے جغرافیائی موقع میں پوشیدہ تھا۔ یعنی اوس شاہراہ پر واقع تھا جو تھوکر شام سے ملائی تھی۔ یہ شہر ۱۱۰۰ء میں مسلمانوں کو قبضہ میں آیا جنہوں نے اس کا نام غزہ رکھا۔ آج بھی اس کا یہی نام ہے اور اس وقت اس کی آبادی پندرہ بیس ہزار ہے۔ مترجم

باندہ کر شہر کے گرد اگر دھسیٹا گیا۔ اس کے بعد کسی کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ اہل مصر نے جنہیں ایرانی حکومت سے نفرت تھی یونانی حملہ آور کا بشتیاق تمام غیر مقدم کیا اور سرخون کا ایک قطرہ گرے بغیر اس کے ہاتھ اگیا۔ مصر کے انتظام میں سکندر نے اپنی مصلحتوں کو پیش نظر رکھا یعنی بڑے بڑے فوجی عہدے مقدونی افسروں کو دے دیے اور ملکی نظم و نسق کی باگ اپناے وطن کے ہاتھ میں رہنے دی۔

جب ایران پر آخری حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو سکندر جو پیٹیرامین دیوتا کے مندر کی جاترہ کو روانہ ہوا جو دوسومیل کے فاصلہ پر صحراے لبیا کے ایک خوش سوا و مرغزار میں واقع تھا۔ مندر کے غیب دان کاہن نے اسے یہ خوش خبری سنائی کہ تم اسی ہیکل کے دیوتا کی اولاد ہو جو سانپ کی شکل اختیار کر کے تمہاری ماں اولمپیاں کو اپنے تصرف میں لایا تھا۔ یہ خیال کہ بے باپ کے بھی اولاد ہو سکتی ہے اور یہ نتیجہ دیوتاؤں اور اودن عورتوں کی مصلحت سے مترتب ہوتا ہے جو اودن کی منظور نظر ہوں اس زمانہ میں اس قدر عام تھا کہ جو شخص اپنے اقربان و امثال میں غیر معمولی طور پر نمایاں اور سربرآوردہ ہوتا تھا آسمانی نسل سے سمجھا جاتا تھا اس قسم کے خیالات صد ہا سال تک لوگوں میں پھیلے رہے۔ چنانچہ رومۃ الکبریٰ کی نسبت عام طور سے یہ مشہور تھا کہ ایک دفعہ ایک کنواری لڑکی رومی سلویا نامی گھڑائے ہوئے پانی بھرنے کے لیے چشمہ پر جا رہی تھی کہ مارسس دیوتا کی اوس پر نظر پڑ گئی۔ دیوتا اس ددشیزہ پر عاشق ہو گیا اور اس عشق کا نتیجہ روڈیوس ہوا جس نے شہر رومہ کی بنا ڈالی۔ اگر کوئی شخص اس مہابت کے عجم ہونے میں شک لاتا تو خدا جانے اوس کی کیا گت بنتی۔ خود فلاطون کی نسبت یہ مشہور تھا کہ اوس کی ماں پیرکیٹونی کنواری تھی جسے اپنا لود دیوتا سے حمل رہ گیا تھا اور دیوتا نے ارشاد کیا کہ جس کے ساتھ پیرکیٹونی کی نسبت ٹھہری تھی فلاطون کے آسمانی نسب کا حال بتا دیا تھا۔

بانی فلاطون اشرافیت کے مصری تلامذہ کے سامنے اگر کوئی شخص اوس کی ابوت کو سامدی لاهل ہونے کے متعلق شبہ ظاہر کرتا تو اودن کی ناراضی کی کوئی انتہا نہ رہتی ”شاہ اسکندر ابن

جو پیٹر ایمن کے القاب کے ساتھ جب سکندر کے احکام و فرامین جاری ہوئے تھے تو شام اور مصر کے باشندے اونہیں اوس انتہائے تعظیم و توقیر کی نظر سے دیکھتے تھے جس کا ج کل صحیح اندازہ ہونا مشکل ہے۔ لیکن آزاد خیال یونانی اس آسمانی نسبت کی اصل قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اولیاس جس سے زیادہ روشنی اس معاملہ پر اور کوئی نہ ڈال سکتا تھا ازراہ مزاج کہا کرتی تھی کہ ”بہتر ہو اگر سکندر مجھ سے اس فضیلت سے معاف رکھے تاکہ جو پیٹر کی نبی کے ہر وقت کے رقیبہ عطیش و غضب سے تو بچی رہوں“ مقدونیہم کے وقایع نویس ایرن کا بیان ہے کہ سکندر کی یہ کوشش کہ اوس کا ربانی الاصل ہونا اوس کی رعایا کے ذہن نشین ہو جائے قابل ملامت نہیں قرار دی جاسکتی اور نہ اس سے اوس پر کوئی بڑا الزام عاید ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی تاویل باوی النظرین یون ہو سکتی ہے کہ اوس کا مطلب اس کوشش سے اس سے زیادہ نہ تھا کہ اوس کی فوج پر اوس کا زیادہ رعب اور اقتدار قائم ہو۔

جب سب انتظام خاطر خواہ ہو چکا تو سکندر شام کو واپس آیا اور اپوزشکر کے ساتھ جس میں اب پچاس ہزار جنگ آزمودہ اور قواعد و ان بہادر موجود تھے مشرق کا رخ کیا۔ دریائے فرات کو عبور کر کے وہ کوہستان میسیا کے دامن و امن سفر کرتا رہا تاکہ مسوپوٹیمیا کے جنوبی سیدانوں کی شدید تہارت سے پناہ لے۔ اس رستہ کے اختیار کرنے میں ایک یہ فائدہ بھی تھا کہ گھوڑوں کے لیے چارہ باقراطل سکا۔ دجلہ کے بائیں کنارے اربلا کے قریب اوس کا مقابلہ گیارہ لاکھ کے اوس عظیم الشان لشکر سے ہوا جسے آراہل سے لایا تھا۔ ایرانیوں کو باوجود کثرت تعداد شکست ہوئی اور اون کا بادشاہ مارا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدونیہ سپہ سالار اون تمام ممالک پر قابض ہو گیا جو دریائے ڈینیوب اور آندس کے درمیان واقع تھے۔ اس کے بعد سکندر نے اپنی فتوحات کو دریائے گنگا تک وسعت دی جو مال و متاع اوس کے ہاتھ آیا وہ قیاس و شمار سے باہر ہے ایرن لکھتا کہ ایک فقط متوسا

میں اسے چپاس ہزار ٹیلنٹ کی رقم ملی۔

زمانہ حال۔ کے فن حرب میں جس شخص کو دستگاہ حاصل ہے وہ ان حیرت انگیز فوجی کارناموں کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آبنائے ہلیک پانٹ کا عبور۔ عظیم کی مزاحمت کے باوجود دریائے کرتیکس کا مردہ موسم سرما میں مفتوحہ ایشیا ڈکوچک کی تنظیم و تسبیح۔ بحرِ روم کے شامی ساحل کے کنارے کنارے فوج کے سینہ و قلب کی بغاوت۔ طائر کے محاصرہ کی مشکلات صعب کا حل۔ شہر غازہ کی تسخیر۔ یونان سے ایرانی سلسلہ تعلقات کا انقطاع۔ بحرِ روم سے ایران کے جنگی بیڑے کی بے دخلی۔ ایتھنس یا اسپارٹا والوں کو رشوت دے کر مقدونیہ کے برخلاف ابھارنے کے متعلق ایرانیوں کی مستمر حکمت عملی کا ٹوٹ۔ مصر کی فتح اور ایک اور موسم سرما گزار کر اوس کے ملکی و فوجی انتظام کی تکمیل۔ آئندہ موسم بہار میں کل فوج کا بحیرہ اسود اور بحیرہ قلزم کی متخالف سمتوں سے کوچ کر کے مسوپوٹیمیا کے شہرہ زار میدانوں میں اجتماع۔ تھبساکس کے شکستہ پل پر بید مجنون سے ڈھکے ہوئے کناروں والے فرات سے گذر کر دریائے دجلہ کا عبور۔ اربیل کی عظیم الشان اور یادگار زما جنگ سے پہلے مشینہ طلایہ گری۔ میدان جنگ پر ترچھی سمت میں فوج کی نسل و حرکت۔ قلبِ عظیم پر ترکتاز (اور یہ وہ چال ہے جس کی تقلید صد سال بعد آسٹریلینز کے میدان جنگ پر کی گئی)۔ شہنشاہ ایران کا ان تھک اور سرگرم تعاقب۔ یہ تمام ایسے کارنامے ہیں جنکے لحاظ سے زمانہ مابعد کا کوئی سپر ہالامیکسڈر پر فوقیت نہیں لے گیا۔

اس طور پر یونانیوں کی دماغی تحریک کو بہت بڑی تقویت پہنچی۔ یونان میں ایسے ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے مقدونی فوج کے ہمراہ دریائے ڈیئوب سے لے کر تباہ رود نیل اور رود نیل سے لنگا کے میدانوں تک سفر کیا تھا۔ ممالک آن روئے بحیرہ اسود کی برہنہ ہواؤں سے اون کا مغز استخوان تک بھجھ ہوا تھا اور مصری صحراؤں کی آتش بار اور ریگ افشان لوؤں نے اون کے چہرہ وں کو بھلسا تھا۔ مقرر کے اہرام جنہیں کھڑے کھڑے

میں صدیان گذر چکی تھیں۔ لکسار کے مخروطی مینارجن پر مقرر قدیم کے راز بخط تصویر منقوش تھے قطار اندر قطار ابو الہول جو اسرار انگیز خموشی کا مرقع تھے۔ اون فرمانرواؤں کے دیو ہیکل مجسمے جنہوں نے صبح آفرینش کے طلوع کے وقت زمام حکومت ہاتھ میں لی تھی۔ یہ تمام عبرت افزا منظر اون کے پیش نظر ہو چکا تھا۔ ایسر ہیڈن کے عالیشان ایوانوں میں وہ اسیر یا کے اون قدیم بادشاہوں کے تختوں کے سامنے کھڑے ہو چکے تھے جسکے چہروں سے جلال و رعب ٹپکتا تھا اور جن کے عاجب و محافظہ پر دار سائند تھے۔ بابل کی شہر پناہ جس کا دور کسی زمانہ میں ساٹھ میل سے اوپر تھا اور جو دین صدیوں اور تین حملہ آوروں کی تاخت و تاراج کے انشی فٹ بلند تھی ابھی تک قائم تھی۔ بعل کے سر فلک مند کے ٹھنڈے زبان حال سے پکار پکار کر اس کی گذشتہ عظمت و شوکت کی شہادت دے رہے تھے اور اس کی چھت پر وہ رصد گاہ موجود تھی جس میں کالدیہ کے اختر شمار بیت دان راقون کو بیٹھ کر عالم بالا کی روشنی و تابناک ہستیوں سے ہم کلام ہوا کرتے تھے۔ ابھی تک فرمانروایان بابل کے دو مہلکوں اور اون شہرہ آفاق معلق باغات کے آثار باقی تھے جن کے تساو درختوں کو دیکھ کر یہ دہو کا ہوتا تھا کہ غضائے بسیط میں اُگے ہوئے ہن اور جن کلون کے ذریعہ سے ان باغوں میں دریا کا پانی پہنچایا جاتا تھا اون کے ٹوٹے پھوٹے نشان بھی ابھی تک موجود تھے۔ اس شہر میں جو مصنوعی جھیل نہروں اور نالیوں کے ایک کثیر التعداد اور بیچ در بیچ سلسلہ کے ساتھ بہ زمانہ سابق تیاری کی گئی تھی وہ کوہستان آرمینیا کی گھلی ہوئی مرغ سے لبریز رہتی تھی اور دریا سے فرات کا پانی اس انداز سے باندھا گیا تھا کہ نہروں کے ذریعہ سے جو پانی شہر میں جاے وہ زاید از ضرورت بہاؤ کا سد باب کر سکے۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب و غریب شاید وہ سرنگ تھی جس کے ذریعہ سے دریا سے فرات کے نیچے سے آمد و رفت ہوتی تھی۔

کالدیہ اسیر یہ اور بابل کے حیرت افزا اور عظیم الشان آثار تو نہایت ہی قدیم تھے یہاں تک کہ اون کے آغاز پر زمانہ کی رات کا سیاہ پردہ پڑا ہوا نظر آتا ہے لیکن ایران



بھی زمانہ مابعد کے عجائبات سے خالی نہ تھا۔ پرسیپس (اصطخر) کے ستون دار ایوانوں کو صنایع کا عجاز خانہ کہنا چاہیے جن میں کندہ کاری بت تراشی مینا کاری کے نفیس و پاکیزہ نمونے۔ سنگ مرمر کی سلون کے کتب خانے۔ مخروطی مینار۔ ابوالہول اور دیو پیکر سائنڈ ترمیم سے آراستہ تھے۔ اکبتا ناما جداران ایران کا ایلاق یعنی موسم گرما بسر کرنے کا مقام تھا۔ اس شہر کے گرد اگر دسات فصیلین ترشے ہوئے اور مجلاتھیر کی تھیں۔ ہر اندر کی فصیل باہر کی فصیل سے اونچی ہوتی جاتی تھی۔ فصیلین جو سب سے سارہ کی تنجی مناسبت سے تیار کی گئی تھیں رنگ میں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ شاہی محل کی چھت چاندی کی اینٹوں کی تھی اور شہر تیرین پر سونے کے پتروں کا نخل چڑھا ہوا تھا۔ آدھی رات کو جب روغن نفط کی مشعلوں سے محل میں چراغان کیا جاتا تھا تو جگہ جگہ کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ آفتاب کی روشنی کا سامان آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔ شہر کے وسط میں ایک پر فضا باغ جوشا بان مشرق کی دلفریبوں کا سب سے بڑا سامان ہے لگایا گیا تھا۔ غرض سلطنت ایران ہیلت پانٹ سے لے کر انڈس تک گزرا عالم نبی ہوئی تھی۔

ہم نے ان حیرت افزا فتوحات کے حالات کا ذکر بالتفصیل اس لئے کیا ہے کہ حربیات میں جو ترقی یونانیوں نے ان کی وجہ سے کی وہ اسکندریہ میں ہندسہ و ریاضی اور فنون علمی کے ان دارالعلوم کے قیام کا باعث ہوئی جو سائنس کا مبداء و منشار ہیں۔ اگر سلسلہ پہلے سہ سرائے لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہماری تمام صحیح معلومات کا ماخذ اصلی یہی مقدونوی فتوحات ہیں۔ ہیپوٹ نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان جب کا رگاہ ہستی کی نبی اور عظیم الشان قوتوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے قواسم دماغی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ سکندر کے سپاہیوں اور ہمراہیوں کو ہر منزل پر غیر مترقب اور دلفریب مناظر دکھائی دئے۔ دنیا کی تمام قوموں میں یونانیوں کی قوت مشاہد سب سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور جو کچھ وہ دیکھتے تھے اس سے بہت جلد اور بدرجہ غایت متاثر ہو جاتے تھے۔ ایک جگہ اگر وہ نہیں

غیر محدود ریگستان نظر آئے تو وہ سرے مقام پر ایسے پہاڑ دکھائی دئے جنگی چوٹیاں بادلوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ صحراؤں میں ادھنیں سراب نے دھوکا دیا تو دامن کوہ میں مبارقہ بارادلوں کے مہیب اور دیوہیکل سایہ نے اپنے بھے میں ڈالا۔ غبرین خراسانوں اور زمر دین سرود و صنوبر کی سیر کرتے ہوئے وہ جھاؤ اور ہندی کی سرزمین میں پہنچے۔ اربیلہ کے میدان میں ادھنیں ہندوستان کے سدھے ہوئے جنگی ہاتھیوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ تاجرہ خزر کے ساحل کے جنگل میں اون کی بلنار کی دھمک نے شیر بر کو بیدار کیا۔ ایسے ایسے جانوروں کے دیکھنے میں آئے جو یورپ کے جانوروں کے مقابلہ میں نہ صرف عجیب الخلق بلکہ براتب عظیم الجثہ تھے۔ گینڈا۔ اونٹ۔ دریائی گھوڑا۔ قیل و گنگا کے نہنگ اون کے لئے بمنزلہ عجائبات تھے۔ ایسی ایسی قوموں سے اون کی ٹرائیاں ہوئیں جو شکل و شمائل اور وضع قطع میں اون کے بالکل مختلف تھیں۔ کبھی وہ سیاہ فام افریقی سے بزد آزا ہوئے اور کبھی سانولے شامی اور گندم رنگ ایرانی سے اونہی بڈ بھیر ہوئی۔ خود سکندر کی نسبت یہ واقعہ مشہور ہے کہ بستر مرگ پر پڑے پڑے وہ اپنے امیر البحر تیارکس سے اوس کے دریائی سفر کی دلچسپ سرگزشت سن سن کر جی بہلایا کرتا تھا جو اوس نے دریائے انڈس سے خلیج فارس تک کیا تھا۔ سکندر نے جب اول اول دریائے مد و جز کو دیکھا تو اوسے بہت حیرت ہوئی۔ اوسے یہ خیال تھا کہ تاجرہ اسود اور تاجرہ خزر بھی بحر احمر اور بحر فارس کی طرح جیسا کہ تیارکس نے دریافت کیا تھا کسی بڑے سمندر کی خلیجیں ہوں گی۔ چنانچہ اس قیاس کو پایہ تحقیقات پر پہنچانے کے لئے اوس نے جہاز تیار کرائے تھے۔ اوس کا بھی ارادہ تھا کہ اوس کے جہازوں کا بیڑہ افریقہ کے گرد اگر د چکر لگاتا ہوا آجائے جبل الطارق میں سے ہو کر بحر روم میں داخل ہو جائے۔ اور یہ خیال اوس کے ذہن میں اس قدیم روایت نے پیدا کیا تھا کہ یہ ہم ایک بار فراعنہ کے زمانہ میں طے ہو چکی تھی۔

مالک مقننہ کے بہت سے غرایب و نادر ایسے تھے جنہوں نے نہ صرف بڑے سے

بڑے بہادران یونان بلکہ اعلیٰ ترین حکماء یونان کو محیرت کر دیا۔ کیکسٹھینیز کو بابل میں مسلسل ایک ہزار نو سو تین سال کے کلدانی مشاہدات اجسام فلکی ہاتھ لگے جو اوس نے ہدیہ ارسطو کی خدمت میں بھیج دئے۔ چونکہ یہ رصدی نتایج پختہ اینٹوں پر ثبت تھے اس لئے یہ ممکن ہے کہ اون کے دوسرے نسخے آنا قدیمہ کے تلاش کرنے والوں کو سریانی سلاطین (خرشتی کتب خانوں میں سے مل جائیں۔ مشہور مصری ہیئت دان پطلمیوس کو ایک بابلی جدول ہاتھ لگی تھی جس میں ۱۸۰۰ قبل مسیح سے لے کر اوس وقت تک کے مشاہدات کسوف و خسوف کے نتایج مندرج تھے۔ ان نتایج میں سے جو ہم تک پہنچے ہیں بعض کی محققانہ تنقید کے لئے ضرور ہے کہ ایک عرصہ دراز تک نہایت وقت نظر اور تسلسل سے رصد بینی کی گئی ہو۔ بابلی مہندسوں نے سال انقلابی کی جو مدت قایم کی تھی وہ زمانہ حال کی متعقہ مدت سے فقط ۲۵ ثانیہ کم ہے اور سال کو کبھی کی مدت کا اندازہ اصلی مدت سے صرف بقدر دو دقیقہ کے زیادہ ہے۔ استقبال نقاط اعتدال یس و نہار کا بھی اون کو علم ہو چکا تھا۔ کسوف و خسوف کے اسباب

لے ارسطو کا بھتیجا اور شاگرد اسکندر کا ہم سبق تھا۔ ستر سال قبل پیدا ہوا۔ اور ۱۸۰ سال بعد اپنی صاف گوئی کو باعث سکندر کو حکم موت کیا گیا۔ مترجم

۱۸ سال انقلابی سے مراد وہ زمانہ ہے جو زمین کو منطقت البروج کے کسی ایک نقطہ مثلاً نقطۂ اعتدال صیفی یا نقطہ اعتدال شتوی سے روانہ ہو کر پھر اوس نقطہ تک پہنچنے میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس کی مدت ۳۶۵ ر ۲۲ ۲۶ یوم شمسی ہے۔ مترجم

۱۸ سال کو کبھی سے مراد اون دو حالتوں کا درمیانی فصل ہے جبکہ زمین آفتاب اور کوئی ایک ستارہ ایک ہی ہیئت میں پائے جائیں۔ اس فصل کی مدت ۳۶۵ ر ۲۵ ۶۳۸ یوم شمسی ہوتی ہے۔ مترجم

۱۸ زمین جو کبھی کامل کرہ نہیں ہے لہذا جس محور پر یہ اپنے گرد گھومتی ہے وہ اس کے مدار کی جانب جھکا ہوا ہے اور اسی لیے وہ بڑے دایرے جو مدار ارض اور خط استوا کی سطوح کے تقاطع سے افلاک میں پیدا ہوتے ہیں ایک دوسرے کو دو نقطوں پر قطع کرتے ہیں جن کا نام نقاط اعتدال (بقیہ ضمیمہ صفحہ آئندہ)

وہ دریافت کر چکے تھے اور اپنے مجوزہ دور کی مدد سے جس کا نام ادن کی اصطلاح میں سیرس تھا وہ ان کے اوقات وقوع کی نسبت پیشین گوئی کر سکتے تھے۔ اس دور کی مدت اونہون نے ۶۵۸۶ دن سے کچھ زیادہ قرار دی تھی اور یہ مدت اصلی مدت سے فقط ساڑھے اُنیس دقیقہ کم ہے۔

ان واقعات سے اس بات کا ناقابل تردید ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ مسو پٹیمیا میں فن ہیئت کو نہایت استقلال اور قابلیت کے ساتھ ترقی دی گئی تھی اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اوس زمانہ میں آلات رصد نہایت ہی ناقص اور غیر مکمل تھے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیوں کر اونہون نے اس فن میں ایسا کمال حاصل کر لیا۔ ان قدیم علماء ہیئت نے کو اکب کی ایک ذہرت تیار کی تھی منطقۃ البروج کو بارہ برجوں میں تقسیم کیا تھا۔ دن اور رات کے بارہ بارہ گھنٹے مقرر کیے تھے۔ ارسطو کا بیان ہے کہ اونہون نے بہت کچھ وقت احتجاب کو اکب کی تحقیقات میں جو چاند کے حایل ہونے کے باعث واقع ہوتا ہے صرف کیا تھا۔ ادن کو نظام شمسی کی ترکیب کا صحیح صحیح علم تھا اور وہ سیاروں کے مقامات کے اعتبار سے تغیرات کی ماہیت سے بھی واقف تھے۔ دھوپ گھڑی۔ پانی کی گھڑی۔ اصطلاب اور دھوپ گھڑی کا کائنات ادن کی ایجاد ہے۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) لیل و نہار ہے۔ ان فلکی دوائر میں سے ایک کا نام منطقۃ البروج ہے اور دوسرے کا دائرہ استواء ہے۔ دونوں نقطے منطقۃ البروج کے گرد آہستہ آہستہ گھومتے ہیں لیکن یہ گردش بلحاظ نوعیت موجب نہیں ہوتی بلکہ سائبہ ہوتی ہے۔ اور اسی کا نام نقاط اعتدال لیل و نہار کا استقبال یا استقبال اعتدالین ہے۔ اس کی وجہ سے دائرہ استواء کے قطب کو منطقۃ البروج کے قطب کے گرد گردش کرنی پڑتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین کا محور ایک شکل بیضاوی بنانا ہے جس کا محور منطقۃ البروج کے قطب میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اس گردش کا زمانہ ۲۵۸۰۰ سال ہے۔ گویا استقبال اعتدالین کا سالانہ اوسط ۵۰۲ ثانیہ ہے۔ مترجم

لے قرآن ثوابت یا سیار اور آفتاب کے درمیان حایل ہو جانا۔ مترجم

اون کی چسپائی کا طریقہ بھی جس کا حال اس وقت کے موجودہ نمونوں سے ظاہر ہوتا ہے خالی از ہنر نہ تھا۔ جو کچھ چھاپنا ہوتا تھا ایک گردش کرنے والے بیلن پر شراخی حروف میں کندہ کر دیا جاتا تھا اور اس بیلن کو نرم گلی مٹی کی اینٹوں پر پھیر دیا جاتا تھا جس سے بیلن کے حروف اینٹوں پر اُبھر آتے تھے اور پھر نہ مٹ سکتے تھے۔ ان کی اینٹوں کی کتابیں ابھی تک ہماری معلومات متعلقہ ادب و تاریخ میں بہت کچھ اضافہ کرنے والی ہیں۔ مناظر و مریا کو اصول سے بھی وہ بے خبر نہ تھے۔ مقام نمرود میں جو شیشہ محراب برآمد ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی چیز کو بڑا کر کے دکھانے والے آلات کی ماہیت بھی جانتے تھے۔ فن حساب میں وہ مراتب اعداد کی قیمت سے واقف ہو چکے تھے لیکن ہندوستان کی ہتم بالشان ایجاد صفر اون سے چھوٹ گئی تھی۔

ان واقعات نے کشور کش ایرانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ آج تک تجربہ اور مشاہدہ سر اونہوں نے کام نہ لیا تھا۔ اون کا سب سے بڑا عقلی کارنامہ اون کے تخیل کی شاعرانہ بلند پروازی تھی اور بس۔

یونانیوں کی دماغی ترقی کو جس کے محرک ایک حد تک فطرت کے وسیع مشاہدات ہوئے مبالغہ مفتوحہ کے مذاہب کی واقفیت سے بہت بڑی تقویت پہنچی۔ یونان کی بت پرستی کو ایران نے ہمیشہ نفرت و کراہیت کی نظر سے دیکھا تھا۔ چنانچہ جب کبھی فرمان روا یا ان ایران نے یونان پر فوج کشی کی تو یونانی مندرون کو انہدام اور اون کے بہائم صفت دیوتاؤں کی تذلیل و توہین کا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جب اس قسم کی توہین و تذلیل کی پاداش میں دیوتاؤں کی طرف سے کوئی آفت ایرانوں پر نازل نہ ہوئی تو لوگوں کی اس عقیدت میں جو اپنی معبودوں کی طرف سے اون کے دیوان میں جاگزین تھی ترزلزل واقع ہو گیا اور یونانی مذہب کی جڑھ کھوکھلی ہو چلی۔ اولپس کے اون ناپاک دیوتاؤں کے پجاری جن کی فحش کاریاں ہر پاکباز شخص کے اندام القہر پر لرزہ طاری کرنے والی تھیں اب ایسے ہتم بالشان اور

مجیدہ و متین مذہب سے دوچار ہوئے جس کی بنیاد فلسفہ پر رکھی گئی تھی۔ ہر اوس سلطنت کی طرح جس کی مدت حکومت طویل ہوتی ہے ایران میں بھی متعدد مذہبی انقلابات واقع ہو چکے تھے۔ اول اول اوس نے زردشت کا موحدانہ مسلک اختیار کیا۔ وحدانیت کے بعد ثنویت کا دور آیا اور ثنویت کی جگہ جوہیت نے لے لی۔ مقدونی فوج کشی کے وقت اہل ایران کے عقاید یہ تھے کہ ایک عقل کل تمام کائنات کی خالق محافظ اور حکمران ہے جو راستی کا پھر پاک اور صداقت و خیر کا سرچشمہ ہے۔ اس کا درجہ ہوتا کو کسی بت یا تصویر کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ اور چونکہ اس دنیا سے دنی میں ہر شے دو متخالف قوتوں کے آثار کی دو گونہ منظر ہے لہذا قاعدہ طلاق کے ذریعہ فرمان دو ہوزن و ہوزاد ازلی وابدی طاقتیں ہیں جنہیں استعارۃً نور و ظلمت کہہ سکتے ہیں۔ یہ دونوں طاقتیں ایک ایسی کش کش اور زور آزمائی میں مصروف ہیں جسکی کوئی انتہا نہیں۔ عالم ان دونوں کا عرصہ کارزار اور انسان ان کا مال غنیمت ہے۔

ثنویت کی قدیم روایات میں مذکور تھا کہ بدی کی طاقت (اہرمین) نے ایک سانپ کو اس کام پر مامور کیا کہ نیکی کی طاقت (یزدان) کے بنائے ہوئے بہشت کو جاکر تباہ کر ڈالے۔ یہی روایات یہودیوں کو اوس زمانہ میں معلوم ہوئیں جب وہ بابل میں قید کے دن کاٹ رہے تھے۔

جس طرح نور اور سایہ لازم و ملزوم ہیں اسی طرح عنصر خیر و عنصر خیر کا مستلزم ہے۔ اس دنیا میں جس کا خالق اور حکمران خیر مطلق ہے شر کی توجیہ اگر کی جاسکتی ہے تو صرف اسی طریقہ سے۔ عنصر خیر و عنصر شر یعنی یزدان و اہرمین میں سے ہر ایک کے ماتحت جو سیون کے عقیدے کے بموجب فرشتے اور وزیر اور فوجیں بھی تھیں۔ اس مسلک کی رو سے ہر نیک انسان کا فرض ہے کہ راستی پاکبازی اور محنت کے اصول اختیار کرے۔ اوسے یقین رکھنا چاہئے کہ اس کا لبد خاکی کی قید سے آزاد ہونے کے بعد اوسے عالم حق میں زندگی عطا ہوگی اور وہ اسی جسم سے

اٹھے گا اوس کی روح کو بقا سے ابدی حاصل ہوگی اور وہ فہم و ادراک کی نعمتون سے مستفیض ہو کر حیات اخروی بسر کرے گا۔

سلطنت کے دور اخیر میں موسیٰ عقاید زردشتی عقاید پر بتدیج بہت کچھ غالب آگئے تھے۔ جو سیت دراصل پرستش عناصر تھی۔ ان میں سے آگ کو خدا سے برتر کی نیابت کا حق سب سے زیادہ حاصل تھا۔ اون کے آتشکد دن میں جو بجائے مسقف مندروں کو زیر ساقایم کئے جاتے تھے ہمیشہ آگ روشن رہتی تھی اور آفتاب بوقت طلوع انسانی پرستش کا مقعد اعظم سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح بادشاہ کے ہوتے ہوئے اور کسی پر نظر نہیں پڑ سکتی اسی طرح آفتاب کی موجودگی میں باقی تمام اجرام فلکی نظر سے غائب ہو جاتے ہیں اور مستحق عبادت نہیں سمجھے جاسکتے۔

سنہ ۳۲۶ ق م میں سکندر اپنے بڑے بڑے منصوبوں کو ادھورا چھوڑ کر ۳۳ سال کی عمر میں بمقام جاہل انتقال کر گیا۔ بعض لوگوں کو اوس کی قبل از وقت موت سے یہ شبہ ہوا کہ وہ نہروں سے کر مار ڈالا گیا ہے۔ اوس کی طبیعت ایسی چڑچڑی اور اوس کا مزاج ایسا بے قابو ہو گیا تھا کہ اوس کی فوج کے بڑے بڑے افسر یہاں تک کہ اوس کے بے تکلف دوست اوس کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کلاسٹس کو جو اوس کا رضاعی بھائی اور ساتھ ساتھ کھیل بھائی اور دوست تھا اوس نے حالت غیظ و غضب میں خنجر بھونک کر مار ڈالا۔ کیستھیننر کو جو اوس کے اور آرسطو کے درمیان علمی واسطہ تھا اوس نے سولی دلوادی یا جیسا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے اول شکنجہ میں جکڑ کر انواع و اقسام کے عذاب میں مبتلا کیا اور اوس کے بعد مصلوب کیا۔ ایسی حالت میں بعید از قیاس نہیں کہ محض اپنی جان بچانے کے خیال سے اوس کے گرد و پیش کے لوگوں نے اوس کے قتل کی سازش کی ہو۔ آرسطو کی بھی اس سازش میں شرکت بیان کی جاتی ہے لیکن یقیناً یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ آرسطو طرح طرح کی عقوبتوں کے ساتھ سوبار مرنا قبول کرتا لیکن ایسے سنگین جرم کے ارتکاب کے معین

ہونے کا ہرگز روادار نہ ہوتا۔

اسکندر کی آنکھیں بند ہوتے ہی غورنری اور خانہ جنگی کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جو کئی سال تک فرو نہ ہوا اور اوس وقت بھی جبکہ اوس کے افسران فوج نے سلطنت کے حصے بخرے کر لیے اور ہر ایک نے ایک نئی اور خود مختار بادشاہت قائم کر لی اس فساد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس طوفان بے تمیزی میں جو قصے قصے پیش آئے اون میں سے صرف ایک واقعہ ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ بطلمیوس ارستینو نامی ایک حسینہ و جمیلہ خواص کے بطن سے شاہ فیاقوس کا بیٹا تھا اور اس لحاظ سے گویا اسکندر کا علاقائی بھائی ہوتا تھا۔ پچپن میں ایک دفعہ باپ نے ظاہر کردہ دونوں کو جلا وطن کر دیا۔ اور اوس وقت سے وہ برابر اسکندر کے ہمراہ رہا۔ کوئی ایسی جنگ یا ہم نہ تھی جس میں اوس نے اسکندر کا ساتھ نہ دیا ہو۔ وہ اول مصر کا گورنر اور بالآخر مطلق العنان فرمانروا ہو گیا۔

رد دس کے محاصرہ کے وقت بطلمیوس نے وہاں کے باشندوں کی ایسی گران بہا مدد کی کہ اونہوں نے فرط امتنان سے اوس کی تعظیم و تکریم دیوتاؤں کے برابر کی اور اوسے سوٹریئے نجات دہندہ کا لقب دیا۔ مصر کے سلسلہ مقدونیہ کے فرمانروایان مابعد سے اوس کو یہی لقب ممتاز کرتا ہے۔

بطلمیوس سوٹرنے بجائے اون شہروں کے جو سابق میں مصر کا پایہ تخت رہ چکے تھے اپنا دار الحکومت اسکندریہ میں قائم کیا۔ جو پٹریمین کے مندر کو جاتے وقت اسکندر نے اس شہر کی بنیاد یہ سمجھ کر ڈالی تھی کہ موقع کے لحاظ سے یہ شہر یورپ اور ایشیا کی تجارت کا مرکز اتصال ہو سکے گا۔ یہ امر خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نہ خود اسکندر نے بہت سے یہودیوں کو فلسطین سے لاکر یہاں آباد کیا اور نہ صرف بطلمیوس سوٹرنے اور ایک لاکھ یہودیوں کو یورشلم کے محاصرہ کے بعد یہاں لایا بلکہ اوس کے جانشین فلطین نے بھی ایک لاکھ اٹھانوے ہزار یہودی غلاموں کو اون کے مصری آقاؤں سے معقول زر فدیہ



ادا کر کے آزاد کرادیا۔ ان تمام یہودیوں کو وہ تمام مراعات و حقوق عطا کئے گئے جو خود مقدونیوں کو حاصل تھے۔ اس لطف و انصاف کے برتاؤ کی وجہ سے کثیر التعداد یہودی اور بہت سے اہل شام برضا و رغبت خود آکر مصر میں آباد ہوتے گئے۔ ان لوگوں کو یونانی یہودیوں کا امتیازی لقب عطا کیا گیا۔ سوٹر کی فیاض اور مہربان حکومت کا شہرہ سن کر بیشمار یونانیوں نے بھی مصر کو اپنا ملجا و ماوا بنالیا اور پرڈیکا س اور انٹیگونس کے جملوں سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ یونانی سپاہی دوسرے مقدونی سپہ سالاروں کی اطاعت سے سخن ہو کر سوٹر کی فوج میں آملنے کے لئے یہ آمادگی تمام تیار ہیں۔

اس اعتبار سے اسکندریہ میں گویا تین مختلف قوموں کے لوگ آباد تھے یعنی دیسی مصری۔ یونانی اور یہودی۔ اور یہ وہ واقعہ ہے جس کا اثر موجودہ یورپ کے مذہبی عقاید میں صاف نظر آتا ہے۔

یونانی سمارون اور انجیرون نے اسکندریہ کو اپنی صنعت کے زور سے دنیا سے قدیم کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر بنا دیا تھا۔ عالیشان محلوں خوش نما مندروں اور دل آراتماشگاہوں سے شہر کا کوئی حصہ خالی نہ تھا۔ وسط میں دو وسیع سایہ دار ٹرکون کے مقام اتصال پر جو ایک دوسرے کو زادیہ قایمہ پر قطع کرتی تھیں چمنون فواروں اور مخروطی میناروں کے درمیان وہ شاندار مقبرہ کھڑا تھا جس میں مصریوں کی رسم کے موافق اسکندر کی حنوط آلودہ نعش محو آرام تھی۔ سکندر کا جنازہ نہایت طمطراق اور شکوہ و جلال کے ساتھ دو سال کے ماتمی سفر کے بعد بابل سے لایا گیا تھا۔ اول اول تابوت طلایے خالص کا تھا لیکن چونکہ اس کی وجہ سے مقبرہ کو بناشون کی دستبرد کا مقدمہ سہنا پڑا لہذا بجائے طلایے احمر کے تابوت سنگ مرمر کا بنا دیا گیا۔ لیکن نہ تو فن تعمیر کے یہ نظرافروز اور دلغریب کرشمے اور نہ سفید سنگ مرمر کا وہ عظیم الشان مینارہ روشنی ہی ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا تھا اور اس قدر بلند تھا کہ وہ آگ جو ہر وقت

اس کی چوٹی پہ چلتی رہتی تھی جہازوں کو میلون سے نظر آتی تھی۔ متحدہ ونوی فرما زوایان مصر کی اصلی حقیقی اور سب سے زیادہ شاندار اور امٹ یا دگار عجائب خانہ اسکندریہ ہے جس کا اثر دنیا میں اس وقت تک قائم رہے گا جبکہ اہرام مصر کی بنیادوں کے سنگریزے تک پس کر گردوزگار میں مل گئے ہوں گے۔

اس عجائب خانہ کی ابتدا بطليموس سوٹر کے عہد میں ہوئی اور اس کے بیٹے بطليموس فلیڈلفس نے اسے تکمیل کو پہنچایا۔ عجائب خانہ کی عمارت بروشنین میں واقع تھی جو شاہی محل کے نزدیک شہر کے اوس حصہ کا نام تھا جہاں امرا و اعیان دولت آباد تھے۔ یہ عمارت سنگ مرمر کی تھی اور اس کے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے تھے تاکہ لوگ ان میں جہل قدمی کرتے ہوئے مکالمہ کا لطف اٹھا سکیں۔ اس کے گردن میں جو سنگتراشی کی صنعت کو نمونے تھے فلیڈلفس کا کتب خانہ تھا اور چاروں طرف نہایت ہی حسین مجسمے اور دلربا تصویریں قرینہ سے سجائی ہوئی نظر آتی تھیں۔ بالآخر اس کتب خانہ میں چار لاکھ جلدیں جمع ہو گئیں اور جب رفتہ رفتہ مزید کتابوں کے رکھنے کی گنجائش باقی نہ رہی تو ایک نیا کتب خانہ اسی کے قریب مسرہ بیان یعنی سرسپس کے مندر میں قائم کیا گیا۔ اس دوسرے کتب خانہ میں جو پہلے کتب خانہ کا بچہ کہلاتا تھا آخر میں تین لاکھ جلدیں جمع ہو گئیں۔ اس حساب سے گویا ان دونوں شاہی کتب خانوں میں سات لاکھ کتابیں موجود تھیں۔

اسکندریہ فقط مصر کی پایۂ تخت نہ تھا بلکہ عقل و ادراک کے لحاظ سے تمام دنیا کا مرکز حکومت تھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں عقل مشرق اگر عقل مغرب سے ہم غوش ہوئی۔ یہ قدیم زمانہ کا پیرس ہر طرح کی نشاۃ الیکیزادہ بائینوں اور شلک آفرین آزاد خیالیوں کا نقطہ اتسال بن گیا۔ یہاں کی دلچسپ اور رنگین صحبتوں میں شریک ہو کر یہودیوں تک کے دلوں سے ولولہ حب وطن و جذبہ جوش قومی محو ہو گیا۔ انہوں نے اپنے آبا و اجداد کی زبان چھوڑ دی اور یونانی زبان اختیار کر لی۔

عجائب خانہ کے قیام سے بطلیموس سوٹرا اور اوس کے بیٹے فلیڈلفیس کے پیش نظر تین مقصد تھے:۔ (۱) علوم موجودہ کی بقا (۲) اس کی ترقی اور (۳) اس کی اشاعت۔  
(۱) علوم موجودہ کی بقا۔

سرکاری کتب خانہ کو صد مہم کو حکم دیا گیا کہ جو کتابیں مل سکین سرکاری خرچ سے خرید لی جائیں عجائب خانہ کا تون کی ایک جماعت اس خدمت پر مامور تھی کہ جن کتابوں کو مالک انہیں فروخت نہ کرنا چاہتے ہوں ان کی صحیح نقلیں کریں باشندگان ممالک غیر عرب کوئی کتاب مصر میں لاتے تھے تو وہ فوراً عجائب خانہ میں بھیج دی جاتی تھی اور نقل مطابق اصل ہونے کے بعد اصلی نسخہ کتب خانہ میں رکھ لیا جاتا تھا اور نقل مالک کتاب کے حوالہ کر دی جاتی تھی۔ بسا اوقات بیش قرار رقیب معاذ نہ یا ہر جانہ کے طور پر بھی دی جاتی تھیں۔ مثلاً بطلیموس یو جینیٹر کے عہد کا واقعہ ہے کہ شخص سے یورپیڈیز سفاقلس اور اسقلس کی تصانیف بہم پہنچا کر اوس نے ان کی نقول کو ساتھ پندرہ ہزار ڈالر ہر جانہ کے طور پر اصل نسخوں کے مالکوں کے پاس بھجوا دیے۔ شام کی مہم سے جب وہ واپس ہوا تو اکبتانا اور سوسا سے وہ تمام مصری یادگارین فتح و نصرت کے شاد دیا لے بجاتا ہوا ہمراہ لایا جنہیں کیتقاد اور دوسرے ایرانی حملہ آور مصر سے لوٹ کر لائے گئے تھے۔ ان یادگاروں کو اوس نے یا تو ان کے اصلی مقامات پر نصب کرا دیا اور یا اپنے عجائب خانوں کو سامان آرائش پر اضافہ کیا۔ جب کسی تصنیف کا نقل کے ساتھ ترجمہ بھی ہوتا تھا تو ایسا بیش قرار معاذ نہ دیا جاتا تھا کہ آج کل اوس کا یقین کرنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے چنانچہ بائبل کے نسخہ ”سیچوا جنٹ“ کے ترجمہ کے لیے جو بطلیموس فلیڈلفیس کے حکم سے ہوا اسی طرح کا گران قدر معاوضہ دیا گیا۔

(۲) ترقی علوم۔

عجائب خانہ اسکندریہ کے قیام کی ایک بہت بڑی غرض یہ بھی تھی کہ سرکاری خرچ کر ایک ایسی جماعت اشخاص کی کفالت کی جائے جو یہاں رہ کر اپنے آپ کو تحصیل علم کر لیے

وقف کر دیں۔ بسا اوقات خود فرمانروا سے وقت بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتا تھا چنانچہ ان غور و نوش کی صحبتوں کے لطایف کی روایتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ علمائے قیم عجائب کو بلجاظ تکمیل علوم و فنون ابتداءً چار طبقات میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی (۱) ادب (۲) ریاضی (۳) ہیئت اور (۴) طب۔ فروعی علوم کو باعتبار مناسبت ان میں سے کسی ایک کے ساتھ شریک کر دیا گیا تھا مثلاً علم حیوانات طب کی ایک شاخ قرار دیا گیا تھا۔ کسی سربراہ اور وہ عالم کو اس دارالعلم کے حاکم اعلیٰ کی خدمت دی جاتی تھی اور وہی اس کے جزو و کل کا انتظام کرتا تھا۔ اول اول اس عہدہ پر ڈیپٹی سیکریٹری کا تقرر ہوا جو کئی سال تک ایجنٹ کا گورنر رہ چکا تھا اور علم و فضل میں یکساں روزگار تھا۔ حاکم اعلیٰ کے ماتحت مہتمم کتب خانہ ہوتا تھا۔ اس خدمت پر بعض ایسے نامور اشخاص مقرر ہوئے جنہی فضیلت کی شہرت ہم تک پہنچی ہے۔ مثلاً ایراٹاسٹینز اور آبلوئس رودس۔

عجائب خانہ کے متعلق ایک باغ نباتات اور جانور خانہ بھی تھا۔ ان کا مقصد جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ تھا کہ نباتات و حیوانات کے حالات کے اکتشاف میں مدد ملے۔ ایک زندگاہ بھی قائم کی گئی تھی جس میں فلکی کرے۔ سادہ کرے۔ دوائر متعلقہ انقلابات۔ صیفی دشتوی۔ دوائر استوائی۔ اصطلاب۔ کوکب کے حقیقی و اعتباری مواقع کے مقیاس اور دوسرے مروجہ آلات ہیئت موجود تھے اور پیمائش کے آلات درجون اور درجے کے چھٹے حصوں میں منقسم تھے۔ رصدگاہ کے فرش پر ایک خط نصف النہار کھینچا ہوا تھا۔ وقت اور حرارت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اگرچہ آلات موجود تھے مگر ان کے نامکمل ہونے کے باعث صحیح اندازہ لگانے میں وقت پیش آتی تھی سیسبیل کی آبی گھڑی سے ٹھیک وقت دریافت نہ ہو سکتا تھا اور حرارت کے درجات کی دریافت کا یہی ایک

لے اسکندریہ کا ایک یونانی ہندس۔ پانی کھینچنے والی۔ آبی گھڑی اور سامنن یعنی خم دار نلی اس کی ایجاد کریں

اور اسی لیے وہ زیادہ تر مشہور ہے۔ مترجم

ذریعہ تھا کہ مائیات کے ذہن دریافت کرنے کا آلہ پانی کے کٹورے میں تیرتا رہتا تھا اور پانی کی لطافت، یا کثافت سے حرارت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ فلیڈلفس کو اخیر اخیر میں موت کی طرف سے سخت خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے بہت سا وقت کیر حیات کی تلاش میں صرف کیا۔ اس قسم کے مشاغل کے لیے عجائب خانہ میں ایک کیمیا خانہ قائم کیا گیا تھا۔ اس زمانہ کے مخالفانہ خیالات کے باوجود طب کے صیغہ کے متعلق علم تشریح کی تحقیقات کی غرض سے ایک کمرہ چیرنے پھاڑنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا اور اس کمرے میں نہ فقط مردوں کی بلکہ اون زندوں کی بھی چیر پھاڑ کی جاتی تھی جن کی نسبت کسی جرم سنگین کی پاداش میں مزاسے موت کا حکم ہو چکا ہوتا تھا۔

(۳) اشاعت علوم۔

عجائب خانہ میں معلومات انسانی کے ہر شعبے پر لکچر دئے جاتے تھے یا مسابختے ہوتے تھے یا درس و تدریس کا کوئی اور موزون طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ علوم و فنون کے اس عظیم نشان مرکز میں اطراف و اکناف عالم سے طالب العلم جوق جوق آتے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ اس دارالعلوم کے طلبہ کی تعداد چودہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ بعد میں کلیسا کے عیسوی تک کے بعض سربراہان و پشوا مثلاً کلیئس الگرنڈرینس آریجن اور آئینسٹینس یہین سے تعلیم پا کر نکلے۔

اس عجائب خانہ کے متعلق جو کتب خانہ تھا اسے جوئس سیزر نے محاصرہ اسکندریہ کے وقت جلا دیا۔ اس نقصان عظیم کی تلافی کے لیے مارک انٹونی نے یومینیہ شاہ پرگیمس کا جمع کیا جو اکتب خانہ نلکے کلیوٹرا کی نذر کیا۔ ابتداءً یہ کتب خانہ بطلمیوسی کتب خانہ کی ساقبت کے خیال سے قائم کیا گیا تھا۔ جب یہ کلیوٹرا کے ہاتھ لگا تو سریمیس کے کتب خانہ میں ضم کر دیا گیا

اب ہم کو مختصر یہ بیان کرنا باقی رہتا ہے کہ یہ بے نظیر دارالعلم جن کو قدما نے ازراہ فخر

”مدرسہ الہیہ اسکندریہ“ کا نام دے رکھا تھا کس فلسفہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا اور انسانی معلومات کے ذخیرے میں جن جن باتوں کا اس کی وجہ سے اضافہ ہوا اور ان میں سے بعض کی نوعیت کیسا تھی۔

ہمارا فرض ہے کہ اس بے مثال عجائب خانہ کے جلیل القدر بانی کی یادگار میں ہم ”تاریخ فتوحات اسکندر“ کو جو خود اسی کی تصنیف ہے تصانیف علمی کی صف اول میں جگہ دیں۔ بطلمیوس سوتر جس طرح ایک بہت بڑا سپہ سالار اور ایک بہت بڑا تاجدار تھا اسی طرح ایک بہت بڑا مصنف بھی تھا۔ زمانہ اون افسانہ کی یاد کو نہیں مٹا سکا جو اس نے ہم پر کیے ہیں مگر اس کی تصنیف کے ساتھ اس نے اچھا برتاؤ نہیں کیا اس لیے کہ ”تاریخ فتوحات اسکندر“ کا ایک بھی نسخہ آج موجود نہیں۔

سکندر بطلمیوس اور آرسطو کی باہمی دوستی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ فلسفہ مشائخہ عجائب خانہ اسکندریہ کا عقلی سنگ بنیاد قرار پائے۔ شاہ فیلقوس نے سکندر کی تعلیم و تربیت پر آرسطو کو مامور کیا تھا جس نے اپنا یہ اثر دکھایا کہ جب سکندر ایران کی تسخیر میں مصروف تھا تو باوجود انہماک مشاغل فوجی کے روپیہ کے علاوہ دوسرے طریقوں سے کتاب ”علم خواص الاشیا“ کی تیاری میں آرسطو کی مدد کرتا رہا جو اس وقت لکھی جا رہی تھی

آرسطو کے فلسفہ کا اصل اصول یہ تھا کہ جزئیات کے مطالعہ سے بذریعہ استقرا کلیات اخذ کیے جائیں جن واقعات و حقائق پر عمل استقرا کا انحصار ہے اور ان کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر یہ عمل زیادہ صحیح اور زیادہ ترین وثوق ہوگا۔ اس طریقہ سے بذریعہ تجربہ و مشاہدہ واقعات کے جمع کرنے میں بے انتہا محنت پڑتی ہے اور ساتھ ہی واقعات مجتمعہ سے نتائج نکالنے میں بہت کچھ غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ طریقہ گویا عقل و محنت پر مبنی ہے نہ کہ تصور و تخیل پر۔ خود آرسطو سے بے اوقات جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں وہ اس طریقہ کی بے اعتباری پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ اس کو معتبر ہونے کا

ثبوت دیتی ہیں۔ ان غلطیوں کا اصلی باعث صرف یہی ہے کہ کلیہ قائم کرنے میں جن واقعات کو کام لیا گیا وہ تعداد میں ناکافی تھے۔

آرسطو کے قائم کیے ہوئے بعض کلیات نہایت پر شکوہ ہیں مثلاً ایک کلیہ اوس نے یہ قائم کیا کہ ہر شے حیات کے سانچہ میں ڈھلنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے اور تماشگاہِ فطرت میں جو مختلف اعضا حی سو بہتین اور کلین مہین نظر آتی ہیں یہ حالات و کیفیات موجودہ کے مقتضیات کی تابع ہیں۔ اگر حالات و کیفیات بدل جائیں تو صورت و اشکال میں بھی تبدیلی پیدا ہو جائے۔ پس اس طور پر ہستی کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے جو نباتات و حیوانات سے ہوتا ہوا انسان تک پہنچتا ہے اور موالید کی مختلف جماعتیں ایک دوسرے میں بتدریج اس طرح ضم ہوتی ہوئی چلی جاتی ہیں کہ حدود انعام محسوس نہیں ہوتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ استقرار سے بس کی ایجاد کا فخر آرسطو کو حاصل ہے ایک بہت بڑا زبردست طریقہ ہے اور جو ترقی سائنس نے اس وقت تک کی ہے وہ اسی کی شرمندگی احسان ہے۔ یہ فلسفہ جب تکمیل کو پہنچا تو مظاہر سے ادوں کے اسباب و علل کا استقرار کیا جاؤ گا اور اسباب کے دریافت ہونے کے بعد بہ اتباع طریقہ اثباتیہ سبب سے سبب کی تفصیل مستنبط ہونے لگی۔

اس طور پر اسکندر یہ بین عقلیات کی بنیاد جہاں ایتھنز کے ایک نامور حکیم کے اصولوں پر رکھی گئی اخلاقیات کا سہرا بھی ایتھنز ہی کے ایک دوسرے مشہور حکیم کے سر رہا۔ اس حکیم کا نام زینو تھا جس کی اصل اگرچہ قبرس یا فینیشیا سے تھی لیکن کئی سال سے اوس نے مستقل طور سے یونان کے پایہ تخت ہی میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ اوس کے شاگرد اسٹونک (جبوتہ) کے نام سے مشہور تھے۔ اوس کے عقاید اوس کے مرنے کے بعد مدتوں قائم رہے اور مصیبت کے وقت میں جب انسان کا بجز بیکسی کے اور کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا اوس کے لیے سرمایہ تسکین و تسلی ثابت ہوئے اور نہ صرف شاہیر یونان بلکہ رومنہ الکبریٰ

کی حسیل القدر حکیموں مدبروں سپہ سالاروں اور فرمانرواؤں کو سراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتے رہے۔

ترتیب کا مقدمہ یہ تھا کہ روزانہ زندگی کے لیے ایک دستور العمل مقرر کیا جائے جس کی بدولت انسان برائی بھلائی میں تمیز کر سکے اور کوشش کی جائے کہ انسان نیک چلن ہو جائیں۔ اوس کا قول تھا کہ تعلیم بچہ کی اصلی بنیاد ہے اس لیے کہ اگر آدمی کو معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا شے ہے تو وہ خواہ مخواہ اوس کی طرف مایل ہوگا۔ علم کا مواد ہم پہنچانے کے لیے ہمیں اپنا واسطہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ باقی رہا اس مواد کی تالیف و ترتیب کا کام سواس کی ذمہ دار عقل ہے۔ اس بارہ میں ترتیب اور اسلوب کا اتفاق رائے بدلا ہوا پایا جاتا ہے۔ ہر خواہش یا شہوت یا آرزو ناقص علم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہماری جبلت یا طبیعت تو مقدرات سے ہے لیکن یہ ہمارا کام ہے کہ اپنے جذبات کو روکیں اور عقل کی پابندی کے ساتھ آزادانہ فیما نہ اور پاکیزہ زندگی بسر کرنا سیکھیں۔ ہماری زندگی ہماری دماغی قوتوں کی میطیع ہونی چاہیے اور زمانہ کے رنج و راحت سے ہم کو نہ کہیں خاطر و بدل ہونا چاہیے نہ مسرور و خرم بلکہ قلب میں سکون و طمانیت کی کیفیت پیدا کرنی چاہیے۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہم آزاد ہیں۔ اپنے اپنا جس کے غلام نہیں ہیں۔ ہمارے پاس ایک ایسا بیش قیمت خزانہ ہے جو تمام دنیا میں کو بھی اگر جاسے تو ہم سے نہیں چھین سکتی اور وہ خزانہ موت ہے۔ ہمیں یہ امر نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ فطرت اپنے عمل درآمد میں عام نتائج کو پیش نظر رکھتی ہے اور افراد کے بچانے کی کبھی فکر نہیں کرتی بلکہ اوہنیں اپنے مقاصد عامہ کی تکمیل کا آلہ قرار دیتی ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ تقدیر کے آگے تسلیم خم کرین اور نیکی اعتدال صبر تحمل انصاف اور علم کے اکتساب میں کوئی دقیقہ اٹھانا نہ رکھیں۔ ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ عالم متغیر ہے۔ فنا کی بعد بقا اور بقا کے بعد فنا لازمی ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں ہر شے مری رہی ہے اور مرے گی موت سے ڈرنا یا اوس پر کڑھنا فضول ہے۔ جس طرح ہر سال آبشار کی ایک ہی صورت



رہتی ہے لیکن جس پانی سے یہ مرکب ہر وہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اسی طرح قدرت کی نمود سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مادہ کی ایک سیل ہر وقت برہمی ہے جس کے وجود کو بقا ہے لیکن شکل آنی و فانی ہے۔ کائنات بحیثیت مجموعی ناقابل تغیر ہے۔ بحر فضا اجزائے لایتجزی اور قوت کے اور کسی شے کو بقا نہیں۔ فطرت کی صورتیں جو ہمارے پیش نظر ہیں چند روزہ ہیں اور ضرور ہے کہ گذر جائیں۔

ہمیں اس واقعہ کی طرف سے خالی الذہن نہ ہونا چاہیے کہ اکثر ان فون کی تعلیم ناقص ہوتی ہے۔ اس لیے ہم کو اپنے زمانہ کے مذہبی عقاید کے خلاف بے ضرورت کوئی بات نہ کہنی چاہیے۔ خود ہمارے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ اگرچہ ایک ایسی قوت ضرور موجود ہے جو ہر ایک لحاظ سے کامل و مکمل ہے لیکن کسی ہستی کا مادہ کا وجود مطلق نہیں۔ ایک غیر مری جوہر کے وجود میں تو کلام نہیں لیکن یہ کہنا کہ ایک ایسا شخصی یا ذاتی خدا موجود ہے جس میں انسان کی صورت اور جذبات اور احساسات پائے جاتے ہیں اتنا باعث کفر نہ ہوگا جتنا موجب لغویت الہام و تنزیل کی بدقت ایک ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں۔ جس شے کو انسان اتفاقی یا حادثہ سے تعبیر کرتا ہے اسے ایک غیر معلوم علت کا معلول سمجھنا چاہیے۔ اتفاقات و حوادث تک ایک مقررہ منابطہ کے پابند ہیں جس سے وہ سرسوتجا و زمین کر سکتے۔ تائید ایزدی یا شان ربانی جس قوت کا نام رکھا گیا ہے اس کا مطلق کہیں وجود نہیں۔ اس لیے کہ قدرت کا طرز عمل اہل اور اسٹ قوانین کا تابع ہے اور اس لحاظ سے کائنات گویا ایک بہت بڑی کل ہے جو خود بخود چل رہی ہے۔ نظام کائنات کی رگ و پے میں جو زندہ طاقت ساری و دایرہ از او سے جہلا خدا کہتے ہیں۔ وہ انقلابات اور تغیرات جن کا اثر ہر شے پر پڑتا ہو کسی طرح ٹل نہیں سکتے اور اسی لیے کہا جا سکتا ہو کہ دنیا کی ترقی یا بندگی و قضا و قدر ایک بیج کی طرح ہے جو صرف اسی طریقہ پر اگ سکتا ہے جو اس کے لیے پہلے سے معین کر دیا گیا ہے۔

الحکیم زین العابدینؑ کا انکار کیا لیکن ایک غیر مری جوہر۔ ایک زندہ طاقت کا اقرار کیا۔ (بقیہ مضمون بطور آئندہ)

انسان کی روح شعلہ حیات کائنات کی ایک چنگاری ہے۔ حرارت کی طرح اس کا نفوذ ایک جسم سے دوسرے جسم میں ہوتا رہتا ہے اور بالآخر اس کا انضمام یا انجذاب اُس ہوہر کلی میں ہو جاتا ہے جس سے اس کا انفصال ہوا تھا۔ اسی لیے ہم کو عدم یا فنا سے محض کا اندیشہ نہ کرنا چاہیے بلکہ انجذاب یا اتصال کا یقین رکھنا چاہیے۔ اور جس طرح تھکا ہوا آدمی اس غفلت کی تمتا کرتا ہے جو نیند سے ہم آغوش ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے اسی طرح فلاسفہ کو چاہیے کہ کمروہات دنیا سے تنگ آکر اس حالت تطہینہ کو اپنا مطہر نظر قرار دیں جو اس خاک اران کی قید سے آزاد ہونے کے بعد ہی میسر ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ باتیں ایسی ہیں جن پر غور کرتے وقت ہمیں ہر ہر قدم پر شبہ و شک سے کام لینا چاہیے اس لیے کہ دماغ اپنے اندر دنیوی ذرائع معلومات ہی سے حقیقت اشیاء سے مطلع نہیں ہو سکتا۔ نمل اولیٰ سے بحث کرنا خلاف شیوہ حکما ہے۔ ہمیں صرف مظاہر یعنی اذن واقعات سے سروکار رکھنا چاہیے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ سب سے زیادہ ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ انسان کے لیے حقیقت مطلق کا اکتشاف محال ہے۔ مادہ کے متعلق انسانی تحقیقات کا انتہائی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا دل العلم ہونے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ یہاں تک کہ اگر اسے علم کامل حاصل ہو بھی جاوے تو اس کے پاس ایسا کوئی معیار موجود نہیں جس کی بنا پر اسے اپنی معلومات کے صحیح و کامل ہونے کا یقین ہو سکے۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) تا نیدا یزدی کو سرا یا لیکن قانون قدرت کو سرا یا۔ کار فرما سے تقاد قدر سے سرتابی کی لیکن تقدیر کے آگے تسلیم خم کیا۔ حاکم کو نہ مانا لیکن حکم کو جائز اور قابل اطاعت سمجھا۔

”فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں“

اس پر بھی جناب باری کی ہستی سے انکار نہ ہو سکا۔ اپنی اپنی سمجھ ہے۔ کوئی اسے کسی طرح مانے کوئی کسی طرح لیکن اس پھندے سے بچ نکلنا محال ہے۔

”ہندو نے مضمین جملہ پایا تیرا آتش پہ معان نے راگ لگایا تیرا“  
 ”دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا“ مترجم

ان تمام باتوں کو تسلیم کر لینے کے بعد ہمارے لیے باقی کیا رہا؟ سبجز اس کے اور کچھ نہیں کہ تحصیل علم کی کوشش کریں۔ نیچی اور پابک بازی کو اپنا شعار قرار دیں۔ اپنے اپنا سے جنس سے دوستانہ برتاؤ رکھیں۔ ایمانداری اور راست بازی کو ہاتھ سے نہ دیں۔ جو کچھ پیش آئے اس کو ممبر و رضا کے ساتھ گوارا کریں اور ایسی زندگی بسر کریں جو ہر اعتبار سے عقل کے احکام کی پابند ہو۔

اگرچہ عجائب خانہ اسکندریہ کے قیام کا مقصد خاص فلسفہ مشائیہ کی اشاعت و ترویج تھا لیکن اس سے یہ نہ بھننا چاہیے کہ دوسرے مذاہب فلسفہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ عجائب خانہ کی بدولت فلسفہ اشراقیہ نہ صرف مد کمال تک پہنچا بلکہ آخرین آرسطو کی حکمت کا نسخہ ثابت ہوا اور جدید اکاڈمی کے ذریعہ سے عیسائیت پر ایک مستقل اور دیرپا اثر چھوڑا گیا۔ فلاطون کا فلسفیانہ طریقہ آرسطو کے طریقہ کی ضد تھا یعنی اس میں استدلالیات سے

لے لفظ اکاڈمی جس کے معنی بیت الحکمت کے ہیں ایک یونانی لفظ اکاڈمیا سے مشتق ہو۔ اکاڈمیا نواح ایٹن میں ایک مقام کا نام تھا جہاں اول سقراط اور اس کے بعد فلاطون اپنے شاگردوں کو آکر درس دیا کرتے تھے۔ فلاطون نے پچاس سال تک اس مقام پر حکمت آموزی کی اور یہی وجہ تھی کہ اکاڈمی کے معنی فلسفہ اشراقیہ کی درس گاہ کے ہو گئے۔ فلاطون کی وفات کے بعد جو حکمت عامین واقع ہوئی اس کے فلسفہ میں ترسیمات ہونی شروع ہوئیں جس کی وجہ سے مذہب اشراقیہ کی تین شاخیں ہو گئیں۔ تیون شاخیں علی الترتیب قدیم اکاڈمی و وسطی اکاڈمی اور جدید اکاڈمی کے نام سے موسوم ہیں۔ قدیم اکاڈمی سے مراد خاص اشراقی عقاید کا مسلک ہے۔ وسطی اکاڈمی کی بنا حکیم آرسیمی ٹیس نے ڈالی جس کا سن ولادت مسیح ۲۷۰ء ہے۔ اس کے بعد مسیح ۲۷۰ء میں حکیم کارنیاڈیز نے جو دیونائس بھی کہنا شروع کیا وہ جدید اکاڈمی قائم کی۔ کارنیاڈیز کا خیال تھا کہ ماہیت انشیا اور اک انسانی سے بالاس ہے۔ اس سے اس کی یہ مراد تھی کہ یہ بات ثابت نہیں کی جاسکتی کہ ادراک شے کو مادہ کے جوہر یا عرض کے لحاظ سے شے مدکر کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

کی جاتی تھی جتنا وجود ہی مذہبی اعتقادات کی طرح قیاسی ہے اور کلیات سے جزئیات یا تفصیلات کا استخراج کیا جاتا تھا۔ بخلاف اس کے آرسطو استقرا کے عمل کی وساطت سے جزئیات سے کلیات تک پہنچتا تھا۔

اس پر صاف ظاہر ہے کہ افلاطون کے مذہب کی بنیاد تخیل پر تھی اور آرسطو کی عقل پر۔ فلاطون ایک ابتدائی خیال کو سامنے رکھ کر اس کے تجزیہ سے اس کی تفصیلات تک پہنچتا تھا اور آرسطو جزئیات و تفصیلات سے تیاج استخراج کر کے ایک کلیہ قائم کرتا تھا۔ اسی لیے فلاطون کے طریقے سے بہت جلد بظاہر نہایت شاندار مگر دراصل ناقابل اعتبار نتیجے پیدا ہو جاتے تھے حالانکہ آرسطو کے طریقہ سے اگرچہ تیاج دیر میں نکلتے تھے اور ان کے استخراج میں بے انتہادقت اٹھانی پڑتی تھی لیکن ہوتے بہت زیادہ مستحکم اور دیر پا تھے۔ ان تیاج کے استخراج کے لیے واقعات کے جمع کرنے میں جس کنج کا دی اور دیدہ ریزی کا کام لینا پڑتا تھا اور تجربہ اور مشاہدہ میں جو جانکا ہی اور قریزی گوارا کرنی پڑتی تھی وہ محتاج بیان نہیں ہیں وہ تھی کہ فلاطون کا فلسفہ گویا ایک شاندار قلعہ ہے جس کی بنیاد ہوا بر ہے اور آرسطو کی حکمت ایک مضبوط اور سنگین عمارت ہے جو بہت سی محنتیں برداشت کرنے اور بہت سی ناکامیوں کا رنج اٹھانے کے بعد ایک ٹھوس اور مستحکم چٹان پر بنائی گئی ہے۔

قوت تخیل سے کام لینا بمقابلہ قوت عقلیہ کے عمل میں لانے کے کہیں زیادہ ولادیر ہے۔ جب اسکندریہ کے عقلی انحطاط کا دور آیا تو مشاہدہ کی دیدہ ریزیوں اور فکر و غور کی جانکا ہیوں کے بجائے طبیعتیں زیادہ تر سہل اور آسان طریقوں کی طرف رجوع

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ) جو کچھ ثابت ہو سکتا ہے وہ فقط اسی قدر ہے کہ ادراک اور شنے مدد کے میں ایک قسم کا باہمی تعلق ہے جس کا اثر انسان کے نظام عصبی پر مترتب ہوتا ہے۔ اس سے کار نیواڈیز نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسانی معلومات غیر یقینی ہیں۔ مترجم

ہو گئیں۔ فلسفہ اشراقیہ جدید کے مدرسوں میں اُمونیسیس سیکاس اور پلانٹینس جیسے تخیل پرست متکھین کا جہوم نظر آئے لگا۔ خدا کی شان ہے کہ قدیم عجائب خانہ کے جفاکش ہند سون کی جانشین ایسے لوگ بنیں جنہوں نے فلسفہ کو باز بھیچہ اطفال سمجھ رکھا ہو۔

اس ذہنیات اور موجودات خارجی میں باوجود دشائی اور اشراقی توجہات کے جو عقلی تناقض مدتوں سے چلا آتا تھا اس کے رفع کرنے کے لیے حکم کے ایک گروہ نے جنہیں سچی علم کلام کا بانی کہا جاسکتا ہے تیسری صدی عیسوی میں فلسفہ کا ایک نیا مذہب فلسفہ اشراقیہ جدید کے نام سے اسکندریہ میں قائم کیا۔ اس مذہب کا مقصد یہ تھا کہ عقل اور ایمان میں توافق پیدا کیا جائے۔ ہستی علی الاطلاق یعنی خدا کی ذات کا نقل چونکہ افلاطون کے کلیات عقل کی وساطت سے ہونا محال تھا لہذا فلسفہ اشراقیہ جدید کے بانیوں نے مکاشفہ کے مسئلہ کو رواج دیا۔ اس مسئلہ کا مفہوم یہ ہے کہ ادراک کے اجزائے عاقل و مستعدہ یعنی نفس ناطقہ و شے مد کہ باہم مخلوط و منضم ہو کر ایک ہو جائیں اور ان میں کوئی فرق نہ رہے۔ دوسرے غفلوں میں اس کی تاویل یوں کی جاسکتی ہے کہ انسان کی تمنا ہے کہ اس کو علم مطلق حاصل ہو لیکن اس حصول کے لیے خارجی اشیا کا ادراک یا طریقہ استعمال بیکار ہے۔ علم مطلق اس کو ادوی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ انجیال فلسفہ اور ترکیب باطن سے محسوسات اور موجودات خارجی کو وہ اپنا پر تو بنالے اور بیرونی اثرات سے یہاں تک مستغنی ہو جائے کہ عالم اور معلوم ایک ہو جائیں اور اس طور پر سب چیزوں کا ادراک مکاشفہ یا بصیرت سے ہونے لگے۔ کثرت کے تصور سے جو عقلی مشکلات فلاسفہ کو اکثر پیش آئی ہیں ان سے بچنے کے لیے فلسفہ اشراقیہ جدید کے پیروں نے مسئلہ انفصال کو اصول ہمہ دوست کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ اس مسئلہ سے مراد یہ ہے کہ کائنات مرنی کے جلد شواہد خالق علی الاطلاق سے ماخوذ اور اس کے مظاہر ہیں۔ مترجم

اس ایک یونانی فیلسوف جس کا زمانہ ۵۰۰ء سے ۴۰۰ء تک ہے۔ فلسفہ اشراقیہ جدید کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ سیکاس کے معنی یونانی زبان میں حال کے ہیں اور یہی اس کے نام کے رکن ثانی کی وجہ تسمیہ ہے۔ اسکندریہ میں وہ حالی کا پیشہ کرتا تھا۔ فروریوس کہتا ہے (بقیہ مضمون برصغیر آئندہ)

والعلم اسکندریہ اوس طریقہ کی پہلی مثال پیش کرتا ہے جس نے زمانہ حال کے ماہرین علم طبعیات کے ہاتھ میں اگر ایسے حیرت خیز نتائج پیدا کیے ہیں۔ اس طریقہ کے اختیار کرکے فوڈا لون نے

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) کہ اوس کے ان باپ عیسائی تھے اور وہ خود بھی ابتدائین عقاید عیسوی کا پابند تھا مگر بعد میں مرتد ہو گیا۔ بعض اہل الرسا کا خیال ہے کہ وہ مرتد ہو کر عیسائی رہا لیکن قیاس یہہ چاہتا ہے کہ فلسفیانہ تخیل نے مذہب عیسوی کے اصولوں کی طرف سے اوس کے دل میں شبہات و شکوک پیدا کر دیے اور اوس نے فلسفہ اشراقیہ میں تصوف کا پیوند لگانا چاہا۔ اوس نے اپنے خیالات قلبیہ نہ نہیں کیے بلکہ جو کچھ اپنے شاگردوں کو سکھایا زبانی طور پر سکھایا۔ اور یہ تعلیم مدتوں سینہ بسینہ چلی آئی۔ خدا کو وہ تثلیث کی شکل میں مانتا ہے لیکن اس تثلیث کے ارکان بجائے باپ بیٹے اور روح القدس کے جو ہر مطلق عقل فعال اور قوت تامہ ہیں۔ مترجم

۳۷۰ سنہ ۵۰۰ میں مصر میں پیدا ہوا اور آئینوئیس سیکلاس سے دس سال تک فلسفہ کی تحصیل کی۔ اس کے بعد ایرانیوں اور ہندوؤں کے فلسفہ سے واقفیت پیدا کرنے کی غرض سے مشرقی ممالک کی طرف روانہ ہوا۔ چند سال کے بعد وہ روم آیا اور وہاں پچیس سال تک درس دیتا رہا۔ فرافورس اور لائنجیس اوس کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ رہبانیت اوس کی زندگی کا جزو اعظم تھی۔ ایک دفعہ اوس کے دوستوں نے اصرار کیا کہ تصویر کھینچو۔ اوس نے جواب دیا کہ انسان ایک سایہ ہے اور سایہ کی نقل اُتارنا طاقت ہے۔ پلائینس گوشت نہیں کھاتا تھا اور نہ ہاتا بھی نہ تھا۔ مشدع میں جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو طبیب کے معالجہ سے بھی انکار کیا۔ اوس کی تعانیف سے جو تعداد میں چوہ ہیں ایک ہستی کاملہ کے خیال کا پتہ چلتا ہے جو ہر خواہشمند پر اپنی خیر و برکت کا پرتو ڈالنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہے۔ پلائینس کا خیال تھا کہ فلاسفہ میں ربانی عنصر موجود ہوتا ہے اور یہ لوگ عوام کا لانعام کی طرح اس بات کے محتاج نہیں ہوتے کہ علایق مادی سے اپنے آپ کو منقطع کریں۔ خود اوس کی طبیعتوں میں عالم بالا کے حقایق کے اکتساب کا رجحان موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح عشاق میں اوس حسن کے ادراک کی استعداد موجود ہوتی ہے جو جسم سے معرا ہے اور موسیقی کا مذاق رکھنے والے ایک کمر درجہ میں (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

دہی خیالی باتوں سے ابالیا اور اپنی مفروضات و نظریات کو اون واقعات و حقائق کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا جو مہندسانہ ثبوت کی تائید سے تجربہ اور مشاہدہ کی بدولت حاصل ہوئے تھے۔ اونہوں نے اس اصول کو عام طور سے رواج دیا کہ صحیفہ فطرت سے حقائق کے اقتباس کرنے کا صحیح طریقہ عملی تجربہ ہے۔ ارشمیدس کی تحقیقات اشیا کے وزن مخصوص کے متعلق اور بطلیموس کی تصانیف مناظرہ درایا کے موضوع پر ہمارے آج کل کے علمی فلسفہ کے اکتشافات سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں اور زمانہ مابعد کے مصنفین کی فرضی و قیاسی مہملات کی طرف انگشت حقارت سے اشارہ کر رہی ہیں۔ لپلیس کہتا ہے کہ دارالعلم اسکندریہ کے قیام سے پہلے یونانیوں نے علم ہیئت کے متعلق اگر کوئی علمی کام کیا تو وہ یہ تھا کہ ۳۲۰ ق م میں میٹرون اور یوڈیٹس نے اعظم انقلاب صغی کا مشاہدہ کیا۔ دارالعلم اسکندریہ ہی میں پہلی مرتبہ جو کو اس امر کی مثال ملتی ہے کہ جو مشاہدات کئے گئے اون میں زاویوں کی پیمائش کے اکون اور علم مثلث کے اصولی طریقہ حساب سے کام لیا گیا۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) ضن مجرہ کا نقل کر سکتے ہیں پلاٹینس کی تصانیف کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انگریزی میں اس کے بعض مقامات کا ترجمہ سٹریڈلر نے کیا ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۲۴ء) لویس نے بھی اپنی تاریخ فلسفہ (مطبوعہ لندن ۱۸۶۶ء) میں پلاٹینس کا حوالہ دیا ہے۔ مترجم

۱۷ لپلیس ایک مشہور فرانسیسی مہندس اور ہیئت دان ہے جو ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا۔ سائنس میں اس کی اجتہادی عظمت کا یہ پایہ ہے کہ اسے نیوٹن کا سہیم و عدیل سمجھا جاتا ہے۔ نظام شمسی کی حرکات کے اصول کے متعلق اس نے ۱۷۹۹ء میں ایک مشہور و معروف کتاب لکھی جس میں قمری سیارگان اعظم کے اقمار، مشتری اور زحل کی ہر دو عدم مساوات اور حقیقت مد و جزر پر نہایت جدت و تحقیق پر بحث کی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ چار جلدوں میں یورڈیج نے کیا اور بمقام بوٹن ۱۸۴۹ء میں چھپوایا۔ مترجم

نہ تو اس کتاب میں اتنی گنجائش ہے اور نہ اس کا موضوع اجازت دیتا ہے کہ عجائبِ خدا اسکندریہ نے معلوماتِ انسانی میں جو اضافے کیے ادن کا یہاں مفصل ذکر کیا جاسکے جو کچھ بیان کیا گیا ہے اوس کا منشاء صرف اسی قدر ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے کو ان ترقیات کی عام نوعیت کا اندازہ ہو جائے۔ اگر تفصیل مطلوب ہو تو میری کتاب ”ہسٹری آف دی انٹلیکچوئل ڈیولپمنٹ آف یورپ“ (یورپ کے دماغی نشوونما کی تاریخ) کا چھٹا باب ملاحظہ فرمایا جائے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حکیم زینو کے فلسفہ میں حقیقتِ مطلق کے ادراک کے متعلق شک ظاہر کیا گیا ہے۔ ادھر زینو ان شکوک و شبہات میں گرفتار تھا اُدھر اقلیدس اپنی اوس معرکتہ الآرا تصنیف کی تیاری میں مصروف تھا جو تمام دنیا کے مقابلہ میں کوں متحدی بجا کر بنی نوع انسان کو یہ دعوت دینے والی تھی کہ اگر دعویٰ ہے تو مجھ میں کوئی نقص نکالو۔ بائس صدیوں کے گزرنے کے بعد بھی یہ کتاب صحتِ رسالتِ صفائی، اِکلیتِ اثبات اور استقراءِ تام کا ایک عظیم النظیر نمونہ ہے۔ اس مہندسِ اعظم کی تصانیف نہ صرف ریاضی کی دوسری شاخوں مثلاً فصولِ مخروطی یا اشکالِ کثیر النتیاج میں پائی جاتی ہیں بلکہ علمِ الاصوات اور علمِ مناظر و مرآیاں بھی بعض رسائلِ ایسے ہیں جو اوس سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ مناظر و مرآیاں میں اوس نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ شعاعیں آنکھ سے نکل کر اشیائے مرئیہ پر پڑتی ہیں۔

ارشمیدس نے اگرچہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں تسلی میں جا کر اقامتِ اختیار کر لی تھی لیکن اوس کا شمار بھی اسکندریہ ہی کے ماہرینِ علمِ ہندسہ و طبیعیات کے زمرہ میں کرنا چاہیے۔ ریاضی میں اوس نے دو کتابیں کرہ اور اسطوانہ کی ماہیت پر لکھی ہیں۔ ان تصانیف میں اوس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر ٹھوس کرہ کا جسم مقدار میں اوس اسطوانہ کی مقدار کا دو ثلث ہوتا ہے جو اس کا محیط ہو۔ اس اکتشاف پر اوسے اس قدر ناز تھا کہ



مرنے وقت اوس نے یہ وصیت کی کہ یہ شکل اوس کی قبر کے تعویذ پر کندہ کی جائے۔ دیرہ اور شکل قریب البیضوی کی تزئین پر بھی اوس نے بحث کی ہے۔ اوس کا ایک رسالہ اشکال میشل مغرود و میشل کرہ پر ہے۔ اس کے علاوہ اوس چکر دار شکل کو بھی اوس نے اپنی عقل دقیقہ سنج کی موشگافی کا موضوع قرار دیا ہے جو اوس کے نام سے مشہور ہے اور جس کا خیال اوس کے ذہن میں اول اول اوس کے دوست کانن نے اسکندریہ میں پیدا کیا تھا۔ اوس کے بعد اس پایہ کا مہندس یورپ دو ہزار سال تک پیدا نہ کر سکا۔ طبعیات میں اوس نے مائیات کی بنیاد لی۔ وزن مخصوص کے دریافت کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ پانی پر تیرتی ہوئی اشیاء کے توازن یعنی مرکز ثقل پر بحث کی۔ بیرم کی ماہیت کا پتہ لگایا اور دریائے نیل سے پانی کھینچنے کے لیے ایک پیچ کی شکل کا آلہ ایجاد کیا جو ابھی تک اوس کے نام سے مشہور ہے۔ غیر متناہی تیج اور نیزہ شیشہ آتشی جس سے سائر اکیوز کے محاصرہ میں اوس نے اہل روم کے جہازوں کا بیڑہ جلا دیا اوس کی ایجادات میں داخل ہیں۔

ایرانا مستغنیہ بھی جو ایک وقت میں کتب خانہ کا صدر مہتمم تھا بہت سی اعلیٰ درجہ کی تصنیفات کا مصنف تھا۔ خطوط سرطان و جدی کا درمیانی فاصلہ اسی نے دریافت کیا اور زمین کی جسامت کے معلوم کرنے کی کوشش بھی اول اول اسی نے کی۔ براعظموں کے جوڑ اور پیمائش۔ پہاڑوں کے سلسلوں کے مقامات وقوع۔ بادلوں کے عمل۔ طبقات الارض کی غرقابی۔ ڈوبے ہوئے طبقات کے ابھار۔ آبنا سے در وانیال و جبل الطارق کو افتتاح اور بحیرہ سود کے تعلقات پر اوس کے مباحثہ موجود ہیں۔ اوس نے حالات ارضی پر ایک مکمل کتاب تین مقالوں میں لکھی تھی۔ پہلے مقالہ میں طبعیات سے بحث تھی دوسرے میں ریاضیات سے تیسرے میں تاریخ سے۔ اس کتاب کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر یونان مالک کا ایک نقشہ بھی شامل تھا جو اوس وقت تک معلوم ہو چکے تھے۔ اوس کی ”تاریخ شاہان تھیبز“

کے بعض اجزاء زمانہ کی دستبرد سے بچ رہے ہیں اور چند سال سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے ہیں درنہ صد سال تک تو ہماری موجودہ دینی تاریخ کے مقابلہ میں جس کی حیثیت ایک مجموعہ لغویات سے زیادہ نہیں ان پر اعتنا ہی نہ ہوا۔

اس مقام پر اون دلائل کا بیان کرنا ضرور نہیں ہے جو اسکندریہ کے علمائے زمین کو گول ثابت کرنے کے لیے اختیار کیں۔ ان لوگوں کو کرہ زمین۔ قطبین محور زمین۔ خط استوا۔ دائرہ قطب شمالی۔ دائرہ قطب جنوبی۔ نقاط اعتدال ییل ونہار۔ نقاط انقلاب صیفی و شتوی۔ سردی اور گرمی کی تقسیم اور مسائل متعلقہ کا صحیح صحیح طور پر علم تھا۔ یہاں صرف اپالوٹیس کی اون تصانیف کا نام ہی لیا جاسکتا ہے جو اس نے فصول مخروطی اور مقدار اکثر و اقل پر قلمبند کی تھیں۔ الفاظ ”ایلیس“ (شکل ایلیی یعنی وہ شکل جسکی ہم مخروطی کو چھترائے پیدا ہوتی ہے) اور ”ہائی پر بلا“ (شکل بعید البیضوی) کا اول اول اسی نے استعمال کیا۔ ارسطیس اور تھاکرس کی رصد بینی کا ذکر بھی بوجہ قلت گنجائش یہاں اچھٹا ہوا ہی کیا جاسکتا ہے۔ استقبال نقاط اعتدال ییل ونہار کا عظیم الشان اکتشاف جو ہپارکس نے کیا ہے تاکرس ہی کے ہیئت مشاہدات پر مبنی تھا۔ قمر کی عدم مساوات اولین اور مساوات مرکز کی تحقیقات بھی ہپارکس ہی کی ہے۔ حرکت دھاری کے اصول پر اجسام فلکی کی ظاہری گردش کی تشخیص کے لیے اس نے وہ مہندسانہ طریقہ ایجاد کیا جس میں دو غیر مساوی دائروں سے اس طرح کام لیا جاتا ہے کہ چھوٹے دائرہ کا مرکز ہمیشہ بڑے دائرہ کے محیط پر گردش کرتا ہے یا دو مختلف المرکز دو دائرہ ایک دوسرے کو قطع کرتے رہیں۔ اس نے ستاروں کی ایک فہرست بھی ایک خاص طریقہ کے مطابق تیار کی تھی جس کی رو سے وہ ستارے جو بظاہر ایک خط مستقیم میں نظر آتے ہیں درج فہرست کھڑے تھے۔

لہ خط استوا کے شمال اور جنوب میں دو فرضی دائرہ واقع ہیں جنہیں سرطان اور جدی کہتے ہیں۔ آنتا موسم شتا و صیف یعنی جاڑے اور گرمی میں خط استوا کے جن بعید ترین نقطوں پر ہو کر گذرتا ہے انہیں نقاط انقلاب صیفی و شتوی کہتے ہیں۔ مترجم

جس ستاروں کا فہرست میں اس طور پر اندراج ہوا وہ شمار میں ۱۰۸۰ ہوتے تھے۔ آسمان کی طرح اس نے زمین کے متعلق بھی اسی طرح کی کج کا دی کی تھی۔ یعنی عرض بلد اور طول بلد کے خط کھینچ کر دیار و معمار اور دوسرے مقامات کی نشاندہی کی تھی شمس و قمر کی میزانیں بھی اول اہل اوس نے تیار کی تھیں۔

مہندسین۔ بنجمن اولمپیدین کے اس حلیل القدر گروہ کی فہرست میں بطلمیوس کا نام بہن نور کے حرفوں میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اوس کی شہرہ آفاق کتاب ”سنٹکس“ (یعنی عالم بالا کی مہندسانہ ساخت) ڈیڑھ ہزار سال تک بحیثیت کے متعلق دنیا کا دستور العمل بنی رہی اور نظام بطلمیوسی کا چراغ صرف اوس وقت گل ہوا جب کہ تیوٹن نے اپنی غیر فانی تصنیف ”پرنسپیا“ لکھ کر اوس سند کو زینت دی جو پندرہ صدیوں تک ”سنٹکس“ کے مصنف کے لیے وقف رہی تھی۔ بطلمیوس کی کتاب کی ابتدا اس اصول سے ہوتی ہے کہ زمین گول ہو اور فضائے بسیط میں قائم ہے۔ اس میں میزان الاوتار کے بنانے کی ترکیب اور اون آلات کا حال مندرج ہے جن سے نقاط انقلاب صیفی و شتوی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ محققانہ بحث کے بعد اصول اعوجاج طریق الشمس کا استخراج کیا ہے۔ علم یا جیب کو ذریعہ سے ارضی عرض بلد نکلانے کا طریقہ بتایا ہے۔ مومنون کا حال بیان کیا ہے۔ معمولی وقت کو کوکبی وقت میں تحویل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ کوکبی سال پر انقلابی سال کو ترجیح دینے کی وجہ بیان کی ہیں نظام شمسی کا ذکر کرتے ہوئے اس اصول کی توضیح کی ہے کہ وہ دوایر جن میں سیارے آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں مختلف المرکز ہیں۔ مساوات وقت کے اصول کی تشریح کی ہے۔ قمر کی حرکات پر بحث کرتے ہوئے اوس کی عدم مساوات اولین اوس کے گہن اور اوس کے نقطہ اس و ذنب کا حال لکھا ہے۔ اس کے بعد خود بطلمیوس کے عظیم نشان الکشاف یعنی قمر کی عدم مساوات ثانیہ پر بحث کرتے ہوئے جس نے بطلمیوس کے نام کو فنا کے رین منتہی ہوئے سے بچا لیا اسے اوس مہندسانہ اصول کا تابع کیا گیا ہو

جس کے بموجب دو غیر مساوی دائروں میں سے چھوٹا دائرہ اپنے مرکز کو بڑے دائرہ کے محیط پر رکھ کر اوس کے گرد گردش کرتا ہے۔ پھر زمین سے سورج اور چاند کا فاصلہ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ آگے چل کر ہپارکس کی تحقیقات یعنی استقبال نقاط اعتدال میل و نہار کا بیان کیا ہے جس کا مکمل زمانہ پچیس ہزار سال ہے۔ بالآخر ۱۰۶۲ ستاروں کی فہرست مرتب کی گئی ہے اور کہکشان کی نوعیت پر نظر انتہاد ڈالنے کے بعد سیاروں کی حرکت پر نہایت متعلقانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک اور امر جس نے بطلیموس کی علمی شہرت کے استحقاق کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے یہ ہے کہ سیاروں کے مدار کی تعیین میں وہ ہیئت و انان از منہ ماضیہ کے ترصدا ت سے اپنے مشاہدات کا مقابلہ کر کے بعد اسے قائم کرتا ہے۔ چنانچہ زہرہ کے مدار کو معین کرتے وقت اوس نے نما کر س کے مشاہدات کو پیش نظر رکھا ہے۔

عجائب خانہ اسکندریہ میں ٹیسٹیس نے آتشین انجن ایجاد کیا تھا۔ اوس کے شاگرد ہیرد نے دو اسطوانوں کے اضافہ سے اسے ترقی دی۔ اول اول دخانی انجن سے بھی یہیں کام لیا گیا کہ وہ بھی تیسرو کی ایجاد سے تھا اور ایک خاص ترکیب سے چلا یا جاتا تھا جو یہ تھی کہ دہات کے ایک کھوکھلے گولے میں جس میں ایک چھوٹا سا منفذ ہوتا تھا پانی بھر دیا جاتا تھا اور نیچے آہنی پنچائی جاتی تھی حرارت پہنچ کر پانی بھاپ کی شکل میں تبدیل ہو جاتا تھا اور بھاپ کے زور سے گولا گردش کرنے لگتا تھا جس سے انجن چلنے لگتا تھا۔ تیسرے کے ایوانوں کی خوشی میں ٹیسٹیس اور اپالونیئس کی آبی گھڑیاں خلل ڈالتی تھیں جن میں سے پانی کے قطر ٹپ ٹپ کرتے تھے اور وقت کا اندازہ کرتے جاتے تھے۔ جب رومنہ الکبریٰ کی تقویم اس قدر ناقص ہو گئی کہ سال و ماہ کے حساب میں ہر وقت غلطیاں ہونے لگیں تو جولیس سیزر نے اس کی اصلاح کے لیے ساتجنیز ہیئت دان کو اسکندریہ سے طلب کیا۔ چنانچہ اوس کے مشورہ کی بنا پر قمری سال منسوخ کیا گیا اور سرکاری سال شمسی قرار پایا اور اوس وقت سے

وہ تقویم رواج ہو گئی جو تیس سیز کے نام سے منسوب ہے۔

تیسرے مقدونی فرمانرواؤں کو اس برتاؤ کے لحاظ سے جو انہوں نے اپنے زمانہ کے مذہبی عقاید کے ساتھ کیا مورد الزام قرار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے مذہب کو اپنی سیاسی مقاصد کی تکمیل کا آلہ بنایا یعنی جہلا اور عوام پر اس کے ذریعہ سے اپنا شاہانہ اقتدار قائم رکھا اور جو سمجھ بوجھ رکھتے تھے ان کی تشفی فلسفہ سے کر دی۔ لیکن بلاشبہ ان کے اس طرز عمل کا موید وہ تجربہ تھا جو یونانیوں کو اپنی ایشیائی فوج کشی کی وجہ سے حاصل ہوا تھا اور جس کی بدولت وہ اقوام عالم میں ممتاز و سربرآوردہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے آبائی وطن کی مذہبی روایات کے بوسیدہ طلسم کو اپنی آنکھوں ٹوٹتا ہوا دیکھ چکے تھے اور ان عجائبات کی ظلمت کو جن کا پردہ قدیم شاعروں کے تخیل نے بحر دم کے اطراف و جوانب پر ڈال رکھا تھا تجربہ اور معلومات کی تیل روشنی کے سامنے کا فور ہوتے ہوئے مشاہدہ کر چکے تھے۔ اولپس کی پراسرار چوٹیوں پر دیوتا غائب ہو چکے تھے اور دیوتا تو ایک طرف رہے خود اولپس کا وجود ایک دہی و فرضی فسانہ سے زیادہ ثابت نہ ہوا تھا۔ ہیڈیز کے خوفناک نظاروں کا نقش پر وہ تصور سے محو ہو چکا تھا اس لیے کہ خود ہیڈیز ہی کا کہیں وجود نہ تھا۔ ایشیائے کوچک کے بربز بنگلوں سایہ دانیشینوں اور بہتے دریاؤں سے مقامی دیوتا اور دیمیان رخصت ہو چکی تھیں یہاں تک کہ ان کے بجا ریون کو شبہ ہونے لگا کہ یہ معبود کبھی ان مقامات میں رشتے بھی تھے یا نہیں۔ شامی لڑکیاں اگر اپنے عشقیہ گیتوں میں ابھی تک اڈانس کے حسرتناک انجام کی یاد کو

لے بنانی علم الاضنام کی روایات میں ایک نوجوان کا نام ہے جس پر بوجہ اس کے غایت درجہ حسین و جمیل ہونے کے دیس یعنی عشق و محبت کی دیوی عاشق ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اڈانس پر ایک جنگلی سور نے حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا۔ دیس نے اپنے معشوق کے زخم پر اگرچہ شراب آسمانی کے قطرے ٹپکائے جس سے زگس کے پھول پیدا ہو گئے لیکن وہ اس زخم جانستان سے جان بر نہ ہو سکا۔ مترجم

تازہ رکھتی تھیں تو اوس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آڈانس کا حقیقت میں وہ خسر ہوا جو روایات میں مذکور تھا بلکہ محض بطور تفضیل طبع۔ ایران نے رہ رہ کر اپنا قومی مذہب تبدیل کیا تھا۔ زردشت کے الہامی مذہب کو چھوڑ کر اوس نے مثنوی عقاید اختیار کیے تھے۔ پھر نئے سیاسی اثرات سے متاثر ہو کر مجوسیت کو اپنا قومی مسلک قرار دیا تھا۔ اوس نے آگ کی پرستش کی تھی اور اپنی قربانگاہوں کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر مقدس غنصر سے روشن رکھا تھا۔ اوس نے سورج کو اپنا معبود مانا تھا۔ اور جب سکندریا آیا تو اوس کا میلان عقیدہ ہمہ اوست کی طرف ہو چلا تھا۔

اوس ملک کے لیے جس کی دستگیری وہاں کے مقامی دیوتا سیاسی مصیبت کو وقت نہ کر سکے ہون تبدیل مذہب ایک لازمی شے ہے۔ مگر کے قدیم دیوتاؤں کو جسکر جلال عظمت کی یادگار میں اونچے اونچے مینار اور بڑے بڑے مندر قائم کئے گئے تھے ممالک غیر کے حملہ آوروں کی تلوار کے سامنے پے بہ پے اپنی گردن جھکانی پڑی۔ اہرام و ابو الہول کی سرزمین میں دیوتاؤں کی صورتوں نے کسی زندہ طاقت کے منظر ہونے کا ثبوت دینا نہ سہے چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں کو اب ادن پر مطلقاً ایمان نہ رہا تھا۔ اب ایسے دیوتاؤں کی ضرورت تھی جنہوں نے حال ہی بن جنم لیا ہو اور یہی وجہ تھی کہ آسیرس کی جگہ سرتیس نے لے لی۔ اسکندریہ کے گلی کو چون میں ہزاروں یہودی ایسے تھے جو اوس خدا کو بھول چکے تھے جس نے سرتیس کے مندر کے سب سے زیادہ مخفی حجرے کو اپنی سکونت کے لیے مخفی کر رکھا تھا۔

روایت الہام یا زمانہ کسی کا اشتراقی نہ رہا تھا۔ یورپین علم الاصنام کے افسانے ایشیائی الہام کی روایتیں مہری کا ہنوں کے قدامت آلودہ عقاید سب کے سب مٹ چکے تھے یا مٹتے جاتے تھے۔ یہی وہ نشانیاں تھیں جنہیں دیکھ دیکھ کر فرمانروایان سلسلہ بظلم و سبکی کی آنکھوں میں مذہبی عقاید کی بے ثباتی کی تصویر بھر گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ادن کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ایک چیز ایسی بھی ہے جو مذہب کی مختلف شکلوں سے زیادہ دیر پا ہے۔ یہ شکلیں تو طبقات الارض کے ازمنہ قدیم کی اعضائی شکلوں کی طرح ایک دفعہ ناپید ہو کر

جس پر اس ظاہر ہے تحقیق اس نمود ہے بود عالم کا پردہ پڑا ہوا ہے کیا جڑ ازل و ابدی حقیقت !!

یہ حقیقت ہم کو ان پاد و ہوار وایتون سے نہیں معلوم ہو سکتی جو ان لوگوں سے ہیں ترکہ میں پہنچی زمین جنہوں نے صبح تمدن کے طلوع کے وقت عالم ہستی کا جلوہ دیکھا تھا اور نہ ان بزرگوں کا خواب و خیال اس کا ماخذ ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو لہم من اللہ تصور کرتے تھے بلکہ اس کا مبداء و نشا مہند سائنہ تحقیقات اور فطرت کا لفظی و عملی تجربہ ہے۔ جس سے بنی نوع انسان پر مستقل بے شمار ادبے بہا برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

وہ دن بھی نہ آئے گا جبکہ تحریر اقلیدس کی ایک شکل سے بھی کسی کو انکار ہوگا۔ ایراقا میں اس کے اس دعوے کی تردید کی کبھی کسی کو مجال نہ ہوگی کہ زمین گول ہے۔ اسکندریہ اور سائر اکیوز میں جو عظیم الشان طبعی ایجادات و اکتشافات ہو چکی ہیں وہ نوح روزگار سے کبھی مٹ نہ سکیں گے۔ تیار کس۔ اپالوینس بطلیموس اور ارشمیدس کے نام ہر مذہب و ملت کے لوگ اس وقت تک جب تک کہ انسان کے سر میں دماغ اور منہ میں زبان ہے تعظیم کے ساتھ لیے جائیں گے۔ اس لیے عجائب خانہ اسکندریہ کے لہن سے علوم جدیدہ پیدا ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ اس عجائب خانہ کے قیام سے مدتوں پہلے چین اور سو پوٹیمیا میں اجرام فلکی کے مشاہدات ہو چکے تھے اور ہندوستان میں فن ریاضی کو ایک حد تک ترقی دی جا چکی تھی لیکن ان ممالک میں سے کسی میں بھی علمی تحقیقات میں تسلسل اور ربط نہیں پایا گیا۔ اور نہ عملی تجربوں ہی سے کام لیا گیا۔ یہ فخر موجودہ سائنس کی طرح اسکندریہ ہی کو حاصل ہے کہ اس نے مشاہدات محض کی حد سے بڑھ کر فطرت کے مطالعہ اور عملی تجربہ کی دادمی میں قدم رکھا۔

# دوسرا باب

## عیسائیت کی ابتدا

شاہی اقتدارات حاصل کرنے کے بعد اس کی تلب مابیت۔ اس کا تعلق سائنس کے ساتھ  
روما کی جمہوری حکومت کی مذہبی حالت۔ جمہوریت کے مبدل پر حکومت شخصی ہونے سے  
لوگوں کا میلان تو حد کی طرف ہو جاتا ہے۔ سلطنتِ روما میں مذہب عیسوی کی اشاعت۔ عیسائیت  
کو حکومت جس طریقہ سے ہاتھ آتی ہے اس کے سیاسی مقضیات عیسائیت اور بیت پرستی کے  
باہمی اتحاد کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ عیسائیت کے عقاید اور رسوم کے متعلق مضمین کا بیان۔  
مظنین کی حکمت عملی کا مخرب اثر۔ عیسائیت کا اتحاد حکمران جماعت کے ساتھ۔ عیسائیت اور  
سائنس کا تناقض باہمی کتب خانہ اسکندریہ کی بریادی اور توسیل فلسفہ کی مانعت۔ اگسٹائن کے  
فلسفہ اور پادریوں کے علوم کی حقیقت۔ کتب مقدس کو سائنس کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔

سیاسی معنوں میں عیسائیت وہ ترکہ ہے جو سلطنتِ روم متہ الکبریٰ نے دنیا کے  
لیے چھوڑا۔

جب روم نے جمہوری طرز حکومت چھوڑ کر شخصی حکومت کا طریقہ اختیار کیا تو وہ تمام آزاد  
و خود مختار قومیں جو بحرِ روم کے چاروں طرف آباد تھیں روم کی مطیع و منقاد ہو چکی تھیں۔ ان کا  
یکے بعد دیگرے مسخر ہونا بجائے اس کے کہ ان کو تباہ کرنا ان کے حق میں موجب سلامتی  
نہایت ہوا اس لیے کہ وہ ہمیشہ کی لڑائیاں جو ان کو ایک دوسرے سے دست و گریبان رکھتی  
تھیں موقوف ہو گئیں اور وہ مصیبتیں جو ان آئے دن کی خونریز معرکہ آرائیوں سے پیدا ہوتی تھیں



عالمگیر اسن سے مبدل ہو گئیں۔

نہ صرف اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر بلکہ فاتحانہ رعونت کے جذبہ کے اقتضا سے دولت رومائے مفتوح اقوام کے دیوتاؤں کو اپنے پایہ تخت میں لالسا یا اور اوس رواداری اور مسالمت کے ساتھ جس سے بوسے استغنا آتی تھی اوس نے ان سب کی پرستش کو جائز قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اصلی وطن میں جو غیر محدود اقتدار ہر دیوتا کو اپنی بجا یوں پر حاصل تھا وہ اون دیوتاؤں اور دیویوں میں شامل ہونے کی وجہ سے جن کا ایک جم غفیر اوس کی طرح دوسرے ممالک سے لایا گیا تھا عقدا ہو گیا۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے جغرافیائی انکشافات اور فلسفیانہ تنقید کی بدولت لوگوں کے قدیم مذہبی عقاید میں پہلے ہی بہت کچھ سزائزل واقع ہو چکا تھا۔ رومہ العبری کے اس طرز عمل کی بدولت جو رہا سہا اعتقاد دھسا اوس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

تمام ممالک مفتوحہ کے فرمانروا تخت سے اتارے جا چکے تھے اور ان کی جگہ ایک شہنشاہ مسند ارے حکومت تھا۔ اسی طرح دیوتا بھی سب کے سب معدوم ہو چکے تھے۔ سیاسی اور مذہبی خیالات میں جو تعلق ہمیشہ قائم رہا ہے اوس کے لحاظ سے یہ بات ہرگز قابل تعجب نہ تھی کہ تعدد معبودوں کی پرستش کے بجائے ایک معبود سے لو لگانے کا خیال دلوں میں گھر کر جائے۔ روایتیں بھی ایسا ہی ہوا۔ اول اول شہنشاہ کے مرنے پر اوسے ربانی اعزاز دئے گئے اور رفتہ رفتہ زندہ شہنشاہ خود چُپچُپ لگا۔

جس آسانی سے دیوتا پیدا کر لیے جاتے تھے دلوں میں اس کا ایک زبردست اخلاقی اثر پیدا ہوئے بغیر نہ رہا۔ جب کوئی نیا دیوتا لوگوں کی عقیدت کے سانچے میں ڈھل کر نکلتا تھا تو پُرانے دیوتا کی لامحالہ تنحیک ہوتی تھی۔ مشرق میں اوتاروں نے اور مغرب میں انسانوں نے دیوتاؤں کا روپ دہار کر اولپس کی ربانی آبادی کو بہت جلد جلد بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ایشیا کا اگر یہ قاعدہ تھا کہ دیوتا آسمان سے اتر کر انسانی قالب میں بروزی رنگ کے

اند رظاہر ہوتے تھے تو یورپ میں انسان زمین سے صعود کر کے آسمان پر چلا جاتا تھا اور دیوتاؤں کے زمرہ میں شریک ہو جاتا تھا۔ روم کے دامنِ اعتقاد کو تشنگ کی جس گرد نے آلودہ کیا وہ یونان سے نہ اٹھی تھی بلکہ کثرتِ مذاہب کی وجہ سے رومین خود بد اعتقاد می کی خاک اڑنے لگی تھی۔

تعد دے تو حد کی طرف رجوع کرنے میں روم کی آبادی کے تمام طبقوں نے یکساں سرعت کے ساتھ کام نہیں لیا۔ تجارتِ قانون دان اور سپاہی جو اپنے مشاغل کی نوعیت کے لحاظ سے سرد گرم زمانہ کا زیادہ تجربہ رکھتے ہیں اور دماغی قابلیت سے بھی نسبتاً زیادہ بہرہ اندوز ہوتے ہیں سب سے پہلے متاثر ہوئے۔ ان کے بعد کاشتکاروں اور مزدوری پیشہ لوگوں کی باری آئی۔

جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنتِ روم انتہا سے ترقی پر فائز ہو گئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجہ اخیر کو پہنچ چکی تھی۔ اہل روم کی عیش پرستی و عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ اون کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہیے کہ زندگی کو ایک سلسلۂ العیش بنا دے۔ پاکبازی حفظِ نفس کے خوانِ نعمت پر سنبھل نہ لگادان ہے اور اعتدال سلسلۂ حفظِ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے۔ اون کے دستِ خوان سونے چاندی کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی پچھے کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اون کے ملازم زرق برق کی پوشاکیں پہنے اون کی خدمت کے لیے کمر بستہ کھڑے رہتے تھے۔ ماہر و دیان روماء جو عام طور پر عصمت کی طلائف زنجیر کی قید سے آزاد تھیں اون کی جھتی انیکر مجنون کا مبطع دو بالا کرنے کے لیے عونا ز رہتی تھیں۔ عالیشان حماموں و نکش تاشا کا ہون اور جوشِ آفرین و تلکون سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی و زندوں سے اوس وقت تک مصروف زور آزمائی رشتے تھے جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لیے خاک و خون میں سوجائے اہل روم کے سامان

تمیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا۔ دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت اور پرستش کے لائق اگر کوئی شے ہے تو وہ قوت ہے۔ اس لیے کہ اسی قوت کی بدولت تمام اوس سرمایہ کا حاصل کرنا ممکن ہے جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکا ہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے۔ مال و الماک کی ضبطی۔ صوبجات کے محاصل کی تشخیص زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے اور فرمانرواے دولت روم اس زور و قوت کا نشان یا علامت ہے۔ غرض روم کے نظام تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی لیکن یہ جھلک اوس نمایشی طمع کی چمک کے مشابہ تھی جو یونان عہد قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا۔

اس زمانہ میں جسکا ہم ذکر کر رہے ہیں دولت روم کے ایک مشرقی صوبہ یعنی شام میں طبقہ ادنیٰ کے چند بے بضاعت لوگوں نے ایک مذہبی برادری قائم کر رکھی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اپنا بے جنس کے ساتھ نیکی کا سلوک کیا جائے۔ ان لوگوں کے اصول ہمہ گیر اخوت کے اوس جذبہ سے توافیق کلی رکھتے تھے جسکا پیوند ممالک مفتوحہ کے الحاق و انضمام نے اخلاق کی شاخ میں لگا یا تھا۔ یہ اصول حضرت عیسیٰ ابن مریم کی تلقینات سے تھے۔

اس زمانہ میں بنی اسرائیل کا بعض روایات کی بنا پر یہ عقیدہ تھا کہ ادن کی قوم میں سے ایک نجات دہندہ پیدا ہوگا جو ادن کے گزرے ہوئے جاہ و جلال اور کھوئی ہوئی عظمت و توقیر کے احیاء و رجعت کا باعث ہوگا حضرت عیسیٰ کے شاگرد تو ادنہیں وہ مسیح موعود سمجھ کر ادن پر ایمان لے آئے جس کے ظہور کی بشارت بزمانہ سابق دی جا چکی تھی لیکن یہودی کاہنوں نے یہ دیکھ کر کہ جناب مسیح کی تعلیم ادن کی اغراض کے منافی ہے ادن کی شکایت رومی گورنر سے کر دی جس نے کاہنوں کی رضا مندی مقدم سمجھ کر ادنہیں بہ تامل بسیار موت کے حوالہ کیا۔

جناب مسیح کی فیاضانہ تعلیم جس میں انسانی اخوت کا نکتہ مغز تھا اس واقعہ کے بعد بھی

زندہ رہی۔ حواریان مسیح نے منشر ہونے کے بجائے اپنا ایک جتھا قائم کر لیا۔ اصول سلوات جایدا کی بنا پر اس برادری کا ہر رکن جایدا مشترکہ میں اپنا اپنا سرمایہ اور آمدنی شریک کر دیتا تھا۔ اس طور پر جماعت مسیحی کی ہواؤں اور تہیوں کی پرورش اور مغلصوں اور مرلیضوں کی نگہداشت ہونے لگی۔ اس بیچ مہرز کو کس مہرس جماعت نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک نئی اور جیسا کہ واقعات نے آگے چل کر ثابت کر دیا ایک زبردست جماعت کی شکل اختیار کر لی جس کا نام کلیسا تھا۔ کلیسا کو نئی تحریک تو اس لیے کہنا چاہئے کہ اس قسم کی کوئی جماعت اس سے پہلے وجود میں نہ آئی تھی اور زبردست اس لیے کہ مقامی کلیساؤں نے جواول اول منتشر و منفرد تھے اپنی مشترکہ اعراض کے تحفظ کے خیال سے اجتماعی تدابیر اختیار کرنی شروع کیں اور ان سب کے باہمی اجتماع سے ایک کلیسا پیدا ہو گیا۔ اسی اجتماع کی بدولت عیسائیت کو تمام سیاسی فتوحات میسر ہوئیں۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں روم کے جیسی تسلط کی وجہ سے عالمگیر امن قائم ہو چکا تھا اور اقوام مفتوحہ میں برادرانہ ارتباط کے خیالات پیدا ہو گئے تھے۔ لہذا سلطنت کے طول و عرض میں جدید تحریک یعنی مسیحی تعلیم کی سریع السیر اشاعت کے لیے رستہ صاف تھا۔ یہ تحریک ارض شام سے شروع ہوئی اور تمام ایشیائے کوچک میں پھیلی ہوئی قبرس یونان اور اٹلی میں جا پہنچی اور بالآخر وہاں سے مغرب کی طرف بڑھتی ہوئی فرانکس اور برطانیہ پر مسلط ہو گئی۔

مسیحیت کے اعلا میں اون منادوں نے بہت بڑا حقہ لیا جو ہر طرف اس دین کی منادی کرتے پھرتے تھے۔ اور یہ وہ طریقہ تھا جس سے فلسفہ کے قدیم مذاہب کے پیروں نے کبھی فائدہ نہ اٹھایا تھا۔

اس نئے مذہب کی حد بندی میں سیاسی حالتیں ایک بڑے دوہ تک معین ہوئیں۔ چنانچہ آخر الامر عیسائیت اون تمام ممالک میں پھیل گئی جن پر رومی پھر براڈا تھا۔ اور بجا کر

یورشلیم کے جس کے مشہد مسیح ہونے میں کلام نہیں ہوا جہاں پطرس کا دفات پانا مشتبہ ہے مذہبی پایہ تخت ہو گیا۔ لیکن باوجود اون متبرک و مقدس یادگار دن کے جو جمعیین اور کیلوری کے ساتھ وابستہ ہیں بہتر یہی تھا کہ عیسائیت کا پرچم سات پہاڑیوں والے شہنشاہی دارالامارہ پر لہراتا ہوا نظر آئے۔

سالہا سال تک مذہب عیسوی صرف تین اصولوں کی تلقین کرتا رہا یعنی حق اللہ تعالیٰ اور حق العباد جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ خدائے بزرگ و برتر کی تعظیم و تکریم کرے۔ ذاتی طور پر نیک اور پاکباز ہو اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ بھلائی کرے۔ اول اول جب یہ مذہب کمزور تھا تو اس نے لوگوں کو نرمی اور انکسار کے ساتھ دعوت دی لیکن جب مسیحی جماعت تعداد اور اثر کے لحاظ سے غالب ہو چلی تو اس میں سیاسی شان نمودار ہوئی اور حکومت کے اندر حکومت اور سلطنت کے اندر سلطنت قائم کرنے کا رجحان اس میں پایا جانے لگا۔ چنانچہ یہ رجحان اس وقت سے لے کر اب تک برابر قائم رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا میلان اس کے نشوونما کا لازمی نتیجہ ہے۔ فرماؤ یا ان دونوں نے اس کی اس ایچ کو اپنی نظم و نسق سلطنت کی راہ میں مزاحم پاکر اس کا سد باب جنگی قوت سے کرنا چاہا۔ اور ایسا کرنے میں انہوں نے اپنے اون فوجی اصولوں کو پیش نظر رکھا جن کی زور سے شہنشاہانہ تفوق کے برقرار رکھنے کا ذریعہ بجز دباؤ کے اور کچھ نہ تھا۔

۳۰۲ء کے موسم سرما میں بعض پلٹنوں کے عیسائی سپاہیوں نے اون مذہبی رسوم میں شریک ہونے سے انکار کر دیا جو دیوتاؤں کی پوجا کرنے اور انھیں بھینٹ دینے کے لیے قدیم سے چلی آتی تھیں۔ یہ بغاوت اس سرعت کے ساتھ پھیلی اور حالت ایسی نازک ہو گئی کہ قیصر ڈیو کلیشن کو مجبوراً ایک مجلس شوریٰ اس غرض سے منعقد کرنی پڑی کہ اس موقع پر کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ جو مشکلات پیدا ہو گئیں تھیں اون کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ قیصر کی ملکہ اور اس کی بیٹی دونوں کی دونوں مسیحی المذہب تھیں۔ قیصر

ایک نہایت بیدار منظر اور فرزانہ و دور بین شخص تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نئی جماعت کے زور کو توڑنا جس کے بغیر چارہ نہیں ایک سیاسی ضرورت ہے لیکن پھر بھی جب اس نے فرمانِ انطاکیہ بغداد جاری کیا تو یہ صراحت کر دی کہ خوزریزی سے احتراز کیا جائے۔ لیکن ایک غیظ آلود انہو کے جوش و خروش کو کون روک سکتا ہے۔ نیکو میڈیا کے گرجے کی اینٹ سے اینٹ بچ گئی۔ اس کا جواب سیمی جماعت نے یہ دیا کہ قیصر کے محل کو آگ لگا دی ایک شاہی فرمان کی علامت توہین کی اور اس سے پر نہ بے پرزے کر ڈالا۔ سیمی افسران فوج ملازمت سے برطرف کئے گئے۔ قتل عام کی نوبت پہنچ گئی۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ واقعات کی سیل جوار کا بہاؤ اس قدر زبردست تھا کہ قیصر بھی اس کی روک تھام نہ کر سکا۔

اب یہ بات روز روشن کی طرح آشکارا ہو گئی کہ عیسائی گروہ نے جو سلطنت کا ایک رکن اعظم ہے اون سفاکانہ مظالم کی وجہ سے جوش میں آکر جو اس پر روار کھے گئے تھے عزم بالجبرم کر لیا ہے کہ اب ان سختیوں کو برداشت نہ کرے گا۔ تو آپو کلیشن نے سنہ ۶ میں اپنی مرضی سے تخت چھوڑ دیا۔ قسطنطین نے جو تخت و تاج کے سابقین میں سے تھا ازراہ غایت مال اندیشی کلم کلام مسیحیت کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حصہ میں مرد عورت بچے بوڑھے اس کی جان نشاری اور ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے اور اس کی خاطر لڑنے مرنے کے لیے مستعد ہو گئے۔ اس کے علاوہ شاہی افواج میں جو سیمی بہ تعداد کثیر موجود تھے وہ اس کی جانبازانہ متابعت کے لیے تیار ہو گئے۔ رستو یا کے پل کے قریب ایک بہت بڑی جنگ ہوئی جس میں اسے کامل فتح حاصل ہوئی اور اس کے تمام منصوبے بار آور ہو گئے۔ پہلے میکسن اور اس کے بعد لائسنیس کی موت نے اون تمام رکاوٹوں کو جو اس کی راہ میں حایل تھیں دور کر دیا۔ اور اولین سیمی فرمانروا ہونے کی حیثیت سے اس نے قیصرہ کے تخت پر قدم رکھا۔

فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ اب جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے

اور مرتبے مٹنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا دار لوگ جنہیں مذہب کی خس برا بر بھی پروانہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ جو شیلے حامی ہو گئے۔ چونکہ وہ بظاہر عیسائی لیکن بہ باطن شرک و بت پرست تھے لہذا اون کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بُت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی قسطنطین نے کہ وہ بھی انہیں کا ہم مشرب تھا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے اون کے اس منافقانہ طرز عمل کا سد باب ہو۔ قسطنطین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گزری اور کہیں آخری وقت (۳۳۷ء) میں جا کر اس نے اون مذہبی مراسم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔

اون ترمیمات کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے جو مذہب عیسوی میں بیرونی عناصر کی آمیزش کی وجہ سے پیدا ہو کر آج کے دن تک قائم ہیں اور جن کی بدولت اس مذہب کو مسیحیت کے ساتھ دست و گریبان ہونا پڑا ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانہ میں جب اس دین کا چشمہ گدلا نہ ہوا تھا اس کی کیا حالت تھی حسن اتفاق سے یہ کیفیت ہمیں قسطنطین کی اس تحریر سے بہم پہنچی ہے جو اس نے قیصر تیوڈورس کے زمانہ میں جبکہ عیسائیوں پر طرح طرح کے ظلم ہو رہے تھے بمقامِ رومِ مقدسہ کی تھی۔ یہ تحریر جس میں عیسائیوں کی طرف سے اون الزامات کا جواب دیا گیا ہے جو اون پر غیر مسیحیوں نے لگائے تھے قیصر کے نام نہیں ہے بلکہ اس کا ردے سخن اون حکامِ عدالت کی طرف ہے جو مزین کے مقدمات کی دہشت کی غرض سے نامور ہوئے تھے۔ اس میں نہایت سلیقہ اور متانت کے ساتھ اس تمام دلائل و واقعات کا استقصا کیا گیا ہے جو قائم عیسائیت کی تائید میں پیش کر سکتا تھا اور تمام دنیا کو مسیحی عقاید اور مسیحیوں کی حالت سے روشناس کیا گیا ہے۔ وہ بختی دشمنوں جو یاد یون کے طرزِ خطاب کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اس میں نام کو نہیں پائی جاتی بلکہ ہر ہر سطر سے تاریخی متانت و ثقافت ٹپک رہی ہے۔ عہدِ قدیم کی مسیحی تصانیف میں جو درجہ اس تحریر کو حاصل ہے کسی اور تصنیف کو میسر نہیں ہوا۔ قسطنطین کی اس تحریر کا زمانہ

شک ہے۔

ٹرلین اپنا بیان صفائی نہایت قابلیت سے شروع کرتا ہے۔ وہ حکام عدالت سے خطاب ہو کر کہتا ہے کہ مسیحیت دنیا میں نئی نئی آئی ہے اور اوس ملک میں جو اوس کا اصلی وطن نہیں ہے اگر اوسے دشمنوں سے سابقہ پڑے تو اس میں کوئی اچھے کی بات نہیں۔ اوس کی استدعا صرف اسی قدر ہے کہ روم کے مسیحی ٹریٹ او سے برات کا موقع دین اور اوس کا بیان سماعت کئے بغیر اوس کے خلاف تجویز صادر نہ کریں۔ اگر اوسے ایسا موقع دیا گیا تو سلطنت کے قوانین آفتاب و ماہتاب بن کر چلکین گے لیکن اگر اوسے اپنی برات میں زبان ہلانے کی اجازت نہ دی گئی تو اوس انصاف کی اغراض پوری نہ ہون گی جس کے لحاظ سے رومۃ الکبریٰ شہرہ آفاق ہے۔ کسی شے سے خواہ وہ فی الحقیقت نفرت ہی کے قابل کیوں نہ ہو ایسی حالت میں نفرت کرنا جبکہ ہم کو اوس کے متعلق کچھ علم نہ ہو خلاف شیوہ معدلت ہے۔ روم کے قوانین کا تعلق اوس افراد سے ہے جو اشخاص سے سرزد ہوں نہ کہ اشخاص کو اسما سے۔ لیکن افسوس ہے کہ باہن ہمد بعض اشخاص روم کی عدالتوں میں سزا یاب ہوئے ہیں نہ اس لیے کہ اوس سے کوئی جرم سرزد ہوا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ مسیحی کہلاتے تھے۔ اس کے بعد وہ مسیحیت کی ابتدا۔ اس کی ماہیت اور اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس کی بنیاد عیسیٰ پر ہے جو سب کتب سے زیادہ متبرک اور قدیم ہیں۔ اور اس مسئلہ کے متعلق مسیحی ٹریٹون سے اس طرح خطاب کرتا ہے:۔ صحت موسیٰ جن میں خدا نے یہودی اور اس لحاظ سے عیسائی مذہب کو ایک بیش بہا خزانہ کی طرح محفوظ کیا ہے آپ لوگوں کی قدیم ترین کتب بلکہ آپ کی سرکاری عہدات آپ کی قائم کی ہوئی حکومت آپ کے بڑے بڑے شہروں آپ کے تاریخی کارناموں آپ کی زمانی یادگاروں اور آپ کی اوس ابجد کے حروف کی ایجاد سے بھی زیادہ قدیم ہیں جو علوم و فنون کی مودل اور عجائبات قدرت کی محافظ ہے۔ بلکہ میں اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ محافظ



آپ کے دیوتاؤں آپ کے مندروں آپ کے غیب گو کا ہنوں اور آپ کی رب النوعی  
 قربانیوں سے بھی عمر میں زیادہ ہیں ان صحابہ کی متغیر بل کا زمانہ محاصرہ ٹرا سے ایک  
 ہزار سال اور ہومر سے پندرہ سو سال پہلے کا ہے۔ زمانہ راستی کا حلیف ہے اور ارباب  
 فہم و تیز بجز اون باتوں کے جو تحقیق اور مسلم ہوں اور جن کی تصدیق زمانہ کر چکا ہو اور کسی بات کو  
 نہیں مانتے۔ ان صحت مقدسہ کی صحت کا سب سے بڑا انحصار اون کی غیر معمولی قدامت  
 پر ہے۔ سلسلہ بطلمیوس کے سب سے زیادہ فاضل فرما کر و افلیڈ لفس نے جس کی اکیلیت  
 مسلم الثبوت ہے ڈیٹر ٹرس فائرس کے مشورہ سے ایک نسخہ ان کتب سادی کا ہم پہنچایا  
 تھا جو اب تک اوس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ان کتب کے سادی الاصل ہونے کا  
 ثبوت یہ ہے کہ کچھ ہمارے زمانہ میں ہو رہا ہے وہ پہلے سے ان میں مذکور ہے اور جو  
 واقعات ان کو ان کے نازل ہونے کے بعد سے پیش آئے ہیں وہ سب ان میں  
 مستدج ہیں۔

کیا کسی پیشین گوئی کا پورا ہونا اوس کی سچائی کی دلیل نہیں ہے؟ اور واقعات نے  
 جو پیش آچکے ہیں جب اون پیشین گوئیوں کی سچائی پر مہر لگادی ہے جو ان کے  
 متعلق قبل از قبل کی گئی تھیں تو کیا اون واقعات کو صحیح تسلیم کرنے کے لیے جنکے وقوع کے  
 متعلق دوسری پیشین گوئیاں اسی قبیل کی موجود ہیں ہم مورد الزام قرار دے جاسکتے ہیں؟  
 پس چونکہ ہم اون باتوں پر ایمان لائے ہیں جنکے متعلق انا جیل میں پیشین گوئی کی جا چکی ہے  
 اور جو پیشین گوئی کے مطابق ظہور میں آئیں لہذا ضرور ہے کہ ہم دوسری باتوں پر بھی ایمان  
 لائیں جو ابھی ظہور میں نہیں آئیں لیکن اون کے متعلق او نہیں انا جیل میں دوسری  
 پیشین گوئیاں موجود ہیں۔

انا جیل مقدسہ کی تعلیم یہ ہے کہ خدا ایک ہے جس نے کائنات کو عدم سے پیدا کیا  
 اور جو اگرچہ ہر روز نظر آتا ہے لیکن ہم بھی آنکھوں سے نہاں ہے۔ اوس کی غیر محدودیت

کا حال بجز اوس کے اور کسی کو معلوم نہیں۔ اوس کی بے انتہا بڑائی نے اوسے چھپا رکھا لیکن ساتھ ہی ظاہر بھی کر رکھا ہے۔ اوس نے انسان کے اعمال حسنہ و سنیہ کے لحاظ سے جزا و سزا مقرر کی ہے۔ یوم نشور کے دن تمام وہ انسان جو آخرتیش کائنات سے اوس کے خاتمہ تک پیدا ہو کر مر چکے ہیں اوس کے حکم سے دوبارہ زندہ ہوں گے اور اپنے دنیوی قالب اختیار کریں گے۔ اس کے بعد وہ اون کے اعمال کی جانچ کرے گا اور جو نیک ہوں گے انہیں تولدت جاودانی عطا فرمائے گا اور جو بد ہوں گے انہیں ابدی شعلون میں جھونک دے گا۔ دوزخ کی آگ سے مراد وہ چھپے ہوئے شعلے ہیں جو تعزیز میں بھٹک رہے ہیں۔ زمانہ گذشتہ میں وہ منادوں یا پیغمبروں کو اخلاق و روحانیت کی تعلیم کے لیے امور کرچکا ہے۔ اس قدیم زمانہ کے پیغمبر یہودیوں کی قوم میں پیدا ہوئے اور انہوں نے غیب کی آواز بنی اسرائیل تک پہنچائی جنہوں نے اس آواز کو بشکل اناجیل قلمبند کر لیا۔ ہم پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم ایک انسان کی پرستش کرتے ہیں بنی اسرائیل کے خدا کی عبادت نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ہمارے دلوں میں جناب مسیح کی طرف سے جو ارادت و عقیدت جاگزیں ہے اوس جو خدا کی اوس عظمت میں جس کا ہمیں اعتراف ہے کوئی فرق نہیں آتا۔

ان بزرگان دین کی برگزیدگی کی وجہ سے یہودیوں پر خدا نے اپنے خاص احسانات اور برکتیں نازل کیں۔ اور ان کو شرف ہم کلامی عطا کیا۔ تاہم ایزدی سے وہ مراتب جاہلیہ پر فائز ہوئے۔ لیکن بخت نفس کے باعث یہ سرکش قوم خدا کو بھول گئی اور اس کے قوانین پر جس پرستی کو ترجیح دینے لگی۔ اس پر خدا نے انہیں متنبہ کیا کہ اگر تم باز نہ آؤ گے تو میں تم سے زیادہ وفادار اور اطاعت شعار بندوں کو اپنی رحمتوں کا شرف بخشوں گا لیکن جب ان کے تمرد نے اس انتباہ کو بھی نظر انداز کیا تو خدا نے ان کو ان کے وطن سے خارج کر دیا اور وہ دشت غربت میں سرگشتہ و سراپہ مٹھکنے لگے۔ آج وہ تتر بتر ہو کر تمام اہل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے نصیبوں میں ذلت و خواری ہے۔ وہ در بدر مارے مارے پھرتے ہیں۔

اوس ہوا سے اون کے مشام نا آشنا ہیں جس کے جھونکون نے اون کے گہواروں کو بھلایا تھا۔ اوس زمین کو اون کی آنکھیں ترس گئی ہیں جہاں اونہوں نے اول اول عالم ہستی کا تماشا دیکھا تھا۔ اب اون کا سر پرست نہ خدا ہے نہ انسان۔ خدا نے جس بات کی اونہیں دھکی دی تھی وہ پوری کر کے دکھا دی۔ اوس نے دنیا کے دوسرے ممالک اور دوسری اقوام سے ایسے بندوں کا انتخاب کیا جو اون کے مقابلہ میں زیادہ وفادار تھے۔ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے اوس نے یہ بشارت دی تھی کہ ان نئے بندوں پر اوس کی خاص رحمتوں کا نزول ہوگا اور اون میں ایک مسیحا پیدا ہوگا جو اون میں ایک نئی شریعت کی اشاعت کرے گا۔ یہ مسیحا جناب عیسیٰ تھے جو خدا بھی ہیں اس لیے کہ جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع جلتی ہے اسی طرح ایک خدا سے دوسرا خدا پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا اور اوس کا بیٹا متحد الوجود ہیں۔ روشنی دونوں شمعوں کی ایک ہی ہے۔

کتب مقدسہ میں مذکور ہے کہ ابن اللہ کا ظہور دنیا میں دو مرتبہ ہوگا۔ پہلی مرتبہ بحالت عجز و انکسار۔ دوسری مرتبہ محشر کے روز جاہ و جلال کے ساتھ۔ یہودیوں کو یہ کل باتیں اون کو پیغمبر پیشتر سے جھلا چکے تھے لیکن اون کے گناہوں کی تازیکی اون کی آنکھوں پر کچھ ایسی چھا گئی تھی کہ جب وہ پہلی مرتبہ آیا تو اونہوں نے اسے بالکل نہ پہچانا اور اس وقت تک اوس کی آمد آمد کا فضول انتظار کر رہے ہیں۔ وہ یہی کہتے رہے کہ مسیح کے معجزے آسمانی نشان نہ تھے بلکہ جاودے کرتھے تھے۔ علمائے مذہب اور پیشوایان دین اوس کو خدا کی نظر سے دیکھنے لگے اور حاکم وقت بائیسٹ کے دربار میں جا کر اوس پر طرح طرح کے بہتان باندھے۔ اوس کو صلیب پر چڑھایا گیا اور جب اوس کا دم نکل گیا اور وہ زمین میں دفن کر دیا گیا تو تین دن کے بعد وہ قبر سے اٹھا اور چالیس دن تک اپنے حواریوں میں رہا۔ اس کے بعد وہ بادل میں لپٹا ہوا سیدھا آسمان کو چلا گیا اور یہ وہ واقعہ ہے جس کی شہادت ردیوس یا کسی اور رومی بادشاہ کی معراج کی انسانی شہادت سے بدرجہا زیادہ معتبر ہے۔

اس کے بعد مٹلمین نے شیطان اور اوس کے گروہ کثیر الانفار کی تکوین اور ماہیت بیان کی ہے اور کہا ہے کہ شیاطین اپنے فرمانروا ابلیس کے حکم سے طرح طرح کی بیماریاں - تغییرات ہوا - امراض و بانی اور پیداوار ارضی کی تباہی کے بانی ہوتے ہیں - انہیں کے درغلانے سے انسان بتوں کو بھینٹ دیتا ہے تاکہ انہیں قربانیوں کا خون جو ان کی غذا ہے چوسنے کو ملے - شیاطین پرندوں کی طرح سبک سیر ہوتے ہیں اس لیے ریل مسکون میں جو واقعات گذرتے ہیں سب ان کو معلوم ہو جاتے ہیں اور چونکہ ان کی بود و باش ہوا میں ہے لہذا دن کو عرش کے حالات بھی معلوم ہوتے رہتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کو دھوکا دے کر غلط باتیں بادر کر دیتے ہیں اور غیب گوئی بھی کرتے ہیں جو انسان کو گمراہ کرتی ہے مثلاً رومان میں شیاطین نے اس واقعہ کا اعلان کیا کہ شاہ پرسیوس پر رومی فوجوں کو فتح حاصل ہوگی لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ پشین گوئی اوس وقت کی گئی جب کفر کی خبر اودن کو مل چکی تھی - وہ بیماروں کو جھوٹا سوٹ اچھا بھی کر دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ اول تو کسی شخص کے جسم میں حلول کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بیمار ہو جاتا ہے اور اوس کے بعد کوئی نسخہ تجویز کر کے اوس کو ستانا چھوڑ دیتے ہیں اور آسیب زدہ کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اوسے دانہ شفا ہو گئی -

اگرچہ عیسائی شہنشاہ کو خدا انہیں مانتے مگر پھر بھی وہ اوس کی ترقی و دولت و اقبال کے لیے ہمیشہ دست بدعا رکھتے ہیں اس لیے کہ وہ عظیم تہلکہ جو دنیا میں پڑے والا ہے اور وہ بلا سے مہم جس سے نظام عالم کا شیرازہ بکھرنے کا خوف ہے اوسی وقت تک رکی ہوئی ہے جب تک کہ یہ سلطنت قوی شوکت قائم ہے - عیسائیوں کی یہ دعا ہے کہ خدا اودن کو دیر سا کا یہ ہولناک خاتمہ نہ دکھائے - وہ فقط ایک جمہوری سلسلہ کے قایل ہیں لیکن یہ سلسلہ غلام عالم کو محیط ہے - اودن کی ایک برادری ہے - وہ ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں اور نجات اخروی کے امیدوار ہیں - وہ صرف شہنشاہ اور حکام ہی کے لیے نہیں بلکہ قیام امن کے لیے

بھی دعا کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتب مقدسہ کو اس غرض سے پڑھتے ہیں کہ ان کے ایمان میں استواری  
 ان کی امیدوں میں وسعت اور اس بھروسے میں استحکام پیدا ہو جو انہیں خدا کی ذات  
 پر ہے۔ ان کی مجلسیں انہام و تغیر کی غرض سے منعقد ہوتی ہیں۔ وہ بدکرداروں کو اپنی جماعت  
 سے خارج کر دیتے ہیں اور ان کے پیشوایان دین ان کی افراد کی رائے سے منتخب  
 ہوتے ہیں جنہیں ان کا اقتدار کرنا ہوتا ہے۔ ہر مہینہ کے ختم پر ہر جماعت کے ہر شخص کو اختیار ہو  
 کہ اپنی قدرت کے موافق کچھ رقم بطور چندہ دے لیکن چندہ دینے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا۔  
 جو رقم اس طور پر جمع ہوتی ہے وہ گویا چندہ دینے والوں کے زہد و اتقا کی نمائندگی ہے۔  
 یعنی اپنے نفس کی آسائش پر صرت نہیں کی جاتی بلکہ مساکین کی پرورش اور تحنن و شکر میں یکسر  
 اور نادر تیمم چون کی خبر گیری ضعیف العمر خاندان دین کی امداد اور ان لوگوں کی انانیت میں  
 اٹھائی جاتی ہے جسکے جہاز تباہی میں آگئے ہوں یا جن کو دین حق پر ثبات قدم رہنے کی وجہ  
 سے جلا وطنی یا قید یا کانون میں مزدوری کرنے کی سزا دی گئی ہو۔ عیسائیوں میں بجز ان کی  
 بیبیوں کے اور کل مال و متاع مشترک الاستعمال ہے۔ نہ تو وہ اس حرص سے پیٹ بھرتے  
 ہیں کہ گویا کل ہی مر جائیں گے اور نہ عمارتیں ایسی عالیشان بناتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ  
 قیامت کے پورے پلٹیں گے۔ ان کی زندگی کا مقصد پاکبازی انصاف و اعتدال  
 اور عصمت ہے۔

مؤلفین نے جہاں اپنے زمانہ کے مسیحی عقاید اور روش زندگی کی یہ دلپذیر تصویر  
 کھینچی ہے وہ ان حکام عدالت کو ایک عظیم الشان واقعہ کے متعلق جو عنقریب پیش آئے گا  
 تھان الفاظ میں بے ہتھک و مکی بھی دی ہے۔ اگرچہ ہماری جماعت کے قیام کو کچھ زیادہ  
 عرصہ نہیں ہوا لیکن وہ کونسا مقام ہے جہاں ہم موجود نہیں۔ شہر۔ قلعے۔ جزیرے۔ صوبے  
 انجمنیں شہر کے گلی کو پے۔ تباہی عملات۔ دکلاے جمہور کے اجلاس۔ فوجی بارکین غرض ہر  
 اوس مقام پر جو آپ لوگوں کی قوت کی خارجی علامت ہے ہم لوگ برابر پاسے جاتے ہیں۔

بجز آپ کے مندروں کے ہم نے آپ کے قبضہ میں اور کوئی شے نہیں چھوڑی غور کیجئے کہ اگر ہم چاہیں تو جنگ کا کیسا طوفان عظیم بپا کر سکتے ہیں۔ اگر تم کو ہمارا مذہب بس کی تعلیم یہ ہے کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے نہ روکے ہوئے ہو تو کس سرعت اور مستعدی سے ہم مسلح ہو کر آپ کے خلاف مدد کر آ رہے ہو سکتے ہیں۔

اپنا بیان صفائی ختم کرنے سے پیش تر ٹائمن نے اوس دعوے کا از سر نو ذکر کیا ہے جس پر ازمنہ مابعدین علمدرا آمد ہونے سے یورپ کی علمی ترقیوں پر ایک بہت بڑا اثر پڑا۔ اوس کا دعویٰ یہ ہے کہ کتب مقدسہ کو وہ گنج شائے گمان سمجھنا چاہیے جس سے دنیا نے علوم و فنون اور دانش و حکمت کے موتی اور جواہر ریزے حاصل کیے ہیں۔ اگر کسی حکیم و فلسفہ کا کوئی نکتہ بیان کیا ہے تو انہیں صحف کے اسرار حکیمہ سے فیض پا کر اور اگر کسی شاعر کو کوئی اچھوتا مضمون ہاتھ آیا ہے تو انہیں مقدس کتابوں کی تخیل آفرینی کی بدولت۔ غرض اوس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہود جدید و عتیق صدق و حقیقت کا معیار مطلق ہیں اور جو مسئلہ ان کے اھول کے مطابق نہ ہو وہ لامحالہ غلط ہے۔

ٹرٹلیٹن کی اس فاضلانہ تحریر سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جب عیسائیت معاذین و مخالفین کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنی ہوئی زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی تو اوس وقت اوس کی کیا حالت تھی۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ شہنشاہانہ اقتدارات حاصل کرنے کے بعد اس میں کیا تبدیلی پیدا ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیورس کے زمانہ کی عیسائیت اور قسطنطین کے زمانہ کی عیسائیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بُت پرستی اور مذہب عیسوی کے مخلوط ہو جانے کے دو بڑے اسباب تھے۔ اول نئے خاندان شاہی کی ملکی مصلحتیں اور سیاسی ضرورتیں۔ دوم وہ طرز عمل جو نئے مذہب نے اپنی اشاعت کے لئے اختیار کیا۔

(۱) اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اوس نے اپنی گون کا بچھا

اوسے تخت پر بٹھا دیا لیکن یہ قدرت اوسے پھر بھی نہ حاصل ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی  
بت پرستی کا استیصال کلی کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کو اصول  
شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی  
شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔ عیسائیت اور اسلام میں اس بارہ میں یہ بڑا فرق ہو کہ  
اسلام نے اپنے مد مقابل کو مطلقاً نیست و نابود کر دیا اور اپنے عقاید کو بلا کسی آمیزش  
کے شائع کیا۔

قسطنطین کا طرز عمل ہمیشہ اوس کے اس عندیہ کی شہادت دیتا رہا کہ وہ اپنی رعایا کے  
کل طبقوں کو ایک آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے فریق کا سیاب کی وکالت کو اپنی فرمانروائی کا  
اصول نہیں قرار دینا چاہتا۔ پس جہاں اوس نے گرجا تعمیر کئے بت پرستوں کے لیے مندر  
بھی بنوائے۔ اگر پادروں کی سرگوشیوں پر کان دہرا تو بت پرست کا ہنوں سے بھی مشورہ  
کیا۔ نائیکیا کی مسیحی کونسل منعقد کی تو دولت کے بت پر بھی چڑھا دے چڑھاے۔ مطباغ  
کی رسم کو قبول کیا تو ایک تمغہ بھی مسکوک کرایا جس پر اوس کا ربانی لقب ثبت تھا۔ قسطنطینیہ  
میں سنگ ساق کے ایک مینار کی چوٹی پر اوس کا بونیسہ نصب کیا گیا وہ اصل میں اپالودوتا  
کی ایک قدیم صورت تھی جس کے خط وخال بدل کر قسطنطین کی صورت سے مشابہ بنا دی گئے  
اور مہر کے گرد اگر دو چرخیں چکی نسبت میان کیا جاتا تھا کہ حضرت عیسیٰ کو مصلوب کرتے وقت  
کام میں آئی گئی تھیں اس منعقد گری کے ساتھ جانی گئیں کہ عظمت و جلال کے ناز کی

لے دیتا ہے کہ چنگ کا ایک قدم شہر سے سکندر کی فوج کے ایک افسر انیگیولس نے بسایا اور دوسرے  
افسر پرنیکس نے اپنی بیوی کی یاد میں اس کا نام نائیکیا رکھا۔ مترجم

۱۔ جس طرح مسلمانوں میں قرآن کے تین مائذین قرآن۔ حدیث اور اجماع جیسی طرح عیسائیوں میں  
بھی ان مسائل کے متعلق ایسا نزاع ہوتا تھا اور بن کا تصفیہ اناجیل سے نہ ہو سکتا تھا پادروں کی  
کونسلین نقد کی عالی تھیں پانچواں قسم کی پہلی کونسل ۳۲۵ء میں ابھارت قسطنطین نائیکیا منعقد ہوئی مگر

شکل پیدا ہو گئی۔

اس خیال سے کہ بت پرستوں کے دل میں شکست لے جو ناسور ڈال دیا ہو اس کا اندمال مراعات خاص اور نواز شہا سے پنہان کے مرہم سے ضروری ہے قسطنطین نے اپنے دربار میں بت پرستی کی رسوم کی تجدید و ترویج سے نہ صرف اغراض کیا بلکہ ان کو شمشون کو استحان کی نظر سے دیکھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کو شمشون میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے اوس کے خاندان کے اراکین تھے۔

(۲) اس شہنشاہ کو جو محض دنیا کا بندہ تھا اور جس کے مذہبی اعتقادات خس سے بھی کم وقعت تھے اپنا ذاتی فائدہ سلطنت کی یہودی اور دونوں مخالف جماعتوں یعنی عیسائیوں اور بت پرستوں کی بھلائی اسی میں نظر آئی کہ جہاں تک ہو سکے ان میں یگانگت و ارتباط پیدا کیا جائے۔ اور تو اور راخ الاعتقاد عیسائیوں تک کو اس حکمت علی سے چند اختلاف نہ تھا اس لیے کہ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پڑانے عقاید کا پیوند لگا دیا گیا تو مذہب جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی اور آخر کار بنجاستون کی آمیزش سے پاک ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا۔ اس الفہام و اختلاط کی بزم آرائی میں شہنشاہ کی مان بلینا نے شاہی دربار کی بیگمات کے ساتھ مل کر شمع انجمن کا کام دیا۔ مصلحت شناس اور مزاجدان لوگوں کو ملکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی ایک نئی تدبیر ہاتھ آگئی جیت المقدس کے ایک غار سے حضرت عیسیٰ کی صلیب۔ دونوں چورون کی صلیبیں۔ واقعہ تصلیب کا کتبہ اور وہ سیخین جو اس موقع پر استعمال میں لائی گئی تھیں تین صدیوں تک امانت رہنے کے بعد برآمد کی گئیں۔ اور ایک مناسب حال معجزہ سے جس کے تصنیف کرنے میں ان بزرگواروں کو ذرا بھی دقت پیش نہ آئی ان متبرک آثار کی تصدیق بھی ہو گئی۔ غرض اچھی خاصی آثار پرستی شروع ہو گئی۔ یونانیوں کے اوہام باطلہ از سر نو نمودار ہو گئے۔ اور اس زمانہ کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی جبکہ وہ آلات جن سے



محاصرہ ٹرائے کا مشہور برجی گھوڑا تیار کیا گیا تھا میٹا پانچم میں رکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ جبکہ پیلا پائیس کا عصا شاہی گردنیا میں۔ ایکٹیز کا نیزہ فیسیلس میں اور میمنن کی تلوار

لے ٹرائے کے محاصرہ کو جسے ہومر نے اپنی مشہور کتاب ”ایڈ“ میں زندہ جاوید کر دیا ہے جب دس سال کی مدت گزرجی اور یہ شہر یونانیوں سے سرنہ ہو سکا تو توکیسیز کو جو بہادران یونان میں بوجہ اپنی ذکاوت و فراست کے ایک خاص شہرت رکھتا تھا ایک حیلہ سوچا۔ اس نے پیل کا ایک گھوڑا تیار کیا اور اس کے جوت میں خود چھپ گیا اور اس گھوڑے کو شہر پناہ کے قریب لے جا کر راتوں رات رکھ دیا۔ مصورین اسے ایک اچھٹے کی بات سمجھ کر اندر اٹھالے گئے۔ اس ترکیب سے توکیسیز شہر کے اندر داخل ہوا اور گھوڑے سے باہر نکل کر شہر کا چھانک کھول دیا اور محاصرین شہر پر قابض ہو گئے۔ مترجم

یہ مشہور جغرافیہ نویس اسطرابو لکھتا ہے کہ جنوبی اطالیہ کا یہ شہر سنہ قبل مسیح میں خلیج ٹرائیم کے کنارے آباد کیا گیا تھا۔ دوسری صدی قبل مسیح تک اس کا شمار دولت یونان کے سب سے زیادہ آباد اور مرفہ الحال شہروں میں ہوتا تھا۔ لیکن ہنری بال افریقی سپہ سالار کی فوج کے زمانہ کے بعد سے اس میں انحطاط کے آثار شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ یہ ایک مٹا کر جب تسمیر کا زمانہ آیا تو بجز چند بوسیدہ دیواروں اور کھنڈروں کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ حکیم قیسا غورث کی زندگی کے آخری دن زمین گئے اور تسمیر کے زمانہ تک اس کی قبر کے آثار بھی زبان موجود تھے۔ مترجم

یہ قدیم یونان روایات میں اپنی بہادری اور شجاعت کے لحاظ سے بے مثل سمجھا جاتا تھا۔ ایک روایت یہ تھی کہ اس کے باپ ٹیلیسیس نے ایک دن دیوتاؤں کی دعوت کی اور بیٹے کو ذبح کر کے دیوتاؤں کے سامنے دسترخوان پر چڑھ دیا۔ صرف ایک دیوتا کو دھوکا ہوا اور وہ مقتول کا ایک بازو کھا گیا۔ اس کے بعد تیس دنے آب نبات چھڑک کر اسے زندہ کر دیا اور جس دیوتا نے اس کا بازو کھا لیا تھا جاسے گوشت دونوں کے بازو کے عارج کا بازو لگا دیا۔ مترجم

یہ قدیم یونان کا ایک شہر جس پر اہل ایتھنز نے شکست کی عین قبضہ کیا۔ اسی مقام پر سکندر کے باپ شاہ قیلقوس نے یونانی ریاستوں کی متحدہ فوج کو شکست (بقیہ مضمنوں پر صفحہ آئندہ)

نکو میڈیا میں کا ہما موجود تھی۔ جبکہ اہل ٹیچیا کیلید و نیا کے جنگلی سور کی کھال دکھا سکتے تھے اور بہت سے شہروں کو یہ دعویٰ تھا کہ ادن کے پاس شہر ٹراے کے محافظ دیوتا کا اصلی بت موجود تھا۔ جبکہ ستراد ہی کے ایسے ایسے مجسمے پیش کئے جاسکتے تھے جو برچھے ہلا سکتے تھے۔ ایسی ایسی تصویریں دکھائی جاسکتی تھیں جو ہنس سکتی تھیں۔ ایسی ایسی مورتیں موجود تھیں جنہیں پسینہ آسکتا تھا اور ایسے ایسے ہزار ہا معبد اور ہیکل اطراف ملک میں پھیلے ہوئے تھے جہاں معجزوں سے مریض اچھے کیے جاسکتے تھے۔

جون جو زمانہ گذرتا گیا وہ مذہبی عقاید کی تفصیل ٹرلمین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند گرا یہ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان عقاید میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا۔ اولپس تو دیوی پہلا سا موجود ہو گیا مگر

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) فاش دے کر ان ریاستوں کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس شہر کے کچھ کھنڈر ابھی تک باقی ہیں۔ مترجم

۵۵ "ایڈ" کے شاہیر میں سب سے زیادہ ممتاز و سربرآوردہ پہلوان کا نام۔ مترجم  
۵۶ قدیم یونانی روایات کے بموجب حبش کا ایک شاہزادہ تھا جو ٹراے کی جنگ میں شکر لے کر مھویرین کی ملک کے لیے آیا تھا۔ اور بہت کچھ داد شجاعت دینے کے بعد آخر ایکیز کے ہاتھوں مارا گیا۔ مترجم  
۵۷ نکو میڈیا دولت روم کا ایک آباد اور پر رونق شہر تھا جسکی بنا نکو میڈیا اول نے مسیح ۶۷ میں ڈالی تھی۔  
۵۸ قیصر ڈیو کلیشنین و قسطنطین اس زمانہ میں جبکہ رومی افواج ممالک مشرقیہ کے سفر کرنے میں مصروف تھیں یہیں بود و باش رکھتے تھے۔ چنانچہ قسطنطین کا انتقال ۳۲۴ مئی ۳۳۷ء کو اسی مقام میں ہوا۔ اسکندر اعظم کا واقع نولیس آیرن یہیں پیدا ہوا تھا۔ مترجم

۵۹ یونانی علم الادب میں مذکور ہے کہ اینٹس شاہ کیلیدان نے آئریس دیوی کو بھینٹ نہیں دی تھی۔ اس پر دیوی نے غضب ناک ہو کر ایک جنگلی سور کو مامور کیا کہ اس بادشاہ کی سلطنت کو تباہ کر ڈالے چنانچہ یہ آفت آسمانی ملک کو برباد کرنے لگی۔ بادشاہ کے بیٹے میجر نے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

دیوتاؤں کے نام بدل دئے گئے۔ سلطنت کے جن صوبوں کی قوت بڑھی ہوئی تھی وہاں کے باشندوں نے علیٰ رغم مذہب شاہی اپنے قدیم عقاید اختیار کر لیے۔ عقیدہ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا۔ نہ صرف آئس کی پرستش بہ تبدیل نام از سر نو ہونے لگی بلکہ اوس کا بت بھی جو کسی زمانہ میں ایک ہلال کے قوس پر رکھا ہوا نظر آیا کرتا تھا از سر نو نمودار ہو گیا۔ اس دیوی کا مجسمہ جو گو دین اپنے بچے حورس کو لیے ہوئے ہے بت تراشی اور نقاشی کی صنعتوں کے ذریعہ سے ہمارے زمانہ تک حضرت مریم اور ادن کی معصوم فرزند کی دلربا تصویر کی شکل میں پہنچا ہے۔ نئے لباس میں قدیم تصورات کی اس تجدید کا ہر جگہ بہ اشتیاق تمام خیر مقدم کیا گیا۔ جب اہل آفریقا کے سامنے اس امر کا اعلان کیا گیا کہ وہاں کی سیمی مجلس نے بصدارت بطریق سائرل یہ فیصلہ کیا ہے کہ مریم عذرا کو ”خدا کی ماں“ کے لقب سے یاد کیا جائے تو ان لوگوں نے خوشی کے آنسوؤں سے اپنے بطریق کے قدم دھوئے۔ یہ اشک ریزی اسی قدیم ناسور کی تراوش تھی جس پر اگرچہ مسیحیت کے اثر کی وجہ سے انگور آچلا تھا مگر وہ فاسد ہونے والا نہ رہا۔ اگر ادن کے آبا و اجداد کے زمانہ میں وہاں یاد دی کے لیے یہی بات کی جاتی جو جناب مریم کے لیے کی گئی تو ادن کے دلوں پر بھی یہی اثر ہوتا۔

دنیا دارنومیسیون کی تالیف قلوب کا یہ طریقہ جس پر ادن کے رسوم و عقاید کے اختیار کر لینے سے عمل کیا گیا ادن لوگوں کے اعتراض سے نہ بچا جنکی بصیرت اس کی علت غائی کی کو پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ فاسٹس نے قیصر آگسٹائن سے برطان ملامت آمیز الفاظ میں خطاب کیا :- ”تم میں اور بت پرستوں میں کیا فرق باقی رہا اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ تمہاری جماعت علیحدہ ہے اور ادن کی جماعت علیحدہ۔ ورنہ افعال دونوں کے ایک

(بقیہ مضون صفحہ گذشتہ) یونان کے بہت سے سوراؤں کے ساتھ مل کر اس بلاے ناگہانی کے استیصال کی فوج ہر ایک جمعا قائم کیا اور بالآخر اسے انگریزوں کی ہلاک کر ڈالا اور اس کی کھال پر بطور نعم و نصرت کی آتش کی کڑھک کر تباہ کیا

ہی سے ہیں۔ اون کے ہاں قربانیان ہوتی ہیں جن میں بدستیوں کا زور ہوتا ہے تمہارے ہاں بزم محبت ترتیب دی جاتی ہے جو مذہبی شکل میں ہوسنا کی اور عیش پرستی کا دوسرا نام ہے۔ اون کے ہاں بت پجھتے ہیں تمہارے ہاں شہداء و اولیاء کی پرستش ہوتی ہے۔ تم اون کی طرح مُردوں کی روحوں کی تواضع شراب و کباب اور چنگ و رباب سے کرتے ہو۔ بُت پرستوں کے تمام مذہبی تیوہار تمہارے ہاں اسی ذوق و شوق سے منائے جاتے ہیں بغیر ہاں اور راس المجدی و راس السلطان میں آفتاب کی تحویل کے وقت تم وہی رسمیں ادا کرتے ہو جو بُت پرستوں کے ہاں رائج ہیں۔ اور طرز ماند و بود اور عادات و اطوار کے لحاظ سے تو تم میں اون میں مطلق فرق نہیں۔ غرض کہ بُت پرستی کے تمام رسم و رواج جاری ہوئے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ شادیوں میں عشق و محبت کی دیوی دیس (زہرہ) کے بھجن گائے جاتے تھے۔

اس مقام پر تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر کر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ عیسائیت کے ساتھ بُت پرستی کے شامل کر دینے کی اس چال نے بالآخر لوگوں کو انحطاط عقلی کے کس طبقہ سا فل تک پہنچا دیا۔ بت پرستی کی رسمیں اختیار کر لی گئیں۔ پرستش کے نمائشی اور بھڑکار طریقے جاری ہو گئے۔ پادریوں نے پر تکلف لباس اور ٹوپیاں اور تاج پہننے شروع کر دیئے۔ کافر و مسیحین سونے چاندی کے گلدان مراسم مذہبی کے لوازم میں داخل ہو گئے۔ عبادت میں براتوں کے جلوس کی سی دھوم دھام نظر آنے لگی۔ قربانی کے ذریعہ سے ہلہا رستہ ہونے لگی۔ ردی بت پرست کا ہون کی جادو کی چھڑی عیسائی اسقف کی حکومت مٹی کا عصا بن گئی۔ گر جا شہداء کے مزاروں پر بنائے جانے لگے اور اون کی تہذیب و تقدیس اون رسوم کے ذریعہ سے ہونے لگی جو سلف میں بت پرست پجاریوں کے ہاں رائج تھیں۔ جھوٹ سچ جہاں کہیں کسی شہید کے کچھ آثار بہم پہنچ گئے فوراً اون کی یادگار میں میلے اور عرس قائم کر دیئے گئے۔ خدا کے غضب کو فرو کرنے اور آسیب اُتارنے کا

سب سے بڑا ذریعہ ناقہ کشی قرار دیا گیا۔ بیت المقدس اور شہدائے مزاروں کی زیارت و طواف کے لیے لوگ ہزار ہا کوس چل کر جاتے تھے۔ بیت المقدس سے منون خاک دہول لاکر لوگ موتیوں کے مول بیچتے تھے۔ اور اس مٹی کو شیطان کے ذریعہ کا ڈر لیتے سمجھا جاتا تھا۔ دم کئے ہوئے پانی کے اوصاف و خواص میں تو کسی کو کلام ہی نہ تھا۔ سورتین اور تبرکات، گرجاؤں کے ضروری لوازم تھے اور خوش عقیدہ لوگ بتوں کی طرح ان کو بھی پوجتے تھے۔ جس طرح زمانہ سابق میں بت پرستوں نے بعض مقامات کو خوارق عادات اور معجزات کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اسی طرح خاص خاص مقامات عیسائی دنیا میں بھی اعجاز و کرامات کے مرکز قرار دئے گئے۔ عیسائیوں کی نجات یافتہ روحوں کو حاضرات کے طریقہ پر طلب کیا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ روحیں اطراف عالم میں بھٹکتی پھرتی ہیں یا اپنے مقابر کے اوپر منڈلار ہی ہیں۔ منہ ردوں اور قربان گاہوں کی تعداد خارج از شمار تھی۔ توبہ اور ازالہ معصیت کے لیے غلطی کو جو تکلیف دہ اور ایذا رسان لباس پہنا پڑتا تھا اس کی بہت سی قسمیں تھیں۔ حضرت مریم کی عیدِ تطہیر کا تین بار اس غرض سے قایم کیا گیا کہ جو بت پرست نئے نئے عیسائی ہوئے تھے ان کے دلوں سے بتوں دیوتا کے یومِ جشن کے منو خ ہونے کی کھٹک جاتی رہے۔ مورتوں، صلیب کے ٹکڑوں، ہڈیوں، کیلون اور دوسرے تبرکات کی پرستش عام۔ رائج یا گمنی گویا اچھی خاصی جماد پرستی رائج ہو گئی۔ ان آثارِ متبرک کی تصدیق کا انحصار دوبرائیں پر تھا یعنی پادریوں کے حکم یا معجزات کے اظہار پر۔ اولیاء کے پھٹے پرانی کپڑوں اور ادوں کی قبروں کی خاک تک متبرک سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ فلسطین سے کچھ بوسیدہ ہڈیاں المانی گنسن اور ادوں کی نسبت بو ثوق تمام یہ مشہور کیا گیا کہ یہ حضرت مرقس اور حضرت جیمس اور دوسرے اولیاء سے عہد سابق کے آثارِ جسمانی ہیں۔ بت پرستی کے زمانہ میں انسان کو دیوتا بنا دیا جاتا تھا عیسائیوں نے اسے ولی کر دکھایا کہ اس کا تصرف بھی معاملات انسانی میں رہائی مداخلت سے کسی طرح کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ مقامی دیوتاؤں کی جگہ مقامی پیر اور

اولیاء قائم ہو گئے۔ اس کے بعد عشاے ربانی کی پراسرار رسم کا ظہور ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ پادری کے عمل سے روٹی اور شراب مسیح کے گوشت اور خون کی صورت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ مرد و مردن نے عیسائیت اور بُت پرستی کے اس الحاق کو اور زیادہ کامل و مکمل کر دیا۔ نئے نئے توہار منائے جانے لگے جن میں سے ایک تو اس برچھے کی یادگار میں قائم کیا گیا تھا جس سے حضرت عیسیٰ کے پہلو میں چڑکایا گیا تھا۔ ایک اون میخوں کی یاد کو تانہ رکھنے کے لیے قائم کیا گیا تھا جن سے آپ کا جسم صلیب میں جڑ دیا گیا تھا اور ایک سے کانٹوں کے اوس تاج کی یاد کو تازہ رکھنا مقصود تھا جو مصلوب کرتے وقت آپ کو پہنا دیا گیا تھا۔ اگرچہ مسیہوں خانقاہوں میں کانٹوں کا یہ بے بہا تاج موجود تھا لیکن زمانہ کا یہ رنگ تھا کہ کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ سب کے سب تاج اصلی ہوں۔

پادری تیوٹن نے اس تعلق کی نسبت جو عیسائیت اور بُت پرستی میں پیدا ہو گیا تھا جو خیالات ظاہر کئے ہیں اون کا اقتباس اس مقام پر خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ وہ کہتے ہیں :-  
 دو کیا آج کل اولیاء ملائیکہ کی پرستش ہر اعتبار سے زمانہ سابق کی پرستش شیاطین سے مشابہ نہیں ہے ؟ صرف نام کا فرق ہے۔ باقی سب کچھ یکساں ہے۔ بت پرست اپنے بزرگوں کو دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے۔ عیسائیوں نے اپنے بزرگان دین کو خدا بنا رکھا ہے۔ جن لوگوں نے اس قسم کی پرستش کو مذہب عیسوی میں رائج کیا وہ غوب جانتے تھے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک طریقہ عبادت کی جگہ دوسرے طریقہ عبادت نے لے لی ہے۔ اور چونکہ دونوں طریقے دراصل ایک ہی ہیں لہذا ان کی رسمیں بھی ایک ہی سی ہیں۔ وقت واحد میں متعدد قربان لگا ہوں پر لوبان یا خوشبوی کی دھونی دینا۔ گرجاؤں کو جاتے اور وہاں سے واپس آتے وقت آب متبرک یا نمک ملے ہوئے پانی کا اون میں چھڑکاؤ کرنا۔ دن دوپہر صد ہا چراغوں اور موم بتیوں کا بتوں کی قربان لگا ہوں اور مورتوں کے سامنے جھلانا۔

بیماریوں اور خطرہ سے فوق العادہ طور پر شفا یا نجات پالنے کے شکرانہ میں نذر و نیاز  
 گزارنا اور نیتیں چڑھانا۔ گزرے ہوئے بزرگان دین کو دلی یا خدا قرار دینا۔ ہر ایک صوبہ  
 یا ضلع کو کسی گزرے ہوئے نامور بہادر یا دلی یا پیر کی حمایت میں خاص طور سے سونپنا۔  
 قبروں اور مزاروں پر جا کر مردوں کی پرستش کرنا یا اون کے آثار و نوں کو پوجنا۔ بتوں کی  
 تق۔ بس اور اون کو سجدہ کرنا اور اون کو صاحب اعجاز و کرامات جاننا۔ گزر گاہوں  
 شاہ راہوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بت خانوں قربان گاہوں اور مورتوں کا قیام کرنا۔  
 گاہے بابے دھوم دھڑکے کے ساتھ بتوں اور آثار و نوں کے جلوس نکالنا۔ خاص خاص  
 اوقات پر مجاہدہ اور ریاضت کے دھوکے میں جسم کو دسے مار مار کر ایذا پہنچانا۔ پادریوں  
 کے مختلف فرقے اور برادریاں قیام کرنا۔ پادریوں کا خاص انداز سے اپنی جائیداد و اثاثہ  
 ازدواجی تعلقات سے عمر بھر محروم رہنے کو جنس ذکور و انات دونوں کے زہد و اتقا کی  
 دلیل سمجھنا۔ یہ سب وہ زمین ہیں جو اور بہت سی رسموں کے ساتھ بت پرستوں اور  
 پوپ رول کے پیروں کے توہمات کی اجزائے لاینفک ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ نوبت  
 یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہی مندر اور وہی بت جو ایک زمانہ میں جو پیٹھ اور اوس کی  
 برادری کے دوسرے خناسوں سے نامزد تھے آج مریم عذرا اور دوسرے مسیحی اولیا  
 سے منسوب ہیں۔ دونوں کی عبادت کی عین اور کہتے ایک سے ہیں اور جو معجزے اور  
 کرامتیں زمانہ سلف میں بت پرستوں کا منہاج ارادت تھیں وہی آج کے دن مسیحیوں کی  
 عقیدت کی تکیہ گاہ ہیں۔ غرض کل کی کل بت پرستی مسیحیت میں منتقل ہو گئی ہے۔ دونوں  
 کا مبادی و منشا ایک ہے اصول و فروع ایک ہیں۔ یہاں تک کہ قدیم و جدید اور بت پرست  
 و مسیحی روماء میں طریقہ عبادت کے لحاظ سے نہ صرف توافق بلکہ تطابق تام پایا جاتا ہے  
 پادری بتوں صاحب کی راے سے استفادہ کرنے کے بعد اب ہم پھر قسطنطین  
 کے زمانہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اگرچہ قدیم اور عام پسند عقاید کی بقا بلکہ اون کی

ترویج میں ان مراعات و بدعات کے ذریعہ سے جھٹلایا گیا لیکن مسیحی فرقے نے جو فرقے غالب تھا اپنے فیصلوں کو بزور حکومت نافذ کرانے میں کبھی بھی ایک لمحہ کا تامل نہ کیا اور حکومت کی طرف سے بھی ان فیصلجات کے نفاذ میں پوری طرح سے تائید کی گئی۔ اس طور پر قسطنطین نامتو کی کونسل کے احکام کی پوری پوری تعمیل کرتا رہا۔ ایرسٹس کے معاملہ میں تو اوس نے

لے تیسری صدی عیسوی کے وسط میں بمقام لیبیا پیدا ہوا۔ اور چوتھی صدی کے شروع میں اسکندریہ کا نائب پادری مقرر ہوا۔ حضرت عیسیٰ کے متعلق عیسائیوں کا عام عقیدہ تیسری صدی میں یہ تھا کہ خدا بشکل انسان یسوع مسیح کے قالب میں نمودار ہوا لیکن اوس کی انسانی حیثیت اوس کی ربانی حیثیت کے تابع تھی۔ بالفاظ دیگر بیٹا اگرچہ خدا تھا لیکن باپ پر فوقیت نہ رکھتا تھا اور نہ اوس کے مساوی تھا بلکہ اوس سے دوسرے درجہ پر تھا۔ لیکن چوتھی صدی کے شروع میں بوجہ اوس نواقض کے جو انیسیت والوہیت کے اس پر اسرار و ناقابل فہم مسئلہ میں پائے جاتے تھے لوگوں میں اختلاف رائے پیدا ہو چلا۔ بعض کی یہ رائے تھی کہ بیٹا باپ سے دوسرے درجہ پر ہے۔ لیکن جو زیادہ خوش عقیدہ تھے اور بیٹے کی جناب میں زیادہ ارادت رکھنے کے مدعی تھے یہ دعویٰ کرنے لگے کہ بیٹا اور باپ مساوی ہیں۔ ایرسٹس آخر الذکر جماعت کا مخالف تھا اور اس مخالفت میں اوس نے نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ اگر بیٹے کا درجہ باپ سے کم ہے تو وہ خدا سے مطلق نہیں یعنی باپ کے برابر نہیں۔ اور چونکہ برابر نہیں اس لیے اوس کا جوہر یا اصل خدا کے جوہر یا اصل سے مختلف ہے۔ اور اگر برابر ہے تو اوس کا جوہر کامل اور نقص سے مبرا ہے اور اس لیے وہ خود بھی کامل اور بے عیب ہے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ خدا موجود ہو گئے جو ہر ایک لحاظ سے مساوی الخیثیت ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ خدا کے علاوہ جو غیر مخلوق ہے اگر کوئی شے موجود ہو سکتی ہے تو وہ مخلوق ہستیان ہیں یعنی وہ موجودات حادث جنہیں خدا سے قدیم نے عدم سے پیدا کیا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ بیٹا قدیم نہیں ہو سکتا بلکہ ایک ایسا وقت بھی تھا جب کہ وہ نہ تھا اس لیے وہ زمانی اعتبار سے محض اول و آخرت مخلوقات ہے۔ رحمت ہو ایرسٹس کی روح پر جس کے (بقیہ مضون برمنو آئندہ)



یہاں تک حکم دے دیا کہ جس شخص کو اس کا فر کفر کی کوئی کتاب ملے اور وہ اسے جلا نہ دے  
اوس کی گردن ماری جائے۔ اسی طرح شہنشاہ تھیوڈوسیوس اصفہ کے زمانہ میں دستور  
کو جلا وطنی کی سزا دے کر صحرائے افریقہ کے ایک دور دراز حصہ میں جہاں درخون کے  
ایک جھنڈ اور پانی کے ایک چشمہ کے سوا صد ہا فرسنگ تک ریگ روان اور موسم سوزان  
کا عمل تھا بھیج دیا گیا۔

بُت پرست فریق میں سلطنت کے قدیم طبقہ امر کے بہت سے ذمی و جاہل  
خاندان شریک تھے۔ اور پُرانے فلسفیانہ مذاہب کے تمام پیرو اس کے حامی و  
مددگار تھے۔ فریق مخالف کو یہ لوگ نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا  
یہ دعویٰ تھا کہ انسان کو علم صرف مشاہد اور عقل کے ذریعہ سے محنت اٹھانے کے بعد  
حاصل ہوتا ہے۔

بہ خلاف اس کے سچی فریق کا یہ دعویٰ تھا کہ کل علم اناجیل و روایات کلیسا میں  
محفوظ ہے اور خدا اپنی الہامی کتابوں میں انسان کے لیے نہ صرف حق و صدق کا معیار  
قرار دے چکا ہے بلکہ اوس کی دانست میں جن باتوں کا جاننا ہمارے لیے ضروری تھا  
وہ سب ہمیں بتا چکا ہے۔ اس لیے کتب مقدس انسانی معلومات کا مجموعہ ہیں جس پر اضافہ  
ہونا غیر ممکن ہے۔ اور اس علمی اجارہ میں پادری بجاہت شہنشاہ کسی رقیب یا حریف کی  
مسابقت کو ارا نہیں کریں گے۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ)۔ یہ سچے مسیحیانہ عقاید دو صدی تک تنلیت کے ظلم کو توڑنے  
کی کوشش میں سرگرم رہے۔ لیکن بت پرستی عیسائی مذہب کی رگ رگ میں سرایت  
کر چکی تھی۔ ساتویں صدی کے خاتمہ سے پہلے آئرس کے مذہب کا خاتمہ ہو گیا۔ غرض  
یہی عقاید تھے جن کی وجہ سے بیجا آئرس کا فر کفر قرار دیا گیا اور  
جلا وطن ہوا۔ مستہزم

یہاں سے علم کی دو قسمیں ہو گئیں علوی و سفلی۔ اور دو مخالف فرقے پیدا ہو گئے جن میں سے ایک نے اپنا ہادی در ہیر عقل کو قرار دیا اور دوسرے نے الہام کو۔ بت پرست جماعت کو اپنی فلاسفہ کے علم و فضل پر غرہ تھا اور عیسائیوں کو اپنے بزرگان دین کے الہام پر۔

اس طور پر کلیسا نے علم و حکمت کا مبدار و نشان بن کر اوس کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور اوس کے فیصلوں کی تکمیل کے لیے زور و حکومت ہر وقت تیار رہنے لگا۔ اس طرز عمل کو اوس کے آئندہ کارناموں پر جبر و تحکم کی جہر لگا دی اور ایک ہزار سال تک وہ یورپ کی دماغی ترقی کا سدا رہ بنا رہا۔

قیصر سلفظین کے عہد سے مسیحیت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جبکہ اوس نے مذہبی رنگ چھوڑ کر سیاسی رنگ اختیار کیا اور اوسے دنیوی سلطنت حاصل کرنے کی فکر شروع ہوئی۔ اگرچہ ایک لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مذہب گرتے گرتے بت پرستی کی شکل میں سبج ہو گیا لیکن دوسرے اعتبار سے یہ کہنا بھی نادرست نہ ہو گا کہ اس نے ترقی کرتے کرتے قدیم یونانی اصنام پرستی کی نشو و نما پذیرفتہ صورت اختیار کر لی۔ یہ اصول کہ جب دو جسم آپس میں ٹکراتے ہیں تو دونوں کی صورت بدل جاتی ہے طبعیات و عمرانیات و دونوں پر یکساں صادق آتا ہے۔ بت پرستی نے مذہب عیسوی کے اصول میں تغیر پیدا کر دیا اور مذہب عیسوی نے بت پرستی کی حیثیت بدل دی۔

مصر میں جہاں قدیم الایام سے تثلیث کا زور رہا ہے مسیحی تثلیث کے معرکہ الارا سبلہ کا چھڑنا ایک لازمی بات تھی۔ سب سے زیادہ اہم بحث اس مسئلہ میں یہ تھی کہ ابن اللہ ہونے کی حیثیت سے مسیح کا کیا وجہ قرار دیا جائے۔ اسکندر یہ مین ان دنوں ایک پادری ایریس نامی رہتا تھا جو ایک دفعہ بشپ (اسقف) کی خدمت کا اُمیدوار تھا مگر محروم رہا۔ اوس نے یہ بحث پیش کی کہ بلحاظ رشتہ فرزند ہی پدری ضرور ہے کہ ایک وقت ایسا ہوا ہو جبکہ بیٹے کا وجود نہ تھا۔ اس لیے کہ باپ کی عمر بیٹے سے زیادہ ہونی چاہیے پس حضرت مسیح

فہم نہیں بلکہ حادث ہیں۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس بحث کا منشا یہ تھا کہ ہر سہ افراد تعلیق ازلی نہیں ہیں۔ تینوں کے تینوں ہم مرتبہ و مساوی الحیثیت نہیں ہو سکتے۔ ایک کو باقی دونوں پر ضرور فوقیت ہونی چاہیے۔ اور جب صورت یہ ہے تو ضرور ہے کہ ایک وہ وقت تھا جب تعلیق کا وجود نہ تھا۔ اس پر اوس لاشپ نے جس کو ایریس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہوئی تھی مجالس عامہ میں اس مسئلہ پر اپنی روانی تقریر کے جوہر دکھانے شروع کئے اور جب مناظرہ نے طول کھینچا تو یہودیون اور بت پرستوں نے جو اسکندریہ کی آبادی کا جزو غالب تھے اس بحث کے متعلق ہلکوں میں مضحکہ انگیز نقلیں کرنی شروع کیں۔ ان نقلوں میں دل لگی کی سب سے بڑی بات یہ ہوتی تھی کہ باپ اور بیٹے کو مساوی السن ظاہر کیا جاتا تھا۔ اس بحث کا جوش و خروش جب حد سے بڑھ گیا اور فتنہ و فساد کا اندیشہ پیدا ہو چلا تو معاملہ شہنشاہ کے پاس تصفیہ کی غرض سے بھیجا گیا۔ پہلے تو منخرفات سمجھ کر اوس نے توجہ نہ کی اور شاید دل میں ایریس کے دعوے کو حق بجانب خیال کیا کہ باپ کی عمر حقیقت میں بیٹے کی عمر سے زیادہ ہونی چاہیے لیکن اوس پر اس قدر دباؤ چاروں طرف سے ڈالا گیا کہ آخر مجبور ہو کر اوس نے نایا کی کونسل کے انعقاد کا حکم دیا۔ اس کونسل نے جھگڑا مٹانے کے لیے ایک فیصلہ صادر کیا جس کی ذیل میں تکفیر و لعنت کا یہ فتویٰ درج تھا کہ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ کسی وقت میں خدا کے فرزند کا وجود نہ تھا یا پیدا ہونے سے قبل وہ موجود نہ تھا یا وہ نیست سے بہت کیا گیا یا کسی ایسے مادہ یا جوہر سے اوس کی تخلیق ہوئی جو ربانی نہیں ہے یا وہ مخلوق یا متغیر ہے ایسے شخص کو کلیسا سے مقدس ملعون قرار دیتا ہے۔ اس فتوے کے صادر ہوتے ہی قسطنطین نے اس کو بزور حکومت نافذ کر دیا۔

اس کے چند سال بعد شہنشاہ تھیوڈوسیوس نے قربانیوں کی مانعت کر دی اور جانوروں کے رودون کے ذریعہ سے استعارہ کرنے کے طریقہ کو سنگین جرم قرار دیا۔ اوس نے مندروں میں جانے آنے کے متعلق بھی امتناعی احکام جاری کئے اور ایک محکمہ

اعتساب مذہبی لوگوں کے عقاید کی جانچ پرتال کے لیے قائم کیا۔ ایک شاہی فرمان اس مضمون کا صادر ہوا کہ جن لوگوں کے عقاید روم کے بشپ ڈاماسس اور اسکندریہ کے بشپ پیٹر کے عقاید سے مطابقت نہ ہوں گے وہ جلاوطن کئے جائیں گے اور اون کے حقوق ہائی ججین لیے جائیں گے۔ اور جو شخص ایسٹ کی عید اوسی روز منائے گا جس روز یہودی سناتے ہیں اس کو قتل کی سزا دی جائے گی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یونانی زبان کا چرچا مغرب میں بہت ہی کم ہوتا جا تھا اور علوم صحیحہ مفقود ہو گئے تھے۔

اس زمانہ میں اسکندریہ کا بشپ تھیوفیلس تھا۔ آسیرس کا ایک قدیم مندر سچوین کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ اس کو ہمسار کر کے اس کی جگہ گر جا بنایا جائے۔ نئی عمارت کی بنیاد کھودتے وقت قدیم پرستش کے بعض نقش آثار برآمد ہوئے۔ تھیوفیلس نے حیا و شرم کے جذبات کو حرارت مذہبی کے طاق پر رکھ کر ان علامات قبیحہ کی تشہیر کی۔ تائیدت کی بحث کے زمانہ میں جب عیسائیوں کے مذہب کی باتھون میں توہین و تذلیل کی جاتی تھی اس وقت بیچارے عیسائی تو چپ چاپ رہے لیکن اس موقع پر جب کہ خود بت پرستوں کی باری آئی تو ان سے ضبط و تحمل نہ ہو سکا۔ وہ فساد پر آمادہ ہو گئے اور ایک عام بلوہ ہو گیا۔ ”سرمین“ کو ادھون نے اپنا بنگاہ بنایا اور وہ فساد اور خونریزی ہوئی کہ شہنشاہ کو مداخلت کرنی پڑی اس نے تھیوفیلس کے نام اس مضمون کا فرمان بھیجا کہ ”سرمین“ کو منہدم کر دیا جائے اس طرح وہ عظیم الشان اور قدیم کتاب خانہ جسکو تاجداران سلسلہ بطریقہ یسوع نے جمع کیا تھا اور جو تیس سینز کی آتش زنی سے بچ رہا تھا اس جاہل و متعصب پادری کو ہاتھوں برباد ہو گیا۔

تھیوفیلس کے بعد اسکندریہ کی دینی پیشوائی کی خدمت اس کے بھتیجے سینٹ سائرل کو ملی جو اپنے دلپذیر اور پر تاثیر مواعظ و خطبات کی وجہ سے اسکندریہ کے مذہبی حلقوں میں مشہور و ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ حضرت مریم کی پرستش اسی کی کوششوں سے اسکندریہ میں

عام ہوگئی۔ لیکن جو اثر اوس کی عام پسند تقریر دن نے اہل اسکندریہ کی جچین طبیعتوں میں پیدا کیا تھا اسے ایک عورت ہائی پیشیا نامی نے بہت کچھ کمزور کر دیا۔ ہائی پیشیا جس کا باپ تھریان بڑے پایہ کا ہندس تھا نہ صرف فلماطون اور ارسطو کے فلسفہ کی شارح تھی بلکہ اپالوئیس اور دوسرے ہندسوں کی تصانیف پر بھی اوس نے عالمانہ شرحیں لکھی تھیں۔

ہر روز اوس کے مدرسہ کے سامنے امراد اعیان کے رتھوں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ اور اسکندریہ کے تمام وضع و شریف اوس کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ جن مسائل پر اوس کی تقریریں ہوتی تھیں وہ دہی سے دہی جن پر ہمیشہ سے بحث ہوتی چلی آئی ہے لیکن آج تک حل نہیں ہو سکے یعنی ”نہیں کیا ہوں“؟ ”کون ہوں“؟ ”کہاں ہوں“؟ اور ”میرے علم کی کیا حد ہے“؟

ہائی پیشیا اور سائرل! ایک کو علم و حکمت میں متحرد دوسرے کو جہل و تعصب میں توغل!! بھلا اجتماع ضدین کیونکر ممکن تھا؟ سائرل نے سمجھ لیا کہ اگر یہی ایل و نہار رہا تو ہائی پیشیا کے آگے اوس کی مشیخت کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اور یہ سمجھ کر اوس نے فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بن پڑے اپنے حریف کا خاتمہ کر دے۔ ایک دن ہائی پیشیا مدرسہ کو جاری تھی کہ سائرل کی امت کے ایک گروہ کثیر الانفا یعنی بہت سے پادریوں نے اوسے لگھیرا۔ ان سب نے مل کر بیچ بازار میں اوس کے کپڑے فوج کھسٹ ڈالے۔ اسے بالکل برہنہ کر دیا اور پھر گھسیٹتے ہوئے ایک گرجا میں لے گئے جہاں عصاے پطرس کی موثر ضربوں سے اوس کا سر توڑا گیا۔ اوس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔ گوشت و پوست کو سمیٹوں سے چھیدا گیا اور ہڈیاں آگ میں جھونک دی گئیں ماس خوفناک جرم کے متعلق سائرل سے جواب تک نہ لیا گیا۔ گویا تسلیم کر لیا گیا کہ چونکہ مقصد محمود تھا اس لئے اوس کی تکمیل کا جزا یہ اختیار کیا گیا وہ بھی محمود ہو گیا۔

اس واقعہ کے ساتھ ہی یونانی فلسفہ کا اسکندریہ سے چرچا اٹھ گیا اور اوس علم کا

جس کی اشاعت کے لیے فرما دیا ان سلسلہ بظلمو سیہ نے اس قدر کوششیں کی تھیں قبل از وقت خاتمہ ہو گیا۔ ”سیرین“ کا کتب خانہ برباد ہو چکا تھا جو کچھ رہی وہی انگلیں فلسفہ و حکمت کے اکتساب کی دلوں میں باقی تھیں اون کا ہاتھی پریشیا کے عبرتناک انجام نے یوں خون کر دیا۔ انسانی خیال کے پاؤں میں مذہب نے بیڑیاں ڈال دیں۔ آزادی خیال کا خاتمہ ہو گیا۔ غرض سال ۱۸۷۶ء وہ تاریخ ہے جبکہ انسان کو تنہا کر دیا گیا کہ شخص صرف اونہیں خیالات کو ذہن میں جگہ دے سکتا ہے جس کی اجازت حکام کلیسا صادر کریں۔ نتیضہ میں بھی فلسفہ دم توڑ رہا تھا۔ جٹینن نے اس کی تعلیم کی ممانعت کر دی اور اس شہر کے تمام مدارس بند کر دیے۔

سلطنت روما کے مشرقی صوبجات میں تو یہ واقعات گزر رہی رہے تھے لیکن مغرب میں بھی وہ قوت رنگ لائے بغیر نہ رہی جو ان واقعات کی محرک ہوئی تھی۔ ایک برطانوی راہب جس نے اپنا نام پلیجیس رکھ لیا تھا مغربی یورپ اور شمالی افریقہ کے علاقوں سے ہو کر گذرا۔ وہ جہان جاتا تھا یہ وعظ کرتا تھا کہ موت دنیا میں حضرت آدمؑ کے گناہ کی وجہ سے نہیں آئی بلکہ وہ طبعاً اور نظراً فانی تھے اور اگر اودن سے گناہ سرزد نہ بھی ہوتا جب بھی وہ ضرور مرتے اودن کے گناہوں کی ذمہ داریاں اونہیں کی ذات تک محدود تھیں جو اودن کی اولاد پر کسی طرح عاید نہیں ہوتیں۔ ان صغریٰ و کبریٰ سے پلیجیس نے جو مذہبی نکتے اخذ کئے وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت کچھ نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔

رومان میں پلیجیس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی لیکن کارتھج میں سینٹ اگسٹائن کے ایسا سے اوس پر بہت کچھ لے دے ہوئی۔ اور اوسے یعنی قرار دیا گیا۔ ٹو ایسپوس میں ایک بڑی مجلس اودن الزامات کی تحقیقات کے لیے منعقد کی گئی جو اس پر لگائے گئے تھے اور اگرچہ ارکان مجلس نے اوسے بری کر دیا لیکن جب آؤمنٹ اول روما کے بطریق اعظم سے اس معاملہ میں استقتا کیا گیا تو اوس نے پلیجیس کی تکفیر کا فتویٰ صادر کیا۔ اس فتوے کی

تفصیل نہ ہونے پائی تھی کہ آئینہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے جانشین نر ایسیس نے فتوے کو منسوخ کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ پلیجیس کے عقاید درست ہیں۔ وہ جماعت جو پوپ کی معصومیت کی منکر ہے ابھی تک ان مخالف و متضاد فتاویٰ کو اپنے فریق مخالف کی تردید میں پیش کرتی ہے۔ پلیجیس کی قسمت یوں پلٹے کھا ہی رہی تھی کہ افریقہ کے عیار اور چالباز پادریوں نے کانٹا و لیٹرس کو کانٹا کر قیصر تک رسائی پیدا کر لی۔ وہاں سے یہ فرمان صادر ہوا کہ پلیجیس بیشک کافر ہے وہ اور اس کے ساتھی جلاوطن کیے جائیں اور ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے۔ یہ کہنا کہ موت کا گذر دنیا میں مہبوط آدم سے پہلے ہو چکا تھا گویا ایک سرکاری جرم تھا۔

جن اصول پر یہ عجیب و غریب فیصلہ مبنی تھا اون پر غور کرنا خالی از نفع نہ ہوگا۔ چونکہ مسئلہ زیر بحث خالص فلسفہ کا ایک مسئلہ تھا اس لئے خیال ہو سکتا تھا کہ اس پر جو بحث کی جائے گی وہ قوانین فطرت کی رد سے کی جائے گی لیکن ایسا نہ کیا گیا بلکہ فقط مذہبی پہلو سے بحث کی گئی۔ جس شخص نے اس کتاب کو بغور پڑھا ہے اس سے یاد ہوگا کہ ٹرملین نے مذہب عیسوی کے جوارگان بیان کئے ہیں اون میں گناہ اولین۔ ثقافت مطلق۔ سر نوشت ازلی۔ عفو اور کفارہ کے سائل کا کہیں ذکر نہیں۔ عیسائیت کے جو مقاصد اس نے بیان کئے ہیں اون میں حصول نجات کے اس طریقہ کا نشان تک نہیں پایا جاتا جو دوسری بعد مذہب عیسوی کا جزو الاینفک بنا دیا گیا۔ ان اہم سائل کی توضیح و تشریح کے لیے ہم سینڈ گٹا کا ترجمہ کے رہن منت ہیں۔

اس مسئلہ کا تصفیہ کرتے وقت کہ موت کا گذر اس دنیا میں حضرت آدم کے مہبوط سے پہلے ہو چکا تھا یا نہ فقط اون کے گناہوں کی پاداش میں بطور سزا تجویز کی گئی تھی یہ تو کسی نے نہ پوچھا کہ آیا پلیجیس کے خیالات قانون فطرت کے موافق ہیں یا مخالف بلکہ دریافت کیا گیا تو یہ کیا گیا کہ وہ سینٹ اگسٹائن کے عقاید سے بھی مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اس کا

نتیجہ دہی ہوا جو ہونا چاہتے تھا۔ جس عقیدہ کو پادریوں نے اس شد و مد کے ساتھ سراپا  
حقیقت قرار دیا اوس کو آج کل کے مسلم الثبوت علمی اکتشافات نے تروبالا کر دیا ہے انسان  
کے ظہور سے مدتوں پہلے کروڑوں افراد بلکہ مخلوقات کی ہزار ہا نوعیں اور جنسین نیست  
و نابود ہو چکی تھیں اور جو باقی ہیں وہ ایک ادنیٰ اور ناچیز جزو ہیں اون بے شمار گروہوں کا  
جن کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

لے اس حقیقت کو جس پر علوم جدیدہ کو اس قدر ناز ہے اور جس کے اکتشاف کے لیے اوسے علماء و حکما کے  
بے تعداد تجربوں اور شاہدوں کا شرمندہ احسان ہونا پڑا کہ کے ایک امی نے جو نہ اشراقی تخیل سے  
آشنا تھا نہ شائقی تعقل میں دسترس رکھتا تھا جس کو نہ کبھی ہندسہ نہ تجربہ سے سابقہ پڑا نہ طبیعیانہ  
مشاہد کا اتفاق ہوا ان روشن الفاظ میں رہ رہ کر دہرایا ہے۔ ”کل من علیہا فان و یبقی  
وجہ ربک ذوالجلال والاکرام“۔ ”کل نفس ذائقۃ الموت“ جس ہر گیر  
اصول کی طرف ان ربانی الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے اوس کا اطلاق اشرف المخلوقات آدم سے  
لے کر ازل موجودات جو انیم تک یکسان ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معارف و حقایق پر انسان  
کی عقل مجرد کے علاوہ ایک اور طاقت بھی روشنی ڈال سکتی ہے اور وہ طاقت مذہب ہے۔  
مذہب اور سائنس گواہ اپنے اپنے موضوعات کو لحاظ سے مختلف اشیاء کے حقیقت آموز ہیں۔ لیکن  
یہ ممکن نہیں کہ ضما اگر کسی ایسے مسئلہ کا ذکر مذہب میں آجائے جس پر بحث کرنا سائنس کا کام ہو تو  
مذہب کوئی ایسی بات کہہ جائے جسے عقل انسانی غلط ثابت کر سکے۔ اس لیے کہ مذہب اور سائنس  
روشنی کی دو کرنیں ہیں جو ایک ہی شعلہ سے نکل ہیں۔ ایک خدا کا کلام ہے دوسرا خدا کا کام۔  
دونوں میں تضاد ممکن نہیں۔ مسئلہ حد و ثامات بعد از ہبوط یا قبل از ہبوط آدم کے متعلق  
عیسائیت نے جو غلطی کی ہے وہ جیسا کہ خود مصنف نے ظاہر کر دیا ہے اوس مذہب سے منسوب  
نہیں کی جاسکتی جس کی تلقین مڑلین نے کی تھی اگرچہ الوہیت مسیح کے متعلق اوس زمانہ کے عقاید  
بھی فاسد ہو چکے تھے ماکہ رومن کیتھولک پادریوں کے اختراعات (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)



اس بحث و مباحثہ کے اخیر فیصلہ سے ایک نہایت اہم نتیجہ مترتب ہوا۔ کتاب پیدائش کو بنا سے مذہب عیسوی قرار دیا جا چکا تھا۔ پس جب اس کی اس روایت کو کہ حضرت آدم سر بہشت میں گناہ سرزد ہوا جس کی اون کو سزا دی گئی مذہبی لحاظ سے اس قدر موثق مانا گیا تو کیا وجہ ہے کہ بزرگان دین عیسوی اس کتاب کو تمام فلسفہ اور علوم کا محکم و معیار نہ قرار دینا چنانچہ یہی ہوا۔ بہت طبقات الارض جغرافیہ۔ علم الانسان۔ علم تاریخ غرض کہ معلومات انسانی کے کل شعبوں کو اس سے تطبیق دے دی گئی۔

چونکہ سینٹ الگ ٹائن کے عقاید نے دینیات کو سائنس کا حریف بنا دیا ہے لہذا اس ذمی اثر بزرگ کے بعض خالص فلسفیانہ خیالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنا خالی از لطف نہ ہوگا۔ اوس کی ایک کتاب ہے جس کا نام ”کنفشنس“ (اقبالات) ہے۔ اس کتاب کی گیارہویں بارہویں اور تیرہویں فصل میں اوس نے کتاب پیدائش کے پہلے باب کی تفسیر لکھی ہے جس کے بعض موزون مقامات کا ہم ذیل میں التقاط کرتے ہیں۔ یہ مقامات حکیمانہ مباحث سے معمور ہیں اگرچہ اکثر حصہ مجذوب کی بڑے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ایک مقام پر خدا سے دعا مانگی ہے کہ بارالہا مجھے توفیق عطا فرما کہ اس کتاب مقدس کو سمجھ سکوں اور اوس کے معانی مجھ پر ظاہر ہو جائیں۔ اوس کا بیان ہے کہ یہ کتاب حسود و زواید سے پاک ہے لیکن ایک ایک لفظ سے صد ہا معنی پیدا ہو سکتے ہیں۔

خلافت کی صورت سے ظاہر ہے کہ اوس کا خالق ضرور ہوگا۔ مگر ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس خالق نے زمین اور آسمان کو کیوں کر بنایا۔ یہ تو ہونہیں سکتا کہ (بقیہ منہون گذشتہ) کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ غرض حقیقت ہر جگہ ایک ہے خواہ اوس کا اظہار نہیب کے ذریعہ سے ہو خواہ سائنس کی وساطت سے۔ اسلام نے جو شرک بت پرستی اور توہمات باطلہ کی آمیزش سے شریعہ ہی سے پاک رہا کچھ سکھایا ہر وہ ہمارے اس دعوے پر گواہ عادل ہی۔ مترجم

اوس نے ان کو زمین اور آسمان کی حدود کے اندر بنایا ہو اس لیے کہ دنیا دنیا کے اندر موجود رہ کر نہیں بنائی جاسکتی اور نہ وہ ایسی حالت میں بنائے جاسکتے تھے جبکہ اودن کے بنانے کے لیے کوئی سامان ہی موجود نہ تھا۔ اس ابتدائی چستان کامل سینٹ الگسٹائن نے یہ کہہ کر کیا ہر کہ ”تو نے کہا اور زمین و آسمان بن گئے“

مگر یہ مشکل بیان ہی طے نہیں ہو جاتی۔ سینٹ الگسٹائن لکھتا ہے کہ جو الفاظ خدا نے کہے اودن کے اجزائے ترکیبی میں بوقت اظہار فصل واقع ہوا ہوگا یعنی الفاظ و حروف یکے بعد دیگرے ادا کئے گئے ہوں گے۔ ضرور ہے کہ کوئی شے مخلوق ان الفاظ کا ذریعہ اظہار بنی ہو۔ پس وہ شے گویا آسمان اور زمین کی پیدائش سے پہلے موجود ہوگی حالانکہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی مادی شے زمین و آسمان سے قبل کیونکر موجود ہو سکتی ہے۔ اس شعر کا مخلوق ہونا لازمی ہے۔ اس لئے کہ الفاظ منہ سے نکل کر ختم ہو گئے مگر ہم کو معلوم ہے کہ خدا کا کلام ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن نہیں کہ الفاظ یکے بعد دیگرے ادا ہوئے ہوں بلکہ الفاظ وقت و احوال میں ادا ہوئے ہوں گے ورنہ حدوث اور زمان لازم آتا ہے۔ تدریج کے لیے زمان کی قید لازمی ہے حالانکہ اوس وقت سوائے قدم و بقا کے اور کچھ موجود نہ تھا۔ خدا کا علم اور قول اودن امور کی بابت جو بقید زمان حادث ہوتے ہیں ازل و ابد سے متصف ہے۔

پھر بہت کچھ اخلاق کے ساتھ سینٹ الگسٹائن نے کتاب پیدائش کے افتتاحی الفاظ ”ابتدائین“ کی شرح کی ہے۔ اس شرح میں اوس نے کتاب مقدس کی ایک اور آیت سے مدد لی ہے جو یہ ہے: ”اے خدا تیری صناعت میں کس قدر عجیب و غریب ہیں۔ تو نے ان کو اپنی حکمت سے بنایا۔“ پس ”یہ حکمت“ ہی گویا ”ابتدا“ تھی اور اسی ”ابتدائین“ خدا نے زمین و آسمان بنائے۔

آگے چل کر سینٹ الگسٹائن کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ آسمان و زمین بنانے سے پہلے خدا کیا کر رہا تھا۔ اگر اوس کی صفت خالقیت کسی خاص وقت سے

شروع ہوئی تو اس سے زمان لازم آتا ہے نہ کہ قدم اور قدم میں کوئی شے حادث نہیں ہوتی بلکہ سب کچھ موجود و مستحضر ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب دینے میں اوس نے اوس بلاغت آفرینی سے کام لیا ہے جس کے لحاظ سے وہ مشہور ہے۔ ”میں اس سوال کے جواب میں یہ تو نہ کہوں گا کہ خدا زمین و آسمان بنانے سے پہلے اون لوگوں کے لیے جو اوس کے امر ارادہ کنہ کا کھوج لگانا چاہتے ہیں جہنم کے بنانے میں مصروف تھا۔ البتہ مستفسر کو یہ جواب دوں گا کہ زمین و آسمان پیدا کرنے سے پہلے خدا نے کوئی شے نہیں بنائی اس لئے کہ مخلوق ہونے سے پہلے کوئی شے مخلوق نہیں ہو سکتی۔ زمانہ خود مخلوق ہے اور اس لیے ممکن نہیں کہ خلقت کے قبل اوس کا وجود ہو۔ پھر زمانہ کیا ہے؟ زمانہ گذشتہ تو بحر نہیں۔ زمانہ مستقبل ہی معدوم ہے۔ رہ گیا زمانہ موجودہ۔ اس کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہے۔ اگر ہو تو شاید وہ شے ہو جسے دو عدوموں کے درمیان کوئی بقا نہیں۔ زمانہ طویل یا زمانہ قلیل جہاں میں اس واسطے کہ جب ماضی و مستقبل ہی موجود نہیں تو ان کا وجود کیسا۔ ان کا وجود سوار روح کے اور کہیں نہیں۔“

جس عبارت میں سینٹ اگسٹائن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ گویا ایک مجذوبانہ بڑے جس کا مخاطب خدا ہے۔ اوس کی تصانیف کی حقیقت خواب پریشان کے ایک مجموعہ سے زیادہ نہیں۔ اس خیال سے کہ ناظرین ہمارے اس بیان کی تصدیق کر سکیں ہم بلا انتخاب کسی ایک مقام سے اوس کی عبارت کے چند فقرہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ ذیل کی عبارت بارہویں فصل سے نقل کی جاتی ہے۔

”پس اے میرے خدا یہی وہ بات ہو جو میری سمجھ میں آتی ہے جبکہ میں تجھے اپنے کلام پاک میں یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور زمین نہ تو دکھائی دیتی تھی نہ اوس کی کوئی شکل تھی۔ اور سمندر پر اندھیرا چھایا ہوا تھا اور تو نے یہ نہیں فرمایا کہ تو نے ان کو کس دن پیدا کیا۔ یہ ہے وہ بات جو میری سمجھ میں

آتی ہے اور اس کی وجہ فلک الافلاک ہے یعنی وہ عقلی آسمان جس کی عقول کو سب کچھ ایک ہی دفعہ معلوم ہو جاتا ہے تھوڑا تھوڑا کر کے اس طرح نہیں معلوم ہوتا کہ گویا چاروں طرف اندھیرا چھا یا ہوا ہے یا کوئی چیز آئینہ میں سے نظر آرہی ہے بلکہ کل کا کل تیرا منظر بن کر دوبارہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک شے کا علم اب ہو اور ایک شے کا تھوڑی دیر کے بعد بلکہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ان عقول کو بلا تدریج یا فصل زمان سب کچھ ایک ہی دفعہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین غیر مٹی اور غیر مُشکل اور تدریج زمانی سے عاری ہو۔ اور تدریج یا فصل ہی وہ حالت ہے جس کے باعث ایک شے اب ظاہر ہوتی ہے اور ایک شے کچھ دیر کے بعد۔ اس لیے کہ شکل یا صورت کے موجود نہ ہونے سے اشیاء میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ پس ہر شے کا وجود انہیں دونوں کے ساتھ وابستہ ہے یعنی ایک تو اس ابتدائی ہستی کے ساتھ جو شکل پکڑ چکی تھی اور ایک اس ابتدائی ہستی کے ساتھ جس کی کوئی شکل نہ تھی۔ ایک فلک تھا لیکن فلک الافلاک تھا۔ دوسری زمین تھی لیکن وہ زمین جو متحرک اور بے شکل تھی۔ انہیں دونوں کی وجہ سے یہ خیال برے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جیسا کہ اے خدا تیری کتاب مقدس بلا تخصیص ایام کہتی ہے کہ ابتدائیں خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ کیونکہ ساتھ ہی اس امر کی بھی تشریح و توضیح کر دی گئی کہ معبود ذہنی کو نسی زمین ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ یہ قہ لاجوردی دوسرے دن پیدا کیا گیا اور اس کا نام آسمان رکھا گیا۔ جس سے ہم کو بلا تعین ایام معلوم ہو جاتا ہو کہ کس آسمان کا پہنے ذکر کیا گیا۔ اے خدا تیرا کلام بھی کس قدر گہرا ہے جس کی سطح ہمارے سامنے ہو۔ ہم بچوں کی طرح ہیں اور وہ ہمارا دل لہجاتی ہے۔ اے میرے خدا تیرے کلام کی گہرائی تعجب خیز ہے اور بہت ہی تعجب خیز ہے۔ اس گہرے کنوئین میں جھانکتے ہوئے دل پر ہیبت چھا جاتی ہے وہ ہیبت جو عزت و آبرو میں لپٹی ہوئی ہے اور لرزہ طاری ہو جاتا ہے وہ لرزہ جو عشق و محبت کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس کے دشمنوں سے مجھ سخت

نفرت ہے۔ کاش تو اپنی تیغ و دو دم سے قتل کر ڈالتا تا کہ وہ تیرے کلام سے دشمنی کرنے کے قابل نہ رہے اور میرے نزدیک اَدِن کا اپنے نفس کے اندر مارا جانا بہت ہی پسندیدہ ہی اس لئے کہ اس طور پر وہ تیری ذات کے اندر بقا حاصل کر سکیں گے۔“

ذیل کے فقرہ کا اقتباس سینٹ اگسٹائن کی کتاب ”اقبالات“ کی تیرہویں فصل سے کیا جاتا ہے جس میں وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ مسئلہ تخلیق کتاب پیدائش میں موجود ہے۔ اس اقتباس سے ہمارا مقصود اس کی شانِ نفیر نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ دکھانا ہے کہ وہ کتاب مقدس کو اسرار و غوامض کی گتھیاں کیوں کر سلجھاتا ہی۔

”اب مجھ کو تخلیق نہ نظر آ رہی ہے اور اس طرح نظر آ رہی ہے جیسے آئینہ میں کوئی چیز دھندلی دھندلی دکھائی دیتی ہو۔ اور یہ اسے میرے خدا تیرا جلوہ ہے کیونکہ تو نے باپ ہوئے کی حیثیت سے آسمان و زمین کو اس کا مظہر بن کر پیدا کیا جو ہماری عقل و تمیز کا مبدار ہے اور جو تیری عقل ہے اور تجھ سے پیدا ہوا اور ازل و ابد میں تیرا شریک و سہیم ہے یعنی تیرا بیٹا۔ ہم فلک الافلاک کا بہت کچھ حال بیان کر چکے ہیں اور اس زمین کا جو دکھائی نہ دیتی تھی اور نفیر کسی صورت کے تھی۔ اور تاریک سمندر کا بھی بلحاظ اس کی مسخ شدہ روحانیت کے تزلزل اور بے ثباتی کے ہم نے بہت کچھ ذکر کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے اس کی شکل اختیار کر لی ہو جس نے بقدر اس کی نشو و نما کو موجودہ کے اس میں جان ڈالی تھی اور اس کی روشنی کی وجہ سے حسن و جمال کے سانچہ میں ڈھل کر وہ فلک الافلاک بن گیا ہو جو آگے چل کر اس طرح قائم کیا گیا کہ اوپر نیچر پانی ہی پانی تھا۔ اس طرح خدا کے نام کے ذریعہ سے مجھ کو باپ کی حقیقت کا علم ہوا جس نے یہ کائنات بنائی اور ابتدا کے نام کے ذریعہ سے مجھے بیٹے کی ماہیت معلوم ہوئی جس میں ساری دد ایر ہو کر اس نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ اور اپنے خدا پرشکل تخلیق ایمان لا کر جب میں نے اس کے کلام پاک کو اور زیادہ تجسس اور تفحص کی نظر سے دیکھا

تو مجھے روح القدس کا جلوہ سطح آب پر نظر آگیا۔ پس اے میرے خدا مجھ پر تثلیث یعنی باپ بیٹے اور روح القدس کی حقیقت آشکارا ہو گئی کہ وہی آفریننے کون و مکان ہے، یہ سینٹ الگسٹائن کی تصانیف کو اہل مذہب پندرہ سو برس سے مستند مانتے چلے آئے ہیں۔ اس لیے ہم کو بھی لازم ہے کہ ان کا ذکر ادب سے کریں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم کو سوراہی کی ضرورت بھی نہیں۔ جن فقرات کا ہم نے ان کی تصنیف سے اوپر اقتباس کیا ہے وہ اپنی تنقید خود کر رہے ہیں۔ سائنس اور مذہب میں جو نزاع پیدا ہو گئی اس کو بانی مبنائی ہی حضرت ہیں۔ کتاب مقدس کی اصلی غرض یہ تھی کہ لوگوں کو نیکی اور پاکیزگی کا رستہ دکھائے۔ ان بزرگوار نے علوم انسانی کی قسمت کا فیصلہ جو اس کے بس کا نہ تھا اس کے حوالے کر کے نہایت بے باکی کی راہ سے انسان کے قوامی عقلی پر جا برا نہ حکومت کا سلسلہ قائم کر دیا۔ مثال تو قائم ہو ہی چکی تھی پیر و بہت سے پیدا ہو گئے۔ مثلاً ہیرفلاسفہ یونان کی تصانیف کو ان مقدس پیروان کلیسا نے علوم مغلی کی ذیل میں داخل کیا۔ عجائب خانہ اسکندریہ کے عظیم المثال اور روشن کار ناموں پر جہالت تعصب اور غیر ممکن الفہم مہلات کے کالے بادلوں کی گھٹا چھا گئی جس میں سے پادریوں کے قہر و انتقام کی بجلیاں رہ رہ کر کوند لے لگیں۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ علوم و فنون میں جن کا مدار علیہ الہام ربانی ہو کسی تغیر یا تبدیل یا ترقی کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اگر الہام کو سائنس کا سرچشمہ مان لیا جائے تو تمام نئے لے جن دو مقامات کا اقتباس یہاں کیا گیا ہے اگرچہ بہتر یہی ہوتا کہ انہیں قلم انداز کر دیا جاتا اس لیے کہ ان کا مطلب یا تو خود جناب الگسٹائن نے سمجھا ہوگا اور یا وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس کو روح القدس کے فیضان سے خاص طور پر بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا ہو لیکن اس خیال سے کہ ناظرین بھی سینٹ الگسٹائن کی ہرزہ سرائی یا بقول مصنف مجدد بانہ بڑکا لطف اٹھانے میں ہمارے ساتھ شریک ہو سکیں اصل عبارت کا مفقعی ترجمہ درج کرنا ہم نے ضروری خیال کیا۔ مترجم

اکتشافات غیر ضروری ٹھہرتے ہیں۔ جو باتیں خدا کو بتانی منظور تھیں وہ اوس نے بذریعہ کتب مقدس انسان پر ظاہر کر دیں۔ ان کے سوا اور کسی قسم کی دریافت کی کوشش گویا خدا کی کنتہ کی بیہودہ اور گستاخانہ تلاش ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اوس مقدس سائنس کی حقیقت کیا ہے جو بذریعہ الہام ربانی حاصل ہوا اور جس پر بزرگان دین یعنی پادری صاحبوں نے معلومات انسانی کا حصر کر دیا۔ یہ علم وہ علم ہے جو کائنات کے تمام مادی و روحانی مظاہر کو افعال انسانی کے مشابہ قرار دیتا ہے۔ اور خدا کے قیوم کو ایک عظیم الجثہ انسان سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ اس کی رو سے زمین ایک چمٹی سطح ہے جس پر آسمان گنبد کی طرح قائم ہے یا بقول سینٹ اگسٹائن جھلی کی طرح کھینچا ہوا ہے۔ آسمان میں سورج چاند اور ستارے اس غرض سے حرکت کرتے ہیں کہ ان کو شبانہ روز روشنی پہنچائیں۔ زمین اوس مادہ سے جسے خدا نے عدم سے پیدا کیا اور تمام حیوانات و نباتات سمیت جو اس پر آباد ہیں چھ دن میں تیار ہوئی۔ آسمان کے اوپر بہشت ہے اور زمین کے نیچے ایک تاریک و آتشیں مقام میں دوزخ ہے۔ زمین مرکز کائنات ہے اور باقی تمام اجسام فلکی و غیر فلکی اس کے تابع اور اس کے فائدہ کی غرض سے بنائے گئے ہیں۔ انسان کو زمین کی خاک سے بنایا گیا۔ اول اول وہ اکیلا تھا مگر بعد میں اوس کی ایک پسلی سے عورت بنائی گئی۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اوسے خدا نے فردوس میں جو دریائے فرات کے کنارے واقع تھا رہنے کو جگہ دی۔ وہ نہایت عاقل اور پاک تھا لیکن چونکہ اوس نے شرم منوعہ کھا کر خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی لہذا اوس شقت اور موت کی سزا دی گئی۔ اس انسان اول کی اولاد کو اوس کی منزا سے کچھ عبرت نہ ہوئی بلکہ اودن سے ایسی ایسی بدیان اور شرارتیں سرزد ہوئیں کہ خدا کو اودن کے تباہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور اس لیے ایک ایسا طوفان عظیم رو سے زمین پر نازل کیا گیا کہ چھاڑن کی چوٹیاں تک پانی میں غرق ہو گئیں۔ جب یہ طوفان انسان کو غارت کر چکا تو ایک

ہو اسے تند چلی جس نے پانی کو خشک کر دیا۔

اس آفت سے حضرت نوحؑ اور اون کے تین بیٹے ہام سام اور یافث مع اپنی بیویوں کے ایک کشتی میں سوار ہو کر بچ گئے۔ ان میں سے سام نے ایشیا کو از سر نو آباد کیا ہام۔ بے افریقہ کو اور یافث۔ نے یورپ کو۔ چونکہ امریکہ کی حقیقت مقدس پادری صاحبوں کو معلوم نہ تھی اس لیے اس کی آبادی کے مورث اعلیٰ کے نام کی گنجائش نہیں نکالی گئی۔

اب ذرا سنئے کہ یہ بزرگوار اپنے دعاوی کی تائید میں کس قسم کے دلائل پیش فرماتے ہیں۔ لکھنؤ ٹیکس نے زمین کے کردی شکل ہونے کی تردید ان الفاظ میں کی ہے :-

”دیکھنا یہ ممکن ہے کہ انسان اس درجہ لغو اور بھل ہو کہ یہ بات باور کرے کہ درخت اور پودے

زمین کی دوسری طرف نیچے کو ٹٹک رہے ہیں یا دھان کے باشندوں کے پاؤں اوپر ہیں

اور سر نیچے۔ اگر ان لوگوں سے پوچھا جائے کہ ان مہلات کی کیا توجیہ کرتے ہو اور کیوں یہ

چیزیں زمین پر سے گر نہیں جاتیں تو وہ کہتے ہیں کہ خاصیت ایشیا یہی ہے کہ بہاری چیزیں

پہیے کر آردن کی طرح مرکز کی طرف مایل ہوں اور ملکی چیزیں مثلاً بادل دھواں اور آگ

مرکز سے اوپر کی طرف اٹھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کو کیا کہوں جو ایک بار غلطی کر

ہیں تو اس مثیلے پن سے اس پر قائم ہو جاتے ہیں کہ ایک حماقت کی تائید میں دوسری حماقت

پیش کرتے ہیں“ مسئلہ تقابل برجلین یعنی اس مسئلہ کے متعلق کہ زمین کے دوسری طرف،

جو انسان آباد ہیں ان کے پاؤں کے تلوے ہمارے پاؤں کے تلووں کے مقابل ہیں

سینٹ الگسٹائن یون ارشاد فرماتے ہیں :- ”زمین کے اوس طرف آبادی کا ہونا محال ہے

اس لیے کہ کتاب مقدس میں حضرت آدمؑ کی اولاد میں سے کوئی قوم اس قسم کی بیان نہیں

کی گئی“ لیکن شاید سب سے زیادہ زبردست اور لا جواب دلیل زمین کے کردی شکل

ہونے کے خلاف یہ پیش کی جاتی تھی کہ اوس طرف کے باشندوں کو خسر کے دن خداوند خدا

ہو اسے زمین پر اترنا کیوں کر نظر آئے گا۔



دنیا میں موت کی آمد۔ واقعات عالم میں روحانیت کا پیہم تصرف۔ ملائکہ دنیا طین کے مناسب۔ زمین کا ایک وقت معبودہ پر آگ سے جل جانا۔ بابل کے مینارہ کا واقعہ۔ زبانوں کا اختلاف۔ بنی نوع انسان کا رو سے زمین پر منتشر ہونا۔ مظاہر قدرت مثلاً کسوف و خسوف و قوس قزح کی تادل۔ یہ تمام ایسے سایل ہیں جن پر یہاں بحث کرنا فضول ہے خصوصاً اودن تصورات پر جو مقدس پادری صاحبوں نے خدا کی ذات و صفات کے متعلق قائم کیے ہیں میں کچھ نہیں کہنا چاہتا اس لیے کہ ان تصورات کے پردہ پر خدا کی جو شبیہ کھینچی گئی ہو وہ انسان سے بہت ہی مشابہ اور شان ایزدی سے بہت ہی گرمی ہوئی ہے۔

البتہ کہ سائنس انڈیکا پلیوسٹینر کے بعض خیالات کا التقاط اس مقام پر کرنا غیر موزون نہ ہوگا۔ یہ خیالات چھٹی صدی میں عام طور سے رائج تھے۔ اس شخص نے ایک کتاب ”کرسچین ٹاپوگرافی“ (مسیحی جغرافیہ) کے نام سے لکھی تھی جس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ اس لمحہ انہ عقیدہ کی تردید کی جائے کہ زمین کر دی شکل ہے اور نیز بت پرستوں کے اس دعویٰ کا ابطال کیا جائے کہ منطقہ حارہ کے جنوب میں منطقہ معتدلہ واقع ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جغرافیہ کے صحیح اور سچے اصول کی رو سے زمین ایک سطح ذوال بعثۃ الزوایا ہے جو بقدر چار سو دن کی مسافت کے مشرق سے مغرب تک اور شمالاً جنوباً اس سے نصف فاصلہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے چاروں طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے جن پر آسمان قائم ہے۔ شمال میں ایک پہاڑ واقع ہے جو سب پہاڑوں سے بڑا ہے۔ جب یہ پہاڑ آفتاب کی شعاعوں کا حایل ہو جاتا ہے تو دنیا پر تاریکی مچا جاتی ہے جسے رات کہتے ہیں۔ زمین بالکل سطح نہیں ہے بلکہ جنوب کی طرف تھوڑی سی جھکی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دریا سے فرات و نیل وغیرہ جیسے بہاؤ کا رخ جانب جنوب ہے نہایت تیزی سے بہتے ہیں لیکن دریا کے نیل کا دہارا بلند یں پر چڑھنے کو باعث بہت سست رفتار ہے۔

بیحدہ ساتویں صدی میں اسی طبقہ کا ایک مصنف ہو گزرا ہے لکھتا ہے: ”دنیا

چھ دن میں پیدا کی گئی اور زمین اس کا مرکز اور سب سے بڑا جسم ہے۔ آسمان ایک آتشیں اور سیال جسم مدور ہے جو زمین پر شامیانہ کی طرح تنا ہوا ہے اور مرکز زمین سے اس کا ہر ایک حصہ مساوی البعد ہے۔ یہ ہر روز نہایت تیزی سے گھومتا ہے مگر اس تیزی میں سات سیاروں کی مزاحمت کی وجہ سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ تین سیارے زحل مشتری اور مریخ آفتاب سے اونچے ہیں۔ ان کے نیچے آفتاب ہے اور آفتاب کے نیچے باقی تین سیارے ہیں یعنی زہرہ عطارد اور قمر ستارے اپنے مقررہ دائروں میں گردش کرتے ہیں۔ اور شمالی ستاروں کا مدار سب سے چھوٹا ہے۔ عرض معلیٰ کی حدود مقرر ہیں۔ اس میں ملایکہ آباد ہیں جو زمین پر اتر کر انسانی شکل اختیار کرتے ہیں اور انسانی فرایض ادا کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ آسمان کی حرارت بخ کے ٹھنڈے پانی سے معتدل ہوتی رہتی ہے ورنہ اسے آگ لگ جائے۔

فلک ادنیٰ کا نام آسمان ہے اس لیے کہ یہ آب فوقانی و تحتانی کے درمیان حد فاصل ہے۔ آسمانی عالم آب فلک الارواح سے نچا مگر تمام جسمانی اشیاء سے اونچا ہے۔ اگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا ذخیرہ ایک دوسرے طوفان کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے لیکن ہمیں اون لوگوں کے ساتھ اتفاق ہو جن کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ عالم آب ثابت کی حرارت کے اشتداد میں اعتدال پیدا کرنے کی غرض سے بنایا گیا ہے۔

جہل تعصب اور خیرہ چشمی کی بھی کوئی حد ہے! کیا انہیں لغو اور بھل خیالات کی اشاعت کر لینے فلاسفہ یونان کی تصانیف سے ابا کیا گیا تھا؟ لیکن جھوٹ کے باؤں نہیں ہوتے۔ ایک دن ان مہلات کی قلعی کھلنے والی تھی۔ جب ”ریفارمیشن“ (اصلاحیت) کا دور آیا تو اون فاضل نقادوں نے جو اس زمانہ میں پیدا ہوئے ان تمام مصنفین کی کتابوں کا ایک دوسری سے مقابلہ کرنے کے بعد ان کو حقارت کی اوس ٹوکری میں جھونک دیا جو ان کے لیے صد ہا سال سے تیار کی جا رہی تھی۔ آج کے دن ان میں سے ایک کتاب بھی ایسی نہیں جسے ہم نفرت کی نظر سے نہ دیکھتے ہوں۔

علوم و فنون کا جو نظام اس طور پر مدون کیا گیا اوس کا سب سے زیادہ عجیب و غریب جزو اس کی منطق اور اس کو مدون کرنے کے ثبوت کا ڈھنگ تھا۔ انبات و عادی کے یہی معجزات پیش کیے جاتے تھے اور ایک واقعہ کے ثبوت میں ہمیشہ کسی غیر متعلق واقعہ کی مثال پیش کر کے سمجھ لیا جاتا تھا کہ ثبوت مکمل ہو گیا۔ ایک عربی عالم نے اس طرز ثبوت کی نسبت کیا خوب لکھا ہے: ”اگر کوئی بھان جتی کا تماشا کرنے والا مجھ سے کہے کہ تین کا عدد دس سے زیادہ جو اور اس کا ثبوت چاہو تو میں اس چھڑی کا سانپ بنا کر دکھا دیتا ہوں تو میں بیشک اوس کے ہتھکھنڈ کو تا قایل ہو جاؤں گا مگر اوس کے دعویٰ کو کسی طرح تسلیم نہ کروں گا۔“  
 با این ہمہ ہزار برس سے زیادہ عرصہ تک یہی منطق یورپ بھر میں رائج رہی اور اسی قسم کے لغو دعویٰ ایسے ہی فضول و جہل ثبوت پر صبح مانے جاتے رہے۔

چونکہ وہ فیزیق جو سلطنت میں برسرِ اقتدار ہو گیا تھا اس قسم کی کتابیں تصنیف کرنے سے عاجز تھا جنہیں بت پرست مصنفین کی مشہور تصانیف سے عقلی طور پر باریکاری مسابقت ہو سکے اور یہ ممکن نہ تھا کہ فیزیق مذکورہ مقابل کو دانش و حکمت میں اپنے سے بڑھ کر تسلیم کرے لہذا مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ علوم سفلی یعنی فلسفہ طبیعیات کی اشاعت کی راہ میں نہ صرف روڑے اٹکائے جائیں بلکہ فلاسفہ و طبیعیات پر یونانیان کی جائیں تاکہ وہ اکتساب و ترویج علوم و فنون سے بالکل ہی دست بردار ہو جائیں اور علم کا چراغ گل ہو جائے۔ قیصر و کینٹا نہیں کے عہد میں جو مظالم حکماءے اشرافیہ پر روا رکھے گئے اُن کی محرک یہی پولیٹیکل مصلحت تھی۔ اُن پر جادوگری کا الزام لگایا گیا اور بہت سے فلاسفہ قتل کر اڈے گئے۔ فلسفہ کو قدم قدم پر خطرات کا سامنا تھا۔ فلسفہ دانی سرکاری جرایم کی فہرست میں شامل ہو گئی۔ علم و حکمت کی جگہ اب عجائبات و توہمات نے لے لی جن سے طبیعتوں کو عشق پیدا ہو گیا۔ اور ہر مصر کے جن مشائیر نے عجائب خانہ اسکندریہ کو بقائے دوام کی چادر اڑا دی تھی اُن کو جانشین جاہل اور اداہم پرست راہبوں کے گردہ بن گئے۔

# تیسرا باب

## نزاع مذہب و سائنس دربارہ مسئلہ توحید پہلی یعنی جنوبی اصلاح

اہل معر امرار کرتے ہیں کہ مریم عذرا کی پرستش کو رواج عام دیا جائے۔ قسطنطنیہ کا ہترین شہورادن کی مخالفت کرتا ہے لیکن انجام کار بوجہ اس رسوخ کے جو مصریوں کو دربار قیصر میں حاصل ہے وہ شہور کو جلا وطن کرا دیتے ہیں۔ اور شہور کے پیروں منتشر ہو جاتے ہیں۔

اصلاح جنوبی (یعنی اسلام) کا آغاز۔ حملہ ایران۔ اس کے اخلاقی تیاج۔ اصلاح عرب۔ حضرت محمد شہوری فرتے کے راہبوں سے ملتے ہیں۔ اور ان کے اصول اختیار کر کے ان اصول پر اپنی طرں سے بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ مریم عذرا کی پرستش مسئلہ تثلیث اور اس عقیدے سے جو توحید باری سے توافق نہیں رکھتا وہ ابا کرتے ہیں۔ عرب کی بت پرستی کو بھرٹا دی ہیں اور دولت روم پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ آن حضرت صلعم کے جانشین شام مصر ایشیائے کوچک شامی افریقہ اور ہسپانیہ کو سوار فرانس پر حملہ کرتے ہیں۔

اس کشمکش سے نتیجہ نکلتا ہے کہ وحدت واجب الوجود کا اصول دولت روم کے اکثر حصہ میں رائج ہو جاتا ہے۔ سائنس از سر نو زندہ ہوتا ہے اور سچی دنیا کے بہت سے شہور مرکز حکومت مثلاً اسکندریہ کارٹیج یہاں تک کہ بیت المقدس عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔

دولت روم کی حکمت عملی نے عہد قدیم کی عیسائیت میں بت پرستی کا عنصر ملا کر سلطنت کے باشندوں کو کفار مسیحی بنادیا تھا۔ بت پرست اور عیسائی بلحاظ عقاید ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دونوں فریق ایک دوسرے میں مذہبی طور پر ضم ہو گئے تھے۔ عیسائیت نے بت پرستی میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں اور بت پرستی نے عیسائیت کو بہت کچھ متغیر کر دیا تھا۔ یہ دو غلامی صوبہ دولت روم کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔

اس اختلاط سے جو عظیم الشان توسیع مترتب ہوئی اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسیحی جماعت دولت مند ہو گئی اور اس کے سیاسی اقتدار کا پلہ بھاری ہو گیا۔ سرکاری مالگزاری کی رقم خیر کا ایک بہت بڑا حصہ عیسائی کے خزانوں میں داخل ہونے لگا۔ اس دولت پر دست مسابقت دراز کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دین عیسوی کی حمایت کا جامہ ریائی پہن کر حقیقت میں اس کے دنیوی نواید سے مستفید ہونے کو اپنا نصب العین قرار دے رکھا تھا۔

قیصرہ زمانہ سابق کے عہد میں فتوحات کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ سلطنت کی تکمیل ہو چکی تھی۔ سپاہیانہ زندگی کے مقاصد اصلی سب ختم ہو چکے تھے۔ جنگ و جدل تغلب و تصرف اور لوٹ مار کا زمانہ گزر چکا تھا۔ لیکن اہل حرص و ہوا کے لیے ایک اور رستہ بھی کھلا تھا اور ان کی مقصد برآریوں کے اور بھی بہت سے طریقے تھے۔ کلیسائی زندگی کی کامیابی میں ان عظیم الشان نواید کا راز چھپا ہوا تھا جو عہد گزشتہ کے جنگی کارناموں کے مقابلہ میں سود مندی کے اعتبار سے کسی طرح کم نہ تھے۔

اس زمانہ میں مذہبی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سیاسی تاریخ کے پرکار مرکز کش قسطنطنیہ اسکندریہ اور روم کے بطریقوں کی مسابقتاں جدوجہد تھی۔ ان میں سحر و ایک یہی جابھتا تھا کہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھا کر عنان سطوت و اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔

قسطانیہ کے دعویٰ تفوق کا انحصار اس واقعہ پر تھا کہ وہ قیصر کا پایہ تخت ہے۔ اسکندریہ کو اپنی تجارتی اور علمی حیثیت پر ناز تھا اور روم اپنی گذشتہ عظمت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتا تھا۔ لیکن قسطانیہ کے بطریق کے منصوبوں کی راہ میں ایک بڑی مشکل بھی حایل تھی اور وہ یہ کہ قیصر کی ہر وقت اوس پر نظر رہتی تھی اور وہ کسی معاملہ میں خود مہرانہ کارروائی نہ کر سکتا تھا۔ بخلاف اس کے اسکندریہ اور روم کو مرکز حکومت سے دور ہونے کے باعث شہنشاہ کی مداخلت کا خوف نہ تھا اور وہ بے کھٹکے من مانی کارروائیاں کر سکتے تھے۔

مشرق میں مذہبی مباحث عموماً خدا کی ذات و صفات کے متعلق ہوتے رہے ہیں لیکن مغرب میں اس قسم کے مناقشوں کا میلان تعلقات و حیات انسان کی طرف رہا ہے۔ یہ خصوصیت اوں تغیرات میں صاف طور سے نمایاں ہے جن سے مذہب عیسوی ایشیا و یورپ میں متاثر ہوا۔ اوس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں سلطنت روم کے مشرقی صوبوں میں ایک عقلی پلچل مچی ہوئی تھی۔ تثلیث۔ جو ہر ذات باری تعالیٰ۔ درجہ ابن اللہ۔ ماہیت روح القدس۔ اقتدار مریم عذرا۔ وہ سائل تھے جن پر نہایت سختی کے ساتھ مذہبی حلقوں میں مناظرے اور مجادلے ہوتے تھے۔ آج ایک فریق نقارہ فتح و نصرت بجاتا تھا تو کل دوسرا فریق اپنی کامیابی کا اعلان کرتا تھا اور متخاصمین اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کبھی معجزے اور کرامتیں پیش کرتے تھے اور کبھی نوبت تیغ آزمائی تک پہنچتی تھی جس سے خون کی ندیاں بہ نکلتی تھیں۔ یہ کوشش کبھی نہ کی جاتی تھی کہ آراء متقابل کو منطقیانہ استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر کھوٹے کھرے کا امتیاز کر لیا جائے۔ لیکن ان سب متخالف فرقوں کے نزدیک یہ امر مفق علیہ تھا کہ بت پرستانہ مسلک کی تمام قدیم شکلیں باطل تھیں اس لیے کہ جس آسانی سے ان مذاہب کا استیصال ہو گیا وہ خود ان کے بطلان پر دلالت کرتی تھی۔ چنانچہ پادریوں نے بے بانگ دہل اس امر کا اعلان کر دیا کہ جب امتحان کا

وقت آیا تو دیوتاؤں کی سورتیں اپنی حفاظت میں انگلی تک نہ اٹھا سکیں۔

یورپ کی جنوبی اقوام نے ہمیشہ تعدد ذات باری تعالیٰ کو اپنا کیش و آئین قرار دیا ہے اور سامی اقوام کا میلان عقیدہ وحدت واجب الوجود کی طرف پایا گیا ہے۔ شاید زمانہ حال کے ایک مصنف کے خیال کے مطابق اس کی یہ وجہ ہو کہ پہاڑوں وادیوں جزیروں دریاؤں اور غلیجوں کی رنگارنگ منظر آرائمان انسان کے دل میں معبودوں کی کثرت کا تصور پیدا کر دیتی ہیں اور ایک وسیع و وسیع ریگستان اور ناپید اکنا رسمند کا نظارہ اوس کے دماغ پر جناب باری کی بیکٹائی کا نقش مرسم کرتا ہے۔

ملکی مصلحتوں سے قیصرانِ روم سے سفارش کی تھی کہ عیسائیت اور بت پرستی کی تشریح کو نظرِ استحسان دیکھیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس طرزِ عمل نے دونوں حریفوں کی باہمی رقابت کی تلخی کو کسی قدر کم کر دیا تھا۔ عام پسند مذہب عیسوی کی بہشت وہی قدیم اولیٰ پس قرار دیا گیا تھا جس میں یونانی دیوتاؤں کا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس بہشت میں بجائے یونانی دیوتاؤں کے جو وہاں سے نکال دئے گئے تھے ایک بہت بڑے سفید تخت پر باپ یعنی خدا بٹھا دیا گیا تھا۔ اوس کے دہنے ہاتھ کی طرف بیٹھا تھا۔ بیٹھ کے برابر مقدس مریم زلفیت کا خلعت پہنے انواع و اقسام کے زیور و ن سے لدی ہوئی جلوہ افروز تھیں اور خدا کے بائیں طرف روح القدس ٹھکان تھی۔ اس تخت کے گرد اگر د ملائکہ کا ایک جم غفیر ہاتھوں میں بالسمیان لیے پراجمائے کھڑا تھا۔ ملائکہ کی صفوں سے گزرتے ہوئے وسیع میدانِ نظر آتا تھا جہاں اطعمہ لذیذ و اشربہ نفیسہ سے لدی ہوئی میزین بھی ہوئی تھیں جو نیک اور پاکباز بندوں کی ارواح پر فتوح کے کام و زبان کے لیے سرمایہ لذت جاد وانی ہم پہنچاتی تھیں۔

عوام و جہال کے اطمینان کے لیے تو راحت و سرور کی یہ تصویر کافی تھی اور شاید اون کا ذہن اس تصویر کے دوسرے رخ کی طرف کبھی منتقل بھی نہ ہوتا ہوا اور اون کے

دل میں یہ سوال پیدا نہ ہوتا ہو کہ آخر ایسے غیر متغیر و غیر متحرک نظارہ میں جس کو دیکھ دیکھ کر طبیعت کا کبھی نہ کبھی اچاٹ ہو جانا لازمی ہے لذت آفرینی کی قابلیت کس حد تک موجود ہو سکتی ہے لیکن جو ذرا سمجھ دار تھے اون سے عوام کا لالعام کی تقلید کی توقع نہ کی جاسکتی تھی۔ طبقہ اعلیٰ کے دقیقہ منج و نکتہ رس پیشوایان دین میں بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے ان تصورات کو جو مادہ پرستی اور ہوس رانی کی آلائشوں سے آغوشہ تھے کمال حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھا اور حاضر و ناظر و قادر مطلق خدا کی ذات و صفات کو ان ناپاک قیود سے بری کرنے کے لیے اپنی آواز بلند کی۔

عیسوی مذہب میں بت پرستی کے عنصر کی آمیزش کا عمل تو بہر طرف جاری ہی تھا۔ اب ہر بطریق کو ہر دفعہ زیر بنی یا اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لیے اس بات کی فکر پکڑ گئی کہ جس طرح بن پڑے اپنے مقتدیوں کے عقاید کو عام اس سے کہ ان عقاید کا زمانہ قبل ظہور مسیحیت ہو یا بعد ظہور مسیحیت مذہب میں داخل کر لیا جائے۔ مصریوں نے اسی طرح سکہ تثلیث کے متعلق اپنے خاص قسم کے عقاید کو عیسائیت میں زبردستی داخل کر لیا تھا اور اب وہ چاہتے تھے کہ مریم عذرا کی پرستش کے بہانہ سے آئسٹس کی قدیم پرستش کو از سر نو زندہ کیا جائے۔

انہیں دنوں میں قیصر تھیوڈوسیئس نے تصور کو جو فلسفہ میں تھیوڈور ساکن پالیوٹیا کا ہم ملک تھا قسطنطنیہ کا بطریق اعظم مقرر کیا (۳۸۰ء)۔ اون ذلیل تجسیمیہ عقاید سے جو عوام میں پھیلے ہوئے تھے تصور کو الٹا کر تھا۔ اور اس کا یہ خیال تھا کہ خدا احد و ذوالجلال و قیوم کو جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں ساری دوایرے ذات یا صفات میں انسان کے مشابہ یا مائل قرار دینا کفر ہے۔ تصور پر اسطو کے فلسفہ نے نہایت گہرا اثر ڈالا تھا اور اس کی یہ کوشش تھی کہ عقاید مشائیہ کو خالص مسیحی عقاید کے ساتھ تطبیق دی جائے۔ اس بنا پر اس میں اور اتحادیہ کے بطریق ملکیل میں جھگڑا ہو گیا۔ سائرل کا تعلق کلیسا



کی اوس جماعت سے تھا جو بت پرستی کی حامی تھی اور نسطور اوس فریق کا سرگروہ تھا جو مذہب کو مطابق عقل ثابت کرنے میں کوشاں تھا۔ یہ سائرل وہی ہے جس نے ہاتھی پیشیا کو قتل کیا تھا۔ سائرل نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ حضرت مریم کی پرستش خدا کی مان ہونے کی حیثیت سے ارکان کلیسا میں داخل ہو جائے اور نسطور کا مصمم قصد تھا کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے صدر گرجا میں نسطور نے ایک خطبہ پڑھا جس میں خدائے قیوم کی صفات کو شرک سے برابر قرار دیتے ہوئے اوس نے ازراہ استعجاب یہ سوال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے خدا کی مان ہو؟ اس کے علاوہ متعدد موعظوں پر اوس نے اور جو خطبے پڑھے یا مضامین لکھے ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا ہی کہ حضرت مریم کو خدا کی مان نہ سمجھنا چاہیے بلکہ حضرت مسیح کے انسانی حصہ کی مان تصور کرنا چاہیے اور یہ انسانی حصہ ربانی حصہ سے ایسا ہی جدا ہے جیسا معبود اپنے معبود سے۔

اسکندریہ کے ادنیٰ درجہ کے پادریوں کی شہ پاکر قسطنطنیہ کے پادریوں نے ”خدا کی مان“ کی حمایت کا بیڑا اٹھایا اور نسطور کی مخالفت شروع کی۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ شہنشاہ کو مجبور ہو کر حکم دینا پڑا کہ افسس میں کونسل منعقد ہو۔ سائرل نے اس اثنائیں دربار شاہی کے صدر خواجہ سرا کو کئی سو متقال سونے کی رشوت دے کر شہنشاہ کی بہن تک رسائی حاصل کر لی۔ اس طور پر آسمانی دربار کی مقدس دوشیزہ کو اپنے ہی ہم جنسوں میں سے ایک حمایت کرنے والی شہنشاہی دربار کی مقدس دوشیزہ کی شکل میں ہاتھ آگئی۔ سائرل مردوں اور عورتوں کے ایک جم غفیر کو جو طبقہ اراذل و افلاس سے تھا ہمراہ لیے ہوئے کونسل میں پہنچا اور خود بخود صدر نشین مجلس بن بیٹھا۔ اوس کے ہمراہیوں نے شور مچانا شروع کر دیا اور اس شور و فل میں قبل ازاں کہ شامی بطریق جو کونسل میں شریک ہونے کے لیے طلب کیے گئے تھے پہنچیں شہنشاہ کا فرمان پڑھوا دیا گیا۔ اس طور پر سائرل نے ایک دن میں میدان مار لیا اور اپنے

حریف کو شکست فاش دے کر خوش خوش گھر پہنچا۔ نسطور نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مار کر اوس کے مذرات تو سن لیے جا ئیں اور جو دلائل وہ پیش کرنا چاہتا تھا اون کو ایک نظر دیکھ تو لیا جائے لیکن اوس کی ایک پیش نہ گئی۔ بلکہ اس کے کہ اوس کو صفائی کا موقع دیا جاتا اوس پر فرد قرار داجرم لگا دی گئی۔ جب شامی بطریق جو نسطور کے طرف دار تھے پہنچے تو اونہوں نے ایک جلسہ میں اس فیصلہ سے ناراضی و بیزاری کا اظہار کیا۔ شدہ شدہ ذہنیت یہاں تک پہنچی کہ فریقین میں فساد ہو گیا۔ سینٹ جان کے گرجا میں ناٹھی جل گئی اور بہت کچھ سرسٹپول ہوئی۔ نسطور مور و عتاب ہوا اور جلا وطن کر کے مصر کے ایک ریگستان میں بھیج دیا گیا۔ اوس کو دشمن عمر بھر اوس کو طرح طرح کی ایذا ین ریتے رہے اور جب اوس کا انتقال ہوا تو اوس کی مرثیہ خوانی ان الفاظ میں کی گئی کہ اوس کی کفر بکنے والی زبان میں کیرے پڑ گئے تھے اور اگرچہ وہ مصری ریگستان کی جھلنے والی کوؤن کی لپٹ سے مرکز بچ نکلا ہے لیکن یقین ہے کہ اب اوس کا جسم جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بھونکا جائے گا۔

لیکن نسطور کی شکست اور سزایابی اوس کے عقاید کو کسی طرح نہ مٹا سکی۔ سینٹ یسےو کی کتاب کے پہلے باب کی آخری آیت اور اسی کتاب کے تیرھویں باب کی پچیسویں اور چھپسویں آیتوں کے صاف اور صریح الفاظ کو جنکے مفہوم میں تاویل کو دخل نہیں پیش نظر رکھ کر وہ اور اوس کے پیرواس بات کا اعتراف نہ کر سکتے تھے کہ آسمان کی نئی ملکہ کی حالت و شیرازی ایک ہمیشہ قائم رہنے والی صفت ہے۔ اون کو فلسفیانہ رجحانات کی جھلک بہت جلد اون کے طرز عمل میں نظر آنے لگی۔ جس زمانہ میں نسطور ریگستان افریقہ میں قید کاٹ رہا تھا اوس کو بہت سے پیرو بھرت کر گئے اور دریا و فرات کے کنارے جا آباد ہوئے جہاں اونہوں نے کلیسائے کلدانیہ قائم کیا۔ انہیں کی مساعی نے ایڈیپ کے مشہور دارالعلم کی بنا ڈالی۔ نسیمس (نصیبین) کے دارالعلم سے وہ علما و حکماء تاج نصیلت سر پر رکھ کر نکلے جنہوں نے نسطوری عقاید کو شام عرب ہندوستان تاتار مصر اور چین میں پھیلا دیا۔ نسطوریوں نے

فلسفہ مشائخہ کو اپنا عقلی مسلک قرار دیا اور اسطو کی تصانیف کا ترجمہ شامی اور ایرانی زبانوں میں کیا۔ اس کے علاوہ ادیبوں نے زمانہ مابعد کے دوسرے مصنفین مثلاً بلاینی کی تصانیف

لے تاریخ میں اس نام کے دو شاہیر کا تذکرہ موجود ہے۔ اکبر داصر۔ یہاں بلاینی اکبر سے مراد ہے جو نہ صرف دولت رومۃ الکبریٰ کے اراکین سلطنت میں ایک خاص درجہ رکھتا تھا بلکہ کثیر التعداد کتابوں کے مصنف ہونے کے لحاظ سے مصنفین عہد قدیم کی صف اول میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ سلسلہ ۶ میں ہنگام دیمہ و ناپیدا ہوا۔ رومانے جب جرمنی پر فوج کشی کی تو اسے بھی فوج کے ایک دستہ کی کمان ملی۔ اس وقت اس کی عمر ۳۴ سال تھی۔ اس فوج کشی کی تاریخ اوس نے سینس جلد دن میں لکھی ہے۔ اس کے بعد سلطنت کے بڑے بڑے ذمہ داری کے عہد دن پر اوس کا تقرر ہوتا رہا لیکن باوجود انہماک مشاغل سرکاری وہ تالیف و تصنیف کے لیے بہت کچھ وقت نکالتا رہتا تھا۔ اوس کی کتاب ”ہسٹوری انچیرٹس“ (صحیفہ فطرت) اوس کی علمی مستندی کی سب سے بڑی یادگار ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ اس کتاب کی سینتیس جلدیں ہیں اور جیسا کہ مصنف مقدمہ کتاب میں لکھتا ہے اس میں بیس ہزار سایل پر بحث ہے جن کا اخذ و ہزار مختلف المضامین کتابیں ہیں۔ بلاینی کی اس تصنیف کا ترجمہ یورپ کی قریب قریب ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ بلاینی کی موت کا واقعہ عجیب و غریب ہے۔ قسطنطنیہ میں جب وہ دولت روم کا امیر البحر تھا ایک دن اوس نے مائیسیم سے جہان اوس کا بیڑہ متعین تھا کوہ ویسودؤس کی چوٹی سے دھوان اٹھتا دیکھا۔ اس کی ماہیت دریافت کرنے کے لیے وہ ایک پنسوی پر سوار ہو کر پہاڑ کے قریب چلا گیا۔ اور ساتھ اپنی نوٹ بک بھی لیت گیا تاکہ جو کچھ دیکھے اوس پر درج کرتا جائے۔ قلعہ کوہ کی آتش افشانی کا منظر اور زیادہ قریب سے دیکھنے کی غرض سے وہ کشتی سے اتر کر وہ امن کوہ کی طرف بڑھا۔ دیکھتے ہوئے انکار و نافرمانی ہوئی راکھ کا مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ اوس کے نوکر توجان بجا کر بھاگ گئے مگر وہ خود وہیں تلف ہو گیا۔ مستہجم

کا بھی ترجمہ کیا۔ یہودیوں کے ساتھ مل کر انہوں نے جندی ساہور میں ایک طبی مدرسہ قائم کیا۔ ان کے سنادوں نے عیسائیت کو منطوری شکل میں اطراف و اکناف ایشیا میں پھیلانے تک پھیلا دیا کہ اس کے پرستش کرنے والوں کی تعداد بالآخر کلیسائے یونان و کلیسائے روس کی تھوڑی سی یورپین پیرودن کی مجموعی تعداد سے بھی بڑھ گئی۔ یہ امر خاص طور سے قابلِ لحاظ ہے کہ عرب میں منطوری مسیحیوں کا ایک بطریق موجود تھا۔

غرض مسلمانانہ اور اسکندریہ کی ان مذہبی معرکہ آرائیوں نے ایشیا کے مغربی حصے کو بہت سے فرقوں کی جولانگاہ بنا دیا جو ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رشتے۔ ٹھٹھے اور چونکہ دربارِ شاہی نے ان میں سے اکثر کو سخت سخت سزائیں دی تھیں اور ان پر طرح طرح کی سختیاں کی تھیں لہذا ان کے دلوں میں شہنشاہ کی طرف سے نفرت اور کینہ کا طوفان بپا ہو رہا تھا۔ اس کا نتیجہ ایک بہت بڑے مذہبی انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوا جس کا اثر آج کے دن تک بہن محسوس ہوتا ہے۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر تھا کہ تمام دنیا اس کی لپیٹ میں آگئی۔ اس مہتمم بان شان واقعہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ اسے دو جدا جدا اجزائیں تحلیل کر کے ہر ایک پر باری باری سے نظر ڈالی جائے یعنی اول تو ایرانیوں کے ہاتھوں ایشیائی مسیحیت کی ہنگامی و عارضی پامالی اور دوم وہ قطعی اور فیصلہ کن اصلاح جو عربوں کے ذریعہ سے عمل میں آئی۔

اولاً۔ مشرقی دربار اپنے آئے دن کے انقلابات کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ اسی طرح ایک انقلاب نے خسرو دلیہ تخت ایران کو مارتس قیصر روم کے دربار میں جا کر پناہ لینے اور اس سے مدد مانگنے پر مجبور کیا۔ مارتس نے اپنے شاہی جہان کی دلجوئی کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا اور ایک لشکر جرار اس کے ہمراہ کر دیا جس کی مدد سے خسرو مالکِ تخت و تاج ہو گیا۔ لیکن وہ نمایاں فتوحات جو اس لشکر نے ایران میں حق کو حق و دار تک پہنچانے کے لیے حاصل کی تھیں خود مارتس کے دولت و اقبال کی محافظت نہ کر سکیں۔ یعنی رومی فوج میں

غدر بپا ہو گیا۔ اس بغاوت کا سرغنہ ایک شخص فوکاس نامی تھا جو فوج میں سوسپاہیوں کی کمان کے عہدہ پر مامور تھا۔ قیصر کے محسوس منہدم کردئے گئے اور قسطنطنیہ کے بطریق نے اس اعلان کے ساتھ کہ فوکاس کے مذہبی عقاید کلیسا کی مقدس کی میزان اعتساب میں پورے اترتے ہیں اس کی تاج پوشی کی رسم اپنے ہاتھ سے ادا کی۔ برگشتہ بخت مار سس ایک خانقاہ سے جہاں اس نے پناہ لی تھی کسان کسان باہر لایا گیا۔ اس کو پانچ بیٹے یکے بعد دیگرے اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کیے گئے اور آخر میں اس کی گردن ماری گئی۔ اس کی ملکہ کو سینٹ صوفیا کے گرجے سے بطاینت الجیل باہر نکلنے کی ترغیب دی گئی اور جب وہ اس مقام امن سے اپنی تین کم سن بیٹیوں کو ایسے ہوئے باہر نکل تو ان چاروں کو طرح طرح کے عذاب دے کرتے تیغ کیا گیا۔ شاہی خاندان کے ہوا خواہوں پر انواع و اقسام کے ظلم کئے گئے۔ ظالموں نے بعض کی آنکھیں نکلوا ڈالیں۔ بعض کی زبان گدی سے پکچھا ڈالی۔ بعض کے ہاتھ پاؤں کٹوا ڈالے۔ بعض کو کوڑے مار مار کر مار ڈالا اور بعض کو زندہ جلا دیا۔

جب یہ خبر روم میں پہنچی تو بطریق گریگوری نے خوشیاں منائیں اور دعا مانگی کہ فوکاس کو خدا اپنے دشمنوں پر غالب آنے کی توفیق بخشے۔ اس ذلیل چالپوسی کے صلہ میں اسے اسعق اعظم کا لقب دیا گیا۔ اس کی اور نیز بطریق قسطنطنیہ کی متحدہ مخالفت کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مار سس کی نسبت یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ ایرانیوں سے راہ و رسم رکھنے کے باعث اس کا میلان مجوسی عقاید کی طرف ہو گیا ہے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے گلی کوچوں میں جب اسے تشبیہ کیا گیا تو عوام الناس نے اس پر پھبتیاں اڑائیں اور آوازے کسے اور اس کو ازراہ استحقاق مجوسی کہہ کر پکارا۔

خسر و کہ جب اپنے دوست کے قتل کا حال معلوم ہوا تو دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی اور غم اور غصہ کا ایک طوفان اس کے دل میں اُٹھ اُٹھ آیا۔ فوکاس نے مار سس اور

اوس کے بیٹوں کے سرکسری کے پاس بھیج دئے تھے۔ جب یہ کٹے ہوئے سرواوس کے دربار میں پیش ہوئے تو اوس نے لرز کر اپنا منہ پھیر لیا اور اپنے محسن کے قاتلون سرواوس کا انتقام لینے کے لیے فوراً دولت روم پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

آفریقہ کے نائب السلطنہ ہرقلس کو بھی جو سلطنت کا رکن اعظم تھا اس دردناک سانحہ کے سننے سے نہایت صدمہ ہوا اور اوس نے دل بین ٹھان لی کہ جو ہو سو ہو قیصران روم کے تخت کو ایک کر یہ المنظر اور فرد مایہ فوجی افسر کی غاصبانہ دستبرد سے بچایا جائے۔ نوکلاس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اوس کا قد چھوٹا اور اوس کی صورت مکروہ تھی۔ اوس کی نا ملائم گھٹی بھون اوس کے سُرخ رنگ کے بالوں اور اوس کی نیکی ٹھڈی نے جس پر دڑھی کی علامت تک نہ تھی اوس کے چہرے کے ایک مہیب داغ کے ساتھ مل کر اوس کی شکل کو نہایت ہی گھناؤنا اور ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ وہ جاہل مطلق اور کثے ناتراش تھا۔ ملک کے قوانین سے بالکل نا بلد تھا حتی کہ ہتھیاروں کے استعمال سے بھی واقف نہ تھا۔ اور عیاشی اور شرابخواری اوس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ پہلے تو ہرقلس نے اوسے خراج دینے اور اوس کی اطاعت کرنے سے انکار کیا۔ پھر کھلم کھلا علم مخالفت بلند کیا لیکن چونکہ ضعف پیری اور انحطاط تو انے اوسے اس قابل نہ رکھا تھا کہ میدان جنگ کی سختیوں اور صعوبتوں کی خود تاب لاسکے لہذا یہ خطرناک ہم آہوس نے اپنے بیٹے کو کہ اوس کا نام بھی ہرقلس تھا سو پنی۔ نوجوان ہرقلس ایک جرات جی بیڑا لے کر روانہ ہوا اور موافق ہواؤن کی مدد سے بہت جلد قسطنطنیہ کے سامنے آ پہنچا۔ زمانہ کی اداسچاٹنے والے پادری۔ ارکان سلطنت اور شہر کے باشندے فرح کا پلہ اوس کی طرف جھکا ہوا دیکھ کر اوس کے شریک ہو گئے۔ آخر غاصب گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔

لیکن قسطنطنیہ کا یہ انقلاب فرمانرواے ایران کی یلغار کا مزاحم نہ ہوا۔ کسریٰ کے مجوسی ہیریدون نے یونانیوں کی دروغ آمیز اور ظالمانہ اوہام پرستیوں کے خلاف اوس کو

کان اچھی طرح سے بھردئے تھے اور اوس کو جتلا دیا تھا کہ یونانیوں کی ایک نہ سنی چاہیے بلکہ جو کچھ کرنا چاہیے اپنی قوت میزہ کے بھروسے پر کرنا چاہیے۔ غرض خسرو نے دریائے فرات کو عبور کیا۔ شام کے سیحی فرقوں نے جو قسطنطنیہ کی طرف سے غارت کھائے بیٹھے تھے اوس کی فوج کے رستے میں اپنی آنکھیں بچھا دیں۔ حملہ آور کا خیر مقدم ہر جگہ نہایت تپاک سے کیا گیا۔ جس شہر میں اوس کا گذر ہوا وہاں کے باشندے روم کی اطاعت کا جوا کندھ سے اُتار کر اوس کے ساتھ مل گئے۔ اس طرح انطاکیہ قیصریہ اور دمشق یکے بعد دیگرے نہایت آسانی سے مسخر ہوتے ہوئے چلے گئے۔ بیت المقدس کسی قدر مزاحمت کے بعد ایک ہلہ میں سر ہو گیا۔ ایرانیوں نے مرقد مسیح اور قسطنطین و ملیکا کے گرجاؤں میں آگ لگا دی۔ صلیب عیسوی کو بطور یادگار فتح ایران بھیج دیا۔ گرجاؤں کا مال و متاع لوٹ لیا۔ مقدس تبرکات کو جنہیں دست اوہام نے بڑے چاؤ سے جمع کیا تھا نہایت دناوود کر دیا۔ پھر مقررہ جگہ پر حملہ کیا اور اوسے فتح کر کے سلطنت ایران کے ساتھ شامل کر لیا۔ اسکندریہ کے بطریق نے بھاگ کر قبرس میں جاپناہ لی۔ ساحل افریقیہ طرابلس تک ایرانی فوج کے قبضہ میں آگیا۔ شمال کی جانب ایشیائے کوچک کل کا کل مسخر ہو گیا اور دس سال تک ایرانی فوجیں قسطنطنیہ کے سامنے باسفورس کے ساحل پر ڈیرے ڈالے پڑی رہیں۔

جب ہر فلس پر سخت ہی آہنی توداوس نے بدرجہ مجبوری صلح کی التجا کی۔ لیکن پرغور اور متکبر کسریٰ نے یہ جواب دیا کہ جب تک شہنشاہ روم اپنے مہلوب خدا سے ابا کر کے آفتاب کی پرستش نہ کرے گا میں اوس کی التجاے صلح قبول نہ کروں گا۔ آخر بعد وقت ساڑھے سات سو سن ہونا اسی قدر چاندی ایک ہزار خلعت ہاے فاخرہ ایک ہزار گھوڑی اور ایک ہزار صاحب جمال دوشیزہ لڑکیاں سلطنت روم کی آزادی کا فدیہ قسدر پائین۔

لیکن ہر فلس کی یہ اطاعت چند روزہ تھی۔ اوس نے کچھ عرصہ کے بعد نہ صرف وہ

ملک جو خسرو نے اوس نے چھینا تھا واپس لے لیا بلکہ ایران پر چڑھائی کر کے دہ جگی کا زلمے  
 یاد دلادے جن کے لحاظ سے دولت روم کا سب سے زیادہ روشن زمانہ یاد کا تاریخ ہو  
 اگرچہ سلطنت روم کی جگی عظمت اس طور پر بحال ہو گئی تھی اور اگرچہ اوس نے وہ  
 تمام ملک جو اوس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا واپس لے لیا تھا لیکن ایک نقصان اوسے لیا  
 پہنچا تھا جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہ تھی۔ یعنی دولت ایمان گئے وقت کی طرح پھر نہ آسکتی تھی  
 جو مسیحیت نے ساری دنیا کی آنکھوں کے سامنے مسیحیت کا خاکہ اٹھایا تھا۔ اور حضرت مسیح کی  
 مزار کو آگ لگا کر۔ گرجاؤں کو لوٹ کر اور مٹا کر۔ بیش بہا تبرکات کو خاک کی طرح ہوا میں اڑا کر  
 اور صلیب کو ہر طرح کے تسخر اور تضحیک کے بعد مال غنیمت میں ملا کر مسیحیت کے مقدس ترین  
 مقامات یعنی بیت اللحم جنین اور کیلوری کی توہین کی تھی۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ شام مصر اور ایشیائے کوچک میں معجزوں کی بھرمار تھی کوئی گرجا  
 ایسا نہ تھا جو ایک طول و طویل فہرست آسمانی نشانات کی پیش نہ کر سکتا ہو۔ بات بات پر  
 معجزے اور کرامتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ لیکن اس نازک موقع پر جب آسمانی نشانات کی ایسی  
 سخت ضرورت تھی ایک بھی نشان ظاہر نہ ہوا۔

ارض مشرق کی مسیحی آبادی نے جب دیکھا کہ مجوسی حملہ آوروں نے اودن کی گرجاؤں کو  
 آگ لگا دی اودن کی خانقاہوں کو سمسار کر دیا اودن کی پاک یادگاروں کی بے حرمتی کی اور  
 اس پر بھی حملہ آوروں پر عذاب آسمانی نازل نہیں ہوا تو اس بوالہبھی نے اودنہیں کچھ دیر کے لیے  
 ساکت و صامت کر دیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا کا قہران کفار پر بجلی بن کر گرے گا۔ آسمان  
 ٹوٹ پڑے گا۔ زمین بھٹ جائے گی۔ خدا کی تلوار برق خاطف کی طرح اوج فلک پر چمکتی ہوئی  
 نظر آئے گی اور ان دین مقدس کی برہمستی کرنے والوں کا حشر بھی وہی ہوگا جو سنہ ۶۰۷ء کا ہوا تھا

سنہ ایک سرانی بادشاہ تھا جس کا زمانہ ۶۰۷ء سے ۶۱۰ء قبل مسیح تک ہے۔ اس کی عظیم الشان  
 فتوحات اور عالیشان محلوں کی تعمیر کا وہ زمانہ آون خشتی کتابوں کے مخروملی حروف میں (بقیہ صفحہ ۱۰۴)



لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ ایک آسمانی نشان بھی اس موقع پر ظاہر نہ ہوئے پایا۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ لوگوں کا تعجب مہل بدل بخون ہو گیا اور خوف کی جگہ بد اعتقاد ہی لئے لڑی۔  
 نیا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ایرانی فتوحات کے نتائج مسیحیت کے حق میں سخت خطرناک تھے لیکن ان نتائج کو بھر بھی اس مہتمم بالشان واقعہ کا محض ایک مقدمہ سمجھنا چاہیے جس کا ذکر اب آتا ہے یعنی مسیحیت کے خلاف جنوبی افراہم کی بغاوت۔  
 اس واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہونا ملک عیسائیوں کے قبضہ میں تھے اور ان کا نو دسواں حصہ اون کے ہاتھ سے لٹ گیا یعنی ایشیا و آفریقہ کا اسیورپ جزائر مسیحیت کی حلقہ گونشی سے آزاد ہو گیا۔

۱۱۵ء کے موسم گرما میں اونٹوں کا ایک خانہ شہر نصر امین پہنچا جو دمشق کے جنوب میں ملک شام کی سرحد پر واقع ہے۔ یہ کاروان مکہ سے آیا تھا اور جنوبی عرب کی گران بہا پیداوار اپنے ساتھ لایا تھا۔ کاروان سالار کا نام ابوطالب تھا جس کے ہمراہ اس کا ایک دوازدہ سالہ بھتیجا بھی تھا۔ چچا بھتیجے شہر کی سطوری خانقاہ میں اتارے گئے جہاں کے مہمان نواز راہبوں نے اون کی بہت کچھ خاطر و مدارات کی۔

خانقاہ کے راہبوں کو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اون کا خور و مال مہمان

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) موجود ہے جو کلدانی و سریانی آثار قدیمہ کی ذیل میں برآمد ہوئی ہیں۔ تورا سے پایا جاتا ہے کہ اس نے قتیسیا شہر اور جوڈیا پر چڑھائی کی تھی لیکن خدا کو اس کی سرکشی پسند نہ آئی اور اس پر مذاب آسمانی نازل کیا گیا چنانچہ ملائکہ کے جنو و جندہ نے راتوں رات اس کے لشکر جبار کو تباہ کر ڈالا اور وہ بحالت تباہ اپنے پای تخت سینوہ کو لوٹ گیا۔ ہراڈوٹس یونانی مورخ ملائکہ کے بجائے یونان کی ایک عظیم الشان فوج کا ذکر کرتا ہے جو مصر یون کے مخالفین پر حملہ کر کے اون کے تیردن کا نون اور ڈھالوں کو نکل گئی اور اس طور پر وہ جب پہنچے رہ گئے تو مارے گئے۔ سناچرب اس لحاظ سے گویا یہودیوں کا آبرو ہے۔ مترجم

جس کا نام علیؑ یا محمدؐ تھا عربوں کے مقدس معبد کعبہ کے محافظ کا بیعتجا ہے۔ ان میں سے ایک راہب تاجر نامی نے کوشش کی کہ جس طرح ہو اس لئے کے دل سے اس بت پرستی کے اثر کو جو اس کا آبائی مذہب ہے زایل کیا جائے۔ تاجر نے دیکھا کہ ڈر کا نہایت ہونہار اور غیر معمولی طور پر ذہین ہے اور مذہبی باتوں کو نہایت شوق اور توجہ سے سنتا ہے۔

محمدؐ کے اہل وطن یعنی مکہ کے باشندوں کا سب سے بڑا معبود ایک کالا پتھر ازرقم شہاب ثاقب تھا جو تین سو ساٹھ بتوں کے ساتھ کعبہ میں رکھا ہوا تھا۔ یہ بت کا لے پتھر کے توابع تصور ہوتے تھے اور چونکہ اس زمانہ میں شمسی سال تین سو ساٹھ دن کا محسوب ہوتا تھا لہذا ہر بت سال کے ایک دن سے منسوب تھا۔

عیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کلیسا کی عیسوی کا شیرازہ پادریوں کے حب جاہ اور خباثت نفس کی وجہ سے پراگندہ ہو رہا تھا۔ اجتہادات کو شان اجماع بخشنے کے بہانے سے اکثر کونسلوں کے اجلاس منعقد ہوتے تھے لیکن اس انتقاد کا اصل مقصد پوشیدہ رکھا جاتا تھا۔ بسا اوقات ان کونسلوں میں جبر۔ ارتش اور بددیانتی کا سان نظر آتا تھا۔ مغرب میں بطریق کا عہد دولت و تمول عیش و عشرت اور شکوہ و طمطراق کی ایسی نیت آزمائشیں پیش کرتا تھا کہ اس عہدہ پر کسی پادری کے نامزد ہوتے وقت خوریز ہنگاموں کا واقع ہونا سادہ ہو گیا تھا۔ مشرق میں دربارتسطنظیہ کے طرز عمل نے کلیسا کو مباحثوں مناقشوں اور مجادلوں کی جولانگاہ بنا رکھا تھا۔ جو بے شمار فرقے ان مذہبی معرکہ آرائیوں نے پیدا کر دیئے تھے

لے جناب رسالت آج مختلف القاب سے یاد فرمائے گئے ہیں۔ مخالفین و معاندین نے اگر آزارہ بخت نفس آپ کو ایو کبشہ یا راعی، اتبرکہا ہے تو موافقین و معتقدین نے بقا ضاے ارادت امین۔ مصطفیٰ اور تجلی کے لقب سے یاد کیا جو لیکن کوئی روایت بسند صحیح اس مضمون کی ہمارے علم میں موجود نہیں جو کہ آپ علیؑ بھی پکارے جاتے ہوں۔ ”علیؑ“ انہی کے دودھ یا دودھ دہنوالے کو کہتے ہیں۔ معلوم نہیں معصن کو یہ نام کیسے ہاتھ آیا اور اس کی کیا اصلیت ہے۔ مترجم

ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ایرمن۔ بسیلڈن۔ کارپوکرشٹن۔ کالیرڈین۔ یوشٹن۔  
 ناسٹک۔ جیکوہائٹ۔ ماریسوناٹ۔ ماریوناٹ۔ نسلورین۔ سبیلن۔ ویلنٹائن  
 منجملہ ان کے میریوناٹ فرقہ کا یہ عقیدہ تھا کہ تثلیث کے ارکان حسب ذیل ہیں :- باپ خدا  
 بیٹا خدا اور مریم عذرا خدا۔ فرقہ کالیرڈین حضرت مریم کو خدا سمجھ کر پرستش کرتا تھا اور ان  
 کی مورت پر ٹھکانی کا پڑھا دیا پڑھاتا تھا۔ فرقہ نسلوری جیسا کہ ہم کو معلوم ہی ہے اس عقیدہ کو  
 انکار کرتا تھا کہ خدا کی بھی مان ہو سکتی ہے۔ اس فرقہ کو اس امر پر ناز تھا کہ وہ یونان قدیم کے  
 علوم و فنون کا وارث و مالک ہے۔

یہ تمام فرقے اگر عقائد میں ایک دوسرے کے حریف تھے لیکن ایک بات قدر مشترک  
 کے طور پر ایسی بھی تھی جس پر ان سب کا اتفاق تھا اور جس کے لحاظ سے یہ ایک دوسرے کے  
 حلیف کہلا سکتے تھے اور وہ بات تھی ان کی باہمی نفرت اور عداوت جس نے ہر فرقہ کو دوسرے  
 فرقہ کا دشمن جان بنا رکھا تھا۔ عرب جس کو اپنی حریت اور خود مختاری پر ناز تھا جس کو کسی کی  
 کشور کشائی سخیز کر سکتی تھی اور جس کی وسیع سرزمین بحر ہند سے لے کر ریگستان شام تک پھیلی  
 ہوئی تھی اڑتے وقت میں ان میں سے ہر ایک کا ملجا دامادی بنا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔  
 قدیم سے ہی جو تاجلا آیا تھا۔ جب کوئی قوم مغلوب ہوئی اور فریق غالب نے اس کا قافیہ  
 تنگ کر دیا تو اس نے بھاگ کر عرب ہی میں پناہ لی۔ چنانچہ جب رومیوں نے فلسطین کو  
 فتح کیا تو یہودیوں کی ایک تعداد کثیر یہیں آکر پناہ گزین ہوئی۔ سینٹ پال اہل نکیشیا سے  
 مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ جب مشرق بہ اضطراب ہو کر میں نے اپنے آپ کو سڑط سڑط مخالفین  
 کے زبذبین گھرا ہوا پایا تو فوراً عرب چلا آیا۔ غرض عرب کی دایوں اور صحرائوں میں عیسائی  
 راہبوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آئے لگے۔ جتنی تبلیغی کوششوں نے عرب کو سربر آوردہ  
 قبایل میں سے اکثر کو دایرہ مسیحیت میں داخل کر لیا۔ جا بجا گرجے بھی بن گئے۔ اور عرب کا  
 جنوبی صوبہ تین قبش کے نسلوری العقاید سی فرماؤں کے قبضہ میں آگیا۔

تجیرہ راہب نے بفر کی خانقاہ میں منسرت محمد کو نسطوری عقاید کی تعلیم دی اور اپنے  
مظالم کی داستان شریع سے آخر تک حرف بحرف کہہ سنائی۔ یہ انہیں ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ  
آنحضرت معلم کے دل میں کلیساے مشرقی کی بُت پرستانہ رسوم کی طرف سے عموماً اور اذنیان  
و اصنام کی پرستش کی طرف سے خصوصاً وہ نفرت بیٹھ گئی جس کو کوئی قوت مٹانہ سکی۔ اور تجیرہ  
راہب ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ آپ نے اوس عجیب و غریب زندگی کے دوران میں جس کے  
کارنامہ بون نے دنیا کو حیرت کر دیا حضرت مسیح کو کبھی خدا کا بیٹا کہہ کر نہ پکارا بلکہ ہمیشہ مسیح  
ابن مریم کے لقب سے یاد فرمایا۔ آپ کے ماتر بیت یافتہ لیکن مستند و افتاد دماغ نے  
صرف اپنے اتالیقوں کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا نہایت گہرا اثر قبول کیا اور یہ وہ اتالیق  
تھے جنہیں ارسطو کے جانشین اور حکمت مشائیہ کے سبق آموز ہونے کے لحاظ سے اپنی ذات پر  
ناز تھا اور بجا ناز تھا۔ بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی صاف شہادت ملتی ہے کہ  
نسطوریوں کے مذہبی عقاید نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا چنانچہ اوس ارادت و محبت کا  
جو آپ اس فرقہ کے ساتھ رکھتے تھے آپ نے متواتر ثبوت دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور ثبوت  
اس انس و عقیدت کا کیا ہو گا کہ آپ نے اپنی زندگی کو نسطوریوں کے دینی عقاید کی توسیع  
و اشاعت کے لیے وقف کر دیا اور جب یہ مقصد پورا ہو چکا تو آپ کے جانشینوں نے  
اون کے علمی و مشائی اصول اختیار کر لیے اور نہایت سرگرمی و حران کی اشاعت میں حصہ لیا۔

لے عیسائی مصنفین جو نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور اون تعلقات کی اہمیت کو نہیں جان سکتے جو  
خدا اور اوس کے برگزیدہ مرسلین کے درمیان وقتاً فوقتاً قائم ہوتے رہے ہیں عام طور سے جب ہمارے  
رسول مقبول کا ذکر آتا ہے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ وہ دیکھے پڑھے تھے یا انہوں نے  
تورات و انجیل کا باسماں نظر مطالعہ کیا تھا یا عیسائی راہبوں سے انہوں نے تعلیم پائی تھی اور اسی تعلیم کا  
یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے دنیا کے سامنے وہ مہتم بالشان اور زندہ جاوید تحریک پیش کی جس کا نام اسلام  
ہے۔ یورپین مصنفین کی ایک خصوصیت یہی ہے کہ ان کو اگر ایک چھوٹا سا (بقیہ مضامین بر صفحہ آئندہ)

جب حضرت محمد مسن رشد کو پہنچے تو آپ نے ارض شام کے اور بھی سفر کیے۔ یہ خیال کرنا بعید از قیاس نہ ہو گا کہ ان موقعوں پر آپ نسطوری خالقاہ میں جا کر اس کے مہمان نواز

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) واقعہ مل جلے تو اس سے سیکڑوں تیاج اپنے مفید مطلب بلاتامل نکالتے ہوئے چلے جاتے ہیں خواہ وہ تیاج مقدمہ کے صغریٰ و کبریٰ سے دور کی نسبت بھی نہ رکھتے ہوں۔ سوئی کا پھانڈا اور رائجی کا پر بت بنا دیا اون کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے پسل کے دم سے خاک کے پر ایسی ایسی رنگ آمیزیاں کرتے ہیں کہ دیکھنے والا جو سطح سے نیچے جانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا بے اختیار فریفتہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈریسٹر معتقد کتاب ہذا بھی باوجودیکہ اسلام اور بانی اسلام کا ذکر عقولیت سے کرتے ہیں اور اون کی تحریر سے اس تعصب کی بو نہیں آتی جو پارلیون کی تحریروں کا خاصہ ہے اس لغزش سے نہیں بچ سکے۔ نقطہ ایک اتنے سے واقعہ سے کہ رسول اللہ گیارہ بارہ برس کی عمر میں شام گئے تھے اور تیرہ راہب سے ملے تھے اور یہ وہ متفق علیہ واقعہ ہے جو سند ابن ابی واثق و ابن ہشام ہم تک پہنچا ہے ڈاکٹر ڈریسٹر نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ تیرہ نے آپ کو نسطوری عقاید کی تلقین کی اور آپ نے اس تلقین سے متاثر ہو کر نسطوریت کو بالآخر بنام اسلام دنیا میں شائع کیا۔ تیرہ کے علاوہ اور جس شخص کا اثر رسول اللہ پر بقول ڈریسٹر پڑا تو قرۃ ابن نوفل مترجم انجیل تھا جس سے آن حضرت کو مذہبی امور پر گفتگو کرنے کا بار ہا اتفاق ہوا۔

اسلامی تاریخوں اور روایتوں سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ بعثت سے قبل آنحضرت کی رسم دراہ یہودیوں اور عیسائیوں سے رہی ہو اور آپ نے اون کے مذہبی پیشواؤں سے مذہبی تعلیم حاصل کی ہو اور ایسی حالت میں جبکہ اسلام اور اس کے مقدس و محترم بانی کے تعلق مغربی مصنفین کی کل معلومات کا اخذ اسلامی تاریخین اور روایات ہی ہوں اس قسم کے نتیجہ پر پہنچ جانا جس پر کہ ڈاکٹر ڈریسٹر پہنچے ہیں اون کی قوت متینہ کی شکر آن خرنی پر ایک گواہ عادل ہے۔

اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ ایک گیارہ برس کا عرب کا لڑکا (کیونکہ رسول اللہ جب اپنے چچا کو ساتھ شام کو تشریف لے گئے ہیں تو آپ کی یہی عمر تھی) جو بت پرستی و جاہلیت کے حوالی سے گھر ہوا ہو اقامت نشہ کی اس عجیب و غریب بحث کو سمجھنے کی قابلیت رکھ سکتا ہے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

ملکینوں سے جنہیں آپ نے فراسوش نہ کیا تھا ضرور ملے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک شام کی آپ کے دل میں بڑی وقعت تھی۔ مکہ کی ایک دولتمند بیوہ جن کا نام خدیجہ تھا اپنی شامی

(بقیہ مضمون برصغہ آئندہ) جسے مسیحیت کا چھ صدیوں کا فلسفہ بھی سلجھنا نہ سکا تھا تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس لڑکے نے اسی پراسرار بھول بھلیاں میں سے توحید کی وہ سیدھی اور سچی راہ کیوں کر ڈھونڈ نکالی فلسفہ و مذہب دونوں کی نگاہ سے اب تک پوشیدہ تھی۔ منطوریات باوجود اوس میلان کے جو اسے توحید کی جانب تھا پھر بھی شرک کے دائرہ کا مرکز تھی۔ مانا کہ وہ مسیح کے جسمانی حصہ ہی کو بطن مریم سے نسبت دیتی تھی لیکن مسیح کے ربانی حصہ سے تو اس کو انکار نہ تھا۔ یہ الفاظ دیکھو کہ اس بات کی تو قایل تھی کہ خدا انسان کا روپ ایک طرح سے دھار سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مسیحیت کے دوسرے عقاید مثلاً کفارہ جو اصل اصول نجات ہونے کے اعتبار سے مذہب عیسوی کا سنگ بنیاد ہے منطوریات میں بلا کسی ترسیم کے داخل تھے۔ ورقہ کا اثر اگر رسول اللہ پر پڑا تو وہ بھی گویا زیادہ سے زیادہ ایک منطوری المذہب عیسائی کا اثر تھا۔ یہودیوں سے توحید کا خیال اگر رسول اللہ متعارف لیتے تو اس میں بھی تجسیمیت کے مادی عناصر شامل تھے۔ پھر وہ کون ہی قوت تھی جس نے مکہ کے اس تیم دیہ اور امی بچے کے قلب میں ابتدا ہی سے اون حقائق کو جمع کرنا شروع کر دیا جن کی روشنی میں اسے تمام ادیان و مذاہب موجودہ کی اچھائیاں اور برائیاں نظر آنے لگ گئیں اور جب ارتقا کے اوس ہرگیر پر گئے جس سے پیغمبر بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا اوس کے قوائے ذہنی کو ترقی دکر کشادہ اور تجربہ کی مدد سے منتہائے کمال پر پہنچا دیا یعنی بعثت کی راعت قریب آئی تو اس نے اچھائیوں کو چن لیا اور انہیں ایک دلاویز دول آرا شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اوس زبردست اور فوق العادت تائید کی بدولت جو ہمیشہ اوس کے شامل حال رہتی ہے درجہ معرفت ویزدان شتائی پر خود بخود پہنچ جاتا ہے اور اس کی مثال بعینہ حضرت ابراہیمؑ کی سی مثال ہوتی ہے جسکی نسبت قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ جب اونہوں نے سارے کو چمکتا ہوا دیکھا تو اودن کی قوت مدد کے لئے جو ابل بایمان تھی اودن کو یکجہا یا کہ ہونہ ہو یہی اودن کا معبود ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو اودن کو معایہ خیال پیدا ہوا کہ فنا ہو جاؤ دالی چیز مسبود و خالق نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح (بقیہ مضمون برصغہ آئندہ)

تجارت کا کل کاروبار آپ کے سپرد کر چکی تھیں۔ آپ کی قابلیت اور ایمانداری نے جناب خدیجہؓ کو آپ کا گردیدہ بنا دیا اور چونکہ سب ارب فیاض سے حسن کامل اور خلق عظیم آپ کے حصہ میں آیا تھا لہذا وہ آپ پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئیں۔ عورتوں کا دل ہر ملک اور ہر زمانہ میں اسی قسم کے جذبات کی جولانگاہ بنا رہا ہے۔ غرض جناب خدیجہؓ نے ایک کنیز کے ذریعہ سے اپنے دل کا حال آپ پر ظاہر کیا اور دونوں کا عقد ہو گیا۔ اس کے بعد چوبیس سال تک جناب خدیجہؓ زندہ رہیں۔ اس مدت دراز میں آن حضرتؐ نے اپنے آپ کو اون کا وفادار شوہر

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) درجہ بدرجہ اون کو چاند اور سورج نظر آئے اور انہوں نے ان اجرام سماوی کو قرص کی عظمت و تجلی کو دیکھ کر پہلے کی طرح انہیں کو اپنا خدا سمجھا مگر جب یہ بھی غروب ہو گئے تو انہوں نے ان سے یہ کہہ کر ابا کیا کہ میں آفتاب سے محبت نہیں رکھتا۔ استدلال و استنباط کے اسی روحانی زینہ کے ذریعہ سے وہ اس خالق ذوالجلال کے بام مہرنت پر جا پہنچے جو آسمان و زمین ثواب و سیار بشر و ملک سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہمارے رسول اکرمؐ میں تائید ایزدی سے خود بخود عمران عرفان پر پہنچے۔ اس منزل کے طے کرنے میں نہ اون کو بخیر دے نہ دوسری نہ تہدین عمر کی راست روی نے ہدایت کی نہ اسمیہ یقینی کر دین خفیت نے ضا خداون کا رہبر تھا اور تائید ایزدی خداون کی پیشوا تھی۔ بت پرستی سے اون کو نفرت دلائی تو خدا نے جیسا کہ قرآن کی یہ آیت پاک ظاہر کر رہی ہے ووجدك ضالاً فهدی اور شرک ورجس سے اون کے دل میں کڑہت پیدا ہوئی تو خدا کی تحریک سے الم نشرح لك صدارك ووصعنا عنك وذرناك الذی انقض ظہرك۔ رسول اللہؐ اگر بقول ڈیر پیر منظوریت کو اصول ہی کی تلقین کرتے تو آج دنیا میں اقا نیم نائشہ کا ایک دوسری صورت میں راج ہوتا۔ وہ فاضل توحید جو اسلام کا خاصہ ہے مفقود ہوتی۔

اس کے علاوہ جیسا کہ پر وقیعہ نظمیں اپنی ایک قابل قد تصنیف میں حوالا ہی میں شایع ہوئی ہر مکھا ہے اس میں تنگ نہیں کہ رسول اللہؐ کے معاصرین میں متعدد اشخاص ایسے تھے جو بت پرستی سے کاہتجو اور صلیف کہلاتے تھے، ممکن ہے کہ ان کا اثر رسول اللہؐ پر پڑا ہو لیکن ان میں (بقیہ مضمون بر صفحہ آئین)

ثابت کیا اور ایک ایسے ملک میں جہاں کثرت ازدواج کی رسم عام تھی آپ کبھی دل میں یہ خیال  
 تک نہ لائے کہ دوسرا نکاح کر کے جناب خدیجہ کی توہین و دل آزاری کا موجب بنیں۔ کئی  
 سال کے بعد جب آپ کا نیر اقبال نصف النہار پر تھا ایک دفعہ جناب عائشہ صدیقہؓ نے جو حسن و  
 جمال کے لحاظ سے عرب بھر میں مشہور تھیں آپ سے جناب خدیجہؓ کے بکبرئی کا ذکر ان الفاظ  
 میں کیا: ”کیا وہ بڑھیا نہ تھی؟ کیا مجھے آپ کے حوالہ عقد میں لا کر خدا نے آپ کو اوس سے  
 اچھی بی بی عطا نہیں فرمائی؟“ آن حضرت یہ سن کر بے قرار ہو گئے اور اوس لہجہ میں جس سے  
 بوئے امتنان آتی تھی یہ جواب دیا: ”واللہ کہ خدیجہؓ سے بہتر بی بی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔  
 جب اور لوگ مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے تو وہ مجھ پر ایمان لائی۔ جب میں کوڑی کوڑی  
 کو محتاج تھا اور دنیا میرے درپے لے آ رہی تو اوس نے مجھے نہال کر دیا۔“

جناب خدیجہؓ سے عقد کرنے کی بدولت آپ معاش کی طرف سے فانیغ البال ہو گئے  
 اور اب آپ کو اوس مذہبی غور و فکر کا پورا موقعہ ہاتھ آیا جس سے آپ کی طبیعت کو فطری مناسبت  
 تھی۔ جناب خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی درقہؓ نے جو یہودی تھا اس زمانہ میں دین عیسوی اختیار  
 کر لیا تھا۔ اور عیسائی ہونے کے بعد پہلا کام جو اوس نے کیا وہ یہ تھا کہ بائبل کا ترجمہ  
 عربی میں کر ڈالا۔ آنحضرتؐ کو مذہبی امور پر درقہؓ سے گفتگو کرنے کا بار ہا اتفاق ہوا اور ان  
 مکالمات نے اوس نفرت کو جو آپ کے دل میں بت پرستی کی طرف سے جاگزیں تھی اور  
 زیادہ راسخ کر دیا۔

جس طرح تارک الدنیا سخی راہبوں نے صحراؤں میں آبادی سے دور اپنی چھوٹی پٹری

(یعنی مضمون صفحہ گذشتہ) اور محمدؐ میں یہ فرق تھا کہ اُن کو تو اپنی ہی نجات کی پٹری تھی اور راہبوں نے  
 ذاتی اغراض کی حدود سے تجاوز ہو کر تمام دنیا کی نجات کی چٹائی بن کر ڈالی تھی

گفت آن کلیم خویش بردن آورد و ز منج

دین جہد می کند کہ برآورد غریق مرا

مترجم



ڈال رکھے تھے جن میں وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے اسی طرح آنحضرتؐ نے کوہِ حرا کی ایک غار میں جو کہ سب سے چھبیل کے فاعلہ پر تھا عزلت گزین ہو کر خدا کی عبادت کرنی شروع کی اور آپ کا وقت مراقبہ و اشراق میں گذرنے لگا۔ اس عالم تنہائی میں آپ نے خدا سے قوم و ذوالجلال کی صفات جلالی پر غور و خوض کرتے کرتے ایشیائی مسیحیت کے عقاید پر نظر ڈالنی شروع کی۔ اقامتِ نملشہ کے عقدہ کو جب بلجھا نا چاہا تو یہ شکل پیش آئی کہ ایک طرف تو حضرت مسیح کو نسبت ابوتِ قادر مطلق سے وابستہ کیے ہوئے ہیں دوسری طرف حضرت مریم ہیں کہ ایک ہی وقت میں شان و دینگی بھی لیے ہوئے ہیں۔ گو دجھی بھری ہوئی ہے اور آسمان کی ملک بھی ہیں۔ ان مشکلات نے آپ کے دل میں یہ سوال پیدا کیا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ انسان اس قسم کے عقاید اختیار کرے اور پھر بھی گناہ میں مبتلا نہ ہو یا کفر و شرک کے خطرات میں گرفتار نہ ہو۔

غارِ حرا میں مدتوں محو غور و فکر رہنے کے بعد حضرت محمدؐ اس نتیجہ پر پہنچے کہ متعناد و متباین عقاید کے بدلون کا جو گھساٹو پھر طرف چھایا ہوا ہے اس میں ایک بڑی حقیقت یعنی توحیدِ باری کی روشنی نظر آسکتی ہے۔ چنانچہ ایک کجور کے درخت کے تنے سے ٹھہر کر اٹھ کر آؤصنعت کو حقیقت کا اعتراف کرتے ہی بنی۔ یا تو اس پر اصرار تھا کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ حاصل کیا جو حیرہ سے حاصل کیا اور اپنی طرف سے جو کچھ کیا یہ کیا کہ نسو ریت کی اشاعت کر دی اور یا اب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ رسول اللہؐ مدتوں محو غور و فکر رہ کر توحیدِ باری کے نکتہ پر پہنچے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ جب حیرہ بت پرستی کا اثر رسول اللہؐ کے دل سے مٹا چکا تھا اور نسو ریت کے تمام اررار و نہیں بچا چکا تھا تو پھر ادوہنیں فارحان مدتوں محو غور و فکر رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگے چل کر مصنف نے اپنے اس خیال کی کہ رسول اللہؐ اسلام کی اشاعت کے لحاظ سے نسو ریت کے شرمندہ احسان تھے صاف الفاظ میں یہ کہہ کر تردید کر دی ہے کہ ”اوں اصول کے تسلیم کرنے سے بھی آپ نے انکار کر دیا جو اگرچہ آپ کے نسو ریت سامنے آئے آپ کو کھائی تھے لیکن آپ کا ضمیر اور عقل ادن کی نائیدہ کر سکتی تھی۔“ مترجم

طبیحا دے کر آپ نے اپنے خویش و اقارب کے سامنے اس بارہ میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے علی رؤس الاشہاد فرمایا کہ آپ اس حقیقت کی اشاعت کے لئے اپنی زندگی کو وقف فرادین گئے اپنے خلیوں میں اور نیز قرآن میں بار بار آپ نے ان الفاظ کو دہرایا ہے ”میں تو محض ایک سنا د ہوں..... اور خدا کی وحدانیت کی تلقین کرتا ہوں“ آپ کی نبوت کے متعلق خود آپ کا خیال یہی تھا۔ چنانچہ اس دن سے اپنی وفات کے وقت تک آپ اپنی انگلی میں ایک انگوٹھی پہنے رہے جس کے نگینہ پر یہ الفاظ کندہ تھے ”محمد الرسول اللہ“

اطبا اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو شخص صائم الدہر ہوتا ہے اور عرصہ تک دماغی پریشانیوں اور فکروں میں مبتلا رہتا ہے اسے التباس حواس کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے یعنی وہ چیزیں محسوس ہونے لگتی ہیں جنکی خارجی اصلیت کچھ نہیں ہوتی۔ نفس کش راستباز اور مستقیم العزم اشخاص نے جن مذاہب کی بنیاد ڈالی ہے ادن میں سے شاید ایک بھی مذہب ایسا نہ ہوگا جس میں فوق العادت آزمائشات و امتحانات اور فوق القدرت احکام و اوامر کی مثالیں نہ ملتی ہوں۔ پراسرار آوازیں عربی پیغمبر کو سنائی دیتی تھیں جس میں آپ کو استقامت کی ہدایت ہوتی تھی اور عجیب و غریب صورتوں کی پرچھائیاں آپ کے سامنے سے گذرتی ہوئی

لے تو اسے کبوتر بام حرم جہمی دانی طہیدن رگ مرغان رشتہ بر بارہ  
کیا اطباء کو یقین دلا سکتے ہیں کہ تباہہ اور ریاضت کے ذریعہ عریاک نفس اور پاک سرشت انسانوں کو جو حقیقتیں نظر آتی ہیں ادن کا وجود ذہن میں بھی نہیں ہوتا کیا حقیقت اشیا کا راز ادن کی خارجی اصلیت ہی میں مرکوز ہے ؟ روحانی کثرتوں کو اطباء جہی التباس حواس سے تعبیر کریں چاہے اختلال دماغ کہیں لیکن ادن سے افکار نہیں ہو سکتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس التباس حواس جس کا نتیجہ قرآن کا سامع التزام کلام اور اسلام کی سلی خلاق آموز حقیقت انتہا فایع رمان اور ہر گز تحرک ہو ہزار دشمنی و اشرافی فلسفے قربان ہیں۔ دنیا میں سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں شخص ایسے گذرتے ہیں جنہوں نے روزے بھی رکھے ہیں ریاضتیں بھی کیں ہیں دماغی پریشانیوں اور فکروں میں بھی مبتلا ہوئے ہیں لیکن باوجود ان تمام باتوں کے کسی میں فکری شان نہ پیدا ہو سکی۔ مترجم

دیے ہی برے سمجھے جاتے تھے جیسا کہ صدیوں کے بعد تو تھردما میں سمجھا گیا۔

لیکن اگرچہ آپ نے فرط حقارت سے ان تمام باتوں کو رد کر دیا جن سے مسئلہ وحدت باری تعالیٰ کی کچھ بھی نفی ہوتی تھی پھر بھی جیسی تصورات کی قید سے آپ اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے۔ قرآن کا خدا بالکل انسان کے مشابہ ہے بلکہ اگر موزونی الفاظ اجازت دے تو کہا جاسکتا ہے کہ جسمانی اور دماغی ہر ایک اعتبار سے یہ خدا مثیل انسان ہے۔ لیکن مسلمان بہت جلد ان ادنیٰ درجہ کے خیالات کی پستی سے نکل کر اذن رفیع الشان تصورات تک پہنچ گئے جن میں حکمت و ادراک کی لطافتیں اپنی جھلک دکھا رہی تھیں۔

لے اسلام پر جو چند سو قیاد اعتراضات عیسائی یا داریوں کے تعصب سے یورپین مصنفین کو ترک نہیں پہنچے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اسلام میں خدا کا تصور انسانی حیثیت سے کیا گیا ہے اور قرآن کا خدا اگر ایک دیوپیکران ہے جس میں تمام عادات و خصایل وہی پائے جاتے ہیں جو عام طور سے بنی نوع انسان میں پائے جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر فریڈریش ہیگنر جس شخص بھی جو وسیع النظر ہونے کے علاوہ اسلامی تعلیم کو رد و اداری اور رسالت کی آنکھ سے دیکھتا ہے اس اعتراض کو جھجھکتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی بے مثل کتاب الکلام ص ۱۰۷ میں اس مضمون پر ایک لطیف بحث لکھی ہے جس کی یہ عبارت ہمیں نہیں بھولنی :-

”دنیا اس عالم کی تاریکی میں پڑی ہوئی تھی کہ دفعۃً اسلام نے اگر تمام غلط خیالات اور مستحبات کا پردہ چاک کر دیا۔ اوس نے بتایا کہ خدا واحد مخلص ہے اور زمان و مکان بہت و اشارہ تحت و فوق ہر قسم کے قیود و خصوصیات سے مبرا ہے۔ یہ وہ تقدیس و منزہ تھی جس پر یورپ نے بھی حیرت ظاہر کی اور لیکن نے کہا کہ جب زمان و مکان و بہت و اشارہ تمام خصوصیات کو الگ کر لیا جائے تو خیال کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اسی تقدیس کی بنا پر اسلام نے ہر قسم کی بت پرستی کا استیصال کر دیا کیونکہ اسلام نے خدا کی نسبت جو پاک اور منزہ خیال قائم کیا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ خدا کا تصور جسمانی پیکر اور صورت کے بغیر دلون میں نہ آسکے۔ ہندو و مہرہ و عیسائی رومن کی تھوک سب خدا کے تصور کے لیے جہانی تمثیل کے محتاج تھے اور (بقیہ مضمون برصو آئندہ)

اسلام کی ابتدا انی صورت کا جو خاکہ یہاں کیے چکا گیا ہے اس پر بڑے بڑے قابل اور  
تجربہ مند لوگ اہل آراء کا مادہ ہے۔ سر ولیم جونسن نے بہ اتباع لاگ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام  
(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) اسی وجہ سے بت پرستی میں مبتلا تھے لیکن اسلام میں باوجود سیکڑوں ہزاروں  
فرقوں کے پیدا ہو جانے کے بھی کسی فرقہ کو آج تک بت پرستی کا کبھی خیال نہ آ سکا۔

اگر ڈاکٹر ڈیر پیر نے قرآن کی آیات کو بصیرت کی نظر سے دیکھا ہوتا تو جو اعتراض اوہوں نے کیا ہے  
کبھی نہ کرتے۔ ہم مثال کے طور پر کلام مجید سے صرف چند مقامات کا استقصا کرتے ہیں:-

(۱) اللہ لا الہ الا هو العلی القیوم لا تاخذه سنین ولا نوم لا ما فی السموات  
وما فی الارض من ذالذی یشفع عنده الا باذنه یعلم ما بین  
ایدیہم وما خلفہم ولا یحیطون بشی من علی الا بما شاء وسع  
کرسیہ السموات والارض ولا یؤده حفتہما وهو العلی العظیم  
(۲) هو اللہ الذی لا الہ الا هو الملک القدوس السلام المؤمن  
المہیم العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون۔ هو اللہ  
الخالق الباری المصور له الاسماء الحسنی یسبح له ما فی السموات  
والارض وهو العزیز الحکیم۔

(۳) اللہ نور السموات والارض مثل نوره کشفوا فیہا مصباح  
الصباح فی زجاجة الزجاجۃ کانها کواکب وری یوقد من شجرة  
مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیتہ ولا غریبتہ یکاد نریتها  
یضی دلوم تمسہ نار نور علی نور یهدی اللہ لنوره من یشاء  
ویضرب اللہ الامثال للناس واللہ بكل شی علیہ۔

(۴) لیس کمثلہ شی وهو السميع العليم

(۵) قل هو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ربیہ مضمون بر صفاً

دسہم نہیں۔

آپ نے اپنے ہاتھ سے اونٹوں کی قربانی کی۔ اس قدیم رسم کی نسبت آپ کا یہ خیال تھا کہ نماز اور قربانی مساوی الفضائل ہیں۔ جو دلیل ایک کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہے اوسے دوسری کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔<sup>۹۱</sup>

کعبہ کے ممبر پر چڑھ کر آپ نے فرمایا کہ اے مسلمانو! میں بھی تمہاری طرح محض ایک انسان ہوں۔ جب یہ الفاظ آپ کی زبان سے نکلے تو سننے والوں کو معاً وہ واقعہ یاد آگیا جب ایک شخص ڈرتے ڈرتے آپ کے قریب آیا تھا اور آپ نے اس سے فرمایا تھا کہ کبھی اس قدر کیون سمجھتے جاتے ہو میں کچھ بادشاہ تو ہوں نہیں۔ ایک غریب عرب عورت کا بیٹا ہوں جو اونٹ کا گوشت دھوپ میں سکھا کر کھایا کرتی تھی۔

حج کر کے آپ نے مدینہ کو مراجعت کی۔ آپ کی زندگی کا عرصہ ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ وقت آگیا کہ آپ دنیا سے رحلت کریں۔ آخری تقریر جو آپ نے مسلمانوں کی جماعت کے سامنے کی اوس کے الفاظ یہ تھے: ”ہر شے خدا کی مرضی کے تابع ہے۔ اور اوس کے لیے ایک خاص وقت مقرر ہے جس میں نہ تقدیم کو دخل ہے نہ تاخیر کو۔ جس نے مجھے دنیا میں سمجھا تھا میں اوس کی طرف مراجعت کرتا ہوں اور تم کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ بھائی بھائی ہو کر رہو۔ ایک دوسرے کے ساتھ عزت اور محبت کا برتاؤ کرو۔ وقت پر ایک دوسرے کے کام آؤ۔ اور ایک دوسرے کو ایمان پر ثبات قدم رکھنا اور نیک عمل کرنے کی ہدایت کرو۔ میں جب تک زندہ رہا تمہاری بھلائی کی تدبیریں کرتا رہا اب مرتے وقت بھی اگر مجھے کوئی خیال ہو تو تم لوگوں کی بہبودی کا۔“

لے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی نظر قرآن مجید کی اس آیت پر پڑ گئی ہوگی ”فصل لہا بک و انھن“

یعنی نماز اور قربانی کو مساوی الفضائل قرار دینا اور اس مساوی فضیلت کے خیال کو جناب رسالت مآب سے منسوب کرنا مصنف کی کمی معلومات پر مبنی ہے۔ مترجم

حالت نزع میں آپ کا سر حضرت عائشہؓ کے زانو پر تھا۔ فرط کرب سے آپ رہ رہ کر اپنا ہاتھ پانی کے ملشت میں جو پاس رکھا ہوا تھا ڈالتے تھے اور اپنا چہرہ تر کرتے تھے۔ آخر اس کی بھی طاقت نہ رہی۔ آپ کی نگاہیں عرش برین کی طرف اٹھ گئیں اور ٹوٹے ہوئے لہجہ میں یہ آخری الفاظ آپ کے منہ سے نکلے: ”اَللّٰہی.... میری گناہ معاف کر.... آمین.... میں آیا“ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے شخص کا نام تعظیم و تکریم کے ساتھ نہ لیا جائے؟ یہ شخص وہ ہے جن کے اصول آج کے دن بنی نوع انسان کے ایک تہائی حصہ کے رہنما پیشوا ہیں۔

حضرت محمدؐ اپنے ملک کے قدیم بت پرستانہ عقاید سے تو پہلے ہی ابا کرچکے تھے۔ اون اصول کے تسلیم کرنے سے بھی آپ نے انکار کر دیا جو اگرچہ آپ کے منطوری اساتذ نے آپ کو سکھائے تھے لیکن آپ کا ضمیر اور عقل اون کی تائید نہ کر سکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کے ابتدائی صفحوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اون مخالف آسمانی کو جو حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئے مخائبہ اللہ سمجھا اور ان دونوں انبیائے کرام کو بھی آپ نے واجب التعظیم خیال کیا لیکن باری تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تعظیم و تکریم کا جلوہ خصوصیت کے ساتھ قرآن کی ہر سورت میں نظر آتا ہے۔ الوہیت مسیح کا مسئلہ آپ کو نہایت ہی قبیح و منکر وہ معلوم ہوتا ہے۔ خدا کی ملان کی حیثیت سے حضرت مریمؑ کی پرستش کو اور عام طور سے مورتوں اور تصویروں کی عبادت کو آپ ایک ذلیل درجہ کی بت پرستی تصور کرتے ہیں۔ آپ تثلیث کے قطعی منکر ہیں جس کی نسبت آپ کا یہ خیال ہے کہ اس مسئلہ کی بجز اس کے اور کوئی تاویل ممکن نہیں کہ تین خدا علیحدہ علیحدہ موجود ہیں۔

آپ کا مقصد خاص صرف اسی قدر تھا کہ مذہب کی اصلاح کی جائے اور جو خرابیاں اس میں پیدا ہو گئی ہیں اونہیں دور کیا جائے یعنی عربوں کی بت پرستی کو مٹا کر اوس دینیانہ فرقہ بندی کا خاتمہ کر دیا جائے جس نے عیسائیت کو فساد کا گھر بنا دیا تھا۔ یہ خیال کہ آپ ایک نیا مذہب قائم کرنا چاہتے تھے ایک بہتان تھا جو آپ پر قسطنطنیہ میں باندھا گیا جہاں آپ

معلوم ہوتی تھیں دور سے گھنسی کے بجنے کی سی آواز ہوا کو چیرتی ہوئی آپ کے کانوں میں پڑتی تھی۔ ایک دفعہ رات کے وقت عالم خواب میں جبریل امین آپ کو مکہ سے بیت المقدس لگے اور وہاں سے دونوں نے آسمان کا رخ کیا۔ چھ آسمانوں کی یہ میں تو جبریل نے آپ کی مشایت کی لیکن ساتویں آسمان کی دلیز پر قدم رکھتے ہوئے دن کے بھی پر چلے۔ اس لیے آپ تن تنہا اس حبیب مادل میں داخل ہوئے جس کا نقاب ہمیشہ قادر مطلق کے چہرے پر پڑا رہتا ہے۔ اور جب باری تعالیٰ کے سر و ہاتھ کا لمس آپ کو اپنے شانہ پر محسوس ہوا تو آپ کا دل دہل گیا۔

ادل اول آپ کے مواظظ و نصیاح کی لوگوں نے بہت مخالفت کی اور آپ کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ بہت پرستون نے آپ کو مکہ سے نکال دیا اور آپ کو مدینہ میں جہان بہت سے یہودی اور نسٹوری موجود تھے پناہ دینی پڑی۔ نسٹوریوں نے فوراً آپ کا مذہب قبول کر لیا جس سے فی الجملہ آپ کو تقویت ہو گئی۔ کفار کی ایذا رسانی سے مجبور ہو کر آپ نے اپنی صاحبزادی اور بعض صحابہ کو پہلے سے حبش بھیج دیا تھا جہاں کا فرمانروا نسٹوری المذہب عیسائی تھا۔ چھ سال کی مدت میں صرف چند رہ سوا آدمی آپ کے مذہب میں داخل ہوئے۔ لیکن تین چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں جو بعد میں بدر احد اور احزاب کے نام سے مشہور ہوئیں آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ کی سب سے زبردست دلیل تلوار ہے چنانچہ اس خیال کو آپ نے

۱۱۴ معلوم نہیں یہ لغو اور ہل فقرہ کہاں سے ڈر رہا کہ ہاتھ لگ گیا۔ معراج کے تعلق روایت کے امکان پر قرآن نے تو قاب قوسین اور ادنیٰ کا پروردگار رکھا ہے لیکن آپ بحیثیت کے درجہ سافل میں پہنچ کر انسان کی قوت لامہ کو خدا کے احساس کا شرف عطا کرتے ہوئے مائل نہیں فرماتے۔ غالباً اسی بنا پر آپ نے اگلی جگہ اسلام پر بحیثیت کا الزام لگایا ہے۔ مترجم

۱۱۵ انوس ہے کہ معتقد نے اسلام کے اصول سے ناواقف اور اون واقعات سے بے خبر ہونے کے باعث جو غزوات نبوی کے محرک ہوئے یہ تحکمانہ اصول قایم کر دیا کہ (بقیہ مضمون برصغیر آئندہ)

ادون فصیح الفاظ میں جو مشرق سے آپ کو میراث میں ملے تھے اس طرح ظاہر کیا ہے ہذا جنت  
تلوار دن کے سایہ کے نیچے ہے۔ غزوات کے ایک کامیاب سلسلہ نے آپ کے دشمنوں کا  
استیصال کلی کر دیا۔ عرب کی بت پرستی نیست و نابود ہو گئی۔ اصول لا الہ الا اللہ کو جس کا  
آپ نے اعلا فرمایا تھا آپ کے ابنائے وطن نے یک زبان ہو کر تسلیم کر لیا اور آپ کی نبوت پر  
بھی ایمان لے آئے۔

تو اب ہم آپ کی طوفان انگیز زندگی کے منہم با نشان کارناموں سے قطع نظر کریں اور  
سنیں کہ جب آپ کے دولت و انجبال کا آفتاب بعد آب و تاب پھل رہا تھا اور آپ کی  
حیات ستار کا آخری وقت قریب آچلا تھا تو آپ کا طرز زندگی کیا تھا اور آپ نے اس وقت  
کیا کیا خیالات ظاہر کیے۔

عقیدہ وحدت باری تعالیٰ کے امرٹ نقش کو اپنی لوح ایقان پر قلم کیسے ہوئے  
آپ اس حج کے قصد سے جس کے بعد پھر کوئی حج آپ نے نہیں کیا مدینہ سے مکہ کو روانہ  
ہوئے۔ ایک لاکھ چودہ ہزار مسلمانوں کا قافلہ آپ کے پیچھے پیچھے تھا۔ اونٹ پر و لون کے  
بارون سے آراستہ دھڑلے تھے۔ لہراتے ہوئے پر جموں سے اس پر ننگوہ کاروان کی جگہ  
دوبالا ہو رہی تھی۔ اس شان و شوکت کے ساتھ جب آپ مکہ منظر کے قریب پہنچے تو آپ نے  
یہ دعا کی:- ”اے میری عبادت کے لیے یہاں موجود ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

تجہی کو عبادت منزا دار ہے۔ تو ہی مالک الملک ہے۔ کوئین کی سلطنت میں تیرا کوئی شریک

(بقیہ معنون صفحہ گذشتہ) اسلام کی سب سے زبردست دلیل تلوار ہے۔ اگر صحت کی ہیں حیات میں پروفیسر  
آرنلڈ کی کتاب ”اشاعت اسلام“ ہی شایع ہو گئی ہوتی تو شاید یہ خیال ظاہر کرتے ہوئے است ۳۱۱ ہوتا۔

اسلام تو اپنے سلسلہ حقوق کی حفاظت ہی میں تلوار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے۔ مگر وہ مذہب غلط

اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں جتنا اصول تو یہ ہے کہ مارنے سے ادا ادا بہتر ہے مگر یہ یہ جو کہ جلتا

کو بھی با مال کر کے صفحہ سستی سے متا دیا جائے۔ مترجم



اور عیسائیت کا سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ مسلمان مسیح کو نہ تو ابن اللہ سمجھتے ہیں اور نہ بیٹے کو الوہیت کی حیثیت سے باپ کا ہم درجہ مانتے ہیں۔ بلکہ خدا کی وحدانیت اور صفات کے متعلق ایسے ایسے خیالات رکھتے ہیں جن سے انسان کے قلب پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ "اٹلی مین اکثر لوگوں کی یہی رائے ہے۔ ڈینیٹی کا خیال تھا کہ اسلام عیسائیت کی محض کی ایک نئی شاخ ہو اور مسلمانوں کو آئرس کے پیروں کا ایک فرقہ سمجھنا چاہیے۔ انگلستان میں وہ قسطلی اسلام کو عیسائیت کی ایک مسخ شدہ شکل سمجھتا ہے۔ لیکن ہماری ذاتی رائے (بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) ولہ یکن لہ کفو احد۔

اس قسم کے مبسوط ہر پرزے جن سے یہ گنج شایگان جگہ گارہے تشکک و الحاد کی نگاہ کو خیرہ کرنے کے لیے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی شخص جو ذرا بھی انصاف پسند ہے دعویٰ کر سکتا ہے کہ خدا کا وہ تصور جو ان آیات سے ذہن انسانی میں پیدا ہوتا ہے شان تجسیم لے ہوئے ہے۔ یا اون صفات میں سے جو ان آیات میں گنائی گئی ہیں کوئی صفت ایسی ہو جو مطلقاً انسان میں پائی جاتی ہو۔

ڈاکٹر ڈیریر فرماتے ہیں کہ مسلمان ان ادنیٰ درجہ کے تصورات کی قید سے بہت جلد آزاد ہو کر اون رفیع الشان تصورات تک پہنچ گئے جن میں حکمت و فلسفہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے بڑے سے بڑے حکیم اور فلسفی کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ مابعد الطبیعات میں آیات قرآنی کا شارج ہے اور بس۔ ابن رشد ابن تیمیہ ابن حزم غزالی ابن عربی فخر رازی جامی بوعلی سینا فارابی شاہ ولی اللہ اور سید احمد خان وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت کے امام ہو گئے ہیں اور آزاد خیالی میں ڈیریر سے بھی دو قدم آگے ہی ہیں لیکن توحید رسالت اور معاد کی حقیقتوں کے متعلق جو کچھ ان مشاہیر نے لکھا ہے وہ یا تو قرآن کی تشبیہ سے یا تاویل پر مبنی ہے۔ نفس جن کا حوالہ ہم ایک مرتبہ پہلے بھی دے چکے ہیں لکھتے ہیں کہ اوس بیس سال کی مدت میں جو رسول اللہ کی بعثت اور آپ کے انتقال کے درمیان منقضي ہوئی آئینہ نسلوں کے مسلمانوں کی ہر سیاسی اور عقلی ترقی کی بنیاد قایم کی جا چکی تھی۔ دنیا میں محمد معلم سو بڑہ کر (بقیہ مضمون صفحہ آئینہ)

یہ ہے کہ اسلام منطوری مذہب کی ایک شاخ تھا جس کے مقاصد ابتدائی محدود تھے۔ جب تک کہ یونانی مسیحیت کو بہت سی نتیجہ خیز لڑائیوں میں نچا دکھا کر یہ مذہب بہ سرعت تمام ایشیا و افریقہ میں پھیل نہ لیا اور اپنی حیرت انگیز فتوحات کے نشہ میں چور نہ ہو لیا اور اس وقت تک اس نے اپنا ابتدائی مقاصد کو پس پشت نہ ڈالا اور ایک نئی شرع کے بانی ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) اور کسی شخص نے اپنی قوم کے مقدر کو اپنے خاص اثر کے سانچے میں نہیں ڈھالا۔ اور اگر یہ مسلمان تمدن کی دوڑ میں بہت جلد آپ سے کو سون آگے نکل گئے لیکن ہر ہر منزل بلکہ ہر ہر قدم پر ہر مسئلہ کے حل کہنے میں وہ آپ ہی سے استناد و استشارہ کرتے رہے۔ مترجم

لے آج تک کسی اہل الرائے کو یہ دعویٰ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا تھا کہ آیہ **الیوم اکملت لکم دینکم** کی تفسیر کے بعد ان اصول میں جو اسلام دنیا کے سامنے علی رؤس الانبیاء پیش کر چکا تھا یا ان مقاصد پر جن کا اظہار انسان کی اصلاح معاش و معاد کے متعلق قرآن میں علی الاعلان کیا جا چکا تھا کوئی اضافہ کیا گیا یا ان اصول و مقاصد میں کوئی تسبیح یا ترمیم رد و رکھی گئی۔ تعجب ہے کہ مصنف کو باوجود اس بات کے جاننے کے کہ اسلام کا دار و مدار قرآن پر ہے اور حامل قرآن یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی حجت حق ختم ہو گئی جس میں نہ آج تک کوئی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہوگی اس عجیب و غریب دعوے کی جرات کیوں کر ہوئی کہ رسول اللہ کی وفات تک تو اسلام کے مقاصد محدود تھے لیکن ایشیا و افریقہ میں پھیلنے کے بعد بوجہ اس کے کہ وہ اپنی فتوحات کے نشہ میں چور ہو گیا تھا اس نے ان مقاصد کو پس پشت ڈال دیا اور ایک نئی شرع کی تردید کا مدعی ہوا۔ اس قسم کے دعائی سیمی جہلا کو خوش کر سکتے ہیں لیکن مسلمانوں سے اور مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ باغ نظر و آزاد خیال مسیحی مستشرقین تک سے یہ توقع رکھنا کہ وہ انہیں بلا چون و چرا تسلیم کر لیں گے گویا دن و ہاڑے ان کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسلام اور اس کے مقاصد سے جو شخص تہوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہے وہ اس اصولی نکتہ سے انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کسی ایک قوم یا ملک یا زمانہ تک محدود نہیں ہے بلکہ ابتدائی سے اس نے تمام دنیا کو اپنے آغوش انتر میں لینے کا ڈھنگ ڈال دیا تھا چنانچہ اس کی یہ شان (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

حضرت محمدؐ کی قریباً ساری زندگی اپنے ہی وطن کا مذہب بدلنے یا اسے فتح کرنے میں بسر ہوئی۔ لیکن اخیر دنوں میں آپؐ کی قوت اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ مسلمانوں کو شام اور

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) ہمہ گیری آ کر یہ دعا ارسال شدت اللہ العالمین میں نظر آ رہی ہے۔ ایسی حالت میں جو شخص یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی مقاصد محدود تھے یعنی اوس کا ظہور عربوں کی بت پرستی کے استیصال کے لیے ہوا تھا وہ گویا اپنے آپ کو اوس برادری میں داخل کرتا ہے جس کی جبین معلومات پر ”نہ داند و بداند کہ بداند“ کا قشقہ لگا ہوا ہے۔

یہ دعویٰ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب ہے کہ اسلام نے تمام دنیا میں پھیلنے اور فتح و نصرت میں سرشار ہونے کے بعد اس امر کا ادعا کیا کہ وہ ایک نئی شرع کا بانی ہے۔ اول تو سرے سے اس ادعا کو اوس سے منسوب کرنا ہی غلطی ہے اس لیے کہ قرآن میں بار بار بتایا گیا ہے کہ جو دین محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعہ سے انسان کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا وہ محض ادیان سابقہ کا مصدق اور حقائق ماضیہ کا موجد ہے۔ آیات قرآنی کے سیاق سے ہر مقام پر یہ بکثرت ترشح ہوتا ہے کہ اسلام نے ادنیٰ سچائیوں کو جکا اظہار برابر ہم اور موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے مرسلین نے اپنے اپنے وقت میں کیا تھا اور کہ در تون اور آلائشون سے پاک کر کے جن سے وہ بوجہ امتداد و زکا ر آلودہ ہو گئی تھیں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ جا بجا اوس نے اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ وہ معرفت اور یزدان شناسی کی وہی پُرانی شراب ہے گرنہ نبی بوتل میں اور اخلاق و روحانیت کا وہی قدیم پیکر و رانی ہے مگر نئے لباس میں۔ ثنائاً اگر ڈاکٹر ڈیرپے کی خاطر سے یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ مسلمانوں نے اس قسم کا متناقض دعویٰ ایشیا اور افریقہ کی تغیر کے بعد اپنی فتوحات کے نشہ میں چور ہو کر علی رغم وحی منطوق و نص مرئع کسی موقع پر کیا ہے تو اوس کا اثر اسلام پر کیا پڑ سکتا ہے۔ اسلام پر اگر کوئی الزام لگایا جاتا ہے تو آیات قرآنی کا حوالہ دے کر اوسے ثابت کیا جائے ورنہ دعویٰ بے دلیل سمجھا جائے گا۔

ڈاکٹر ڈیرپے کا یہ خیال بھی اٹوٹکا ہے کہ اسلام منطوریات کی ایک شاخ ہے۔ جیسا کہ ہم ایک گذشتہ نوٹ میں ظاہر کر چکے ہیں منطوریات اور عیسیٰ کی مسخ شدہ سیائیت میں (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

ایران پر حملہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو چلا تھا۔ چونکہ آپ نے سلطنت کو اپنے خاندان میں قائم رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا لہذا آپ کی جانشینی کا مسئلہ جھگڑے میں پڑ گیا۔ آخر بہت کچھ (بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) بجز اس مسئلہ کے اور کسی بات میں فرق نہ تھا کہ نسٹوری حضرت عیسیٰؑ کی ذات کے ربانی و جسمانی عناصر کو جدا جدا خیال کرتے تھے اور حضرت مریم کو اون کے عنصر جسمانی کی والدہ تصور کرتے تھے۔ باقی ہر ایک لحاظ سے وہ اون کی الٰہیت کے قایل تھے یعنی حضرت عیسیٰؑ کی فطرت ربانی و جسمانی کو متحد و غیر منفصل سمجھتے تھے اور اون کا ایمان تھا کہ یسوعؑ کے افعال جسمانی شان ربانی لیے ہوئے ہیں۔ اقاہیم ثلثت کو بھی وہ اسی تریسم کے ساتھ قایل تھے اور کفارہ و عشاء ربانی اور دوسرے غوامض مسیحیت سب اون کے عقاید کا جزو لا ینفک تھے۔ اور یہی وہ باتیں تھیں جنکی نسبت ڈریپر نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے اون اصول کے تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا جو اگرچہ آپ کے نسٹوری اساتذہ نے آپ کو سکھایا تھا لیکن آپ کا ضمیر اور عقل اون کی تائید نہ کر سکتی تھی۔ ایسی حالت میں اسلام کو نسٹوریت کی ایک شاخ قرار دینا منصفانہ کی خوش فہمی نہیں تو اور کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک پیغمبرِ ادا العزم کی لوح بعیرت بمنزلہ ایک ذکی المحس آئینہ عکسی کے ہوتی جو جس پر اوس کے اخلاقی حوالی کے باریک سے باریک نقوش شعاع ادراک سے اثر پذیر ہوتے ہی مرقم ہو جاتے ہیں۔ حقایق کے اس مرتع کو پیش نظر رکھ کر وہ اپنی قوت میزہ کی مدد سے جو فیضان باری کی مطرح خاص ہوتی ہے اون صورتوں کا انتخاب کر لیتا ہے جن سے اقوامِ داعم فیض یاب ہو کر قدرت کے فشار اخلاقی کی تعمیل کرتی ہیں۔

حضور سرورِ کائناتؐ جو انبیائے اولوالعزم کے سر تاج ہیں اوس زمانہ میں مبعوث ہوئے جبکہ دنیا کی توہین ارتقائے اخلاق کے تمام مدارج طے کر چکی تھیں لیکن اون کی روحانیت گوئن کے زاویۃ المراس سے گر کر بایل بہ قاعدہ فساد ہو رہی تھی۔ وحدت واجب الوجود۔ بقا و قدرت باری تعالیٰ۔ عدم تغیر قوانین ایزدی بقائے روح۔ حیات اخروی۔ حسن اخلاق۔ اخوت جماعت انسانی۔ یہ تمام اصول انسان کو معلوم ہو چکے تھے اور ان کے فروع ہند دمت۔ بدھ مت۔ مجوسیت۔ موسویت۔ مسیحیت میں (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

کنکمش اور جدوجہد کے بعد جناب عایشہؓ کے والد حضرت ابوبکرؓ جانشینی کے لیے نامزد ہوئے اور پہلے خلیفہ یا نائب رسول اللہ مقرر ہوئے۔

اشاعت اسلام و اشاعت مسیحیت میں ایک بہت بڑا اہم فرق ہے۔ مسیحیت کو کبھی بھی اتنی طاقت حاصل نہ ہوئی کہ دولت روم کی بت پرستی کا قلع و قمع کر سکتی۔ جس قدر اس کو ترقی ہوئی اسی قدر بت پرستی کا عنصر اس میں زیادہ ملتا گیا۔ ایک مذہب کی قدیم شکنیں زندہ ہو کر دوسرے مذہب میں آئیں اور نتیجہ جیسا کہ گذشتہ اوراق میں تفصیل بتایا جا چکا ہے یہ ہوا کہ مسیحیت بت پرستی کے ساتھ مخلوط ہو گئی۔

لیکن عرب میں حضرت محمدؐ نے قدیم بت پرستی کو ایسا مٹایا کہ اس کا نشان تک باقی نہ رکھا۔ جن عقاید کی آپؐ نے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشینوں نے تلقین کی اور ان میں بت پرستی کا ڈھونڈنے سے بھی سراغ نہیں ملتا۔ وہ حجر اسود جو آسمان سے گرا تھا اور وہ بت جو اس کو گرد و حلقہ زن تھے سب نظر سے غائب ہو گئے۔ نئے مذہب کا اصل اصول یعنی لا الہ الا اللہ دنیا میں بغیر کسی قسم کی مشرکانہ آمیزش کے پھیل گیا۔ جنگی فتوحات نے قرآن کے مذہب کو دنیوی اعتبار سے بہت کچھ نفع بخش ثابت کیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ مذہب کا اصل اصول خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جب تلوار کا زور ہوتا ہے تو بہت سے لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر نئے مذہب کی حلقہ

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) موجود تھے لیکن انسان کے طغیان و عصیان نے ان نورانی حقیقتوں پر شرک و جس کا تاریک پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس پردہ کے اٹھانے کے لیے ایک ایسے مامور من اللہ ہادی کی ضرورت تھی جس کی زبردست شخصیت اور تمام مشکلات سے عہدہ برا ہو سکے جن کا پیش آنا اس معرکہ میں لازمی تھا۔ دفعۃً قدرت ایزدی کی شان آشکارا ہوئی اور محمد مصطفیٰؐ نے مسند رسالت پر جلوہ افروز ہو کر ایک مجدد اعظم و مصلح اکبر ہونے کی مشیت سے اور تمام تباہیوں کا جو دیان و مذاہب سابقہ میں پہلے سے موجود تھیں اقتباس و انتقاط و انتخاب کر کے شیرازہ باندھا اور اس دکنش و دلاویز تالیف کو بنام اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مترجم

ہنگوشتی کئے۔ یہ تیار ہو ہی جاتے ہیں۔

اسلام کے باقی عقاید کو جو مشہور و معروف ہیں میں یہاں نظر انداز کرتا ہوں۔ جن ناظرین کو اس بحث سے دلچسپی ہو وہ میری کتاب ”ہسٹری آف دی اٹلیکچرل ڈیولپمنٹ آف یورپ“ (یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ) کا گلیا ہوان باب ملاحظہ فرمائیں جس میں میں نے قرآن پر تنقید کی ہے۔ اس مقام پر صرف اتنا لکھ دینا کافی ہو گا کہ مسلمانوں کی بہشت کی سات منزلیں ہیں اور ہر منزل کو یا فرماؤ یا ان مشرق کا ایک محل ہے جس میں ہر طرح کی جسمانی لذتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں سیاہ آنکھوں والی حوریں اور غلمان بھرے پڑے ہیں۔ اسلام کے خدا کی صورت

یہ ایک اور مضحکہ انگیز الزام ہے جو اسلام پر لگایا جاتا ہے۔ باوجودیکہ وہ لوگ جو اس قسم کی بین میک نکلنے کے عادی ہیں خود بہت بڑے مادہ پرست ہیں اور ان کا بال بال اجزائے دیمقراطیس میں بندھا ہوا ہے جن کے انزلی وابدی اور ناممکن الفنا ہونے پر انہیں ایسا ہی یقین ہے جیسا اپنی ہستی پر لیکن جب کبھی حیات اخروی کے عذاب و ثواب میں انہیں جسمانی شان نظر آتی ہے خواہ وہ برسبیل تمثیل ہی کیون نہ ہو تو ان کا ستون ثقاہت و متانت مرکز ثقل سے ہٹ جاتا ہے اور وہ ایسے بے سرو پا اور لغو اعتراضات پر اتر آتے ہیں کہ ہم سے متسم ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ ہم ان لوگوں سے جو بہشت کے اسلامی تصور پر یہ کہہ کر نکمے چین ہوا کرتے ہیں کہ اس میں ہر طرح کی جسمانی لذتیں پائی جاتی ہیں اور جن کو حورون غلمانوں کے ذکر سے اس قدر چڑھے کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا آپ کے خرم تقدس پر برق خافض گر پڑی یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ خدا اور اوس کی تنزیہ و تقدیس کے قایل ہیں تو آخراں دنیا میں ناز و نیاز اور اوس کی متعلقہ لذتوں کے پیدا کرنے سے اوس کے دامن تقدس و متروین کون سا ایسا حصہ لگ گیا جو عقی میں حورون اور غلمانوں کی عدم موجودگی سے چھوٹ جائیگا۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ خدا اس دنیا میں کچھ اور ہے اور آئے والی دنیا میں کچھ اور ہو جائے گا وہ ایک انوکھی منطق سے کام لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے معترضین اصل حال سے تو بے خبر ہیں (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

شاید کفر آلودہ عیسائیت کے خدا کی شکل کی بہ نسبت زیادہ ہییب اور بارعب ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا کو انسانی صفات سے متصف کرنے کا خیال ادن لوگوں کے دلوں سے محض نہیں ہو سکتا

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) لیکن شوقِ نیکہ یعنی قلم کو چین نہیں لینے دیتا۔

شاہ ولی اللہ صاحب اپنی کتاب حجۃ اللہ الی اللہ میں انبیاء کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے ادن کی عقل و علم کے لحاظ سے خطاب کیا کرتے ہیں۔ اسی خیال کو امام فخر الدین رازی نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ قرآن کا روئے سخن عوام و خواص کی طرف یکساں ہے لیکن چونکہ عوام اکثر امور میں اپنے افتادِ طبیعت کے لحاظ سے حقایق کے ادراک سے قاصر ہیں لہذا مصلحت یہ تھی کہ ایسے الفاظ میں ادنہیں مخاطب کیا جائے جو ادن کے خیالات و تصورات کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں۔ قرآن کے ادن مقامات کا مطالعہ کرتے وقت جن میں بہشت و دوزخ کی تصویریں کھینچی گئی ہیں اسی حکیمانہ اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان پڑھ اور اکھڑ جھلا کے غیر نشو و نما یافتہ دماغ کے پردہ پر اعمالِ حسنہ کی جزا کی تصویر اگر کھینچی جاسکتی تھی تو صرف ادن نعمتوں اور لذتوں کے تذکرہ کو جن کا احساس یا ادراک ادن کے لیے ممکن تھا۔ بہشت کا وہ تصور جس میں حور و غلمانوں اور بہتی ہوئی نہروں اور لہلہاتے ہوئے چمنوں کا عنصر شریک ہے تمثیلی پیرایہ میں عوام کا لانا م کو عبادِانی مسرتوں سے روشناس کرنے کا فلسفیانہ ذریعہ ہے۔ ورنہ اس بہشت کا تصور بھی اسلام میں موجود ہے۔ جس میں داخل ہو کر بڑے سے بڑے مشائی یا اشتراقی فیلسوف کو بھی یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی طبیعت کسی زمانہ میں اس کی خوشیوں سے اچاٹ ہو جائے گی۔ حیاتِ اخروی کا وہ اصل الاصول اور غایت الغایا جس کے حصول کے لئے اسلام کے حکماء عقلماء و صوفیہ کرام نے اپنی عمریں وقف کر دی ہیں نقائے باری تعالیٰ یا دِصال ذاتِ ذوالجلال و الجلال ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی تشریح حضور سرور کائنات نے ایک صحابی کے اس استفسار پر کہ بہشت کی ماہیت کیا ہے ان الفاظ میں فرمائی تھی لا عینِ سراء و لا اذنِ سمعت ولا خطر علی قلب بشر یعنی بہشت کی لذت وہ لذت ہے جس کا ادراک سامعہ دبا مرہ تو ایک طرف سے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

جو حکمت آشنا نہیں ہیں۔ اون کا خدا زیادہ سے زیادہ گویا ایک دیو سیل انسان ہی جس کا سر آسمان سے لگا ہوا ہے اور ٹانگیں زمین پر ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے مسند خلافت پر شکن ہوتے ہی حسب ذیل اعلان شایع کیا :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللہ جل شانہ کی حمد و ثنا کرنے اور محمد رسول اللہؐ پر درود بھیجنے کے بعد ابو بکر تمام مسلمانوں کے لیے دعا مانگتا ہے کہ اون پر خدا کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں اور اون کو صحت و عافیت کی نعمت میسر ہو۔ اس کے بعد تم لوگوں کو واضح ہو کہ میرا ارادہ مسلمانوں کو شام کی جانب روانہ کرنے کا ہے تاکہ یہ ملک کفار کے ہاتھوں سے لے لیا جائے۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) تصور تخیل تک سے نہیں ہو سکتا۔ اسی حقیقت کا انکشاف قرآن پاک کی اس آیت سے ہوتا ہے یا ایتھا النفس المطمئنة اسرجی الی سرباب راضیة مضیئة۔ ایک اور مقام پر جناب باری نے لذت نجات کی حلاوت سے حقیقی معنوں میں بہرہ اندر ہونے والوں کو ان الفاظ میں بشارت دی ہے کہ وہ اخیر فیصلہ والے دن اپنے خدا کے جلال عالم آرا کا مشاہدہ کریں گے۔ اسی طرح ایک نص مریخ اس مضمون کی موجود ہے کہ کسی نفس کو اس سرست ابدی کا علم نہیں ہے جو پوشیدہ طور پر اس غرض سے تیار کی گئی ہے کہ اون اعمال حسنہ کے انعام کے طور پر اس کو مرحمت کی جائے جو اس سے اس دنیا میں صادر ہوں۔ فلسفیانہ اصطلاح میں ان مضامین کو انجذاب یا اتصال سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ قرآن کا بہشت وہ بہشت ہے جس سے عامی و جاہل عالم و فلسفی اپنے اپنے مذاق کے لحاظ سے یکساں لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ اگر ایک خدا شناس فلسفی اسی کو اپنی خوشیوں کی معراج تصور کرتا ہے کہ اوس کی روح اس خاکدان کی قید سے آزاد ہونے کے بعد روح کائنات یعنی ذات باری تعالیٰ میں ضم ہو جائے تو یہ انتہائی خوشی بھی قرآن کے توسل سے اوس کو حاصل ہو سکتی ہے اور اگر ایک ادنیٰ درجہ کا دین دار عامی جس کی آرزو صرف اسی قدر ہے کہ عورتوں سے ہم کنار ہو کر شراب ملو کر پیائے پیا کرے اور طوبی کے پھل توڑ توڑ کر کھایا کرے تو ڈیر پر یا اوس کے ہم خیال بزرگوں کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ اس خوشی سے اس بچا پرے کو محروم کرنے کے لیے جوڑ توڑ کریں۔ مترجم



میں تم سب کو یہ جلا دینا چاہتا ہوں کہ مذہب کی حمایت میں لڑنا خدا کی اطاعت کرنا ہے۔  
 پہلی لڑائی میں جب عربی فوج کے سپہ سالار خالد کا قافیہ غنیم نے تنگ کیا تو اوس نے  
 اپنی سب فوج کے سامنے ہاتھ اٹھا کر ان الفاظ میں خدا سے دعا مانگی: ”بارالہا یہ بد بخت  
 مشرک بتوں کا نام لے لے کر دعا مانگتے ہیں اور تیرے سوا دوسرے خدا کی پرستش کرتے  
 ہیں حالانکہ ہم تیری توحید کے قایل ہیں اور چہا را یہ ایمان ہے کہ تیرے سوا اور کوئی خدا نہیں  
 پس ہم نہایت عاجزی کے ساتھ تجھ سے التجا کرتے ہیں کہ اپنے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ  
 علیہ وسلم کے طفیل ہماری مدد کرو اور ہمیں ان بت پرستوں پر فتح دے۔“ عربوں نے فتح  
 شام میں حرارت دینی کا حد سے زیادہ اظہار کیا۔ شامی عیسائیوں کے عقاید اون کے  
 دلوں میں غیظ و غضب اور نفرت و حقارت کے طوفان بپا کر کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک  
 موقع پر خالد کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے: ”میں اوس کفر بکنے والے بت پرست  
 کی کھوپری پھوڑ ڈالوں گا جو اللہ جل جلالہ کی شان میں یہ کہے گا کہ وہ بھی بیٹے والا ہے۔“  
 حضرت عمرؓ فاتح بیت المقدس فلس قیصر روم کو خط لکھتے ہیں جس کے ابتدائی الفاظ یہ  
 ہیں: ”حمد ہو اللہ کو جو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے اور جس کے نبی نبی ہے اور نبیؐ  
 اہل عرب عیسائیوں کو مشرک کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ عیسائیوں نے مریم دینیؑ کو اللہ تعالیٰ  
 جل شانہ کا شریک بنا رکھا تھا۔“

حضرت ابو بکرؓ کا یہ قصد نہیں تھا کہ فوج کی کمان خود کریں۔ یہ خدمت نام کو ابو عبید  
 اور دراصل خالد کے سپرد کی گئی۔ رخصت کو وقت جب خلیفہ المسلمین نے فوج کا جائزہ لیا تو  
 افسردہ اور سپاہیوں کو تائید کی کہ فریق مقابل سے انصاف اور درجہ کا برتاؤ کریں۔  
 اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم رہیں۔ یہودہ گفتگو سے بچیں۔ شراب خواری سے پرہیز کریں۔  
 پانچون دقت پابندی کے ساتھ نماز پڑھیں۔ جہاں جہاں گذرین عام لوگوں کے ساتھ بہ ملاطفت  
 پیش آئیں مگر اودن کے پادریوں پر ذرا رحم نہ کریں۔

دریائے زردون کے مشرق کی جانب بصرہ کا مستحکم شہر واقع ہے جہاں رسول عربیؐ اول  
 اول اپنے نسطوری معلموں سے ملے تھے۔ دولتِ روم کے جو قلعے ارضِ شام میں جا بجا بنے  
 ہوئے تھے ادھنہن میں بصرہ کے قلعہ کا بھی شمار تھا۔ فوجِ عرب نے اس کے سامنے ڈیرے  
 ڈال دیے۔ قلعہ بند فوج کی طاقتِ غنیم کے مقابلہ میں کچھ کم نہ تھی اور اس طاقت میں  
 اودن مقدس صلیبیوں اور متبرک جھنڈوں نے اضافہ کر دیا تھا جنہیں مصویرین کی خوش اعتقاد  
 نے فہیل پر بلند کر رکھا تھا۔ اہل قلعہ عرصہ داز تک اپنی حفاظت کر سکتے تھے لیکن قلعہ دار  
 ردینس کی نیت بدل گئی اور اوس نے چپکے سے پھاٹک کھول دیے۔ اوس کے اس طرز  
 عمل سے ظاہر ہے کہ اہل شام کی حالت کیسی بری ہو رہی تھی۔ جب فوجِ محاصرہ شہر میں داخل  
 ہو گئی اور ردینس نے قلعہ کی کنیان سپہ سالار عرب کے حوالہ کر دیں تو اہل قلعہ کو اوس نے  
 حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کیا: ”آج سے میں تم لوگوں سے جدا ہوتا ہوں۔ دنیا و عقبی  
 دو دنوں جگہ میری تمہاری راہیں الگ الگ ہوں گی۔ مجھے اوس خدا سے انکار ہے جو مصلوب  
 ہوا تھا اور جو لوگ اوس کی پرستش کرتے ہیں میں اودن سے بھی بیزار ہوں۔ میرا خدا آج سے  
 خدا سے واحد ہے۔ میرا مذہب آج سے مذہبِ اسلام ہے۔ میرا قبلہ آج سے مکہ معظمہ ہے۔  
 میرے بھائی آج سے مسلمان ہیں اور میرا رسول آج سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
 ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا اور جس نے علیٰ رغمِ مشرکین  
 اعلا سے کلمۃ الحق میں کامیابی حاصل کی۔“ ایران کے حملہ کے بعد ایشیائے کوچک۔ شام  
 بلکہ قسطنطین میں بھی منکمرامون اور مردون کا ایک گروہ کثیر ایسا پیدا ہو گیا تھا جو عربوں کے  
 ساتھ مل جانے کے لیے صرف موقع کا منتظر تھا۔ ردینس کا شمار بھی اودن ہزار ہا لوگوں میں تھا  
 جو ایرانی فتوحات کی وجہ سے بد اعتقاد ہو گئے تھے۔

شام کا پایتخت دمشق بصرہ سے صرف بہتر میل جانبِ شمال واقع تھا۔ فوجِ عرب  
 بلا توقف اسی طرف روانہ ہوئی۔ اہل دمشق سے کہا گیا کہ تین باتوں میں سے جو چاہو

انتیار کر دینی یا تو اسلام لاؤ یا جزیہ دو یا مقابلہ کرو۔ شہنشاہ ہرقلس اس وقت انطاکیہ میں مقیم تھا جس کا فاصلہ دمشق سے بہت شمال صرغیہ و بصرہ سویل کے رہ گیا تھا۔ جلد آوروں کی پیش قدمی کی خبر وحشت اثر سن کر ہرقلس کے ہوش اڑ گئے اور اس نے فوراً ستر ہزار فوج غنیم کا رستہ روکنے کے لیے روانہ کی۔ عربوں کو مجبوراً دمشق کا محاصرہ چھوڑنا پڑا۔ اخباتین کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور رومی فوج شکست فاش کھا کر بحالت تباہ منتشر و پیریشان ہو گئی۔ یہاں سے مظفر و منصور ہو کر خالد بن بھر و دمشق کے سامنے اپنا علم جس پر سیاہ عقاب کا نشان بنا ہوا تھا بلند کیا۔ اور ستر دن کے محاصرہ کے بعد اہل دمشق نے ہتھیار ڈال دئے۔

عربی تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک افواج عرب کی حالت مذہبی غیظوں کی ایک بے قاعدہ جمعیت سے کچھ بہتر نہ تھی۔ بہت سے سپاہی ایسے ہوتے تھے جنہیں تن و شکنے کے لئے کپڑا تک میسر نہ تھا۔ اکثر ایسے ہوتا تھا کہ ایک شخص فوج کی صف سے نکل کر میدان میں اکٹھا ہوتا تھا اور فریق مقابل سے مبارز طلب کرتا تھا اور یہ دونوں اس وقت تک لڑتے رہتے تھے جب تک کہ ایک کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ مرد تو ایک طرف رہے عربین تک شریک جنگ ہوتی تھیں اور داد شجاعت دیتی تھیں۔ چنانچہ ان کے ان بہادرانہ کارناموں کی بہت سی دلچسپ روایتیں تاریخوں میں موجود ہیں۔

کوہستان لبنیس کی برتن سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں اور دریائے آرافلس کے خوشنواں اور پرفضا کناروں کی روانہائی سے عربی فوج دمشق کے شمال کی طرف روانہ ہوئی۔ رستہ میں بعلبک اور حمص دو شہر پڑتے تھے۔ دونوں کو یکے بعد دیگرے اس نے مسخر کیا۔ ہرقلس کو پل پل کی خبریں لگتی تھیں۔ حملہ آوردن کی مزید پیش قدمی کا سد باب کرنے کے لیے اس نے ایک لاکھ چالیس ہزار کا لشکر جارج جمع کیا۔ یرموک کے میدان جنگ میں دونوں فوجوں کا

لہذا یہ اندازہ اس وقت تک لاکھ کے کم ہے۔ اس سربکریں مسلمانوں کی فوج چالیس ہزار تھی اور جیسیون کی دلاکھ چالیس ہزار تھی۔

سامنا ہوا۔ پہلے حملہ میں عربی فوج کے سینہ کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن عرب عورتوں نے ہزیمت کھائے ہوؤں کے دلون میں اپنے غیرت آفرین الفاظ سے نیا جوش پیدا کر دیا۔ وہ پلٹے اور اس بے جگر سی سے لڑے کہ لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ رومی فوج اون کے حملہ کی تاب نہ لاسکی اور اسے شکست فاش ملی۔ چالیس رومی قید ہوئے اور ہزار دن میدان جنگ میں کام آئے۔ اب تمام ملک فاتحوں کے قبضہ میں آگیا۔ چونکہ اونہوں نے دریائے زردن کے مشرق کی جانب پیش قدمی کی تھی لہذا صاف ظاہر تھا کہ ایشیائے کوچک پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے فلسطین کے مستحکم اور سربراہ اور وہ شہر دن کا سفر ہو جانا ضروریات سے ہے۔ سرداران فوج میں اس مسئلہ کے متعلق اختلاف رائے ہوا کہ اول قیصر یہ پر حملہ کرنا چاہیے یا بیت المقدس پر جب بحث اس اختلاف کا تصفیہ نہ کر سکی تو دربار خلافت سے استہد کیا گیا۔ خلیفہ کی عقل سلیم نے بیت المقدس کی فتح کے اخلاقی فوائد کو تسخیر قیصریہ کے جنگی فوائد پر ترجیح دی چنانچہ عربی فوج سو سپہ سالار کے نام اس مضمون کا حکم پہنچا کہ بیت المقدس پر اول حملہ ہو اور جس طرح بن پڑے اسے سر کیا جائے۔ غرض اس شہر کا یہ سرگرمی تمام محاصرہ کیا گیا۔ یہاں کے باشندوں کو ایرانی حملہ کے وقت مزار مسیح کی توہین فراموش نہ ہوئی تھی۔ اس لیے اونہوں نے مخالفت و دغاوت کی بہت بڑی تیاریاں کیں۔ اور جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ لیکن چار مہینے کے محاصرہ کے بعد جب اونہوں نے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی تو بطریق سفر امنس فصیل شہر پر اکھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اگر ہم کو امان دی جائے اور شرائط ملے ہو جائیں تو ہم لوگ ہتھیار ڈال دینے پر آمادہ ہیں۔ چونکہ فتح دمشق کے وقت سرداران فوج کی غلط فہمیوں کی وجہ سے باشندگان شہر کا قتل عام ہوا تھا لہذا سفر امنس نے یہ شرط پیش کی کہ بیت المقدس خلیفہ کی موجودگی میں مسلمانوں کے حوالے کیا جائے گا۔ یہ شرط منظور کر لی گئی اور حضرت عمرؓ جو اس وقت خلیفہ تھے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ آپ نے سفر اس حیثیت سے کیا کہ ایک سرخ رنگ کے اونٹ پر سوار تھے اور زرادراہ کی قسم سے آپ کے ساتھ ایک تیلے میں

کچھ اناج تھا۔ ایک تھیلے میں کچورین تھیں۔ ایک لکڑی کی رکابی تھی اور پانی کے لیے ایک چمڑے کی چھاگل تھی۔ غرض اس شان کے ساتھ عرب فاتح عیسائی بطریق کی سواری کے ہمراہ بیت المقدس میں داخل ہوا اور مسیحیت کا صدر مقام بغیر کسی شور و شر اور بغیر کسی خوزیزی کے پیشوا سے اسلام کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ حکم دینے کے بعد کہ ہیکل سلیمانی کی جگہ ایک مسجد تعمیر کی جائے خلیفۃ المسین نے مدینہ کو مراجعت کی۔

ہرقلس سے یہ بات بھی نہ تھی کہ جو تباہیان اور مصیبتیں عیسائیت پر مہم نازل ہو رہی ہیں اور ان کا باعث تحالف القیادسیحی فرقوں کا تفرقہ ہے۔ اسی لیے جہاں اوس نے سلطنت کی حمایت میں تلوار اٹھائی وہاں ان اختلافات کے مٹانے کی بھی بدل کوشش کی۔ اس غرض کو پیش نظر رکھ کر اوس نے یہ اصول مسیحی دنیا میں شائع کرنا چاہا کہ چونکہ مسیح کی ربانی اور انسانی فطرتیں ایک دوسرے میں ختم ہو چکی ہیں اور جدا جدا نہیں لہذا مسیح کی مشیت بھی جس سے اوس کے ربانی و انسانی افعال صادر ہوتے ہیں ایک ہے اور وہ مشیت ایزدی ہے مشیت انسانی نہیں۔ لیکن یہ کوشش ہرقلس نے اوس وقت کی جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ بیت المقدس کی تغیر کے بعد مسلمان ایشیائے کوچک کی طرف بڑھے اور قلعہ اور القلک کیہ پر قبضہ کیا۔ وہ برابر بڑھتے ہوئے چلے جاتے تھے اور کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو ان کی فتوحات کے سیلاب کو روک سکے۔ خود ہرقلس کو جان بچانے کو لیے فرار ہونا پڑا۔ اور تمام کاموہ جسے جو قس سیزر کے رقیب پامپی اعظم نے سات سال پہلے دولت رومۃ الکبریٰ کے ساتھ ملحق کیا تھا جو عیسائیت کا زاد بوم تھا جہاں اس کی مقدس اور قیمتی یادگارین موجود تھیں جہاں سے خود ہرقلس نے ایک مرتبہ ایرانی حملہ روں کو نکال دیا تھا اب ایسا ہاتھوں سے نکالا کہ پھر واپس نہ آیا۔ کہتے ہیں کہ جس جہاں زمین ہرقلس سواری ہو کر قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا جب اوس نے لنگر اٹھایا تو ہرقلس حسرت بھری نگاہوں سے پیچھے ہٹتی ہوئی پہاڑیوں پر منگلی جاکر درود کر کے لہجہ میں پکارا:-

”الوداع اے شام ہمیشہ کے لیے الوداع“

فتوحات عرب کے باقی واقعات کی تفصیل اس مقام پر درج کرنی ضروری نہیں ہے۔ طرابلس اور ٹایر (صور) کا خود اپنے ہی افسروں کی غداری سے مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جانا۔ قیصریہ کا فتح ہونا۔ کورستان تینیس کے درختوں اور فیشیا کے ملاحون کی مدد سے ایک بیڑے کا تیار کیا جانا اور اس بیڑے کا روم کے جنگی بیڑے کو شکست دے کر سیلیسٹ کی طرف بھگانا۔ قبرس رومس اور سکیدس کا تاخت و تاراج ہونا اور کلاسس کے مجسمہ کا جو عجائبات دنیا میں شمار ہوتا تھا ایک یہودی کے ہاتھ جو اس کے پتیل سے نو سو اونٹ لاد کر لے گیا بکنا۔ اور اسلامی فوج کا تیسرا سو کی طرف بڑھنا بلکہ قسطنطنیہ کی دیواروں کے سامنے ڈیرے ڈالنا۔ یہ تمام ایسی باتیں تھیں جن کی فتح بیت المقدس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔

فتح! اور وہ بھی بیت المقدس کی!! عیسائیت کے پایہ تخت کی!! اس طرح ممکن تھا کہ لوگ اس واقعہ کو اسلام کے غلبہ اور مسیحیت کی شکست سے تعبیر نہ کریں۔ دونوں مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو سچا سمجھ کر اس یقین کے ساتھ کہ فتح سچائی کو ہوگی ایک دوسرے کا مقابلہ کیا تھا اور فیصلہ خدا پر چھوڑا تھا۔ خدا نے فتح اسلام کو عطا کی اور فتح کاتمغہ بیت المقدس کی شکل میں مسلمانوں کو دیا۔ اور اگرچہ حروب صلیبیہ کے دوران میں عیسائیوں کو تھوڑی دیر کے لیے کامیابی حاصل ہو گئی لیکن نتیجہ یہ ہے کہ ہزار سال کی جدوجہد کے بعد آج بھی وہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ دولت قسطنطنیہ کے مورخین پر قایم نگاری کا جو طریقہ اختیار کرنے کا الزام لگایا گیا ہے اس کے لحاظ سے وہ ایک حد تک قابلِ ممانعت ہیں۔ ”اومنون نے کلیسائے شرقی کی تباہی کے اہم مسئلہ کو چھوٹک بنیں“ باقی رہا کلیسائے غربی۔ سو اس کی یہ حالت ہے کہ ازمنہ وسط یعنی دورِ حروب صلیبیہ کے ذلیل اساقف تک کی رگِ حمیت پھٹنے لگتی تھی جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ ہم روم کو اس جھوٹی روایت کی بنا پر

کرسینٹ پیٹر نے یہاں قدم رنج فرمایا تھا مجبور ہو کر مسیحیت کا پائے تخت قرار دے رہے ہیں حالانکہ عیسائیت کا اصلی مرکز حکومت یعنی سیج کی ولادت زندگی اور وفات کا عظیم الشان اور مقدس مقام کفار کے قبضہ میں ہے۔ یورپ کے مسیحی مصنفین نے ہرمون پر قلم اٹھاتے وقت خواہ اوس کا موضوع تاریخ ہو یا مذہب یا سائنس جب اپنے فحشہ مخالفین کا ذکر کیا ہے تو اسی طرح زہر اگلا ہے۔ اوس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ جس چیز میں وہ کوئی منقبت کا پہلو نہ نکال سکیں اوسے پھیپھیں اور جس چیز کو چھپا نہ سکتے ہوں اوس کی نقیص کریں۔

قلت گنجائش اور نیز اس کتاب کا موضوع ہم کو اجازت نہیں دیتا کہ جس طرح فتح بیت المقدس کا ذکر ہم نے تفصیل کیا ہے اسی طرح پوری وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کی دوسری فتوحات کے واقعات لکھیں چکی بہ دلت آگے چل کر ایک ایسی عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم ہوگئی جو جغرافیائی وسعت میں اسکندر کی سلطنت بلکہ دولت رومہ النکبری پر بھی بمراتب فوقیت لے گئی۔ لیکن اس مضمون پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے ہم اس قدر کہنا بے موقع نہیں سمجھتے کہ عیسائیت پر جو طمانچہ پڑا تھا جو مسیحیت نے اس سے بھی زور کا تھپڑ کھایا۔ قادیسیہ کی جنگ نے ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ مدائن کے لٹنے پر خزائنہ واسطہ شاہی اور بے انتہا مال غنیمت عربوں کے ہاتھ آیا۔ معرکہ نہاند کو عرب مورخوں نے جو ”فتح الفتوح“ کا لقب دیا ہے وہ کچھ غیر موزون نہیں ہے۔ ایک طرف تو وہ بحیرہ خزر کی طرف بڑھے اور دوسری طرف جنوبی سمت میں دجلہ کے کنارے کنارے اضطمر کا رخ کیا۔ فرمانروائے ایران اوس شہر کے میناروں اور چتر کی مورتوں میں سے گزر کر جو اسکندر کی محفل محو نوشی کی رات سے اجڑا پڑا تھا صحرائے نمک میں سہوتا ہوا جان سلامت لے کر بھاگ گیا۔ عربی فوج کا ایک حصہ اوس کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اوس کو بیچون جوہر کر آیا جہاں اوسے ترکون نے قتل کر ڈالا۔ اوس کے بیٹے کو

چین میں پناہ لینی پڑی جہاں وہ مغفور چین کی فوج میں کپتان ہو گیا۔ جیون کے اوس پار کا علاقہ بھی مسلمانوں کا مطیع و منقاد ہو گیا اور خراج میں دو لاکھ اشرفیاں دینی منظور کیں۔ غرض ایک طرف تو مغفور چین اپنے پایہ تخت یکن سے مدینہ میں اپنا سفیر بھیج کر خلیفۃ السلیک سے التجائے صلح و آشتی کر رہا تھا اور دوسری طرف علم نبوی دریائے انڈس کے کناروں پر لہرا رہا تھا۔

شام کی لڑائیوں میں جن سرداران فوج نے علم امتیاز بلند کیا اون میں سے ایک عمرو بن العاص بھی تھا جس کے مقدر میں فاتح مصر ہونا لکھا تھا۔ خلفائے اپنی شمالی و مشرقی فتوحات ہی پر قناعت نہ کی بلکہ اب مغرب کی طرف نگاہ اٹھائی اور افریقہ کے الحاق کی تیاریاں شروع کیں۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی مذہبی فرقوں کا باہمی عناد و تفرقہ اون کی کامیابی کا باعث ہوا۔ فرقہ ”جیکو بائٹ“ نے مسلمانوں کو اپنا ذریعہ مخلصی سمجھ کر عرب فوج کا خیر مقدم صدق دل سے کیا۔ فرقہ منوفطائیہ نے جو بقول بیروان مذہب سینٹا تھینیس ذات ابن اللہ کی الوہیت و انسانیت کو مخلوط سمجھتا تھا اپنے سرگروہ متو قس کے ذریعہ سے اس امر کا اعلان کیا کہ ہم یونانیوں سے نہ دنیا میں تعلق رکھنا چاہتے ہیں نہ عقبی میں اور ظالم قیصر قسطنطنیہ اور اوس کی کونسل سے جس کا مستقر جلیسیڈان ہے ہمیشہ کے لیے ابرا کو تو ہیں۔ غرض انہوں نے خلیفۃ الاسلام کو خوشی خوشی خراج دینا قبول کیا۔ مگر کون اور پلون کی مرمت خود کر دی اور حملہ آور فوج کو نہ صرف رسد ہم پہنچائی بلکہ اوس کے لٹو جاسوسی کی خدمت بھی انجام دینے میں دریلغ نہ کیا۔

مفسر پر جو فراعنہ کے زمانہ میں مصر کا پایہ تخت تھا مسلمانوں کا بہت جلد قبضہ ہو گیا اور اس کے بعد افواج اسلام نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا۔ چونکہ اسکندریہ کے پس پشت سمندر کی راہ کھلی تھی لہذا اہل قلس کو محصورین کے لیے ملک بھیجنے کا موقع ملتا رہا۔ اور حضرت عمرؓ نے بھی جو اس وقت مسند خلافت پر تھیں تھے فوج محاصرہ کی امداد کے لیے شام



کی جنگ آزمودہ سپاہ روانہ کی۔ محاصرین کی طرف سے بہت سے دھاوے ہوئے اور محصورین نے بہت دفعہ نفل نفل کر مسلمانوں پر حملے کیے۔ ایک دفعہ محصورین نے عمرو کو گرفتار کر لیا مگر وہ ایک غلام کی جانب ازانہ عیاری سے بچ کر نفل آیا۔ غرض چودہ مہینے کے محاصرہ کے بعد جس میں مسلمانوں کی تیئیس ہزار فوج کام آئی اسکندریہ کو اسلام کے آگے سرسجدہ ہونا پڑا۔ عمرو بن العاص نے جب دربار خلافت میں فتح اسکندریہ کا مژدہ بھیجا تو مغرب کے اس شہر غدار کے شان و شکوہ اور جاہ و جلال کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ اس میں چار ہزار محل چار ہزار حمام چار سو تماش گاہیں بارہ ہزار پھل ترکاری اور نانج کی دکانیں ہیں اور چالیس ہزار باج گذار یہودی آباد ہیں۔

اس طرح عیسائی دنیا کا دوسرا شہر بھی کشور کشیاں اسلام کی سلک فتوحات میں منسلک ہو گیا اور جو حشر بیت المقدس کا ہوا تھا وہی اوس اسکندریہ کا بھی ہوا جس کو اپنڑ سیچی آثار پر ناز تھا جس نے آئینہ سیس اور ایریس اور سائرل کو گودیوں میں کھلایا تھا جس نے کلیسا کے عقاید کی شاخ میں اقامت ملنے اور پرستش مریم کا پیوند لگایا تھا۔ ہر قلس قسطنطنیہ میں تھا کہ یہ جانکاہ خبر پہنچی۔ اس صدمہ سے اوس کی کمر ٹوٹ گئی اور دنیا اوس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا عیسائیت کے زوال سے اوس کی حکومت کے ماتھے پر کلنک کا امٹ ٹیکا لگنے والا ہے۔ فتح اسکندریہ کے صدمہ نے اوسے ایک مہینہ سے زیادہ زندہ نہ رہنے دیا اور وہ اسی رنج میں کھل کھل کر مر گیا۔

اسکندریہ کا ہاتھ سے نفل جانا قسطنطنیہ کے لیے ایک دہرا دھکا تھا۔ اس لیے کہ مذہب کے مرکز ہونے کے علاوہ اوس کا وجود روزمرہ کی رسد رسانی کے لحاظ سے بھی قسطنطنیہ کے لیے ضروریات سے تھا۔ مقررہ دیون کے لیے اناج کی منڈی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زبردست جنگی بیڑوں اور جرار فوجوں کی مدد سے دو دفعہ اس مقام کو مسلمانوں سے چھین لینے کی کوشش کی گئی اور دونوں دفعہ عمرو کو یہ شہر گویا از سر نو فتح کرنا پڑا۔ فاتح

اسکندریہ لئے جب یہ دیکھا کہ سمندر کے کنارے پر واقع ہونے کے باعث اس شہر پر غنیمت  
 آسانی حملہ آور ہو سکتا ہے جس کے دفعیہ کی ترکیب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ شہر پناہ کو ہی  
 مسمار کر دیا جائے تو اوس کے منہ سے بے اختیار یہ کلمات نکلے : ”قسم ہے خدا سے  
 تو تم کی کہ اگر تیسری مرتبہ پھر بھی کوشش انخیز کی طرف سے ہوئی تو میں اسکندریہ کو کسی طوائف  
 کے دروازہ کی طرح تمام دنیا کے لیے کھول دوں گا۔“ یہ ڈانکی پوری ہو کر رہی۔ عہد لئے جو کچھ  
 کہا تھا اوس سے زیادہ کر دکھایا۔ یعنی فوراً شہر کی فیصلوں اور دھسوں کو زمین کے برابر کر دیا  
 جس سے اس کی قوت مزاحمت و مدافعت سب ہو گئی۔

مختلف اسلام کا قصد یہ نہ تھا کہ اپنے دائرہ فتوحات کو نہ ہی تک محدود رکھیں۔  
 حضرت عثمان غنیؓ ثالث نے افریقہ کے کل شمالی ساحل کی تسخیر و الحاق کا عزم کیا۔ چنانچہ  
 آپ کے سپہ سالار عبداللہ نے چالیس ہزار فوج کے ساتھ تونس سے روانہ ہو کر پھر اُسے  
 بڑھ کر قطع کرتے ہوئے طرابلس کا جا محاصرہ کیا۔ لیکن چونکہ فوج میں وبا پھوٹ پڑی اس لیے  
 اوست مجبوراً متحضر کو واپس آنا پڑا۔

اس کے بعد بیس سال تک مسلمانوں نے کوئی پیش قدمی نہ کی لیکن تقریباً ربع صدی  
 کا جوش کشور کشائی جو اندر ہی اندر کی چشمہ کی طرح ابل رہا تھا اب تک رکا رہتا۔ آخر یہ  
 جوش ظاہر ہوا اور فتوحات کا ایک سیلاب شمالی افریقہ پر چھا گیا۔ عقبہ و ادوی نیل سے  
 آمدنی کی طرح اٹھا اور کوہ و صحرا دشت و بیابان کو قطع کرتا شہر و دیواروں کو حلقہ بگوش  
 خلافت بناتا ہوا بحر اوقیانوس کے ساحل تک جا پہنچا۔ اور جب سمندر کی موجوں نے  
 اوس کے اسپہ سالار رفتار کے سمون کو جزائر کثیر کی بال مقابل بوسہ دیا تو یہ الفاظ  
 اوس کے منہ سے نکلے : ”سبحان ذی الکبریٰ و الجبروت ! اگر یہ سمندر میرا خراج نہ ہوتا  
 تو میں مغرب کے نامعلوم ملکوں میں برابر بڑھا ہوا چلا جاتا اور خدا نے بزرگ و برتر کی  
 وعدہ اینست کا ڈنکا بجاتا ہوا ادا نہ تمام سرکش قوموں کو تلواریں کے گھاٹ اُتارتا جو خدا نے

واحد کے سوا کسی دوسرے خدا کی پرستش کرتی ہیں۔“

عربوں نے یہ چڑھایا نہ ملک کے اندر و فی علاقوں پر کی تھیں۔ اس لیے کہ ابھی تک ہجیرہ دوم پر فرمانروایان قسطنطنیہ کے اقتدار کا علم لہراتا تھا اور جو شہر ساحل پر واقع تھے وہ بحری قوت کی بدولت ان کے قبضہ میں تھے۔ آخر کار خلیفہ عبدالملک فی کار تہج کی تسخیر کا عزم کیا جو ان شہروں میں سب سے زیادہ آباد اور طاقتور تھا بلکہ گویا شمالی افریقہ کا دارالسلطنت تھا۔ اموی سپہ سالار حسن نے کمندین اور سیڑھیان لگا کر ایک بلہ مین اسے سر کر لیا لیکن چونکہ کار تہج والوں کو قسطنطنیہ سے ملک پہنچ گئی اور اس کے علاوہ سسلی اور تھمہ کی فوج بھی ان کی مدد کے لیے آگئی لہذا حسن کو پسپا ہونا پڑا۔ لیکن یہ کامیابی چند روزہ ثابت ہوئی۔ حسن نے چند مہینے کے بعد سنہیل کر پھر حملہ کیا اور اس مرتبہ غلبہ پانڈ کے بعد کار تہج کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیا۔

بیت المقدس اور اسکندریہ پہلے ہی عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ کار تہج کی تسخیر سے عیسائی طاقت کا ایک اور زبردست مرکز کم ہو گیا۔ قسطنطنیہ کا فتح ہونا بھی صرف چند دن کی بات تھی۔ اس کے مسخر ہو جانے کے بعد عیسائیوں کے پاس بے دھڑ کر ایک صرف دو ما باقی رہ جاتا تھا۔

عیسائیت کے نشوونما میں کار تہج نے کچھ کم حصہ نہیں لیا تھا۔ اسی کی بدولت یورپ میں رومن کلیتہاً ایک مذہب بنے رواج پایا۔ اسی کی خاک سے اس مذہب کے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں سینٹ اگسٹائن کے سے شہرہ آفاق پادری نے جنم لیا۔

جب ہم دنیا کے مذاہب کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سرعت و وسعت اشاعت میں کوئی مذہب اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اسلام کو وہ الطامح سے لے کر ہجر اقصیا فوسس اور وسط ایشیا سے لے کر افریقہ کی

مغربی حد و تک کوس لمن الملک الیوم بجار ہاتھا۔

اب خلیفہ ولید کا دور آیا اور اس نے فرمان صادر کیا کہ یورپ پر چڑھائی کی جائے اور اندلس یعنی مغرب الاقصیٰ کو سلطنت اسلام میں شامل کر لیا جائے۔ مذہبی تفرقہ اور ملکی تلکھرا می ہمیشہ سے اسلامی حملہ آوروں کی اعانت کرتی چلی آئی تھی۔ اس موقع پر بھی مسلمانوں کے سپہ سالار موسیٰ کو یہی دو پرانے رفیق مجسم ہو کر ٹالیڈ و کے اسقف اور گاتھ فوج کے سپہ سالار کاؤنٹ جو لین کی شکل میں مل گئے۔ جنگ زیریں میں عین اس وقت جبکہ مسلمانوں اور مسیحیوں میں برابر کی چٹین چل رہی تھیں اور یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ فریقین میں سرشت کون پائے گا اور فتح کس کو ہوگی مسیحی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ ٹالیڈ و کے پادری اور کاؤنٹ جو لین کی تحریک پر مسلمانوں کے ساتھ آگیا۔ ہسپانیہ کے بادشاہ کو میدان جنگ سے بھاگنا پڑا اور دریائے گواڈلکویور کی موجوں نے اسے غنیم کے تعاقب سے ہمیشہ کے لئے امان دے دی۔

موسیٰ کا نائب طارق برسرعت تمام ٹالیڈ و کے میدان جنگ سے شمال کی طرف روانہ ہوا اور رستہ میں جو شہر ملا اسے فتح کرتا ہوا برق و باد کی طرح بڑھا چلا گیا۔ جب موسیٰ شمالی افریقہ سے جہان وہ کچھ عرصہ کے لیے چلا گیا تھا واپس آیا تو طارق کی تلوار تمام جزیرہ غاصب اسپین کو مسخر کر چکی تھی اور گاتھ فوج کا بقیہ السیف بحال تباہ کوہستان پر تینیز سے گذر کر فرانس میں جا پناہ گزین ہوا تھا۔ تسخیر اسپین کو اپنی فتوحات کی پہلی منزل قرار دے کر طارق نے اپنا یہ عندیہ ظاہر کیا کہ فرانس کو فتح کرنا ہو اٹلی میں جا پہنچے اور پوپ کے محل میں توحید کا تقارہ بجا کر قسطنطنیہ پر فوج کشی کر دیں پھر دولت روم تک پہنچیں کو ہمیشہ کے لیے خاک و غون میں سلاتا ہوا دمشق پہنچ کر اپنی مظفر و منصور تلوار کو خلیفہ المسلمین کے قدموں پر جا رکھے۔

مگر کار پر وازان قضا و قدر کو یہ بات منظور نہ تھی۔ موسیٰ نے طارق کے ان روشن

کھانا من کو رشک و حسد کی نظر سے دیکھ کر اس سے طرح طرح کی ذلتیں دین طارق کے بھی دربار خلافت میں بہت سے ہوا خواہ موجد تھے۔ انہوں نے موسیٰ کی اس بے سلوکی کی کیفیت خلیفہ سے خوب ملک مریج لگا کر بیان کی نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق سے ایک سفیر روانہ ہو کر اسپین پہنچا۔ موسیٰ اپنے خیمہ میں تھا کہ یہ نے اگر شاہی فرمان سنایا اور اسے گرفتار کر کے دمشق لے گیا۔ موسیٰ جب دربار خلافت میں پہنچا تو خلیفہ نے اس پر بے حد عتاب کیا اور حکم دیا کہ سب کے سامنے اسے کوڑے لگائے جائیں۔ اس بے عزتی نے موسیٰ کا دلی تورا ویا اور وہ اس بندہ سے جان برند ہو سکا۔

طارق کا منصوبہ تو برصغیر کا رہا لیکن بعض درمیرے اسلامی سپہ سالاروں نے فرانس پر ضرور فوج کشی کی۔ پہلی ہی لڑائی میں فرانس کا وہ علاقہ جو دریائے گیرون اور دریا لائر کے درمیان واقع ہے مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اس کے بعد اسلامی سپہ سالار عبدالرحمن نے فوج کو دو جماعتوں میں تقسیم کر کے ایک جماعت کو ہمراہ لیا اور مشرق کی طرف بڑھ کر دریائے رڈن کو عبور کرنے کے بعد آئرس کا محاصرہ کیا۔ موسیٰ بھی فوج محصورین کی کمک کے لیے آئی تھی اسے سخت نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ اس کی فوج کے دوسرے محرٹ کو بھی جس نے مغرب کی طرف پیش قدمی کی تھی نمایان کامیابی حاصل ہوئی۔ اس حصہ فوج نے دریائے ڈارڈنوں سے گزر کر ایک اور سیحی فوج کو جو اس کا رستہ روکے پڑی تھی سخت شکست دی اور اس کا ایسا سخت نقصان ہوا کہ خود ان لوگوں کا بومیہ میدان جنگ سے جان بچا کر بھاگے یہ بیان ہے کہ ”مقتولوں کی تعداد کا خدا ہی کو علم ہے“ تمام وسط فرانس پر عرب ہی عرب چھا گئے اور دریائے لائر کے ساحل تک تمام علاقہ پر مسلط ہو گئے۔ گرجاؤں اور خانقاہوں کی برسوں کی جمع کی ہوئی دولت ان کی لوٹ میں آئی اور وہ مسیحی پیر اور دلی جو اپنی خورد حانی تصرفات کے کرشمے آئے دن بے وجہ و بلا ضرورت دکھایا کرتے تھے آج جبکہ ان کی کرامتوں کی ایسی سخت ضرورت تھی ایسی سٹی بھوسے کے لایک بھی

کراست یا معجزہ نہ دکھاسکے۔

آخر کار سلسلہ میں چارلس مارٹل نے حملہ آور دن کی پیش قدمی کو روک دیا۔ ٹورس اور پائٹ بیرس کے درمیان ایک عظیم الشان جنگ ہوئی جو سات دن تک رہی۔ اس میں کپٹن عبدالرحمن شہید ہوا اور عرب پسپا ہوئے۔ اس کے بعد انہیں بہت جلد کوہستان پٹنیر سے گذر کر اسپین واپس آنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اس لحاظ سے گویا دریائے لائیکا ساحل مغربی یورپ میں مسلمانوں کی پیش قدمی کی انتہائی حد ہے۔ لیکن ان ہتھم باشان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے حسب ذیل رائے ظاہر کرتا ہے: ”جبل الطارق سے لے کر تاجہ ساحل لائیکا یونان کے فوج و نصرت کا ایک مسلسل خط کینچ دیا تھا جس کی لمبائی ایک ہزار میل سے اوپر تھی۔ اگر اسی قدر فاصلہ وہاں سے لے کر تاجہ کی حد تک اور دوسری طرف اسکاٹ لینڈ کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچ جاتی“ اسلام کے ان جنگی کارناموں پر ان واقعات کا اضافہ کرنا غیر ضروری ہے کہ کیونکہ بحر روم میں اپنے فتنہ بیڑوں کو لے جا کر انہوں نے اول کریٹ کو فتح کیا پھر تسلی کو سفر کیا اور اس کے بعد روم کو ذیل در سوا کیا۔ البتہ اس امر کا تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی اطالیہ اور تسلی میں اون کے موجود ہونے کی وجہ سے یورپ کی عقلی و دماغی ترقی کو ایک بہت بڑی تحریک پہنچی۔

برسبیل تذکرہ ہمارے قلم سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ اسلام نے روم کو ذیل در سوا کیا۔ حقیقت میں اون واقعات سے زیادہ اور کیا امر اس کے لیے باعث ذلت و رسوائی ہو سکتا تھا جو سلسلہ میں پیش آئے۔ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جمیعت دریائے ٹائبر میں رہتی ہوئی روم کی دیواروں کے سامنے آکر انداز ہوتی ہے۔ اس قدر طاقت تو اس جماعت میں ہے نہیں کہ زبردستی شہر میں داخل ہو جائے لہذا وہ حوالی شہر ہی کو لوٹتی ہے۔ گرچہ اون اور خائفوں کی بے حرستی کرتی ہے اور سینٹ پیز اور سینٹ پال کے مزاروں کو ہانڈ

تسے زندگی ہے۔ خود اگر شہر کا شہر تاخت و تاراج ہو جاتا تو اوس کا اخلاقی اثر ایسا بُرا نہ ہوتا جیسا اس حالت میں ہوا۔ مسلمانوں نے سینٹ پیٹر کے گرجے سے اوس کی چاندی کی تیریا لگا لکھیا ڈالی اور اوسے بطور یادگار غلبہ اسلام افریقہ بھیج دیا۔ مسیحیت کے ہلکے میں اس سے زیادہ ناسور اور کیا پڑ سکتا تھا کہ سینٹ پیٹر کی دیوی قربان لگا ہو اس کی سب سے بڑی مذہبی علامت تھی یوں غارت ہو جائے۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ عرب پہنچے ہی کئی دفعہ کر چکے تھے۔ اس کی تسخیر ٹل نہ سکتی تھی۔ صرف معرض التوا میں بڑی ہوئی تھی۔ روم کی ایسی سخت توہین ہوئی تھی کہ اوس کے تصور کو سچیرن کے اندام ارادت پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ایشیا کو چمک کے قدیم کلیسا معدوم ہو چکے تھے۔ کوئی مسیحی مسلمانوں کی اجازت کے بغیر بیت القدس میں قدم تک نہ رکھ سکتا تھا۔ ہیکل سلیمان کی جگہ مسجد عمر کھڑی تھی۔ اسکندریہ کے کھنڈروں میں ”مسجد رحمت“ اوس عوب سپہ سالار کی یاد کو تازہ کرتی تھی جس نے قتل عام سے سیر ہو کر رسول عربیؐ کے پیچھے کچھے دشمنوں کو جنہیں ڈھونڈے سے بھی راہ فرار نہ ملتی تھی قحارت آمیز رحم کے ساتھ امان دی تھی۔ جہاں ایک زمانہ میں کار تھج کا پر رونق اور دلکش شہر آباد تھا وہاں اب بجز اوس گڑگاہ میں جھلے ہوئے کھنڈروں کے اور کچھ باقی نہ تھا۔ دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور مذہبی سلطنت و فتنہ پرورہ عدم سے نکل کر منعمہ شہود پر جلوہ گر ہوئی تھی۔ اس سلطنت کا ایک سرا بھرا قبائلس پر تھا تو وہ سدا دیوا چین پر ایک صد بحیرہ خزر کے کنارے سے ملتی تھی تو دوسری بحر ہند کے ساحل سے۔ اس پر بھی ایک لحاظ سے یہ سلطنت اپنے منہائے عروج پر نہ پہنچی تھی۔ اس لئے کہ ایک دن وہ آئے والا تھا جب وہ قیصر کے جانشینوں کو اداں کے دار الحکومت سے نکال کر اور جزیرہ نمائے یونان پر اپنا پھر براڈا کر ایک طرف تو یورپ کے قبضہ کے لئے اس براعظم کے بیچان بیچ عیسائیت پر حملہ کرنے والی تھی اور دوسری طرف افریقہ کے آتشخیز صحرائوں اور بالائیکیز جھگڑوں میں اپنے موصد انہ عقاید کی تلقین کرتی ہوئی ساحل بحر روم پر

خطا استوائ کے پرلے سرے تک نقارہ انا ولا غیر ی بجائے والی تھی۔

اسلام کو اگرچہ ابھی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرنی باقی تھیں لیکن سلطنت خلفاء نصیب انہما کمال پر پہنچ چکی تھی۔ یورپ کو اسلام کی حلقہ گبوشی سے جس چیز نے بچا یا وہ چارلس مارٹل کی تلوار نہ تھی بلکہ عربوں کی وسیع سلطنت کے اندرونی فسادات تھے۔ اگرچہ خلفائے بنو امیہ کی حکومت سے شام کے لوگ خوش تھے لیکن باقی ہر جگہ وہ غاصب اور جاہل سمجھے جاتے تھے اور عام خیال یہ تھا کہ اصلی سستی خلافت آل رسول ہے۔ تین جماعتوں نے جو اپنے اپنے علموں کے رنگ سے ممتاز ہوئیں خلافت کو اپنے فسادوں اور نزاعوں سے پارہ پارہ کر دیا اور ان کے دھشیانہ مظالم سے اس کی وہ بے وقری اور بے حرمتی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ بنی امیہ نے سفید رنگ اختیار کیا۔ بنی فاطمہ نے سبز اور بنی عباس نے سیاہ۔ آخر الذکر جماعت آن حضرت کی اولاد عم تھی۔ ان خانہ جنگیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ دسویں صدی میں سلطنت اسلام کے تین حصے ہو گئے اور تین علیحدہ علیحدہ خلافتیں بغداد قاہرہ اور قرطبہ میں قائم ہو گئیں۔ مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کا اب خاتمہ ہو گیا اور مسیحیت کی جان میں جان آئی۔ لیکن مسیحیت کی سلامتی کا باعث تائید آسمانی نہ تھی بلکہ مسلمان فرمانرواؤں کی رقابت اور باہمی نزاع۔ اندرونی فسادوں اور خانہ جنگیوں کو اغیار و اجانب کی دست اندازیوں نے اور زیادہ مہلک بنا دیا اور جب ترک اور بربر سر اقتدار ہوئے تو اس عربی تحریک کا جس نے دنیا کی عقلی و دماغی ترقی میں اتنا بڑا حصہ لیا تھا خاتمہ ہو گیا۔

اپنی خانہ جنگیوں میں عرب اس درجہ مہلک ہو رہے تھے کہ انہیں یورپ کی مخالفت کی جس برابر بھی پروانہ رہی تھی۔ آگلی اپنی تاریخ میں سچ کہتا ہے کہ ”عربوں میں ایک بھی سپہ سالار یا جرنیل یا کپتان ایسا نہ تھا جو یورپ بھر کی متفقہ فوجوں سے اگر اپنی توہین کر لیتا تو اسے اپنی بہت بڑی ذلت اور رسوائی نہ خیال کرتا۔ اور اگر کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ کیا وجہ تھی کہ یونانیوں نے ان شوخ چشم حملہ آوروں کے استیصال کے لیے جان نہ لڑائی



تو جو شخص ان لوگوں کی طبیعتوں سے واقف ہے اوس کے لئے یہ جواب کافی ہو گا کہ عمر بن العاص اس کے نزدیک یہ مین بر سر حکومت تھا اور معاً وہ دمشق میں۔

یورپ والوں کو مسلمان جس حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اوس کا انداز اس مثال ہی ہو سکتا ہے کہ جب ناسیفورس قیصر روم نے خلیفہ ہارون الرشید کو ایک خط لکھا جس میں خلیفہ کو دھمکی دی گئی تھی تو اوسے یہ جواب ملا:-

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ امیر المؤمنین ہارون الرشید کی طرف سے ناسیفورس رومی کتے کے نام۔ ادبے ایمان مان کے بیٹے میں نے تیرا خط پڑھا۔ تو اس خط کا جواب بھیگا نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھے گا۔“

تاریخ گواہ ہے کہ یہ جواب خون و آتش کے حروف میں فرحیہ کے میدان جنگ کے صفوں پر لکھا گیا۔

کسی قوم سے اگر ملک چھین لیا جائے تو وہ زندہ رہ سکتی ہے۔ اگر اوس کے خزانے لوٹ لئے جائیں تو وہ پھر بھی منپ سکتی ہے۔ بڑے سے بڑا تاروان جنگ ادا کرنے کے بعد بھی اوس کی حالت کا سدھ نہ نامکن ہے لیکن جنگ کے اوس نہایت ہی خوفناک عمل کے بعد یعنی اس کے بعد کہ اوس قوم کی عورتوں کو فاتح اپنے زینت میں لے آئے اوس قوم کی بقا محال ہے۔ جب ابوعبیدہ نے فتح انطاکیہ کی خبر دربار خلافت میں بھیجی تو حضرت عمرؓ نے جو اوس وقت خلیفہ تھے ابوعبیدہ کو اس بات پر ملامت کی کہ کیوں اوس نے فوج کو سپاہیوں کو عورتوں کی صحبت سے روکا۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں: اگر وہ شام میں شادی کرنا چاہیں تو کرتے دو اور لونڈیاں بھی مننی چاہیں رکھنے دو۔ حقیقت یہ ہے کہ کثرت ازدواج کی رسم جس پر ممالک متمدنہ کی عورتوں کو اپنے حوالہ تصرف میں لاتے وقت مسلمانوں نے عمل کیا اسلامی حکومت کے ثبات و قیام کی مدد ہوئی۔ ان شادیوں سے جو اولاد پیدا ہوئی اوس کے لیے فاتحوں کی نسل سے ہونا مایہ فخر و ناز ہو گیا۔ اس حکمت عملی کے موثر و کارگر

ہونے کا سب سے بڑا ثبوت شمالی افریقہ میں ملتا ہے جہاں کثرت از دواج کا قوی اثر ملک کی سیاسی و عمرانی حالت کے بدلنے میں نہایت حیرت انگیز ثابت ہوا۔ ایک بھی نسل نہ گذرنے پائی تھی کہ اس علاقہ کے حکام نے خلیفہ کو اطلاع دی کہ خراج اب سو قوت ہونا چاہیو اس لئے کہ یہاں جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں سب مسلمان ہیں اور سب کے سب عربی بولتے ہیں۔

اسلام کو جس صورت میں اس کا بانی چھوڑ گیا اس پر اگر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک تجسیمہ مذہب ہے۔ اس کا فائدہ محض ایک کوہ پیکر انسان تھا۔ اس کی ہمت جسمانی لذتوں کا ایک عیش آفرین محل تھی۔ لیکن ان ناقص خیالات کی قید سے اول مسلمانوں نے جو زیادہ فطین و فہیم تھے اپنے آپ کو آزاد کر لیا اور بجائے ان کے زیادہ فلفلیانہ اور زیادہ صحیح خیالات قائم کیے۔ آخر کار لا اوریت کے حکیمانہ عنصر کی آمیزش کی بدولت ان خیالات کو ان خیالات کے ساتھ مطابقت ہو گئی جنہیں آج کے دن باپائے مردما کی کونسل بھی صحیح سمجھتی ہے۔ چنانچہ امام غزالی کا قول ہے: ”خدا کا علم اوس علم کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا جو انسان کو اپنے یا پیروں کے متعلق حاصل ہے۔ خدا کی صفات کو انسان کی صفات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اوس کی تائید نہیں اور آئین حکمرانی کا نہ مقابلہ ہو سکتا ہے اور نہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔“



یہ صفت کو شاید یہ معلوم نہیں کہ امام غزالی کا یہ قول قرآن کے مشہور و معروف آیت لیس کشفہ شہی کی شرح جو علی رؤس الاشہاب اس الزام کی تردید کر رہی ہے کہ اسلام ایک تجسیمہ مذہب ہے۔ مترجم

# پوٹھا باب

## جنوب میں سائنس کا احیا

سطوریوں اور سیو دیوں کے اثر کی وجہ سے عرب الکتاب علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ تضاد و تدارک اور سرگزشت ازل کے متعلق ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی ہے اور کائنات کی ہیئت ترکیبی کا اون کو صحیح صحیح علم ہو جاتا ہے۔ وہ زمین کی جستا اور شکل کی تحقیق کرتے ہیں۔ اون کے خلفاء عظیم الشان کتب خانوں کی بنا ڈالتے ہیں علوم و فنون کے ہر شعبہ کی سرپرستی کرتے ہیں اور رمذ کا ہین قائم کرتے ہیں۔ وہ فن ریاضی کو ترقی دیتے ہیں الجبرا ایجاد کرتے ہیں اور فن ہندسہ و فن مثلث پر بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ فنون ریاضی و ہیئت کے متعلق تدیک و ثنائی تصانیف کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں اور انکا عربی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ ارسطو کے طریقہ استقرا سے تمام پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ بہت سے دارالعلم قائم کرتے ہیں اور سطوریوں کی مدد سے موجودہ وضع کے مدارس کھولتے ہیں۔ عربی سیاق و احوال اور فن حساب کو رواج دیتے ہیں اور ستاروں کی فہرستیں مرتب کر کے اون کے نام رکھتے ہیں۔ موجودہ فنون ہیئت و کیمیا و حیاتیات کی بنیاد رکھتے ہیں اور فلاحیت و صنعت و حرفت کو بہت کچھ ترقی دیتی ہیں۔

خلیفہ چہارم حضرت علی کا قول ہو کہ میں نے اپنی طویل طویل زندگی میں اکثر یہ بات دیکھی ہو کہ انسان مادات و مصالح میں اپنے ابا و اجداد سے اتنی مشابہت نہیں رکھتا جتنی اپنے مہم دیوں سے۔ ہوں ہوئی کے ابا و کایکمانہ مقبرہ نہ نہایت ہی درست ہے اس لیے کہ کو کسی شخص کے جسمانی تعلیم و

یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فلاں نسل سے ہے لیکن اوس کی ترکیب دماغی اور اس لحاظ سے اوس کی خیالات کا برحمان اوس حوالی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے جن میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ کے نائب عمرو بن العاص نے مصر کو فتح کر کے عربی سلطنت میں شامل کیا تو اسکندریہ میں اوس کی ملاقات یوحنا عرف فلپونس ایک یونانی نحوی سے ہوئی۔ فلپونس ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی محنت پسند کے ہیں۔ رفتہ رفتہ عمرو اور یوحنا میں دوستی ہو گئی اور اس دوستی کے بھروسے پر محنت پسند نے عمرو سے درخواست کی کہ کتاب خانہ اسکندریہ کی جو کتابیں حادث جنگ - مرد و بہرہ اور مذہبی تصنیف کی بہیم دستبرد سے بھی بچائی باقی چلی آتی ہوں وہ اس سے دے دی جائیں۔ عمرو نے اس بارہ میں خلیفہ سے استعصاب کیا۔ وہ ان سے یہ جواب کیا کہ اگر یہ کتابیں کلام الہی یعنی قرآن مجید سے مطابق ہیں تو ان کا رکھنا فضول ہے اور اگر نہیں مطابق ہیں تو ضرور رسان ہیں لہذا انہیں ضائع کر دو۔ اس فرمان کی بنا پر سب کتابیں اسکندریہ کے حاسون میں تقسیم کر دی گئیں اور میان کیا جاتا ہے کہ ان کے جلنے میں چھ مہینے کی مدت لگی۔ اگرچہ اس واقعہ سے انکار کیا گیا ہے لیکن اس میں مطلق شک نہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم ضرور دیا۔ وہ نوشت و خواند سے عاری تھے ان کے چاروں طرف تعصب اور جہالت کا بادل چھایا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اگر انہوں نے یہ حکم دیا تو کون تعجب کی بات ہو۔ عمرؓ کے اس فعل نے گویا عالمی اس کے قول کی تصدیق کر دی۔

لیکن یہ نہ قیاس کرنا چاہیے کہ وہ کتابیں جو یوحنا محنت پسند کو اس درجہ عزیز تھیں وہ کتابیں تھیں جو تاجداران سلسلہ بطلموسیہ کے مشہور کتب خانہ یا یومینیر شاہ پرتیس کے کتب خانہ کا سرمایہ اعتبار تھیں۔ فلپونس کو کتب خانہ قائم کیے ہوئے ایک ہزار سال کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اس کتب خانہ کی اوس کتابیں جو تیسرے سینر نے جلادی تھیں اور باقی اسکندریہ کے باؤیون نے اپنے اہتمام سے ضائع کرادی تھیں۔ اور دسویں صدی میں نے سات الفاظ میں جنگی کوئی دوسری تاویل نے اسپین کا ایک مورخ تھا جس نے پانچویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا ہے۔ ۶۴۷ء میں (بقیہ مضامین صفحہ ۱۴۸)

نہیں ہو سکتی بیان کیا ہے کہ سینٹ سائرل کا چچا تھیافیلس جب شہنشاہ تھیوڈوسیوس سے کتب خانہ کی بربادی کا فرمان حاصل کر کے تمام کتابوں کو ضائع کر چکا تو اس کے بیس سال بعد اس نے کتابوں کی الماریوں کو اپنی آنکھوں دیکھا کہ وہ سب کی سب خالی تھیں اور اون میں ایک کتاب باقی نہ تھی۔ اور اگر فیض محال یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ایسی دشمنانہ بربادی کے بعد بھی عظیم الشان کتب خانہ بچ رہا تو ہزار سال کی فرسودگی اور شاید تصرف بجا کے اثر کا مقابلہ کرنے کے بعد اس کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی ہوگی۔ اس کے علاوہ یوحنا کو اس کے عرف کی مناسبت سے سندھی اور شغولیت کا خواہ کیسا ہی بڑا تذکرہ نہ عطا کیا جائے لیکن یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک اکیلے یوحنا کی محنت پسندی کیونکر پانچ لاکھ کتابوں کی نگہداشت اور اہتمام سے عہدہ برا ہو سکتی تھی۔ اور کس طرح ایک ادنیٰ درجہ کا غریب نحوی اس مہتمم باستان کتب خانہ کو قائم رکھنے اور چلانے کے مصارف کا متکفل ہو سکتا تھا جس پر بطریقہ میں کو شاہانہ محال کا ایک بیش قرار حصہ صرف ہو کر رہا تھا۔ کتب خانہ کو جلنے کی جو مدت بتائی گئی ہے اس سے بھی کتابوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جہلی کو کاغذ سے زیادہ بڑی ایندھن کا ہونا ممکن نہیں۔ کاغذ اور پٹیل اگرچہ اچھی طرح جل سکتا ہے

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ) اس لئے گشتائے کی ملاقات کی غرض سے افریقہ کا سفر اختیار کیا۔ اس کی مشہور کتاب ”تاریخ عالم“ اسی ملاقات کا نتیجہ ہے۔ اگشتائے نے اس کتاب کی تصنیف کی فرمائش کرتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ اس میں اس بات کو ثابت کرنا چاہیے کہ دولت، دباہرت پرستی کے زمانہ میں بھی ویسی ہی مصیبتیں نازل ہوئیں جیسی سحیت کے زمانہ میں ہو رہی ہیں۔ تاریخ سے اور دسٹیکس بیت المقدس گیا اور وہاں چند دن تک پتھریس کی مخالفت میں اس کے حریفوں کا ہم سفر رہا۔ وہ کوٹن کو ٹما۔ رستہ میں اسکندریہ پڑتا تھا۔ چند روز یہاں کی بھی سیر کی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب سینٹ سائرل کا ساتھ صوبہ اور دشمن علم پادری جس نے آجی پیشیا کے دشتیانہ قتل و غارت کے گلے پڑائی پھری پھیری تھی اسکندریہ کا بطریق تھا۔ اول تو سائرل کا چچا تھیافیلس ہی کتب خانہ اسکندریہ کی تمام بچی کچی کتابوں کو برباد کر چکا تھا اور فیض محال اگرچہ بچ رہی ہوں فردوسہ کہ آجی پیشیا کے وحشی قاتل نے انہیں ضائع کر ڈالا ہو۔ (بقیہ مضمون صفحہ آئندہ)

لیکن ان کتابوں میں سے زیادہ تر ایسی تھیں جو جھلی پر لکھی ہوئی تھیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکندریہ کے حامیوں نے دو سرا ایندھن چھوڑ کر چرمی اور اراق جلانے پسند کیے ہوں جن کی آغج جیسی تہذیب ہو سکتی ہو وہ تو ظاہر ہے البتہ چراند کے ہر طرف پھیل جانے میں کچھ شک نہ تھا۔

پس اس میں شک نہیں کہ حضرت عمرؓ نے یا تو یہ سمجھ کر کہ کتابیں کسی مصرف کی نہیں اور یا اس خیال سے کہ اون کے پڑھنے سے لوگ بد اعتقاد ہو جائیں گے اس کتاب خانہ کے جلانے کا حکم ضرور دیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حروب صلیبیہ کے دوران میں بھی پیش آیا جبکہ عیسائی

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) اور اس لیے اور دسویں کی اس تاریخی شہادت کی سچائی میں کلام نہیں ہو سکتا کہ جب اس نے کتاب خانہ کو جاکر دیکھا تو اس میں ایک کتاب بھی موجود نہ تھی۔ گویا حضرت عمرؓ کی خلافت سے دو سو بیس سال قبل کتاب خانہ اسکندریہ عیسائی پادریوں کی جہالت اور تعصب کے ہاتھوں تمام وکمال برباد ہو چکا تھا۔

اس کتاب خانہ اسکندریہ کا بعد حضرت عمرؓ حکم حضرت اقدس جلایا جانا ایک ایسا الزام ہے جس کی اصل حقیقت کا انکشاف علامہ شبلی کا سحر آفرین قلم کر چکا ہے۔ ہمارے ناظرین میں سے جن صاحب کو اس بحث کی تفصیل مطلوب ہو وہ علامہ مدوح کی تصنیف ”رسل شبلی“ کا باعنوان مطالعہ کریں۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ باوجود اون تمام براہین و دلائل کو جو اس الزام کے جواب میں پیش کی جاسکتی تھیں ڈر پیر نے یہاں خود پیش کر دیا ہے پھر بھی اسے اصرار ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کتاب خانہ کے جلادے جانے کا حکم ضرور نافذ فرمایا۔ ڈر پیر کو اس امر کا اعتراف ہے کہ فتح اسکندریہ کے وقت ”سرمیان“ یعنی نلیڈ لفس کے کتاب خانہ کی کوئی کتاب موجود نہ تھی اس لیے کہ تمام کتابیں کچھ تو جو تیس سیرز کے عہد میں جل چکی تھیں اور جو باقی بچی تھیں وہ حکم شہنشاہ تھیودوسیوس بطریق تھیمافیلوس کی نگرانی میں منتشر کی جا چکی تھیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اور دسویں جو ایک مسیحی مورخ ہے اپنے چند یہ حالات کی بنا پر اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ شہنشاہ تھیودوسیوس کے حکم کی تعمیل کے بیس سال بعد جب اس نے کتاب خانہ کو جاکر دیکھا تو ایک کتاب موجود نہ پائی۔ اس کے علاوہ مصنف اون اندرونی و ذیلی شہاداتوں کا بھی مقرر ہے جو اس اصولی ثبوت کی موید ہیں مگر باریں ہر اس اصرار و ہستید اسے کام لے کر جو مستقریت سے کوسوں دور ہے اور جس میں کسی سوفسطائی کی کٹھ جھٹی کی شان نظر آ رہی ہے (بقیہ مضمون صفحہ آئندہ)

عجاہ دن نے کتب خانہ طرابلس کو جس کے نسخوں کی تعداد ازراہ مبالغہ تیس لاکھ بیان کی گئی ہو  
آگ لگا دی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب عیسائی کتب خانہ طرابلس کے پہلے کمرہ میں داخل  
ہوئے آراہین بجز قرآن کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ اس سے انہوں نے یہ قیاس کر کے کہ باقی کتب  
بھی آج حضرت نبی کی تصانیف ہوں گی تمام کتب خانہ کو آگ میں جھونک دیا۔ ان دونوں تصویف میں

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) یہ کہے جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم سے کتب خانہ جلادیا گیا۔ اور اس کی وجہ یہ بیان  
کرتا ہے کہ چونکہ وہ نوشت و خواند سے عاری تھے اور ان کے پاروں طرف تعصب اور جہالت کا بادل چھایا ہوا  
تھا لہذا اگر انہوں نے یہ حکم دیا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر طریپر نے اس مقام پر  
ایسے جملے لکھا کہ ثابت دیا اور جس کی ایسے عالم، فاضل شخص سے ہم کو ہرگز توقع نہ ہو سکتی تھی۔ حضرت عمرؓ کو  
نوشت و خواند سے عاری اور تعصب و جاہل سمجھنا تاریخ کی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہے۔ جو شخص عربی میں  
یہ طعن رکھنے کے علاوہ عبرانی زبان میں بھی دست گاہ والی لکھنا ہر جس نے فقہی علم اصول قانون جیسے دانش  
آزمائی کی بنیاد قائم کی ہو۔ جس کی محنت و عظمت یہ رسو سال سے احمدیوں کے دلوں میں جاگزیں ہو۔  
جو رشو و سحر سے ایک خاص مذاق رکھتا ہو اور اشعار و لطیف کے سب سے بڑے نقاد ہونے کی حیثیت سے  
قانون لطیف کے اس شعبہ خاص کا بہت بڑا سرپرست مانا گیا ہو۔ جس کو علم المائت اب موروثی طور پر ترکہ میں ملا ہو۔  
جس نے انیسیم کو جن معنوں میں کہ یہ لفظ اسلام کے قرون اولیٰ میں مستعمل تھا عام ملکہ ایک حد تک جبری کر دیا ہو  
جس نے سب سے اول قرآن کے جمع و مدون کئے جانے کی تحریک کی ہو۔ جس کو قرآن مجید (بازد فی صلوات)  
اور حدیث سے ”اطلبوا العلم ولو کان بالاعصین“ کا سبق ملا ہو۔ جو مدینۃ العلم کے خرم فیوض کا خوش چین  
اور باب العلم کا ہم شرم و ہم نشین ہو۔ جس کی مسالت۔ رواداری۔ الفاضل۔ سیاست و حکمت شہرہ آفاق ہوا ہو  
وہاں یہ تعصب کہنا ڈاکٹر طریپر کی کلام ہے۔

مصطفیٰ نے حضرت علیؓ کے اس قول کو کہ انسان عادات و خصایل میں اپنے آباؤ اجداد سے اتنی  
مناہت نہیں رکھتا جتنی اپنے ہمدموں سے ”حضرت عمرؓ کے جہل و تعصب کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ لیکن  
ہم یہ نہیں جانتے ہیں کہ جہالت و تعصب نے حوالی میں زندگی بسر کرنے کے باعث اگر (بقیہ مضمون بر صفحہ آئینہ)

کسی قدر راصلیت اور بہت کچھ مبالغہ ہے۔ لیکن مجنونانہ تعصب نے ہمیشہ اس قسم کی حرکتوں سے اپنا نام کیا ہے۔ ہسپانیہ کے عیسائیوں نے جب نیکو پر حملہ کیا تو ڈھیر کے ڈھیر اداں کتابوں کے

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) حضرت عمرؓ بھی اپنے معاصرین کی طرح جاہل و متعصب تھے تو پھر انہیں عالیٰ میں سے حضرت علیؓ کا ساجیم اور فلسفی کس طرح پیدا ہو گیا جس کی حکمت کا خود ڈیرہ پر کبھی اعتراف نہ کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ بہات الامور میں حضرت عمرؓ کو صلاح و مشورہ دیا کرتے تھے اور کوئی اہم مسئلہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں حضرت علیؓ کی رائے نہ لی جاتی ہو۔ پس اگر حضرت عمرؓ نے اس کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا حکم دیا جس کا وجود بائبل قاطع و براہین ساطع متعصب پادریوں اور اداں کے خون تا شناس ہم صغیروں کے دماغ ہی میں ممکن ہونا ثابت ہے تو اس الزام میں حضرت علیؓ بھی حضرت عمرؓ کے برابر کے سماجی ہیں۔ لیکن شاید ڈیرہ پر کو حضرت علیؓ پر بھی جاہل و متعصب ہونے کا الزام لگاتے ہوئے تامل ہو گا۔ مترجم

۱۔ کتب خانہ اسکندریہ والے قصہ میں تو ہم نے ثابت کر دیا کہ مبالغہ مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ پادریوں کی طرف سے ہے لیکن مسیحی مورخ اس واقعہ کی تکذیب و تردید نہ کر سکیں گے کہ حزب منیبہ کے جاہل و وحشی سوراؤں نے کتب خانہ طرابلس کو اس وقت جلا دیا جبکہ اس میں لاکھوں کتابیں جمع تھیں۔ کتب خانہ اسکندریہ کا تو حضرت عمرؓ کے عہد میں سرے سے وجود ہی نہ تھا مگر جب عیسائی سوراٹا طرابلس پر حملہ آور ہوئے ہیں تو کتب خانہ طرابلس اپنی پوری علمی شان کے ساتھ موجود تھا۔ یہ واقعہ مسلم و متحقق ہے کہ پندرہویں صدی تک مسیحیت مجنونانہ جہالت اور مجبوظانہ تعصب کی مترادف تھی جس کا خیازہ علوم و فنون کو رہ کر کھینچنا پڑا اختلاف اس کے مسلمان علم و حکمت کے علم بردار اور غلط فہم تمدن کی نشیں تھے۔ ایسی حالت میں اگر وحشی و خونخوار مسیحین پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے کئی لاکھ کتابیں جو مسلمانوں نے جمع کی تھیں جلا دیں تو اداں کے حامیوں کا یہ فرمانا کہ کئی لاکھ نہیں بلکہ صرف چند ہزار کتابیں جلائیں واقعہ آتش زنی کی سنگینی اور مسیحیوں کے تعصب و وحشیانہ پن کے اشتداد کو کم نہیں کر سکتا۔ مانا کہ کتب خانہ طرابلس میں کئی لاکھ نسخے نہ تھے بلکہ کئی ہزار تھے لیکن اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے کہ حزب منیبہ کے مسیحی سوراؤں نے ان سب کو آگ میں جھونک دیا۔ بجائے کئی ہزار کے اگر کئی لاکھ نسخے ہوتے تو کیا اداں کی بے محابا آتش زنی سے بچ جاتے پترجم



جن میں امریکہ کے قدیم تمدن کی داستان بظاہر محفوظ تھی کمال وحشیانہ پن سے جلا دئے اور یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی زمانہ نہیں کر سکتا۔ ہسپانیہ کے ایک متعصب پادری ہنریک ویل زمین نے غناطہ کو چوک میں عربی زبان کے انہی ہزار قلمی نسخوں کا ڈھیر لگا کر آگ لگا دی۔ ان میں سے بہت سے نسخے شاہزادہ صنفین زمانہ قدیم کی تصانیف کے عربی تراجم تھے۔

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ اسکندر کی ایرانی فتوحات نے فن انجیری کے متعلق یونانیوں کی قابلیت کو ترقی دے کر فرما دیا ان سلسلہ بطلیموسیہ کی سرپرستی میں سائنس کے نشوونما میں حیرت انگیز حصہ لیا۔ یہاں ہم تاریخ کے سبق کو دہرا کر یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ عربوں کے فوجی کارناموں سے بھی اسی طرح کے نتائج مترتب ہوئے۔

فاتح مصر عمر بن العاص اور یوحنا غوی کی باہمی دوستی صاف ظاہر کرتی ہے کہ عربی دماغ ترقی کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ کعبہ کی بت پرستی سے محمد صلعم کی وحدانیت تک پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو ادب و دانش اور فلسفہ و حکمت کے بہارستان کی سیر کے لیے تیار پایا۔ عربوں کی اس ترقی کے اسباب پر جب ہم غور و فکر کرتے ہیں تو ہم کو دو اثرات نمایاں نظر آتے ہیں یعنی (۱) شام میں نسطوریوں کا اثر اور (۲) مصر میں یہودیوں کا اثر۔

گذشتہ باب میں ہم نے ادنیٰ غتیوں کا ذکر کیا ہے جو نسطور اور اوس کے پیروں کو نجات دہن کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑیں۔ اگرچہ ادنیٰ کو طرح طرح کے عذاب دئے گئے اور ادنیٰ میں تو بہت سے مارے گئے لیکن وحدت باری تعالیٰ کے اصول سے ادنیوں نے کبھی منہ نہ موڑا۔ اولپس کے دیوتاؤں اور دیویوں سے ادنیوں نے ہمیشہ نہایت سختی کے ساتھ اور قطعی طور پر ابا کیا۔ ادنیٰ کا قول ہے کہ ”آسمان کی ملکہ کو ہمارا دور ہی سے سلام ہے۔“

ان خاص عقاید کی وجہ سے نسطوریوں کو اپنے عرب فاتحوں کے ساتھ مل جانے میں کچھ بھی وقت نہیں نہائی۔ مسلمان ادنیٰ کا حد سے زیادہ ادب و احترام کرتے تھے اور سلطنت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر ادنیوں نے نہایت فراخ دلی سے مقرر کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنی امت کو

پر تشدید تمام ہدایت کی ہے کہ ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہ کیا جائے۔ نسطوریوں کے اعتقادات عظیم  
 مسیحیوں کے ساتھ خود ان حضرات اور ان کے بعد حضرت عمرؓ نے معاہدے کئے اور آگے  
 چل کر خلیفہ ہارون الرشید نے اپنی سلطنت کے تمام مدارس کا ناظم ایک نسطوری المذہب عالم  
 بنان ماس کو مقرر کیا۔

نسطوریوں کے اثر کے ساتھ یہودیوں کا اثر بھی شامل ہو گیا۔ جب عیسائیت میں بہت  
 پرستی کی آئینہ نش کے آثار شروع ہوئے تو یہودیوں نے مذہب عیسوی میں داخل ہونا ترک کر دیا  
 اور جب عیسائیت میں اتنا غلبہ نہ تھا تو یہ مذہبی تبدیلی مطلقاً موتوں ہو گئی۔ مصر اور شام کے  
 شہروں میں یہودی کثرت سے آباد تھے۔ ایک فقط اسکندریہ ہی میں جب عمرو بن العاصؓ نے اسے  
 فتح کیا ہے چالیس ہزار یہودی ایسے تھے جو حکومت کو خراج ادا کرتے تھے۔ صدیوں تک وقف  
 مظالم و مصائب رہنے کی وجہ سے وہ اپنے عقیدہ وحدت ذات باری میں اور زیادہ راسخ  
 ہو گئے تھے اور بہت پرستی کی طرف سے اوس قلبی نفرت کا اشتداد اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا  
 جسے وہ اپنے سینہ میں باہل کی امیری کے زمانہ سے امانت کے طور پر جگہ دے چلے آتے تھے۔  
 نسطوریوں کے ساتھ شریک ہو کر انہوں نے فلسفہ کی بہت سی یو لانی و لاطینی کتابوں کا شامی  
 زبان میں ترجمہ کیا اور اس شامی ترجمہ کا پھر عربی میں ترجمہ ہوا۔ ان دونوں فرقوں کو اسلامی تمدن  
 کے ساتھ دو مختلف جنتیوں کا تعلق رہا۔ نسطوریوں نے مسلمان امرا کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا  
 ذمہ لیا اور یہودی طبیب بن کر ان گھرانوں تک پہنچے۔

ان اثرات سے مسلمانوں کا تعصب کم ہو چلا۔ ان کے اخلاق پسندیدہ ہو گئے اور ان کو  
 خیالات میں ششگی آگئی۔ جس سرعت سے انہوں نے دولت و مالا کے صوبوں کو تاخت و تاراج  
 کر ڈالا تھا اسی سرعت سے فلسفہ اور سائنس کی ملکیتوں کو سخر کر لیا۔ اور اسلام کی عاسیانہ غلطیوں کو  
 چھوڑ کر سائنس کا حقیقتوں کو تسلیم کر لیا۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں ہارون طرفت ہی بت بچ رہے تھے عربوں کی تلواریں خدائیں

ذوالجلال کے توحید کی حمایت میں چلی اور تعدد کو مٹا کر رسمی۔ اس کامیابی کا سہرا تقدیر کے اوس مسئلہ کے سربراہ جس کی تلقین قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے :- ”کوئی شخص اپنے مقدر کو ٹال نہیں سکتا۔ تقدیر کی ساعت نہ گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے۔ اگر ہم ہر درج مشیت میں بھی محفوظ ہوں تو موت سے نہیں بچ سکتے۔ خدا نے ہر شخص کی موت کا مقام ازل سے مقرر کر رکھا ہے۔“ رسول اللہ کا قول ہے کہ ”کوئی شخص جھاگ کر اپنی تقدیر سے بچ نہیں سکتا۔ شمشیر اراں تھا۔ قدر رات کے وقت اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلے ہیں..... خواہ نیم بستر پر سوتے ہو خواہ میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہو ملک الموت کی آنکھ سے نہیں بچ سکتے“ حضرت علیؓ جبکہ دانش و حکمت کا ذکر ہم پیش کر چکے ہیں کہتے ہیں کہ ”مجھے یقین ہے کہ معاملات انسانی میں ہمارے انتظام کو دخل نہیں ملکہ خدا کے فضلہ کو دخل ہے“ غرض مسلمان وہ ہیں جو راضی برضاے الہی ہو کر خدا کے آگے گردن تسلیم جھکا دیں۔ وہ جبر و اختیار میں یہ کہہ کر توافق پیدا کرتے ہیں کہ نقاش قضا نے ہمیں خاک کھینچ کر دے دیا ہے اوس میں رنگ آمیزی ہم اپنے اختیار اور مرضی سے کرتے ہیں۔ اون کا قول ہے کہ تو انین قدرت پر غالب آنے کے لیے ہمیں اون کا مقابلہ نہیں بلکہ موازنہ کرنا چاہیے۔

اس مسبب عقیدے نے مسلمانوں کو اون کا رہاے نمایان کے لیے تیار کر دیا جو بظاہر ان کی کوشش کی رسائی سے باہر تھو لیکن جن کو عربوں نے انجام دے کر دکھا دیا۔ اسی عقیدے نے بابوسی کو مبدل برضا و تسلیم کر کے انسان کو امید سے مستغنی ہونا سکھا دیا۔ عربوں میں ایک مثل تھی کہ مالوسی حرسے اور امید عبد۔

لے اسلام کی تعریف مولوی سید امیر علی صاحب اپنی کتاب ”اسپرٹ آف اسلام“ میں باین الفاظ کرتے ہیں :-  
 ”اسلام مادہ سلم سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی طینان قلب۔ سکون نفس۔ مجاہدہ فی فرض۔ ادا کر دین۔ کامل آشتی و امن اور بالآخر اپنے آپ کو اوس ذات پاک کے تین سوئپ دینے کے ہیں جس کے ساتھ نشہ آشتی و امن قائم کیا جائے۔ جو اسم مادہ سے مشتق ہے اوس کے معنی امن (بقیہ مضون بر صفحہ آئندہ)

لیکن جنگ میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے صاف طور سے ثابت کر دیا کہ تقدیر ایک بڑی حد تک تابع تدبیر ہے۔ تجربہ سے عربوں کو معلوم ہو گیا کہ دواسے درد کم ہو سکتا ہے مہم پی کرنے سے زخم بھر سکتا ہے اور جو شخص دم توڑ رہا ہو اور بظاہر اس کے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو طبیب کی سیجائی سے گویا از سر نو زندہ ہو سکتا ہے۔ اطباء یہود و قرآن کو مسئلہ تقدیر کی تردید کی زندگی مثال بن گئے۔ رفتہ رفتہ قسمت اور تقدیر کے مسئلہ کی سختی

واقعی مضمون معنی گذشتہ تلمط سلامتی اور نجات کے ہیں۔ عام طور پر اس لفظ سے مطلقاً راضی نہ رہنا ہے۔ آہی ہونا مراد لیا جاتا ہے مگر یہ مفہوم درست نہیں ہے۔ نجات اس کے اسلام کے معنی ہیں نیک بننے کی کوشش کرنا۔ مترجم

۱۔ کلام حمید میں اگرچہ بکثرت ایسی آیات موجود ہیں جن سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعمال میں جو مرض ہے چنانچہ (۱) لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ (۲) هو القاهر فوق عباده (۳) وما تشاءون الا ان یشاء اللہ (۴) قل کل من عند اللہ کا مطلب بادی النظر میں یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے انسان کو کچھ اختیار نہیں دیا گیا لیکن یہ مطلب ان آیات کو دہی لوگ نکالنے ہیں جو ظاہر میں ہیں اور سطح کے نیچے جانے کی رحمت اپنے دماغ کو نہیں دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کائنات مجموعہ اضداد ہے یعنی ہر نیکی کے لیے ایک بدی کا ہونا لازم ہے ہر بندی ایک پسپائی کو چاہتی ہے ہر نور ایک ظلمت کا محتاج ہے غرض دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا تصور اس کی ضد کے بغیر ممکن ہو اسی طرح مسئلہ جبر بھی اپنی ضد یعنی مسئلہ اختیار کا مستلزم ہے۔ یہ فلسفیانہ بحث قرآن کی ان بظاہر متعارض مگر بہ باطن متوافق آیات میں مضمر ہے جن میں سے کسی میں اگر یہ کہا گیا ہو کہ تم کسی بات کو نہ چاہو گے جب تک کہ خدا نہ چاہے تو کسی میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ جبر و اختیار کی یہ آمیزش اس اٹل اور ازلی قانون کے مقتضیات میں سے ہے جس کی تشریف ان الفاظ میں کی گئی ہے (۱) لا تبدیل لخلق اللہ (۲) خلق کل شیء تقدیراً (۳) فلن تجد لسنة اللہ تبدیلاً (بقیہ مضمون بر صفحہ ۱۵۶)

کم مگوئی اور عام طور پر یہ بات تسلیم کی جانے لگی کہ انفرادی حیثیت سے انسان کے افعال کو نتائج معلل بہ اختیار ہوتے ہیں اور خاص خاص حدود کے اندر جو افعال اوس سے سرزد ہوتی ہیں اودن کی ذمہ دار خود اسی کا ارادہ یا مرضی ہوتی ہے۔ لیکن اقوام چونکہ ذاتی یا شخصی طور پر خدا کو آگے اپنے افعال کی جواب دہ نہیں ٹھہر سکتیں بلکہ اودن کی اجتماعی حیثیت خدا کے بلا واسطہ احتساب سے بلاشبہ لہذا وہ قدرت کے غیر تغیر پذیر قانون کے تابع ہیں۔

اس بارہ خاص میں مسیحی اور مسلم اقوام میں بین فرق تھا۔ مسیحی کہ معاملات انسانی خدا کی مسلسل دست اندازی پر پورا ایمان تھا۔ اوس کا عقیدہ یہ تھا کہ انتظام کائنات میں قاعدہ قانون کوئی چیز نہیں۔ دعاؤں اور التجاؤں سے انسان خدا کو صورت معاملات کے بدلنے پر

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) اس سے زیادہ حکیمانہ توجیہ کائنات کے کسی ارادی یا غیر ارادی حادثہ کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اسباب و علل کے ایک محکم و متقن سلسلہ کے ذریعہ سے اوس مدبر اعظم کی ذات پر جانمندی ہوتا ہے جو علت العلل اور مظاہر عالم کا سبب اولین ہے۔ لیکن مقدرات کے اس جبر یہ عنصر میں علتہ افعالی نے جس کی حکمت آفرین شان پر ”الذی خلق فسوخی“ کو گواہ ہے ارادہ ان فی کا اختیاری عنصر بھی ایک خاص حد تک شامل کر دیا ہے جس کا اندازہ ”والذی قدر فہدی“ سے کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کی رو سے انسان نہ مجبور مطلق ہے نہ مختار مطلق۔ وہ اودن حدود کے اندر جو فطرت ان فی کے ارتقا کو عقل و روحانی و اخلاقی کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں اپنے افعال کا مختار ہے لیکن ان حدود سے آگے بڑھنے پر قادر نہیں۔ انتظام کی نسبت یہ سمجھنا کہ اوس نے اپنے پیروں کو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کی تلقین کی ہے اور نہ کھنکایا ہے کہ اگر مرغیوں کو مرنا ہے تو طیب سے رجوع کرنا فضول ہے اس لیے سرے سے علاج ہی نہ کرنا چاہیے اس کی تعلیم کا ایک جاہلانہ اور متعصبانہ اندازہ کرنا ہے۔ جس کی نفی نہ صرف قرآن کی آیات بلکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قرون اولی کے اودن مسلمانوں کی زندگیاں کر رہی ہیں جن سے زیادہ شریعت کا راز دان اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ جبر و اختیار کے معنی کو معارف دستگاہ مولانا روم فی ان سادہ الفاظ میں حل کر دیا ہے۔

(بقیہ مضمون ہر صفحہ آئندہ)

آباد کر سکتا ہے اور اگر خدا کی بارگاہ میں اوس کی دعا مقبول نہ ہو تو پھر سرج یا مریم کی توجہیں کی  
مطلب برآری کے لیے کافی ہے اور اگر یہاں سے بھی وہ محروم رہا تو پھر بزرگان دین کی شفقت  
یا اون کے نہرات اور پڑیوں کا اثر مشیت ایزدی کا رد عمل کر سکتا ہے۔ اگر خود اوس کی  
سنت و ساجت یا عجز و الحاح سے کام نہ چلے تو حلقہ کے پادری یا کلیسا کے دوسرے مقدس  
پیشواؤں کی سفارش خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اوس کی طرف سے کوئی چڑھاؤ اچڑھایا گیا ہو یا  
بند مبنی رقم بطور نذرانہ پیش کی گئی ہو اوس کی حاجت روائی کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ غرض سچی  
دنیا کو یقین تھا کہ فوق الانسان ہستیوں پر اثر ڈال کر وہ معاملات دنیوی کے دہارے کو جس  
رخ میں چاہے بدل سکتی ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کا دار و مدار اس اصول پر تھا کہ خدا کی مشیت  
قابل تغیر نہیں ہے انسان کو لازم ہے کہ اس کے آگے تسلیم و رضا کا سر جھکا دے۔ عیسائی کی  
دعا اگر طلب منفعت ہوتی تھی جس کے ذریعہ سے وہ بصد عجز و الحاح خدا سے اپنی مراد میں مانگتا تھا  
اور مسلمان کی دعا اون نعمتوں کا استننا آمیز شکر یہ ہوتی تھی جن سے وہ فائز و بہرہ اندوز  
ہو چکا تھا۔ دونوں نے گویا دعا کو ہندوؤں کے گیان اور دھیان کا قائم مقام قرار دی رکھا تھا۔  
عیسائی کی نظردن میں ترقی دنیا غیر مبوط حادثوں اور ناگہانی حیرتوں کا ایک سلسلہ تھی مسلمان  
کے نزدیک اس ترقی میں کچھ اور ہی عالم نظر آتا تھا۔ وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ ہر جسمانی حرکت  
کسی حرکت سابقہ سے وابستہ ہے۔ ہر خیال کسی خیال مابین کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ہر تاریخی واقعہ  
کسی گزشتہ تاریخی واقعہ سے ماخوذ ہے۔ ہر انسانی فعل کسی گزرے ہوئے اور انجام پائے  
ہوئے فعل کا نتیجہ ہے۔ بنی نوع الانسان کی تاریخ میں جو قرنہا قرن پر محیط ہے آج تک ایک بھی

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ)

گفت پیغمبر بہ آواز بلند بر توکل زانوںے اشتہر بہ بند

ہم کو اپنی طرف سے مقدمہ و رجحان کو شش کرنی چاہیے۔ اور نتیجہ کے لیے اوس لطیفہ غیبی کا منتظر رہنا چاہیے  
جو مسئلہ بحکمت و پابند قانون غیر ممکن التغیر ہے۔ مترجم

واقعہ ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جو ایک ایک طور پر من آگیا ہو۔ حالت و معلول اور سبب و مسبب کو سلسلہ کی مرکز میں دوسری کڑی سے اس ترتیب و تدریج کے ساتھ ملی ہوئی ہے کہ کہیں فصل نظر نہیں آتا۔ مقدر ایک آہنی زنجیر سے جس کے ملتے و ملتے واقعات ہیں۔ ہر حلقہ اسی جگہ نصب ہے جہاں خدا و قضا و قدر نے اسے قائم کر دیا تھا۔ ایک حلقہ بھی اپنی جگہ سے آج تک نہ ہٹا ہے اور نہ طبعاً کیا گیا ہے۔ جب انسان عالم میں آتا ہے تو اسے اس کا کچھ علم نہیں ہوتا جب وہ جہان سے رخصت ہوگا تو شاید ایسی مرضی کے خلاف رخصت ہوگا۔ پس کیا وجہ ہے کہ دو عالم بہتیم و رضا میں کر نہایت ٹھنڈے دل سے اپنی قسمت کے فیصلہ کا انتظار نہ کرے۔

انسان کی شخصی زندگی کے تابع مقدر ہونے کے متعلق جب خیالات میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی تو دنیا کی بہت ترکیبی کے بارہ میں بھی خیالات نے پلٹا کھایا۔ قرآن کی روشنی میں ایک سلع مریں ہے جس کے کناروں پر بڑے بڑے پہاڑ واقع ہیں اور ان پہاڑوں کا یہ دہرا فائدہ ہے کہ ایک تو ان کی وجہ سے زمین اپنی جگہ قائم رستی ہے اور دوسرے آسمان ان پر لگا ہوا ہے۔ اس وسیع بلورین گنبد کو جو بیکسی فطر یا صدمہ کے اپنی جگہ قائم کر دیکھ کر ہمیں خدا کی طاقت و حکمت کے لحاظ سے اس کی حمد و ثنا کرنی چاہیے۔ آسمان کے اوپر بہشت کی بنیاد ہے جس کی سات منزلیں ہیں۔ سب سے اونچی منزل خدا کا سکن ہے جہاں وہ دیو پیکر انسان کی شکل میں ایک تخت پر بیٹھا ہے اور اس تخت کے دونوں طرف اسی طرح کوزہ و الجناح بیل ہیں جیسے قدیم سد یا نی باوشا ہون کے محل میں ہوتے تھے۔

لے خدا کی شان وہ لوگ جو عربی کا ایک حرف تک نہیں جانتے جیسی کل معلومات قرآنی کا مائدہ ذیل لفظی ترجمہ ہیں جو جس جیسے تعصب اور نا اہل یا درہوں نے کیے ہیں اس بات کے مدعی ہوں کہ وہ قرآن کو حقیقی معانی کے سمجھنے کی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔

مصنف کا تو انتقال ہو چکا ہے اس لیے ہمارے دے سخن اون کی طرف نہیں ہو سکتا البتہ جو لوگ ان کے ہم خیال ہیں ان کی خدمت میں ہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

یہ خیالات کچھ اسلام ہی سے مخصوص نہیں ہیں۔ ہر قوم نے اپنے دماغی نشوونما کے ایک خاص درجہ پر پہنچ کر انہیں وحی آسمانی سمجھا ہے۔ لیکن جو مسلمان زیادہ ترقی یافتہ تھے انہوں نے (بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ) تحریف شدہ انجیل کی طرح قرآن نے اس قسم کا لود و وحی کہیں نہیں کیا کہ زمین ایک سطح پر ہے جس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں یا یہ کہ زمین غیر متحرک ہے جس پر آسمان ٹکا ہوا ہے یا یہ کہ بہشت آسمان پر ہے اور سب سے اونچے آسمان پر خدا ایک انسان کی شکل میں تخت پر بیٹھا ہے جس کے دونوں طرف پر دربار بنی کھڑے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے پہلے ہی دن مذہب اور سائنس کی حدود کو الگ الگ کر دیا تھا۔ رسول کے مبعوث ہونے کا منشاء یہ تھا کہ لوگوں کو اخلاق میں سکھائے اور ایک نئے دینی زندگی کے حقائق سے آگاہ کرے نہ یہ کہ انہیں جغرافیہ و ہیئت اور فلسفہ و طب کا سبق دیتا پھرے۔ حضور رسالت بناؤ انسان صاف یہ فرمادیا ہے کہ اقم اعلم باموراد نیا کمر۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں جابجا ایسی آیات پائی جاتی ہیں جس میں آسمان زمین بہشت و جہنم کی سی کا ذکر ہے لیکن افلا یظن ان الی الارض کیف سلطت سے یہ معنی لینا کہ زمین ایک سطح پر ہے یا اللہ تعالیٰ الجبال ادا واداکے یہ تاویل کرنا کہ پہاڑ زمین میں بخون کی طرح ٹھکے ہوئے ہیں اور اسے اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیتے۔ یا قلہ استوی علی العرش کا یہ مفہوم سمجھنا کہ باری تعالیٰ باعتبار جہت و اشارہ و بلحاظ تحت و فوق سب سے اونچے آسمان پر تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ یا ما تروی فی خلق آدم من تفاوت فارجع البصر هل تری من فطر کا یہ مطلب سمجھنا کہ آسمان ایک بلورین گنبد ہے جو نیچے کسی دروازے کی طرح قائم ہے فن بلاغت کے اس اصول کی گردن پر الٹی چھری پھیرنا جو میں خطابیات کے قہمی اثر کا راز چھپا ہوا ہے۔

علامہ شبلی الکلامین تحریر فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ انبیاء تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کے سوا اور قسم کے مباحث اور مسائل اور حقائق سے متعرض نہیں ہوتے اور اس قسم کے امور کے متعلق کچھ بیان کرتے ہیں تو انہیں کئی روایات اور خیالات (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)



ان کے بجائے وہ خیالات قائم کر لیے جو از روئے سائنس درست و صحیح تھے۔ پھر بھی عیسائی ممالک کی طرح اسلامی ملکوں میں بھی عامیان مذہب کی مخالفت کے بغیر یہ ترقی نہ ہو سکی۔ مثلاً جب آئامون کوزمین کا کردی شکل ہونا معلوم ہوا اور اس نے اپنے ہندوؤں اور ہیت دانوں کو ایک درجہ ارضی کی پیمائش کا حکم دیا تو علامہ تقی الدین نے جو اس زمانہ کے مشاہیر علمائے دین میں سے تھے غلبہ کے اس فعل کو بدعت قرار دے کر ظاہر کیا کہ مسلمانوں کو ایک جھوٹے اور مشہورہ فلسفہ کی اشاعت سے گمراہ کرنے کی پاداش میں خدا یقیناً آئامون پر عذاب نازل کرے گا۔ لیکن آئامون نے اس فتوے کی کچھ پروا نہ کی۔ اور اپنے حکم کی تعمیل کراہی کر رہا۔ بحیرہ قازم کے ساحل پر شنار کا میدان اس پیمائش کو لیے تجزیر کیا گیا۔ ایک منظر لای کی مدد و مقامات پر جو ایک ہی خط نصف النہار پر واقع تھے اور جن کا باہمی فاصلہ پورا ایک درجہ تھا افق سے

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) کے مطابق اور اس میں بھی استعارات اور محازات سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ انبیاء کے اصول میں سے ایک یہ بات ہے کہ جو امور تہذیب نفس اور سیاست دینی سے تعلق نہیں رکھتے ان میں وہ دخل نہیں دیتے مثلاً کائنات الجوی یعنی بارش گہن ہالہ کے پیدا ہونے کے اسباب۔ نباتات اور حیوانات کے عجائبات۔ چاند سورج کی رفتار کی مقدار۔ حوادث یومیہ کے اسباب۔ انبیاء سلاطین اور ممالک کے قصے وغیرہ۔ ان چیزوں سے وہ بحث نہیں کرتے۔ مگر ان چند معمولی باتیں جن سے لوگوں کے کان مانوس ہو چکے ہیں اور ان کی عقلوں نے اعلان باتوں کو قبول کر لیا ہے اور ان باتوں کو بھی وہ لوگ خدا کی شان اور قدرت کے ذکر میں ضمنی طور پر اجمالاً بیان کرتے ہیں اور اس میں مجاز اور استعارہ سے کام لیتے ہیں اور اسی اصول کی بنیاد پر جب لوگوں نے آنحضرتؐ سے چاند کے گھٹنے بڑھنے کا سبب پوچھا تو خدا نے اس کے جواب سے اعراض کیا اور اس کے بجائے ہینون کا فایہ بیان کر دیا چنانچہ فرمایا **و یسئلونک عن الالہة قل ہی مواقیئ للناس والجم**۔ اکثر لوگوں کا مذاق ان فنون (یعنی ریاضیات وغیرہ) کے اشتغال کی وجہ سے خراب ہو گیا ہے تو یہ لوگ انبیاء کے کلام کو خدا کی حقیقت محل پر محمول کرتے ہیں۔ مترجم

تکب کے ارتقاع کا اندازہ قائم کیا گیا۔ ان دونوں مقامات کے درمیانی فاصلہ کی جب پیمائش کی گئی تو معلوم ہوا کہ دو لاکھ ہاشمی گز ہے۔ اس حساب سے گویا کل زمین کا دور چوبیس ہزار انگریزی میل ہوا جو صحت سے بہت زیادہ دور نہیں۔ چونکہ زمین کی کرورت اس قسم کی ایک ہی پیمائش سے قطعی طور پر متبطن ہو سکتی تھی لہذا خلیفہ نے حکم دیا کہ ایک درجہ کی پیمائش کو فہ کے قریب کی جائے۔ شاہی جہندس دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے اور ایک نقطہ سے متخالف سمتوں میں روانہ ہو کر ایک جماعت نے بجانب شمال اور دوسری نے بجانب جنوب ایک درجہ ارضی کے قوس کی پیمائش کی۔ اس پیمائش کا نتیجہ گز دن میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اگر یہ گز وہی ہیں جو ہاشمی یا شاہی گز کے نام سے مشہور ہیں تو ایک درجہ کے طول کی صحیح مقدار میں اور اس مقدار میں جو انہیں معلوم ہوئی صرف  $\frac{1}{16}$  میل کا فرق ہے۔ ان پیمائشوں سے خلیفہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین کا ردی الشکل ہونا مسلم ہو۔

ہمیں رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ عربوں کا وحشیانہ تعصب کیونکر اس قدر جلد تحصیل علوم و فنون کی زبردست خواہش کی شکل میں بدل گیا۔ اوّل اوّل قرآن ادب و انشا اور حکمت و فلسفہ کا مزاج تھا۔ ان حضرات نے اسے تمام تصانیف کا کل سرسبد ظاہر کر کے اس کی پرنسپل فصاحت و بلاغت کو اپنی مامورین الہی کے ثبوت میں پیش کیا تھا۔ لیکن ادن کی وفات کے بعد بیس سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ گزرا تھا کہ وہ تجربہ جو مسلمانوں کو شام ایران ایشیا ترکہ کوچک اور مصر میں حاصل ہوا اپنا رنگ لایا اور یہ واقعہ مسلم ہے کہ حضرت علیؑ نے جو اس وقت سریر آرا سے خلافت تھے ہر طرح کے علمی مشاغل کا لوگوں کو خود شوق دلایا۔ امیر معاویہ نے

لے کیا ڈاکٹر ڈیر علیؑ رحمہ اللہ ”قل رب نہ ادنیٰ علماً“ ہم کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اسلام ان اکتساب علم و حکمت تھا؟ کیا وہ اس کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں کی تلوار نے مشرق و مغرب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تو اس تمدنی کا زور ہو ”وان کنتم فی سرب عانزلنا علی عبدنا فاتوبسورۃ من مثله داد عوشہد اعم ان کنتم صادقین (بقیہ مضمون بر صفحہ آئینک)

جوبانی خاندان بنو امیہ میں ۶۷۱ء میں برسر اقتدار ہوتے ہی آئین حکومت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ پہلے حکومت انتخابی تھی اب موروثی ہو گئی۔ انہوں نے مدینہ کے بجائے دمشق کو جس کا موقع زیادہ مرکزی تھا دار الخلافہ بنایا اور بیس و عشرت اور شان و شوکت کی زندگی اختیار کی۔ انہوں نے استناد و قصب کے سلاسل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور علوم و فنون کی سرپرستی شروع کی۔ یہ حیرت انگیز انقلاب تیس سال کے اندر اندر پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں ایک ایرانی گورنر جب دربار خلافت میں آداب بجالانے کو حاضر ہوا تو اس نے امیر المومنین کو مسجد نبویؐ کی بیڑھیوں پر فقیروں کے ساتھ سوسے ہوئے پایا لیکن چھٹے خلیفہ امیر معاویہ کے دربار میں دول غیر کے جو سفیر باریاب ہوئے وہ خلیفہ کے رویہ و ایک عالیشان محل میں پیش کیے گئے جو نقش و نگار سے مزین اور چمن اور فواروں سے آراستہ تھا۔

ان حضرت کی رحلت کے بعد پوری ایک صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ مشاہیر حکمائے یونان کی تصانیف کا ترجمہ عربی زبان میں ہو گیا اور ”الیٹہ“ اور ”آڈیسی“ جیسی نظموں کو جو بوجہ اپنی بت پرستانہ تعلیمات کے موجب گمراہی تصور کی جاتی تھیں علم و دست اور ہنر پر دور لوگوں کے شوق نے شامی زبان کا لباس پہنا دیا۔ المنصورؒ نے اپنے عہد خلافت (۳۵۵ھ) میں حکومت کا مرکز دمشق سے بغداد میں منتقل کیا اور نئے دار الخلافہ کو عروس البلاد بنا دیا۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) وان لم تفعلو ولن تفعلو فاتقوا الناس التي وقودها الناس والجماعة اعدت للکافرین“ کے حرف حق میں ساری دیر تھا کم ہو گیا تھا کیا ڈاکٹر ڈریپر حضرت علیؓ کی اسی کا دم بھی کچھ کر سکتے ہیں کہ باوجودیکہ قرآن ادب و دانٹ اور حکمت و فلسفہ کا مزاج تھا پھر بھی انہوں نے لوگوں کو ہر طرح کے علمی مشاغل کا شوق بطور خود دلایا کیا ڈاکٹر ڈریپر کے ہم خیال قریباً ساڑھے تیرہ سو سال کے گزرنے کے بعد بھی کوئی ایسی کتاب دکھا سکتے ہیں جو فصاحت و بلاغت میں قرآن کی ٹھکانی ہو؟ مترجم

اوس کا بہت سا وقت علم ہیئت کے مطالعہ اور اس فن شریف کے ترقی دینے میں صرف ہوا تھا اس کے علاوہ اوس نے سلطنت میں جا بجا طب اور قانون کے مدارس قائم کیے۔ اوس کا پوتا ہارون الرشید (۱۹۵ھ) بھی اوس کے نقش قدم پر چلا چنانچہ اوس کے حکم سے دولت عباسیہ کی ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ لیکن علم و حکمت کا سب سے زیادہ روشن زمانہ جو ایشیا کے لیے سرمایہ صدافتخار و نازش ہے المامون کا عہد خلافت ہے (۸۳۲-۸۴۸ھ)۔ اوس نے بغداد کو سائنس کا مرکز بنادیا۔ عظیم الشان کتب خانے قائم کیے اور اپنے دربار کو علما و فضلاء کی مجلس بنادیا۔

یہ اعلیٰ درجہ کا علمی مذاق اوس وقت تک بھی بدستور قائم رہا جب کہ اندرونی تنازعات و فسادات کی وجہ سے عربی سلطنت تین جداگانہ حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ بنی عباس ایشیا میں بنی فاطمہ مصر میں اور بنی امیہ اندلس میں ایک دوسرے کے سیاسی رقیب تو تھے ہی لیکن علم و حکمت اور ادب و دانش کی سرپرستی میں بھی ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ دوسروں پر فوق لے جائے۔

شعر و سخن میں عربوں نے ہر دلچسپ و نتیجہ خیز مضمون پر کتابیں لکھیں۔ ادن کو اس امر پر ناز تھا کہ ایک اکیلے عرب نے جس قدر شاعر پیدا کئے ہیں وہ تعدا دین دنیا بھر کے شاعروں سے زیادہ ہیں۔ سائنس میں ادن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اکتساب میں ادنہوں نے یورپ کے یونانیوں کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ اسکندریہ کے یونانیوں کی روش کا اتباع کیا۔ ادن کی عقل سلیم نے ادنہیں یہ بات سمجھا دی تھی کہ سائنس کی ترقی محض تخیل ہی سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس ترقی کا میم اور یقینی ذریعہ صحیفہ فطرت کا عینی مطالعہ ہے۔ وہ حکمت منظر پر حکمت عملی کو ترجیح دیتے تھے یعنی ادن کے علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر تھی۔ فن ہندسہ و ریاضیات کو وہ استدلال و استنباط کے آلات تصور کرتے تھے۔ فن جبرقیل۔ توازن و ابعات۔ فن مناظر و مریا پر جو کثیر التعداد کتابیں ادنہوں نے لکھی ہیں ادن میں یہ دلچسپ

خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ہر مسئلہ کسی تجربہ یا کسی آلد مشاہد کے ذریعہ سے حل کیا گیا ہے۔  
یہی خصوصیت تھی جس نے انوکھ فن کیا کا موجد بنا دیا جس نے اون سے تقطیر (عرق کھینچنے)  
تعمید (بخار اڑا کر بخند کرنے) سیج (پگھلانے) اور تردیق (چھاننے) کے آلات ایجاد کرائے۔  
جس نے فن ہیئت میں اون کو آلات منقسمہ مثلاً لہنہ و اصطرلاب سے کام لینے کی ترغیب دلائی۔  
جس نے فن کیا میں اون سے ترازو کا استعمال کرایا جس کے اصول سے وہ تجویز واقف تھے۔  
جس نے اون سے بغداد اندلس اور ہندوستان میں اجسام کے اوزان کی میزنا میں اور ہیئت کی نقشے  
تیار کرائے۔ جس نے اون کو علم ہندسہ - علم مثلث - علم جبر و مقابلہ اور ہندی طریقہ اعداد و نویسی  
میں نئے نئے نکتے پیدا کرنے کے قابل بنایا۔ یہ وہ نتائج ہیں جو ارسطو کے علمی و استقرائی  
طریقہ کو افلاطون کی خیالی آرائی پر ترجیح دینے کی بدولت اون کی کوششوں نے پیدا کیا۔  
کتب خانجات عامہ کے قیام و توسیع کے لیے کتابوں کے جمع کرنے میں نہایت  
اہتمام کیا جاتا تھا۔ خلیفہ مامون عباسی کی نسبت روایت ہے کہ اوس کی کوششوں سے صد ہا  
اونٹ جو قلمی کتابوں کے پشتاروں سے لدے ہوئے تھے بغداد میں داخل ہوئے۔ جو معاہد  
اوس نے یونانی فرمانروا میکا مکمل نمائش کے ساتھ کیا تھا اوس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ قسطنطنیہ  
کا ایک کتب خانہ اوس کے حوالے کر دیا جائے۔ جو علی خزانے اس طرح الماموں کے ہاتھ  
آئے اون میں بطلمیوس کی اوس مشہور تصنیف کا ایک نسخہ بھی تھا جو اوس نے سیارہ و ثوابت کی  
مہندسانہ ساخت پر لکھی تھی۔ اس کا ترجمہ خلیفہ کے حکم سے فوڑاعربی زبان میں کیا گیا اور ترجمہ  
کا نام الجسطلی لکھا گیا۔ جو کتاب میں اس طور پر جمع کی گئیں اون کی کثرت تعداد کا اندازہ اس سے  
ہو سکتا ہے کہ قاهرہ کے کتب خانہ فاطمیہ میں ایک لاکھ نسخے جن کا خط نہایت پاکیزہ اور  
جلدیں نہایت خوشا تمین موجود تھے۔ ان میں سے چھ ہزار پانچ سو نسخے نقط ہیئت اور طب  
پر تھے۔ اس کتب خانہ کے قواعد کے بموجب اون طالب العلون کو جو قاهرہ میں سکونت پذیر  
تھے کتابیں مستعار مل سکتی تھیں۔ کتب خانہ میں زمین کے دو کمرے بھی تھے۔ ایک تو ٹھوس

چاندی کا تھا۔ دوسرا پتیل کا تھا۔ پتیل کے کرے کی نسبت مشہور تھا کہ اسے بطلیموس نے بنایا تھا۔ چاندی کے کرے پر تین ہزار دینار لاگت آئی تھی۔ خلفائے اندلس کے عظیم الشان کتب خانہ کو نسخوں کی تعداد رفتہ رفتہ چھ لاکھ ہو گئی۔ اس کی فہرست ہی چوالیس کتابوں پر مشتمل تھی۔ اس شاہی کتب خانہ خاص کے علاوہ اندلس میں ستر سرکاری کتب خانہ ایسے تھے جن میں ہر شخص جاکر اپنی معلومات بڑھا سکتا تھا۔ خاص خاص اشخاص کے پاس بعض دفعہ کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہوتا تھا۔ ایک طبیب کی نسبت روایت مشہور ہے کہ جب سلطان بنارائے اوسے بلا بھیجا تو اوس نے وہاں جانے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اوس کی کتابوں کی باربرداری کے لیے چار سو اونٹوں کی ضرورت تھی۔

ہر بڑے کتب خانہ میں ایک سررشتہ نقل اور ترجمہ کا ہوتا تھا۔ تراجم بھی بسا اوقات بعض اشخاص اپنے ذاتی اہتمام سے مرتب کراتے تھے۔ چنانچہ ایک نسٹوری طبیب حنین نامی نے اس قسم کا ایک دفتر بغداد میں قائم کر رکھا تھا (شہ ۶۰۰)۔ یہ شخص ارسطو افلاطون بقراط جالینوس اور دوسرے مشاہیر یونان کی تصانیف کے تراجم شایع کرتا تھا۔ تراجم کے علاوہ جدید تصانیف کا بازار بھی ہر طرف گرم تھا۔ تصنیف کا طریقہ یہ تھا کہ دارالعلوم کے حکام اساتذہ کو مقررہ موضوع پر کتابیں لکھنے کے لیے مامور کرتے تھے۔ ہر خلیفہ کے دربار کا وقایع نویس علیحدہ ہوتا تھا۔ قصص و حکایات کے متعلق الف لیلہ جیسی کتابوں کا وجود عربوں کی قوت تخیل کا پتہ دیتا ہے۔ تصوف اور افسانوں کے علاوہ انواع و اقسام کے دوسرے مضامین پر بھی کتابیں تصنیف کی جاتی تھیں مثلاً تاریخ۔ اصول فقہ۔ سیاست۔ فلسفہ وحیرہ۔ سوانح عمریان نہ فرنا جلیل القدر اشخاص بلکہ مشہور گھوڑوں اور اونٹوں تک کی لکھی جاتی تھیں۔ کتابوں کی اشاعت میں کسی قسم کی مزا حمت یا مانعت من جانب حکومت نہ ہوتی تھی اور نہ اون کے مضامین میں مصلحت عام کے بہانے سے کسی قسم کی حک و اصلاح کی جاتی تھی۔ البتہ اخیر اخیر میں دنیا کی کتابوں کی اشاعت کے لیے مصنفوں کو سہ کاری اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ واقفیت

عامہ کے متعلق علمی حوالجات کی کتابیں کثرت سے لکھی گئیں۔ جغرافیہ۔ شمار و اعداد۔ طب۔ تاریخ۔ غرض ہر مضمون کی ایک جامع لغات موجود ہو گئی یہاں تک کہ اون کے لمحضات بھی تیار کر دیے گئے۔ چنانچہ محمد ابو عبد اللہ کی تصنیف ”دایرة المعارف“ اس صنعت کی ایک ممتاز مثال ہو۔ کتابوں میں جو کاغذ لگایا جاتا تھا اس کی صفائی اور سفیدی کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا۔ رنگارنگ روشنائیوں کی تیاری میں بہت کچھ اہتمام کیا جاتا تھا۔ اور کتابوں کے عنوان کو مطلقاً مذهب کرنے اور ادوں کو طرح طرح کے نقش و نگار سے زینت دینے میں نہایت دیدہ ریزی و ہنر آفرینی اور کمال خوش سلیقگی کا ثبوت دیا جاتا تھا۔

غرض دنیا سے اسلام میں علوم و فنون کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ منگوئیہ۔ تاتار۔ ایران۔ عراق۔ شام۔ مصر۔ شمالی افریقہ۔ مراکش۔ فیض اور اندلس میں کثرت سے مدرسے اور درس گاہیں موجود تھیں۔ دولت و ماکار قبہ با آن ہمہ عظمت و جبروت اتنا نہ تھا جتنا اس عربی سلطنت کا۔ اس عظیم الشان سلطنت کے ایک کنارہ پر تو سمرقند کا مشہور مدرسہ اور رصد گاہ تھی اور دوسرے کنارے پر اندلس کا شہرہ آفاق مینارہ ترصد آسمان سے ہم کلام تھا۔ مسلمانوں کی اس سرپرستی علوم و فنون کا ذکر کرتے ہوئے گبن لکھتا ہے: ”صوبوں کے خود مختار امیر بھی علم و ہنر کی سرپرستی میں شاہانہ اقتدارات برتتے تھے۔ اور ادوں کی رقیبانہ مسابقت نے مذاق علمی کی ترویج میں غیر معمولی حصہ لے کر سائنس کے نور کو سمرقند و بخارا سے لے کر فیض اور قرطبہ تک پھیلا دیا۔ ایک سلطان کے وزیر نے ایک دفعہ ایک لاکھ اشرفیان اس غرض سے وقف کر دیں کہ اس سرمایہ سے بغداد میں ایک کالج قائم کیا جائے اور اس کالج کے مصارف کے لیے پندرہ ہزار دینار سالانہ کا دوامی عطیہ مقرر کر دیا۔ تعلیم کے فیضان سے عوام و خواص کو یکساں بہرہ اندوز ہونے کا موقع دیا جاتا تھا۔ وزیر کا بیٹا اور ایک ادنیٰ درجہ کے موجی کا بیٹا پہلو بہ پہلو بیٹھ کر استاد سے سبق لیتے تھے طالب العلموں کی تعداد ایک ایک دارالعلم میں چھ چھ ہزار تک پہنچی ہوئی تھی۔ جنکی جماعتوں کو باوقات

مختلف تعلیم دی جاتی تھی۔ نادار طلبہ کے لیے معقول وظائف مقرر تھے اور اساتذہ کو پیش قرار  
 تنخواہیں ملتی تھیں۔ ہر شہر میں عربی زبان کی نادر تصنیفات کے نقل اور جمع کرنے کے لئے  
 طالبان علم کا شوق اور اہل دہل کا نمود ہر وقت سرگرمی و مصروف تھا۔ ان مدارس و مکتب کی نگرانی  
 فراخ حوصلگی کے اقتضا سے بعض دفعہ مسطور یون اور بعض دفعہ یہودیون کے سپرد کی جاتی تھی۔  
 کسی شخص کو کسی خدمت جلیلہ پر سرفراز کرتے وقت حکومت کو یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ وہ کس قوم  
 سے تعلق رکھتا ہے یا اس کے مذہبی عقاید کیا ہیں بلکہ محض اس کی علمی قابلیت کا لحاظ کیا  
 جاتا تھا۔ ”خیر الناس من ینفع الناس“ کے اصول کو پیش نظر رکھ کر خلیفہ اعظم  
 المامون نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ”اہل علم و فضل خدا کے برگزیدہ اور بہترین بندے  
 ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اپنے قوائے عقلی و ادراکی کی ترقی کے لیے وقف رکھی ہے۔  
 وہ اپنے ابنائے جنس کو حکمت و دانش کے نکتے سکھاتے ہیں اس لیے وہ نظام دنیا کے  
 شیرازہ بند اور محفل کون و فساد کی شمع ہیں۔ اگر ان کی ہدایت چراغ راہ نہ ہو تو اہل دنیا  
 پر اسی جہالت اور وحشیانہ پن کی ظلمت پھر چھا جائے جو پہلے چھائی ہوئی تھی۔“

مدرسہ طبیبہ قاہرہ کے طرز عمل کی تقلید نے دوسرے طبی مدارس میں بھی یہ قاعدہ  
 جاری کر دیا کہ زمانہ تعلیم کے اختتام پر طلبہ کا نہایت سختی کے ساتھ امتحان لیا جائے۔ اور  
 کامیاب ہونے پر انہیں طب کرنے کی سند دی جائے۔ یورپ کا پہلا طبی مدرسہ وہ  
 تھا جسے عربوں نے اٹلی کے شہر سرنوین میں قائم کیا اور پہلی رصد گاہ جو یورپ کو نصیب ہوئی  
 وہ تھی جو اموی خلفا کی سرپرستی میں بمقام اشبیلیہ (اسپین) قائم ہوئی۔

اگر ہم اس مہتمم باثان علمی تحریک کی جزئیات سے بحث کریں تو اس کتاب کا حجم حد سے  
 زیادہ جڑہ جائزہ گا۔ لہذا ہم صرف اس اجمال پر اکتفا کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے قدیم علوم و  
 فنون میں بہت کچھ اضافے کیے اور نئے نئے علوم ایجاد کیے۔ انہوں نے حساب کے  
 ہندی طریقہ کو رواج دیا جس میں تمام رقوم نہایت خوبصورتی کے ساتھ دس اعداد کے



ذریعہ سے اس طرح ظاہر کی جاتی ہیں کہ ہر عدد کی اول تو ایک قیمت مطلق مقرر کر دی گئی ہے اور اس کے بعد ایک قیمت اعتباری ہے جو بلحاظ موقع یا مرتبہ پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ہر طرح کے اندازے کے لیے سہل اور سادہ قاعدے بنا دئے گئے ہیں۔ جبر و مقابلہ یا بالفاظ دیگر ہمہ گیر ریاضی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے مقدار غیر معینہ کی تعیین یعنی ان تعلقات کی دریافت ہو سکتی ہے جو ہر قسم کی مقادیر کے درمیان قائم ہوں خواہ ان مقادیر کا تعلق علم حساب سے ہو خواہ علم ہندسہ سے۔ اس طریقہ کا مہوم سا خیال ڈائیونٹس نے کو پیدا ہوا تھا جسے عربوں نے ترقی دے کر اس حد کمال تک پہنچایا۔ جبر و مقابلہ میں محمد بن موسیٰ نے مساوات درجہ چہارم اور تہم بن ابراہیم نے مساوات درجہ سوم کے حل کرنے کا عمل دریافت کیا۔ عربوں ہی کی سعی سے علم مثلث نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی۔ اودنہوں نے حبیب سوسی کے بجائے جس کا اول استعمال ہوتا تھا اوتار کو اس فن میں داخل کیا۔ اور اسے ترقی دے کر ایک مستقل فن کی حیثیت عطا کی۔ موسیٰ نے جس کا ذکر ہم ادپر کر آئے ہیں علم مثلث کر دی پر ایک رسالہ لکھا اور البنادی کا ایک رسالہ ساحت پر موجود ہے جس میں اس فن کے متعلق یہاں تک داد و تحفہ بخشی دی گئی ہے کہ بعض لوگ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اس موضوع پر اقلیدس کا جو مقالہ گم ہو گیا تھا البنادی کا رسالہ اوسی کی نقل ہے۔

۱۔ ایک یونانی الاصل ریاضی دان تھا جو چوتھی صدی عیسوی کے خاتمہ پر اسکندریہ میں پیدا ہوا۔ جبر و مقابلہ کے بعض ابتدائی مسائل کی دریافت اس سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کی قبر کی لوح پر چند اشعار بزبان یونانی کند تھے جو ہم تک پہنچے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ۳۳ سال کی عمر میں شاہی ہوئی۔ اس کا بیٹا شاہی کے پانچ سال بعد پیدا ہو کر ۲۴ سال کی عمر میں اس سے چار سال پہلے مر گیا اور اس حساب سے اس کی عمر ۸ سال ہوئی۔ یہ اطلاع جبر و مقابلہ کی ایک شکل میں قلمبند کی گئی ہے۔ اساطین (علم حساب) پر اس نے ایک کتاب تیرہ مقالوں میں لکھی تھی جس میں سے صرف چھ مقالے اس وقت موجود ہیں۔ مترجم

علم ہیئت میں ادھنون نے نہ صرف ستاروں کی فہرستیں تیار کیں بلکہ اوس حصہ آسمان کے نقشے بھی تیار کئے جو ادن کے پیش نظر تھا۔ بڑے بڑے ستاروں کے ادھنون نے عربی نام بھی رکھے اور آج کے دن تک یہ ستارے انہیں ناموں سے مشہور ہیں۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے۔ ادھنون نے سطح زمین کے ایک درجہ کی پیمائش کر کے اس کی جہاست دریافت کی۔ طریق الشمس کا اعوجاج معلوم کیا۔ آفتاب و ماہتاب کی صحیح میزانیں شائع کیں۔ سال کی مدت مقرر کی۔ استقبال اعتدالین کی توثیق و تصدیق کی۔ نیپلیس نے البتانی کے زمانہ علم کو اکب کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے اور حاکم بامر اللہ خلیفہ مصر (سنہ ۵۰۰) کے دربار کے مشہور ہیئت دان ابن یونس کی ایک عالمانہ تصنیف کے بعض جگہ جیسا کہ اجزا کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں انصور عباسی کے زمانہ سے لے کر ادس وقت تک کے مختلف مشاہدات ٹنکی مشن کسوف و خسوف۔ نقاط اعتدال میل و نہار۔ نقاط انقلاب صیفی و شتوی قرآن سیارگان و احتجاج کو اکب کے نتائج مندرج ہیں۔ ان رصدی نتائج نے نظام عالم کے بڑے بڑے تغیرات پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ بحیثیت دانان عرب نے آلات ہیئت کی ترکیب و تکمیل پر بہت سادقت صرف کیا۔ وقت کا اندازہ لگانے کے لیے مختلف قسم کی پانی اور دھوپ کی گھڑیاں ایجاد کیں۔ اور سب سے پہلے اس مقصد کی تکمیل کے لیے ”پنڈم“ یعنی رقص ساعت ادھنین نے ایجاد کیا۔

علمی علوم میں جن کا دار و مدار تجربہ پر ہے علم کیمیا کی ایجاد کا سہرا ادھنین کے سر ہے۔ ادھنون نے اس فن کے بعض نہایت ہی اہم سمیار دریافت کیے مثلاً گندھک کا تیزاب۔ شورے کا تیزاب اور الکحل۔ اس فن سے ادھنون نے مطب میں بھی کام لیا اور سب سے اول ادویات مفروضہ و مرکبہ کی قریباً دینین شائع کیں۔ اور ان میں معدنی نسخہ جات بھی شامل کیے۔ علم جبر ثقیل میں ادھنون نے گرتے ہوئے اجسام کے قوانین دریافت کیے۔ قوت کشش ثقل کی ماہیت سے بھی وہ نا بلند نہ تھے۔ جبر ثقیل کی قوتوں کے مسئلہ کا ادھنین اچھی طرح

علم تھا۔ علم توازن مایعات میں جو ترقی اونہوں نے کی اوس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اجسام کے اوزان مخصوص کی میزانیں مرتب کر کے پانی میں اجسام کے ڈوبنے اور تیرنے کے مال و ماحلیہ پورا اونہوں نے بسوٹا بحثیں کھین سخن مناظر درمیا میں اونہوں نے یونانیوں کی اس غلط فہمی کو درست کیا کہ شعاع نور آنکھ سے نکل کر شئی مرئی پر پڑتی ہے۔ اس کے بجائے اونہوں نے اس بناء کو رواج دیا کہ شعاع شے سے چل کر آنکھ میں داخل ہوتی ہے۔ واقعہ الفکاس و انعکاس ضیائی مابینیت کا اونہیں پورا علم تھا۔ ابن حزم سے یہ مشہور تحقیقات منسوب ہے کہ شعاع نور کرہ ہوا کو ہر شکل قوس قطع کرتی ہے اور اس سے اس نے یہ ثابت کیا کہ ہم آفتاب و مابتاب کو قبل طلوع و غروب دیکھتے ہیں۔

اس علمی استعداد کا اثر اس ترقی میں صاف نظر آتا ہے جو صنعت و حرفت کے متعدد فنون میں جلد جلد ہونی شروع ہوئی۔ فن فلاح میں آبپاشی کے طریقے پہلے سے بہتر ہو گئے۔ کھاد کا استعمال ہزار طریقہ کے ساتھ کیا جانے لگا۔ چوپایوں کی افزائش نسل کے متعلق قیمتی نکتے معلوم ہو گئے۔ دیہی قوانین کا ضابطہ کاشتکاروں اور مزارعین کے حقوق کے لحاظ سے بہت زیادہ کامل و مکمل ہو گیا۔ جن کھیتوں میں پہلے دہان کی کاشت نہ ہوتی تھی وہاں اب اس کی بلبلاتی فصلیں نظر آنے لگیں۔ جہاں ایکھ اور قہود کا نام و نشان نہ تھا وہاں اب ان کی پیداوار بھی ہونے لگی۔ سلطنت میں جا بجا ریشم روئی اور اُون کے کپڑوں کو کارخانے قائم ہو گئے۔ قریبہ اور مراکو میں چرم سازی و کاغذ سازی کا کام شروع ہو گیا۔ معدنوں پر کام ہونے لگا۔ مختلف وسعتیں ڈھنسنے لگیں۔ ٹائل و مین ایسے ایسے فولاد و میخ و تلواریں تیار ہونے لگیں کہ لیک دنیا اول کالو بامان گئی۔

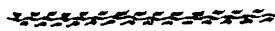
شاعری اور موسیقی پر عرب فریفتہ تھے۔ اون کا جو وقت فکر معاش سے بچتا تھا ان فنون لطیفہ کی نذر ہوتا تھا۔ شطرنج کا کھیل یورپ سے عربوں سے سیکھا اور قصص و حکایات اور خیالی مضامین کا شوق بھی جو اہل یورپ میں اس قدر پایا جاتا ہے عربوں ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔

فن ادب کی اون شاخوں میں جو محض تفریح اور دلہنگی ہی کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ شان ثقاہت و متانت لیے ہوئے ہیں اون کی فکر سلیمہ و دیکھتہ آفرینی دیتی تھی۔ دنیا کی ناپایداری۔ لاندہمی کے نتائج۔ قسمت کی گردش۔ عالم کی ابتداء۔ اس کی میعاد اور اس کا خاتمہ وہ مضامین ہیں جن پر ادیبوں نے لطیف اور نتیجہ خیز کتابیں لکھی ہیں۔ بعض دفعہ ہمیں تعجب ہوتا ہے ہمارے نگاہ ایسے خیالات پر جا پڑتی ہے جن کی نسبت ازراہ تفکر ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان خیالات کے موجب ہونے کا شرف ہمیں کوحاصل ہے۔ مثلاً ایک مسئلہ ارتقا ہی کو لیجئے جسے ہم اکتشاف جدید سمجھتے ہیں۔ اس مسئلہ کی تعلیم اون کے مدارس میں دی جاتی تھی۔ اور ہم تو خیر پھر بھی اس کے مجدد و مبنی بنے ہیں۔ وہ ہم سے بھی ایک قدم آگے بڑھے ہوئے تھے اور غیر عضوی اجسام یعنی جمادات تک کو اس کے حیر عمل میں داخل سمجھتے تھے۔ رسیا میں کیمیا سازی کا اصلی راز فلزاتی اجسام کے ارتقا کی نظری میں مرکوز تھا۔ انگریز اپنی جس نے بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا ہے لکھتا ہے: جب عوام الناس فلاسفہ طبیعیین کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ سونا ایک جسم ہے جو درجہ کمال کو پہنچ گیا ہو تو انہیں کمال یقین ہو جاتا ہے کہ سونا ایک ایسی چیز ہے جو اور دھاتوں کی شکل کیے بعد دیگرے اختیار کرتا ہوا ایک زمانہ دان کے بعد اس حالت کمال کو پہنچا ہے یعنی ابتدائیں یہ سیسہ تھا پھر رانگ ہو گیا اور اس کے بعد پتیل ہوا پھر چاندی ہوا اور چاندی سے ترقی کر کے سونا بن گیا۔ ان جہلا کو یہ معلوم نہیں کہ فلاسفہ طبیعیین کا یہ قول کہ سونا ایک ترقی یافتہ جسم ہے قریب قریب اون کے اس قول کو ہم معنی ہے کہ انسان اپنی فطرت اور ترکیب جسمانی کے لحاظ سے قدرت کی قوتوں کے اعتدال کا مرکز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے اون کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آدمی پہلے بیل تھا۔ پھر گدھے کی شکل میں تبدیل ہوا۔ پھر گھوڑا بن گیا اس کے بعد بندر کے قالب میں ظاہر ہوا اور سب کو آخر میں انسان بن گیا۔“



# پانچواں باب

## نزاع مذہب سائنس دربارہ ماہیت روح مسئلہ انفصال و انجذاب



روح کی ماہیت کے متعلق قدیم اہل یورپ کے خیالات - یعنی روح جسم کے مشابہ ہے۔ اہل شرق و فلسفیانہ خیالات - ہندو مذہب اور بدھ مذہب مسئلہ انفصال و انجذاب کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی مذہب ارسلو کا بھی ہے جس کی تقلید پیروان فلسفہ اسکندر یہ اور بدھ میں یہودی اور عرب کرتے ہیں۔ یہی مسئلہ اریٹیمیا کی تصانیف میں بھی پایا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا تعلق مسئلہ بقا و متعاقب قوت کے ساتھ جسم اور روح کے آغاز و انجام کی باہمی مماثلت - روح انسانی کا قیاس روح حیوانی پر۔ فلسفہ ابن رشد جو انہیں واقعات پر مبنی ہے اسپین اور سسلی ہوتا ہوا سیمی دنیا میں پھیلا ہے۔

فلسفہ ابن رشد کے استیصال کی تاریخ اسلام کا اس سے ابا کرنا۔ یہودیوں کے مذہبی طبقہ کی مخالفت - پاپائی، واما اس فلسفہ کو مشادینے پر کلمہ بانہ صنا۔ انکویشن (محکمہ احتساب مذہبی) کا اسپین میں قائم ہونا۔ اس محکمہ کے دشمنانہ مظالم اور اون کے نتائج یہودیوں اور عربوں کا اخراج - یورپ میں فلسفہ ابن رشد کی پاپائی ڈیمینکونسل کا فیصلہ۔

بت پرست یونانیوں اور رومیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کی روح اوس کی جسمانی صورت

کے مشابہ ہے۔ جسم بڑھتا ہے تو یہ بھی اوس کے ساتھ بڑھ جاتی ہے اور گھٹتا ہے تو گھٹ جاتی ہے۔ غرض تئیراتِ جسمانی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اوس مشابہ عصر کو جنہیں مرنے کے بعد ہیڈیز کے طبقہ سا فل میں داخل ہونے کی کار پر دازان دنیا تختائی کی طرف سے اجازت ملتی تھی اپنے پُرانے رفیقوں کے پہچاننے میں کوئی دقت نہ پیش آتی تھی۔ نہ صرف ان باشندگانِ عالمِ عقبی کی جسمانی صورت ہی بدستور قائم رہتی تھی بلکہ اوس لباس تک میں جسے وہ اس دنیا میں پہنا کرتے تھے کسی قسم کی تبدیلی نہ واقع ہوتی تھی۔

قدیم سچیوں نے جن کے خیالات حیاتِ اخروی اور بہشت و دوزخ یعنی نیکو کاروں اور گناہ گاروں کے امکان کے متعلق اپنے بت پرست پیش روؤں کے تصورات کے مقابلہ میں بہت زیادہ واضح و نمایان تھے انہیں قدیم تصورات کو تسلیم کر کے اوس پر اپنی طرف سے بہت کچھ حاشیے چڑھا دیے۔ اوس کو ذرا شک نہ تھا کہ آنے والی دنیا میں وہ اپنے احباب و اقارب سے اسی طرح مل کر باتیں کریں گے جس طرح اس دنیا میں کرتے ہیں۔ اور اوس کی یہ اُمید فطرتِ انسانی کے مقصنات کے لحاظ سے چنداں بیجا نہ تھی اس لئے کہ جب کوئی عزیز و دوست ہمیشہ کے لیے جدائی کا جانکاہ داغ دے جاتا ہے تو اس خیال سے کہ دوسری زندگی میں اوس سے ہماری ملاقات ہو ہی جائے گی ہمارے دل کو تسکین ہو جاتی ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق کہ روح جسم سے جدا ہونے کے بعد روزِ جزا تک کس حالت میں اور کہاں رہتی ہے صحیح صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے خیالات مختلف تھے۔ ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ روح قبر کے گرد و پیش منڈلایا کرتی ہے۔ دوسرا گروہ یہ سمجھتا تھا کہ مرنے کے بعد روح بحالتِ مرناسیمگی و پریشانی فضا کے بیسط میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہے۔ عام عقیدہ یہ تھا کہ سینٹ پیٹر بہشت کا دربان ہے۔ اور اوس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس کو چاہے دروازہ میں گھسنے دے اور جس کو چاہے روک دے۔ وہ ان انوں کی رجوع کو اپنی مرضی سے بہشت میں داخل کرتا ہے یا وہاں سے نکال دیتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اوس کے

ان اقتدارات کے منکر تھے جس کی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ جب روزِ جزا سے پہلے ہی سیدھے پیر  
لے روح کو بہشت میں داخل کر دیا یا دہان سے نکال دیا تو پھر روزِ جزا کی کیا ضرورت باقی رہی  
پاپاؤں کی گنجری کے زمانہ کے بعد یہ عقیدہ عام طور پر رائج ہو گیا کہ قیدِ عنصری سے آزاد ہو کر زمین  
ایک مقام پر رکھی جاتی ہیں جہاں اون کا تزکیہ ہوتا ہے یعنی بدو کو اپنی بدی کی تلافی کا موقع  
دیا جاتا ہے۔

مردوں کی روحوں کا وقتاً فوقتاً زندون سے اکر ملنا اور اپنے ویرینہ مساکن میں بود و باش  
اختیار کرنا ایک ایسا خیال ہے جسے یورپ کے تمام ممالک میں ہر زمانہ کے نہ صرف جہلا بلکہ  
عقلا بھی تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ جاڑے کے موسم میں غروبِ آفتاب کے بعد دیکھتے ہوئے  
سماں کے سامنے بیٹھ کر جب بھوت پریت سایہ کی کہانیاں دہرائی جاتی ہیں تو سنسنے والوں  
پر ایک دل کو بھلا معلوم ہونے والا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں اہل روماتین  
قسم کی ارواح کے قایل تھے۔ یعنی نیکن کی روحیں بدو کی روحیں اور اون لوگوں کی روحیں  
جن کے اعمال مشکوک تھے۔ اگر اس بارہ میں انسانی شہادت کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے تو  
حقیقت یہ ہے کہ قدیم الایام سے اس قسم کی صد ہا روایتیں جتنے راوی نہایت ثقہ اور معتبر  
سمجھے گئے ہیں اس مضمون کی ہم تک پہنچی ہیں کہ مردوں کی روحیں یا تو قبرستانوں میں جمع ہوتی  
ہیں یا میدانِ فلکوں کے تنگ و تاریک حجرِ دہن میں اقامت پذیر ہوتی ہیں۔ یا چاندنی رات  
میں تنہا خاموشی کے ساتھ چہل قدمی کیا کرتی ہیں۔

ادھر یورپ میں تو اس قسم کے خیالات مقبول خاص و عام ہوئے لیکن ایشیا میں اس کو  
برعکس دوسرے قسم کے خیالات جو تفصیل کے طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے عام طور پر پھیل گئے۔  
پیشہ ایمان مذہب نے سولہویں صدی میں ان کو اگرچہ دبا دیا لیکن اون کا استیصال کبھی  
کبھی نہ ہو سکا۔ خود ہمارے زمانہ میں بھی ان کی اشاعت ایک نہایت وسیع چارہ پر یورپ  
تہذیب میں اس خاموشی کے ساتھ ہوتی رہی کہ پاپاؤں کو دہانے مناسب سمجھا کہ اون کی صاف صاف

طور پر قلمی کہول دی جائے۔ چنانچہ پاپا کا دینی فرمان جب ”وینکین کونسل“ میں پڑھا گیا تو کونسل نے بالاتفاق ان خیالات کو موجب ضلالت و گمراہی قرار دے کر ایک فتویٰ جاری کیا جس میں اداں سب لوگوں کو ملعون ٹھہرایا گیا جو ان کو صحیح سمجھتے ہوں۔ اس فتوے کا ایک فقرہ یہ ہے:-  
 ”لعنت ہو اوس پر جو یہ کہتا ہے کہ روحانی اشیا کا انفصال یا خروج ذات باری سے ہوا ہے یا یہ کہ ذات باری اپنے مظاہر کے ذریعہ سے یا نشو و نما پانے کے بعد تمام چیزوں کی تشکیل قبول کر لیتی ہے۔“ چونکہ رومانی مذہبی کونسل نے ان عقاید کی تکفیر میں اپنے اقتدارات کا پورا زور صرف کیا ہے لہذا ضرور ہوا کہ ان کے مالہ و ممالک پر تاریخی پہلو سے منظر ڈالی جائے۔

ماہیت ذات باری کے تصورات سے ماہیت روح کے تصورات کا اثر پذیر ہونا لازمی ہے۔ ذات باری کے تصور سے مشرقی ایشیائیوں نے شخصیت کا خیال خارج کر دیا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ روح کو متعلق اولن کے ہاں مسئلہ انفصال و انجذاب رواج پا گیا۔ ویدانت میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ایک روح تمام کائنات میں ساری دائرہ ہے۔ اس روح کل یا خدا کی ماہیت وہی ہے جو روح انسانی کی ہے۔ نہ صرف ویدون میں بلکہ منو کی سمرتیوں میں بھی یہ دعویٰ موجود ہے کہ روح شعلہ عقل کل کی ایک چمکا رہی ہے جو اس سے جدا ہو گئی ہے اور ایک زمانہ موقت کے بعد اس میں پھر مل جائے والی ہے۔ اسی کا نام اصول انفصال یعنی جدائی و انجذاب یعنی ملاپ ہے۔ ویدون اور سمرتیوں میں روح کی کوئی شکل نہیں مانی گئی۔ مظاہر قدرت کو جیسی رعنائیاں اور رنگینیاں آنکھ اور دل کو بھاتی ہیں خدا کا محض ایک سایہ تصور کیا گیا ہے۔

ویدون کے مذہب نے ترقی کرتے کرتے بدلے مذہب کی شکل اختیار کر لی جو بنی نوع انسان کے جزو غالب کا ایمان ہے۔ اس مذہب کو ایک طاقت عالیہ کے وجود کا تو اعتراف ہے لیکن کسی ہستی عالیہ کے موجود ہونے سے انکار ہے۔ بدھوں کا عقیدہ یہ ہے



کہ قوت کا وجود اصلی حقیقی مادہ کو اپنا منظر بنا کر عالم شہود میں لاتا ہے۔ وہ مسئلہ انفصال و انجذاب کے قایل ہیں۔ ایک جلتی ہوئی شمع ادن کے نزدیک گویا انسان کی مورت ہے جس میں مادہ مجسم ہو کر قوت کے عمل ارتقا کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر ہم ادن سے سوال کریں کہ روح کا کیا حشر ہوگا تو وہ ہم کو یہ الزامی جواب دیتے ہیں کہ جب شعلہ بجھا دیا گیا تو اس کا کیا حشر ہوا اور جب مشعل جلی نہ تھی تو شعلہ کہاں تھا۔ کیا وہ اس وقت معدوم تھا اور اب فنا ہو گیا ہے؟ بدھ مذہب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ذات یعنی انانیت کا خیال جن نے ہمیں عمر بھر دھوکے میں ڈالے رکھا ہے شاید مرتے کے ساتھ ہی تو زایل نہ ہو لیکن رفتہ رفتہ ضرور جاتا رہتا ہے۔ اسی عقیدہ پر مسئلہ تنازع مبنی ہے شخصیت یا انانیت کے بتدریج مٹنے کے بعد واقعہ انجذاب یعنی عقل کل کے ساتھ روح کا اتحاد ظہور میں آتا ہے۔ اس حالت میں جس کو حالت نردان کہتے ہیں روح پر محویت یا خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور یہ ایک ایسا عالم ہے جس میں مادہ فضا اور زمانہ کے اعتبارات کا کہیں نشان نہیں ہوتا جس میں بھی ہوئی مشعل کا شعلہ چلا گیا ہے اور جس میں انسان پیدا ہونے کے قبل موجود تھا۔ یہی وہ انجام ہے جس کی انسان کو اُمید رکھنی چاہیے۔ یعنی یہ وہ حالت ہے جس میں روح قوت کل کی لذت وصال سے بہرہ اندوز ہو کر سرمایہ سرور بے پایاں و راحت جاویدان حاصل کرتی ہے۔

مشرقی یورپ میں ان خیالات کی ترویج کا پہلا ذریعہ ارسطو ہوا اور آگے چل کر وہ ان کا بانی مبنی سمجھا جانے لگا۔ کتب خانہ اسکندریہ نے اپنے دورِ آخر میں جو حکما پیدا کیے ان پر ان خیالات کا نہایت گہرا اثر ہوا۔ قلو نامی ایک یہودی شہنشاہ کیلیگیولا کے زمانہ میں رہتا تھا۔ اس کے تمام فلسفہ کا دار و مدار ہی مسئلہ انفصال پر ہے۔ پلاٹینس نے نہ صرف اس مسئلہ سے حقیقت روح انسانی کا معاملہ کرنا چاہا بلکہ اقاہم ثلثہ کی گتھی کو بھی اسی کی مدد سے سلجھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کا یہ خیال تھا کہ جس طرح نور کی ایک شمع آفتاب

نکلتی ہے اور جس طرح شعاع کے اجسام مادی پر پڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے اسی طرح باپ سے بیٹا اور بیٹے سے روح القدس نکل سکتی ہے۔ ان خیالات کی بنیاد قائم کر کے پلاٹینس نے اوس پر ایک مکمل مذہبی عمارت تعمیر کی اور ار باب زہد و ریاضت کو عالم قال سے عالم حال میں آنے کے طریقوں کی تعلیم دے کر یہ بتانا شروع کیا کہ عالم حال وصال عقل کل یا ذات باری کی پہلی منزل ہے۔ اور اس عالم میں روح پر خود فراسوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح فروریوس نے بھی انجذاب یا وصال باری کو معاد کے انتہائی مقصد سے تعبیر کیا۔ فروریوس تائزین پیدا ہوا تھا۔ رومان میں اوس نے حلقہ درس قائم کیا اور عیسائیت کے رومین بہت سی کتابیں لکھیں۔ یون تو یوسیبس اور سینٹ جردم نے بھی ان کتابوں کے جواب میں رسائل تصنیف کیے لیکن سب سے بڑی حجت قاطع شہنشاہ تھیوڈوسیوس کے جواب میں مضمون تھی جس نے فروریوس کی تصانیف کے تمام نسخے ہی جلوا دئے۔ فروریوس اپنی ناقابلیت پر افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے عالم حال میں خدا کے قرب سے چھ یا سی سال کی عمر میں صرف ایک دفعہ مشرف ہونے کا موقع ملا حالانکہ میرے استاد پلاٹینس نے کل ساٹھ برس کی عمر پائی اور اس عرصہ میں پھر مرتبہ وصال باری تعالیٰ کی نعمت سے شرف اندوز ہوا۔ براکلس نے بھی مسد الفصال و انجذاب کی بنا پر ایک مکمل مضابطہ دینیات مرتب کر کے طریقہ انجذاب سے بہت کچھ بحث کی ہے یعنی آیا روح قالب سے نکلتے ہی فنا فی اللہ ہو جاتی ہے یا کچھ عرصہ تک اپنی ذات کے ادراک میں مقید رہ کر بتدریج وصال کامل حاصل کرتی ہے۔

فتح اسکندریہ کے بعد یہی خیالات مسلمانوں میں پھیل گئے اور ادھون نے بہت جلد خدا اور روح البانی کے متعلق اپنے تجزیہ عقاید کو ادانی واقاصی کے لیے چھوڑ دیا۔ سب عربی فلسفہ نے ایک مستقل بالذات فن کی حیثیت اختیار کی تو مسد انجذاب و انفصال اس کے معرکتہ الآرا مباحث میں شریک ہو گیا۔ اون عقاید کے ترک کر دینے میں جو مسلمان

مملکت جہلا میں مقبول عام تھے مگر اسے اسلام نے ایک بڑی حد تک یہودیوں کا متبع کیا۔ یہودیوں نے اپنے آبا و اجداد کی تہذیبیت کو ترک کر دیا تھا اور اس معبود کے بجائے جو سابق میں معبود کے اندر نقاب اسرار اوڑھے رہا کرتا تھا ایک ایسے خدا کی پرستش شروع کر دی تھی جو عقل مطلق اور طاقت غیر محدود ہونے کے لحاظ سے کائنات کے ہر رنگ و ریشہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اور چونکہ یہ بات اون کی تہذیب میں نہ آئی تھی کہ کیوں کر ایک ایسی شے جو دفعۃً عدم سے وجود میں آئی ہو غیر فانی ہو سکتی ہے لہذا وہ اس عقیدہ پر راسخ ہو گئے کہ ہر انسان کا تعلق ایک طرف تو اس ازل سے ہے جس کی کوئی ابتدا نہ تھی اور دوسری طرف اس ابد سے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

عربوں کی دماغی ترقی کی ہر منزل میں عرب اور یہودی ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ادن کی پولیٹیکل تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تب بھی یہودی اور مسلمان دوش بدوش نظر آئیں گے۔ شام مصر اسپین جس ملک میں انھوں نے دونوں ایک ساتھ نظر آتے ہیں مغربی یورپ نے ان دونوں سے اپنے فلسفیانہ خیالات اخذ کیے۔ اور ان خیالات کو امتداد دینا اور اسے مسلک ابن رشد کی شکل میں بدل دیا۔ اسلام کو اگر فلسفیانہ رنگ میں دیکھنا چاہو تو ابن رشد کے مذہب کا مفادہ کرو۔ ابن یورپ عام طور سے ابن رشد ہی کو ان ضلالت آفرین عقاید کا بانی خیال کرتے تھے اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے اسی اعتبار سے اس کو مذہب و ملامت قرار دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان خیالات کا محض جامع اور شائع تھا اور بس۔ اس کی تصنیفات نے عیسائی دنیا پر دو طرف سے حملے کئے۔ یعنی ایک طرف تو اسپین سے براہ جنوبی فرانس اور مہنہ نے اٹلی کے شمال میں پہنچ کر رستہ میں بہت سے عقاید کو بدل ڈالا اور دوسری طرف تسلی سے روانہ ہو کر شہنشاہ فریڈرک ثانی کی حمایت میں وہ تیار ہوئی ہوئیں جنہوں نے اٹلی میں جا پہنچیں۔

لیکن اس زبردست عقلی حملہ سے مدد تو ان پہلے یورپ میں بعض مستشرقین بطور خود شریقی

خیالات کی اشاعت میں حصہ لے چکے تھے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہم ایک برطانوی حکیم جان اریجینا (سنہ ۱۷۷۲ء) کے خیالات درج ذیل کرتے ہیں۔ اریجینا مشائی المذہب تھا اور ارسطو کے فلسفہ کی تعلیم دیتا تھا۔ وہ ازراہ ارادت یونان کے اس نامور فلسفی کے مولد کی زیارت بھی کر چکا تھا۔ اوس کی یہ آرزو تھی کہ فلسفہ اور مذہب میں اون سیسی پادریوں کے طریقہ مجوزہ کے موافق اتحاد پیدا کیا جائے جو اندلس کی اسلامی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے۔

انٹیسٹیس نے ایک چٹھی میں جو اوس نے شاہ چارلس الملقب بہ اتملق کو نام لکھی ہے اریجینا کی تحریر علی اور فکر دقیقہ سچ کا ذکر کرتے ہوئے ان الفاظ میں اپنا نتیجہ ظاہر کیا ہے :-  
 ”سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسا وحشی جو دنیا کے دوسرے کنارے سے آیا ہے اور دانشمند و فرزانہ اشخاص کی صحبت سے بے بہرہ ہے کیوں کر بڑے بڑے ادق علمی مسائل کے سمجھنے اور انہیں اس خوبی کے ساتھ ایک غیر زبان میں ترجمہ کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔“ اریجینا کی تصانیف کا عام مقصد جیسا کہ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں یہ تھا کہ فلسفہ اور مذہب میں اتحاد پیدا کرے لیکن اس موضوع پر قلم اٹھانا تھا کہ پادریوں نے اوس پرے دے شروع کر دی اور اوس کی اکثر تصانیف جلا دی گئیں۔ اوس کی سب سے زیادہ مشہور کتاب کا نام ”تقسیم قدرت“ ہے۔

اریجینا کا فلسفہ مشابہ اور تجربہ کے اس نچوڑ پر مبنی ہے کہ ہر ایک زندہ شے کسی ایسی شے سے پیدا ہوتی ہے جو پہلے زندہ تھی۔ عالم مرئی چونکہ دنیا سے حیات ہے لہذا لازمی طور پر اس کا انفصال یا خدج کسی وجود اولین سے عمل میں آیا ہے اور وہ وجود خدا ہے جو ہم سب کا پیدا کرنے والا اور محافظ ہے۔ ہر وہ شے جو ہمیں نظر آتی ہے اپنے وجود کو بحیثیت ایک شے مرئی کے اوس قوت کے ذریعہ سے قائم رکھتی ہے جو خدا سے ماخوذ ہے اور اگر یہ قوت ہٹالی جائے تو ضرور ہے کہ شے معدوم ہو جائے۔ اس طور پر خدا کے متعلق اریجینا کا یہ خیال ہے کہ وہ قدرت کے ہر عمل میں علی التوالی والتوازی حصہ لیتا ہے یعنی وہ قدرت کا

بچانے والا۔ قایم رکھنے والا اور سنبھالنے والا ہے۔ اور اس لحاظ سے گویا یونانیوں کی ہمہ گیر روح یا عقل فعال کے مشابہ ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ افراد کی زندگی وجود عام یعنی روح عالم کا ایک جزو ہے۔

اگر وہ قوت جس پر تمام اشیا کے وجود کا مدار ہے ہٹالی جائے تو ان اشیا کا رجوع اپنے مبداء اصلی کی طرف لازمی ہے یعنی ضرور ہے کہ وہ ذات باری کی طرف راجع ہو کر اوس میں غم یا جذب ہو جائیں۔ اس طور پر کل مظاہر کائنات کا انجام کار عقل فعال میں پیوست ہو جانا لازمی ہے۔ اریکینا کا قول ہے کہ ”جسمانی موت جسم کی حالت اصلی یا ہیئت۔ تدبیری کی طرف عود کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے کہ اصوات فنا ہو کر ہوا میں جا ملتی ہیں جو اون کا مبداء و منشا اور مدار علیہ ہے اور پھر سنائی نہیں دیتیں۔ کسی شخص کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اون کا کیا حشر ہوا۔ اوس آخری اور انتہائی انجذاب کی حالت میں جو ایک میعاد موت کے بعد لازمی طور پر ظہور پذیر ہونے والی ہے حضرت خدا ہی کی ذات موجود ہوگی۔ بجز اوس کے اور کچھ نہ ہوگا۔“ ایک اور مقام پر بحث ذات باری میں وہ لکھتا ہے :- ”میں اوسے کل کائنات کا مبداء اول اور علت العلل سمجھتا ہوں۔ تمام وہ اشیا جو ہیں اور نیز تمام ایسی اشیا جو نہیں ہیں مگر ایک زمانہ میں تھیں اوسی سے پیدا ہوئیں اوسی نے پیدا کیں اور اوسی میں پیدا ہوئیں۔ اس کے علاوہ میں اوس کو کل کائنات کی انتہا اور ساعت موقت خیال کرتا ہوں جس کا ملنا ممکن نہیں۔ کائنات کے تصور کی چار شکلیں ہیں۔ ان میں سے دو اشکال یعنی آغاز و انجام کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے اور دو کا تعلق بطور سبب و مسبب یا علت و معلول موجودات ترکیبی یا طبعی سے۔ باقی اور غیر فانی بجز خدا کے اور کوئی نہیں۔“

عقل کل کی طرف روح کی اس رجعت کو اریکینا نے جس لفظ سے تعبیر کیا ہے وہ فنا فی اللہ کا مترادف ہے۔ مقام فنا میں داخل ہو کر روح کو اپنے سابقہ تجربے مطلقاً فراموش

ہو جاتی ہیں اور اوس کی وہی حالت ہو جاتی ہے جو جسم میں داخل ہونے سے پہلے تھی۔  
ظاہر ہے کہ ایسے عقاید کو اہل مذہب کس طرح استحسان کی نظر سے دیکھ سکتے تھے۔ اریجنینا  
پر کلیسا کا عتاب نازل ہوا اور پادری اوس کے درپے آزار ہو گئے۔

سب سے اول جس قوم کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ قوت غیر فانی اور ابدی ہے وہ ہندوؤں  
کی قوم تھی۔ اس حقیقت کا مفہوم اوس اصول سے ملتا جلتا ہے جسے علمی اصطلاح میں ”مجم تناسب  
و صیانت قوت“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ نظام عالم کا قیام و ثبات بھی اس اصول کی حقیقت کا موجد  
ہے اس لیے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر کائنات کی مجموعی مقدار قوت میں کچھ بھی کمی یا  
بیشی ہو جائے تو نظام عالم کا شیرازہ بکھر جائے۔ پس یہ واقعہ کہ کائنات میں توانائی یا قوت  
کی ایک معین اور غیر متغیر مقدار موجود ہے ایک علمی حقیقت ہے جس کے تسلیم کیے بغیر چارہ  
نہیں۔ جو تغیرات ہمیں اس دنیا میں نظر آتے ہیں اون کی وجہ محض اس قوت کی  
تقسیم ہے۔

لیکن چونکہ روح ایک قوت فعال ہے لہذا ایک بالکل نئی روح کا دم سے وجود میں  
آنا اس کا مستلزم ہوگا کہ جو قوت کائنات میں پہلے سے موجود تھی اوس میں کچھ اضافہ کیا جائے  
اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آج تک جتنے انسان پیدا ہوئے ہیں ہر ایک کی پیدائش کے  
وقت دنیا کی قوت میں بقدر ہر انسان کی روح کے اضافہ ہوتا رہا اور آئندہ بھی جتنے انسان  
پیدا ہونے والے ہیں اون میں سے ہر ایک کے متعلق اسی عمل کا اعادہ ہوتا رہے گا تو اس کے  
یہ معنی ہونے کہ قوت کی مجموعی مقدار ہر وقت بڑھتی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ اکثر زاہد و متواضع لوگ اس خیال پر کراہت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ  
سکتے کہ قادر مطلق اپنے بندوں کے تلون اور شہوائے نفسانی کا تابع ہے کہ نطفہ کے استقرار کی  
کچھ مدت کے بعد اوسے جنین کے لیے ایک نئی روح پیدا کرنی پڑتی ہے۔

چونکہ انسان کی شخصیت روح و جسم و دو اجزا سے مرکب ہے لہذا ایک اور تعلقات

دوسرے کے پوشیدہ اور غیر معلوم تعلقات پر بہت کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ اجزا جن سے جسم نے ترکیب پائی ہے اس عام مادہ سے ماخوذ ہیں جو ہمارے گرد و پیش موجود ہے اور مرنے کے بعد اسی مادہ میں جا کر مل جاتے ہیں۔ اس مشابہت سے یہ بدیہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا صانع قدرت نے شخصیت انسانی کے مادی حصے کے آغاز و انقباض و انجام کی شکل میں ہماری آنکھوں کے سامنے ایسا عقدہ تو پیش نہیں کیا جس کے حل کرنے سے ہمیں جسم کے رفیق یعنی روح کے آغاز و انجام کا علم حاصل ہو سکے؟

اؤ دیکھیں ایک بہت بڑے زبردست مسلمان فلسفی امام غزالیؒ (سنہ ۵۰۵) کا قول اس بارہ میں کیا ہے:-

”خدا نے انسان کی روح کو اپنے نور کے ایک قطرے سے پیدا کیا ہے اور اس قطرے کی خلقت کا منشا یہ ہے کہ جس سمندر سے نکلا تھا آخر کو اسی میں جا کر مل جائے۔ اپنے نفس کو اس خیال لایینی سے دھوکا نہ دو کہ جسم کے فنا ہوتے ہی روح بھی فنا ہو جائے گی۔ جب تم دنیا میں آئے تھے تو تمہاری شکل کچھ اور تھی اب کچھ اور ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ چونکہ تمہارا جسم ہلاک ہو گیا ہے لہذا روح بھی ہلاک ہو جائے۔ تمہاری روح اس دنیا میں ایک تازہ وارد مسافر کے طور پر آئی ہے اور چند دن کے لئے گویا ایک سرائے میں مقیم ہے۔ اس زندگی کی مصیبتوں اور بلاؤں سے ہماری پناہ خدا کے ہاں ہے۔ سکون جاودانی ہم کو اوسی وقت حاصل ہوگا جب ہم وصال جناب باری کی نعمت سے مستفیض ہوں گے۔ اور یہ حالت مطہرہ جب حاصل ہو جائے گی تو ہم کو وہ راحت ملے گی جس میں رنج کی آمیزش نہیں۔ وہ طاقت نصیب ہوگی جو کمزوری سے مبرا ہے۔ وہ علم حصہ میں آئے گا جو شک سے پاک ہے۔ اور حیات و نور کے اوس سرخیشہ ابدی کا دیدار میسر ہوگا جو ہمارا مبداء و منشا ہے۔“

پتھر میں چونکہ مادہ کے ذرات متحرک ہو کر بحالت اعتدال قائم ہیں لہذا وہ ہمیشہ تک برقرار رہ سکتا ہے لیکن حیوان کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ مادہ کی ایک نہر کے

سلسلہ بہاؤ کی ایک خاص شکل ہے۔ اس کو ادھر غذا ملتی ہے اور دھر فضلہ خارج ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حیوان ایک آبشار یا باندی یا شعلہ کے مشابہ ہے۔ یعنی آبشار یا باندی یا شعلہ کی طرح اُن ذرات کو جس سے یہ مرکب ہے مطلق قرار نہیں کیونکہ یہ ذرات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے تسلسل یا حیات کا دار و مدار خارجی اجزاء کے مشمول پر ہے۔ اس کی عمر طبعی کی ایک میعاد مقرر ہے اور ایک نہ ٹلنے والی ساعت ایسی آتی ہے جب اسے چاروں ناچار مرنا پڑتا ہے۔

ایک ہی واقعہ کو پیش نظر رکھنے سے فلسفہ روح کا عقد شکل مل ہونا دشوار ہے۔ ہمیں چاہیے کہ جس قدر واقعات سے مدد لے سکیں لیں۔ روح انسانی کی گتھی اُس وقت تک پوری طرح سے نہیں سلجھ سکتی جب تک روح حیوانی کی حقیقت پر بھی ساتھ ہی ساتھ غور نہ کیا جائے۔ ہمیں ڈیکارٹ کے طریقہ سے کام لے کر یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا ان ذرات کی رو میں حیوانوں کی روحوں سے کوئی قرابت رکھتی ہیں اور آیا نشوونما کے لحاظ سے ان دونوں کا تعلق ایک ہی سلسلہ سے ہے جس کا حصہ فوقانی روح انسان ہے اور حصہ تحتانی روح حیوان چوٹی کی فہم و فراست سے جو نیاز ہم افذکرین اُن پر بھی ہمیں ایسا ہی غور کرنا چاہیے جیسا انسان کی عقل و بصیرت کے کرشموں پر۔ اعضاء انسان کی تشریح کا علم آج اس درجہ کمال کو پہنچا ہوا نہ ہوتا اگر اس پر علم تشریح اعضاء حیوانات کی روشنی نہ پڑتی۔

برڈوئی نے واقعات پر نظر فائر ڈالنے کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ روح انسانی

لے فرانس کا سب سے زیادہ مشہور فلسفی ہے جس کے تخیل نے مابعد الطبیعیات پر ایک غیر ممکن الحاق پیش چھوڑا ہے۔ عقلیات میں اُس کا اصل اصول یہ نکتہ ہے کہ میرے وجود پر میری قوت غور و فکر گواہ ہے۔ تجربہ اور شاہد کی تائید کہ وہ موجودات کی حقیقت کی تصدیق کے لیے فرد ہی نہیں خیال کرتا بلکہ ذہنیات ہی کو حق مطلق کے اکتشاف کا ذریعہ اولیٰ سمجھتا ہے۔ ڈیکارٹ کا سن ۱۵۹۶ء اور سن وفات ۱۶۵۰ء ہے۔ مترجم

سے سرخشن کالن برڈوئی انگلستان کا ایک مشہور طبیب ہے جسے فنِ جراحی سے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)



اور روح حیوانی کی ماہیت ایک ہے۔ جو شخص کتے کی عادات و خصایل سے اچھی طرح واقف ہے اسے یہ بات ماننی پڑے گی کہ کتا نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے اور جب کوئی خطا کرتا ہے تو جانتا ہے کہ اس سے یہ خطا ہوئی۔ بہت سے پالو جانور دن میں قوت استدلال موجود ہوتی ہے اور وہ حصول مقاصد کے لئے مناسب تدابیر عمل میں لاتے ہیں۔ کون ہے جس نے باغی اور بندر کے ارادی افعال و حرکات کی بے تعداد مثالیں نہیں سنیں۔ اور ان جانوروں کے یہ عقائد ان افعال کچھ عقیدہ جامد یا ان سے میل جول رکھنے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان کی فطری سرشت کا لازمہ ہیں اس لیے کہ جنگلی جانور بھی جنہیں ان کی صحبت کا اتفاق نہیں ہوا اسی قسم کے اوصاف سے متصف پائے گئے ہیں۔ مختلف انواع کے حیوانوں میں ذہنی قابلیت اور عادات و خصایل کے لحاظ سے بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً کتا نہ صرف بلی کی نسبت زیادہ سمجھدار ہوتا ہے بلکہ اس میں وہ عمرانی و اخلاقی صفات بھی پائی جاتی ہیں جو بلی میں موجود نہیں ہیں۔ کتے کو اپنے آقا سے محبت ہوتی ہے اور بلی کو اپنے گھر سے۔

ڈو بوا ریمان کا یہ قول ہمیں نہیں بھولنا: ”کارگاہ ہستی کے عجائبات پر ایک ہمہ گیر اور گہری نظر ڈالو۔ اور ننھی سی چیونٹی کے اس دماغ کو دیکھو جو مقدار میں جزو لای تجزی سحر کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ مادہ کے اس عصبی ذرہ میں اس روح کو کرشمہ سنج دیکھ کر تم پر رعب اور حیرت طاری ہو جائے گی جس میں محنت و استقلال۔ اختراع و ایجاد۔ ترتیب و تناسب۔ و فائیکشی۔ و جان سپاری اور شجاعت و دلادری کی شانیں پہلو پہلو جلوہ گر ہیں۔ غور تو کر دیکھو چیونٹی کو یہ ترقی کتنے زمانہ میں جا کر نصیب ہوئی ہے۔ بے تعداد سلکون نے شبانہ روز محنت کی ہر تب کہیں جا کر خدا کی یہ ننھی سی مخلوق اس درجہ کمال کو پہنچی ہے۔“

(بقیہ مضامین منہ گذشتہ) دستگاہ کامل حاصل تھی۔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۸ء میں مکہ معظمہ و کتبہ۔ یہ کہہ کر اس طرح مقرر ہوا۔ اس کی تاریخ انتقال ۱۸۳۸ء کو ۱۲۷۸ھ ہے۔ علم الاراض علم الاصلہ اور علم النفس پر اس کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔ مترجم

ہیو بر جس نے چیونٹی کے حالات پر ایک نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز رسالہ لکھا ہے بیان کرتا ہے کہ ”اگر تم کسی چیونٹی کے طرز عمل کو اوس وقت جبکہ وہ کام کر رہی ہو بغور دیکھو تو تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ وہ آگے چل کر کیا کرے گی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جب میں چیونٹیوں کے ایک گروہ کو اپنا گھر بناتے دیکھ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک داروغہ نے اگر عمارت کا معائنہ کیا لیکن جب اوسے معلوم ہوا کہ مستریوں نے دیوار کی بلندی یعنی رکھنی چاہیے تھی نہیں رکھی اور چھت ڈالنی شروع کر دی ہے تو اوس نے فوراً چھت اُدھڑا ڈالی اور دیوار دن کو کافی بلند کر کے پرانی چھت کے سالے سے نئی چھت از سر نو ڈلوائی۔“ کیا اس بیان کے بعد بھی شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ یہ کٹرے محض کلین ہیں جن سے تمام افعال بر سبیل اضطراب سرزد ہوتی ہیں۔ مشیت۔ ارادہ و اختیار کون سی ایسی صفت ہے جو ان میں نہیں پائی جاتی ؟ چیونٹیاں جب اپنی پرانی سہیلوں کو کئی مہینوں کے بعد دیکھتی ہیں تو اد نہیں فوراً پہچان لیتی ہیں اور اس ملاقات پر خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کا منہ سے منہ ملا کر باتیں کرنا دیکھو۔ اس طریقہ سے یہ بہت سے خیالات ظاہر کر سکتی ہیں۔ یہ طریقہ اظہار خیالات ان کے گھر کے لیے جس کے اندر چاروں طرف اندھیرا گھپ چھایا ہوا ہے ہر طرح سے موزون ہے۔

اکیلے رہنے والے کیڑوں کی اتنی عمر نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش کر سکیں لیکن اکٹھے مل کر رہنے والے کیڑوں کی زندگی زیادہ ہوتی ہے۔ اون میں اخلاقی خواہشیں موجود ہوتی ہیں اور وہ اپنے بچوں کی تربیت اور پرورش خاص اہتمام سے کرتے ہیں۔ یہ بیچ میرزا جانداز جو محنت و استقلال کی زندگی تصویریں ہیں سولہ سولہ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹی روزانہ کام کرتے ہیں۔ حالانکہ بہت کم آدمی ایسے ہوں گے جو دماغی محنت ایک وقت میں

لے فرمائے (ہیو بر (التونی) سٹریٹز لینڈ کا ایک مشہور ماہر علم خواص الاشیاء ہے۔ اگرچہ آخر آخر میں بصارت سے محروم ہو گیا تھا لیکن اپنی بی بی اور ایک وفادار ملازم کی مدد سے اس نے شہد کی کہیوں اور چیونٹیوں کو حالات کے متعلق نہایت قیمتی مواد فراہم کیا اور اپنی معلومات کو ۱۸۹۷ء میں بصورت کتاب شائع کیا۔ مترجم

سلسلہ چار پانچ گھنٹے سے زیادہ کر سکیں۔

نتیجہ کی کیسانی اسباب کی یکسانی پر دلالت کرتی ہے اور افعال کی مشابہت اعضا کی مشابہت کو تسلیم ہے۔ ہمارے وہ ناظرین جو جانور دن کی عادات و خصایل سے عموماً اور چیونٹی کے تمدن سے خصوصاً پوری واقفیت رکھتے ہیں اگر ہماری کتاب ”یورپ کی داغی ترقی کی تاریخ“ کا انیسواں باب ملاحظہ فرمائیں گے تو انہیں ملک سپر واقع امریکا کی وحشی قوم انکا کے تمدن کی کیفیت معلوم ہوگی۔ ظاہر ہے کہ چیونٹی ایک ذرہ ناچیز ہے اور انسان ان شرف المخلوقات لیکن چیونٹی کے تمدن اور قوم انکا کے تمدن کا موازنہ کرنے کے بعد اور ان خصوصیات رسم و رواج و عادات و خصایل کو میزان تقابل میں تو لے کر کے بعد جو ان دونوں میں یا ہی باقی ہیں ناظرین کو شاید ہم سے اس رائے میں اتفاق ہوگا کہ مشہد کی کلیتیں اور بیڑوں اور چیونٹیوں اور پرندوں اور آدمیوں اور تمام چھوٹے درجے کے حیوانات سے جنہیں انسان حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اس سے ایک دن یہ سبق سکھنا ہے کہ خود اس کی حقیقت اور ہستی کیا ہے۔

ڈیکارٹ تمام کیڑوں کو خود بخود چلنے والی کلیت تصور کرتا ہے۔ لیکن یہ خیال بہت کچھ ترمیم کا محتاج ہے۔ کیڑے محض اس اضطراری حرکت کے لحاظ سے تو متحرک بالذات کلیت کہے جاسکتے ہیں جو ان کے خیط البطن اور سلتہ الراس کے اس حصہ سے سرزد ہوتی ہے جس کو ایک ہی وقت میں مختلف احساسات سے اثر پذیر ہونے سے تعلق ہے ورنہ باقی ہر اعتبار سے وہ متحرک بالارادہ اور فاعل مختار ہیں۔

جس مادہ سے اعصاب مغوط مرکب ہیں اس کا ایک کام یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے جو نقوش اشتیاق خارجی کے اس پر ترسم ہوں ان کے آثار و باقیات کو محفوظ رکھے۔ اس لحاظ سے سلتہ الاعصاب کو جو اسی مادہ سے بنا ہے گویا نظام تصور کا محکمہ اندراج نقوش سمجھنا چاہیے۔ نظام عصبی کے عمل میں اس کی وجہ سے زمانہ کا عنصر بھی داخل ہو جاتا ہے یعنی وہ نقش جو سلتہ الاعصاب کے موجود نہ ہونے کی حالت میں فوراً منجربہ رد عمل ہوتا۔

کچھ دیر تک حالت اصلی پر قائم رہتا ہے اور اس قیام کی وجہ سے وہ تمام اہم نتائج مترتب ہوتی ہیں جنہیں بہت سے قدیم وجدید نقوش کے باہمی تعامل نے پیدا کیا ہے۔

کوئی خیال خود بخود نہیں پیدا ہو سکتا۔ ہر عقلی فعل کسی فعل سابق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اوس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک کہ کوئی شے جو پہلے گزر چکی ہے اوس کے وجود میں آنے کا باعث نہ ہو چکی ہو۔ دودماغ جن کی ساخت میں سرمو فرق نہیں اگر یکساں حوالی میں ہوں گے تو اودن سے ایک ہی سا خیال پیدا ہوگا۔ اس مشابہت عمل یا یکسانی خیال کو تیز مشترک کا نام دینا چاہیے جس سے مراد فہم و شعور کی وہ عام قابلیت ہے جو دماغ میں بطور قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ خیال کے پیدا ہونے کی دوجداگانہ حالتیں ہوتی ہیں یعنی ایک تو دماغ کی وہ حالت جو نقوش یا تصورات مابقی پر منحصر ہے اور دوسری وہ حالت جس کا دار و مدار موجودہ طبیعی حالات پر ہے۔

کیٹرون کے سلعتہ الراس میں اون نقوش کے آثار کا خزانہ جمع رہتا ہے جو معمولی اعضا بیرونی پر مرتب ہوتے ہیں اور باصرہ و شامہ و سامعہ کے ذریعہ سے جو احساسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں وہ ان اعصاب میں رکھی رہتی ہیں۔ دونوں کا تعامل اضطراری حرکات کو تبدیل بہ افعال اختیاری کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کیٹرون کو خود بخود حرکت کرنے والی کلون پر جن میں انتقالش فوری رد عمل کا مستلزم ہے فوقیت حاصل ہو۔

ہر مرکز عصبی کا فعل عام اس سے کہ وہ مرکز ترقی کے درجہ اعلیٰ میں ہو یا ادنیٰ میں ایک اصولی حالت کی پیروی کے تابع ہوتا ہے جسے ایک اسے تعبیر کرتے ہیں۔ خود انسان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ خون جو اوس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے ایک لمحہ کے لیے روک دیا جائے تو نظام عصبی کی طاقت زایل ہو جاتی ہے اور اگر گرم کر دیا جائے تو مقدار کم شدہ کی مناسبت سے کم ہو جاتی ہے لیکن اگر بڑھا دیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ کچھن سے ملی ہوئی نائٹروجن تنفس کے ذریعہ سے پھیپھڑوں میں پہنچائی جائے تو اعصاب کی عملی قوت

اوی نسبت سے بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدل یا تحلیل کی ضرورت واقع ہوتی ہے اور نکلان اور بیداری کے بعد آرام کرنا اور سونا لازمی ہے۔

اشیائے خارجی کے ہر ادراک کے ساتھ دو اصولی خیالات لازمی طور پر وابستہ ہیں۔ یعنی زمان و مکان۔ ان دونوں تصورات کے لیے نظام عصبی میں ابتدا ہی سے جبکہ وہ ناقص و غیر مکمل ہوتا ہے گنجائش رکھ دی جاتی ہے۔ آنکھ سے مکان کا احساس ہوتا ہے اور کان سے زمان کا اور ان دونوں اعضا کی مکمل ساخت نے ادراک زمان و مکان کو اس قدر خیم کر دیا ہے کہ اگر صرف قوت لاسہ ہی سے کام لیا جاتا تو ہرگز اتنا صحیح ادراک نہ ہو سکتا۔

سلطنت الاعصاب کی لوح پر ارسام نقوش کی کیفیت چند سا وہ تجربہ یوں سے واضح ہو سکتی ہے۔ اگر کسی مرد مجلداً و آبدار دھات مثلاً ایک نئے استری کے پھل پر کوئی شے مثلاً ایک قرص رکھ دیا جائے اور سانس کی بھاپ دے کر غمی کے خشک ہو جانے کے بعد قرص کو اٹھایا جائے تو اگرچہ نہایت غور سے دیکھنے پر بھی استری کی آبدار سطح پر کوئی شکل نظر نہ آئے گی لیکن اگر منہ سے پھر بھاپ دی جائے گی تو قرص کا دھندلا سا سیاہ نمودار ہو جائیگا اور یہ غل ایک دفعہ نہیں بلکہ مکرر کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اگر استری کو بحفاظت تمام بند کر کے ایسی جگہ رکھ دیا جائے جہاں اس کے پھل کی آب و تاب میں فرق نہ آنے پائے تو کئی مہینے کے بعد جب پھر اس کو منہ سے بھاپ دی جائے گی تو قرص کا سیاہ موہوم پہلے کی طرح نظر آنے لگے گا۔

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناپیز سے ناپیز نقش اس طور پر قائم ہو کر محفوظ رہ سکتا ہے۔ پس جب ایک ایسی جمادی وغیرہ عضوی سطح پر ایک اسٹ نقش نمودار ہو سکتا ہے تو اس طرح اعصابی پر تو اسے بدرجہ اولیٰ مرسم ہونا چاہیے جسے صالح قدرت نے تیار ہی اسی مقصد سے کیا ہے۔ کوئی سایہ بھی دیوار پر ایسا نہیں پڑتا جو اپنا مستقل نشان وہاں نہ چھوڑ

جاتا ہو اور اگر مناسب تدابیر عمل میں لائی جائیں تو یہ نشان ظاہر ہو سکتا ہے۔ عکسی تصاویر کا عمل اس دعوے کا ثبوت ہے۔ ہمارے احباب و اقارب کی تصویریں اور مناظر قدرت کے نقشے آئینہ عکسی کی ذکی الحس سطح پر گوہیں آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے لیکن جب مناسب اودو یہ کا استعمال کیا جاسے تو وہ جھٹ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ گویا ایک پری ہی جو ہمارے عمل سے سریشہ میں اتر آتی ہے اور وہ پیکر جمالی جو پہلے جلاب خفا اڈھے ہوئے تھا چہرے سے نقاب الٹ دیتا ہے۔ ہمارے غفی سے غفی غلوت کدے میں جہان ہم یہ سمجھے ہیں کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا اور کسی نامحرم کی نظر وہاں تک نہیں پہنچ سکتی ہمارے تمام افعال و اعمال کے نشانات و آثار موجود ہوتے ہیں اور جو کچھ ہم نے کیا ہے اوس کی ایک دھندلی سی تصویر سیاہ سایہ کی شکل میں نقش دیوار بنی ہوئی پائی جائے گی۔

اگر کچھ دیر تک پلکین بند رکھنے کے بعد مثلاً صبح کو جاگتے وقت ہم یکایک ٹنگی کی باندہ کر کسی روشن چیز کی طرف دیکھتے رہیں اور پھر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں تو جس غیر محدود تاریکی کا میدان ہمارے سامنے پھیلا ہوا ہوگا اوس میں اس چیز کا سایہ ہمیں نظر آئے گا۔ یہ سایہ کوئی خیالی شے نہ ہوگا بلکہ فی الحقیقت موجود ہوگا اس لئے کہ اصل شے کی جن باریکیوں پر چشم زدن میں ہمیں غور کرنے کا موقع نہ ملا تھا وہ ہمیں اس سایہ میں نظر آ سکتی ہیں۔ مثلاً جاگتے وقت جس چیز پر اول اول ہماری نظر پڑی وہ اگر جالی کا پردہ تھا جس میں پھولدار لیس ٹکی ہوئی تھی یا درخت کی شاخیں تھیں جو ہماری خواہ گاہ کے درجہ کے باہر آگاہ ہوا تھا تو پلکین بند کرنے کے بعد پردے یا شاخ درخت کی پوری تصویر بلا کم و کاست ہماری آنکھوں میں پھر جائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ تصویر دھندلی ہوتی جاتی ہے اور ایک دو منٹ میں بالکل غایب ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر موج غلامین تیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اگر ہم آنکھ کی پتلی کو حرکت دے کر اس صورت طلسمی کا پیچھا کرنا چاہتے ہیں تو وہ یکایک نگاہ سے غایب ہو جاتی ہے۔

مشبکہ یعنی آنکھ کے پہلے پردے پر نقوش کے اس امتداد سے ثابت ہوتا ہے کہ اعصاب منقوٹ پر خارجی اثرات کا عارضی و آتی ہونا کچھ ضروری و لازمی نہیں ہے۔ آنکھ کے ان نقوش اور عکسی تصاویر کے نقوش میں امتداد انجلاہ و انطفا کے لحاظ سے پوری مطابقت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہم نے میکسکو کے مناظر و اماکن کی ایسی عکسی تصویریں دیکھی ہیں جنکی نسبت عکاسوں کا بیان ہے کہ شیشہ عکسی پر مبینون بعد تئو یارک میں یہ ادویہ کا عمل کیا گیا اور جب اس سفر طویل اور مدت مدید کے بعد تصویریں شیشہ پر ابھر کر کاغذ پر اتریں تو خط و خال اور ٹوک پلک کے لحاظ سے اصل اور نقل میں سرمو فرق نہ تھا۔ گویا شیشہ عکسی نے اپنی ودیعت کو پوری طرح سے ادا کر دیا۔ ہمیشہ قائم رہنے والی سرنگلک پہاڑوں کا ڈیل ڈول اور ڈاکوڑن کے کسی گردہ کے لادو کا کچھ دیر میں غایب ہو جانے والا دھوان کوئی تفصیل ایسی نہ تھی جو تصویر میں رہ گئی ہو۔

ان واقعات کے مشابہ کو بعد یہ سوال پیدا ہونے لگا کہ آتات حس فی جن نقوش کو خارجی اشیا سے فراہم کیا ہے آیا اون کے آثار جس طرح مشبکہ میں عارضی طور پر قائم رہتے ہیں دماغ میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوتے ہیں؟ کیا قوت حافظہ کے معنی یہی ہیں کہ روح حوادث گذشتہ و واقعات ماضیہ کی اون تصاویر کو جو اوس کے سپرد کر دی گئی ہیں مستحضر رکھنے کی کوشش میں مصروف ہے؟ کیا اوس کے نگار خانہ میں جہاں خاموشی کا عالم طامی ہے زندہ اور مردوں کی ننھی ننھی تصویریں اور دیکھے ہوئے مناظر اور آزمائے ہوئے واقعات کے نقشے لٹکے ہوئے ہیں؟ کیا یہ مستقل اور دیر پا نقوش کسی کتاب کے حروف کی طرح محض وہ علامتیں ہیں جو دماغ میں خیال پیدا کرتی ہیں یا اشیاے خارجی کی ایک نہایت ہی چھوٹے پیمانہ پر حقیقی شبہیں ہیں جن کو خود بین کی مدد سے دیکھ کر ہمیں اتنی سی جگہ میں جو سوئی کے سوراخ سے زیادہ نہیں پوری کتب کا مرتع ایک گاہ میں نظر آ جاتا ہے؟

منشککہ پر جو خیالی تصاویر نقش ہوتی ہیں وہ دون کی روشنی میں نظر نہیں آسکتیں اسی طرح وہ تصاویر جو پردہ حسن مشترک پر اتری ہوئی ہیں اوس وقت تک ہماری توجہ کو اپنی طرف مایل نہیں کرتیں جب تک کہ آلات حس اپنے کام میں چلتی اور استعدادی سے مصروف رہ کر نئے نئے نقش حس مشترک کے لیے جمع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب یہ آلات تھک کر سست پڑ جاتے ہیں یا جب ہمیں سخت فکر و استغیر ہوتی ہے یا جھٹ پٹے کے وقت ہم بیٹھے ہوئے کسی سوچ میں محو ہوتے ہیں یا جب ہم سو رے ہوتے ہیں تو یہ معنی مورتیں اپنے نہانہ خانہ سے نکل آتی ہیں اور چونکہ اس وقت ان کا امتیاز بوجہ تقابل و تضاد و نمایاں ہو جاتا ہے اس لیے یہ صاف صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بخار کی حالت میں جب ہم پر ہذیان طاری ہوتا ہے یا موت کے وقت جب ہم عالم سکرات میں ہوتے ہیں تو یہ بھی چھپائی تصویریں ہمارے سامنے اکھڑی ہوتی ہیں۔ ہماری زندگی کا ایک تنہائی حصہ نیند میں گذرتا ہے اور اس زمانہ میں ہم پر عالم خارجی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سامعہ باصرہ اور دوسرے قوا معطل ہوتے ہیں لیکن وہ کبھی نہ آنکھ پھینکے والی اور ہر وقت فکر میں ڈوبی رہنے والی نقاب پوش ساحرہ یعنی روح اپنے کچھ تنہائی سے اولیٰ تصویروں پر نظر ڈالتی رہتی ہے جو اوس لئے جمع کی ہیں۔ یہ تصویریں نہ مٹ سکتی ہیں اور نہ ان کا نور گہنا سکتا ہے۔ اور ان کو طرح طرح سے ترکیب دے دے کر وہ اوس دلکش اور حیرت انگیز مرقع کی تیاری کا سامان کرتی ہے جسے خواب کہتے ہیں۔

اس طور پر قدرت نے ان کی جسمانی ساخت کا ڈھنگ بھی کچھ ایسا ڈالا ہو کہ بقائے روح اور حیات اخروی کے تصورات بے اختیار اوس کے داغ میں پیدا ہو کر رہتے ہیں۔ غیر مہذب و وحشی کو بھی جس کی روح پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی ہے عالم ردیامیں وہ سہانہ جگل اور دلغریب مرغزار نظر آتے ہیں جو اوس کی یاد کا سب سے زیادہ خوشگوار حصہ ہیں۔ ان غیر حقیقی اور سوہوم تصاویر سے وہ بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکال سکتا ہے کہ وہ سایہ ہیں



اوس دلکش حقیقت کا جو اوسے ایک آنے والی زندگی میں نظر آئے گی۔ کبھی کبھی خواب میں اوسے اون گزرے ہوئے لوگوں کی صورتیں بھی نظر آجاتی ہیں جن میں سے زندگی کی حالت میں کوئی اوس کا دوست رہ چکا ہے اور کوئی دشمن۔ ظاہر ہے کہ عالم خواب کے ان مظاہر کو وہ روح کے وجود و بقا کی محبت قاطع سمجھتا ہے۔ خود ہم بھی جنگی تہذیب و تمدن کا آفتاب نصف النہار پر ہے اس قسم کے واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور جو نتائج ہمارے غیر مذہب آباد اجداد نے ان سے اخذ کیے تھے وہی ہم بھی نکالتے ہیں۔ ہماری اعلیٰ معیار کی تہذیب و شائستگی جس طرح ہمیں کمزوریوں اور بیماریوں سے نہیں بچا سکتی اسی طرح مقننات فطرت کی قید سے بھی آزاد نہیں کر سکتی۔ ان اعتبارات سے روئے زمین کے کل انسان مساوی الحیثیت ہیں۔ ہم خواہ وحشی ہوں خواہ تہذیب یافتہ لیکن اس سبب ہم کو کسی طرح سفر نہیں کہ ہماری فطرت فنا اور بقا کی اون حقیقتوں کو جن سے زیادہ ہمتہ باشان اور قلب کو مرعوب کرنے والی حقیقت اور کوئی نہیں ہو سکتی ایک نہ ایک وقت ہمارے سامنے پیش کر کے رہتا ہے۔ ان حقیقتوں کے انکشاف کے لئے فطرت انسانی کسی سحر زدہ موقع کی منتظر رہتی ہے۔ اور یہ موقع اوس وقت آتا ہے جب ہم ان فراغ یا بیماری کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ہماری فطرت اپنا پورا عمل کرتی ہے اور ہم بھی اس وقت اس کی حقایق آموزیوں سے متنبہ ہونے کے لیے پوری طرح تیار ہوتے ہیں۔ اس فطرت کا عمل سب پر یکساں ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک فریب امیر جاہل عالم سب برابر ہیں۔ مغرور سے مغرور اور متکبر سے متکبر۔ شخص اس کی سرزنش اور نصیحت سے نہیں بچ سکتا اور مسکین سے مسکین اور عاجز سے عاجز شخص کو بھی حقیقت عینی کی معرفت کی تسکین سے یہ محروم نہیں رکھتی۔ اس پر کسی کی سازش یا خود فرضی کا جادو نہیں چلتا۔ انسانی کوشش کی خارجی تائید کی اس کے نہ ملنے والے اثر کو بردہ نہیں۔ ہر انسان کے ساتھ خواہ وہ کہیں بھی کیوں نہ جائے یہ برابر سایہ کی طرح لگی رہتی ہے۔ گذشتہ تصورات کے آثار و باقیات سے حیرت انگیز صفائی کے ساتھ عالم

عقبی کی آنے والی حقیقتوں کی ناممکن التردد شہادتوں کا استخراج اس کا کام ہے۔ یہ اوس سرچشمہ سے سیراب ہوتی ہے جو ظاہر بین نگاہوں کو خشک نظر آتا ہے۔ اور اودن وہی و خیالی شبہوں سے جو ظاہر ہوتے ہی غائب ہو جاتی ہیں ہمارے صورتکہہ ایقان کے لیے اودن لعبتوں کو تیار کرتی ہے جو فنا و زوال کی رہیں منت نہیں ہیں۔

کیڑے اور کل میں یہ بڑا فرق ہے کہ ایک متحرک بالذات ہے اور ایک متحرک بالارادہ۔ بالفاظ دیگر کل میں خارجی تحریک کے پہنچتے ہی حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور کیڑے پر اودن غریکات کا بھی اثر ہوتا ہے جن کا داخلہ دماغ میں مروجہ سے یعنی جو پہلے سے دماغ پر نقش ہو چکی ہیں۔ حیوانات کے طبقہ اعلیٰ میں اس تسجیل نقوش کا عمل زیادہ کامل ہو جاتا ہے اور قوت حافظہ زیادہ کمال کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی خارجی شکل میں اور اوس کے اس نقش میں نوح السعہ پر قسم ہو کوئی مشابہت پائی جائے یا اس لیے کہ اوس پیغام تار برقی کے الفاظ میں جو تار گھر میں داخل کیا جاتا ہے اور اودن علامات میں بھی تو کوئی مشابہت نہیں ہوتی جن کے ذریعہ سے یہ پیغام ایک مقام سے دوسرے مقام در در و دراز تک پہنچا یا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کسی چھپی ہوئی کتاب کے حروف اور اودن افعال یا مناظر میں بھی کوئی تطابق شبہی نہیں پایا جاتا جن کا اظہار بذریعہ حروف کیا گیا ہو۔ البتہ حروف سے واقعات و مناظر کی تصویر پڑھنے والے کے پردہ ذہن پر صفائی سے اتر آتی ہے۔

آلات حفاظت نقوش سے جو حیوان محروم ہو اوس کی حقیقت متحرک بالذات کل سے زیادہ نہیں۔ اوس میں قوت حافظہ نہیں ہو سکتی۔ ان آلات کا ابتدائی مواد نہایت ہی بے حقیقت و غیر متیقن ہوتا ہے لیکن اسی مواد سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے یہ آلات درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ ترقی کی جڑھتی رفتار کے ساتھ فہم شعور اور ادراک کی قابلیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ان کے آلات تحفظ و تسجیل نقوش منتہائے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔

اوس کے گزشتہ وجودہ نقوش اوس کے لیے دستور العمل کا حکم رکھتے ہیں۔ وہ تجربہ کو اپنا رہنما قرار دیتا ہے اور اس کے افعال عقل کی ہدایت سے صادر ہوتے ہیں۔

جب کسی حیوان میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اون نقوش کا علم جن کا ذریعہ اوس کی مرکز عصبی میں جمع ہے اوس نوع کے دوسرے حیوان پر منتقل کر سکتا ہے تو ترقی کی ایک بہت بڑی منزل طے ہو جاتی ہے۔ یہ ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ انفرادی زندگی کے لئے اجتماعی یا عمومی زندگی کی منتقل اختیار کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ کیفیات ذہنی کے انتقال کی قابلیت یعنی تعلیم و تربیت کے لیے لازمی ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے کٹر۔ اپنے خیالات کا اظہار ایک دوسرے پر پہلے الحس لاسہ رد ہنگوٹن کے تماس سے کرتے ہیں اور انسان کا ذریعہ اظہار معلومات تکلم ہے۔ بنی نوع انسان اپنے ابتدائی دور یعنی زمانہ جاہلیت میں اپنی معلومات کا اظہار اپنے ربانائے جنس پر مرث باہمی گفتگو کے ذریعہ سے کر سکتے تھے۔ اس طور پر ایک نسل کے افعال اور خیالات دوسری نسل کو ترکہ میں پہنچتے تھے اور اوس کے افعال و خیالات پر اپنا اثر ڈالتے تھے۔

لیکن زبانی روایت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ قوت گویائی کی بدولت انسان مل جل کر رہنے کے قابل ہو جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ تمدنی ترقی نہیں کر سکتا۔

قوت گویائی کو سلسلہ ارتقا کا شاہد غالباً خالی از لچسپی نہیں۔ فن تحریر کی ایجاد و نقوش کے اندراج و تسخیل کو شان و وسعت و دوام عطا کی۔ جو نقوش اب تک مرث ایک انسان کے دماغ میں جمع تھے ان سے تمام نوع انسانی ہر زمانہ میں مستفید ہونے کے قابل ہو گئی۔ اس قابلیت نے تمدن کو ممکن کر دیا اس لیے کہ تحریر یا کسی ایسے ذریعہ کے بغیر جس سے واقعات کسی نہ کسی شکل میں محفوظ رہ سکیں تمدن کا وجود ممکن نہیں۔

اس فلسفیانہ پہلو سے اگر ہم غور کریں تو ہمیں چھاپے کی ایجاد کی اصلی قدر و منزلت معلوم ہوگی۔ چھاپہ تحریر کے ارتقا کا وہ درجہ ہے جو خیالات کو روز بہ سرعت کے ساتھ شائع کرنے اور انہیں ہمیشہ کے لیے قائم و برقرار رکھنے سے بنی نوع انسان کی ترقی

تہذیب اور اتحاد و ارتباط باہمی کا باعث ہوتا ہو۔

ذرات عصبی کی لوح پر نقوش کے ارتسام اور ادن کی تسجیل اور ادن کے تیار ہونے کے متعلق جو کچھ مین نے گذشتہ فقرہ میں بیان کیا ہے وہ دراصل ادن خیالات کا خلاصہ ہے جو میری کتاب ”ہیومن فزیالوجی“ (ترکیب اعصاب و انسانی) میں بوضاحت درج ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ جن ناظرین کو تفصیل مطلوب ہو وہ اس کتاب کی وہ فصل ملاحظہ فرمائیں جس کا عنوان ”بصارت مقلوب یا دماغی مبنائی“ ہے۔ اس کے علاوہ مقالہ اول کی فصل چہارم اور مقالہ دوم کی فصل ہشتم کا مطالعہ بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

روح انسانی کی ہیج ماہیت کا اگر سرانجام لیا جاسکتا ہے تو اس کی شکل یہی ہے کہ اس کا مقابلہ روح حیوانی سے کیا جائے۔ یہ طریقہ اگرچہ وقت طلب ہے اور بہت کچھ وقت اور محنت اس پر خرچ کرنی پڑتی ہے لیکن اس کے نتائج کی بحث مین بھی کلام نہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر کیا مین یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ مادہ کی طرح روح کا بھی ایک عظیم الشان وجود کائنات کی رگ و پے میں ساری دوایر ہے اور یہ روح ایک بہت بڑے جرم فلسفی کے قول کے مطابق ”پھردن میں سوتی ہے جانور دن کے قالب میں اگر خواب دیکھتی ہے اور انسان کے جسم میں داخل ہوتے ہی جاگ اٹھتی ہے“؟ کیا جسم کی طرح جو مادہ سے بنتا ہے روح بھی روحانی وجود سے پیدا ہوتی ہے؟ کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد اپنے اپنے خواج کو لوٹ جاتے ہیں یعنی جسم مادہ میں جاتا ہے اور روح روح میں جاسا مل جاتی ہے؟ اگر حقیقت حال یہی ہے تو پھر ہم وجود انسانی کی تاویل کر سکتے ہیں اور یہ تاویل حقایق علمی کے ساتھ تطابق کلی رکھ سکتی ہے یعنی ہمارا یہ خیال کہ نظام کائنات دائم و قائم اور غیر تغیر پذیر ہے اس تاویل سے باطل نہیں ہونے پاتا۔

عربوں نے دوسری مشرقی اقوام کی تقلید کر کے اس ہمہ گیر روحانی وجود کا نام ”عقل فعال“

رکھا۔ اون کا خیال یہ تھا کہ جس طرح منجھ کا قطرہ سمندر سے نکل کر کچھ دیر بعد پھر اسی میں جاتا ہے اسی طرح انسان کی روح عقل فعال یعنی خدا سے صادر ہو کر ایک مدت معینہ کے بعد اسی کے ساتھ واصل ہو جاتی ہے۔ اس طور پر سلاٹون میں مسئلہ انفصال و اتحاد کا ظہور ہوا۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ہندوستان میں ساکی منی نے اس مسئلہ کو ایک صورت میں مسلم الثبوت قابلیت کے ساتھ رواج دیکر مذہب بدعو کا مدار علیہ بنایا۔ اسی مسئلہ کو دوسری شکل میں ابن رشد نے عربوں میں رائج کیا۔ لیکن ساکی منی کا طریقہ تعلیم ابن رشد کے مقابلہ میں زیادہ استناداً تھا۔

لیکن یہ رائے شاید زیادہ تر قرین صواب ہوگی کہ اہل یورپ ابن رشد ہی کو اس مسئلہ کا بانی قرار دیتے ہیں اس لیے کہ اون کی نظروں سے وہ سلسلہ اسناد جو ابن رشد کو مسئلہ مذکور کے موجدوں سے ملاتا ہے پوشیدہ تھا۔ یورپ والے چاہر ابن رشد کو کیسی ہی وقعت کی نظر سے کیوں نہ دیکھیں لیکن مسلمانوں نے تقدم کا سہرا اوس کے سر نہیں رصنے دیا۔ وہ اون کے نزدیک محض شارح آرسطو تھا اور اوس کی حیثیت اون کے نزدیک اس سے زیادہ متجلی کہ وہ مدرسہ اسکندریہ اور اپنے زمانہ تک کے دوسرے فلسفیانہ مسالک کا ناظم تھا۔ ذیل کا اقتباس موسیورینان کے اوس تاریخی شعرون سے ہے جو اوس نے فلسفہ ابن رشد پر لکھا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کا خیال اوس کے فلسفہ کی نسبت ذہنی تھا جو اوپر مذکور ہوا۔

اس مذہب (فلسفہ ابن رشد) کے پیروں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص مرتا ہو تو اوس کا جوہر عقلی یعنی روح جداگہ طور پر قائم نہیں رہتی بلکہ اوس عالمگیر روح یا عقل فعال یا روح کائنات یعنی خدا کی طرف رجوع کر کے اوس میں جذب ہو جاتی ہے جس سے ابتداءً اس کا صدور یا خروج یا انفصال ہوا تھا۔

عقل کل یا عقل فعال یا عقل موجود فی الخارج نہ مخلوق ہے نہ اوس میں کسی شے کا نفوذ ممکن ہے۔ نہ وہ فساد پذیر ہے۔ نہ اوس کی ابتدا و انتہا ہے اور نہ اوس میں انفرادی ارواح کی تعداد کی زیادتی سے زیادتی واقع ہوتی ہے۔ وہ مادہ سے بالکل منزہ ہے۔ وہ گویا نظام کائنات کا جوہر یا طاقت ہے عقل فعال کا یہ تو حد ابن رشد کے فلسفہ کا اصل اصول ہے اور اسلام کے اصولی و انتہائی عقیدے یعنی وحدت واجب الوجود کے ساتھ توافقی و مطابق رکھتا ہے۔

عقل منفرد یا عقل الفعالی یا عقل موجود فی الذہن عقل کل سے صادر ہوئی ہے اور ان کی روح پر مشتمل ہے۔ ایک اعتبار سے تو یہ عقل فانی ہے اور اس کا خاتمہ جسم کے ساتھ ہو جاتا ہے مگر دوسرے اعتبار سے یہ غیر فانی بھی ہے اس لیے کہ موت کے بعد اس کی رجعت عقل کل کی طرف ہوتی ہے جس میں یہ ضم یا جذب ہو جاتی ہے اور اس طور پر تمام ارواح انسانی کے ہمہ گیر روح میں ملنے سے آخر میں صرف ایک روح یعنی یہی ہمہ گیر روح باقی رہ جاتی ہے جو سب کا مجموعہ ہے۔ زندگی کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں بلکہ اس کی مالک قدرت ہے۔ انسان کی زندگی کا مقصد انتہائی یہی ہے کہ عقل فعال کے ساتھ اوس کا اتحاد شان الکلیت لیے ہوئے ہو۔ یہی اتحاد یا انضمام یا وصال روح کے لیے مایہ سرور جاودانی ہے۔ کاتب تقدیر نے ہماری لوح مقدر کا عنوان سکون و طمانیت قرار دیا ہے اور اسی کے حصول کے لیے ہم کو کوشش کرنی چاہیے۔ ابن رشد کا خیال یہ تھا کہ روح کو جسم سے جدا ہوتے ہی عقل منفرد عقل کل میں جذب ہو جاتی ہے لیکن بد مذہب والوں کا حقیقہ یہ ہے کہ فنا کے کامل یعنی نردان کے مقام تک پہنچنے میں روح کو کچھ مدت لگتی ہے اور اس اثنا میں انسان کی شخصیت برقرار رہتی ہے لیکن اوس میں انحطاط و زوال شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ گھٹتے گھٹتے بالکل فنا ہو جاتی ہو۔

فلسفہ نے نظام کائنات کی توجیہ کے ہمیشہ دو پہلو اختیار کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک

شخصی خدا ہے جس کا وجود سب سے علیحدہ ہے اور اس کا تئیسہ ایک انسانی روح ہے جسے خدا نے پیدا کیا ہے اور جو خدا کے بعد غیر فانی ہو جاتی ہے۔ دوم یہ کہ ایک غیر شخصی عقل یا غیر معین خدا ہے جس میں سے روح نکلتی ہے اور ایک مدت مقررہ کے بعد اوس میں جا کر مل جاتی ہے۔ موجودات کی تکوین کے متعلق بھی دو متضاد خیالات ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عدم سے وجود میں لائی گئی۔ دوسرے یہ کہ وہ اشکال و صور سابقہ سے نشوونما پا کر موجودہ حالت میں پہنچی۔ مسئلہ پیدائش نظریہ اول سے متعلق ہے اور مسئلہ ارتقاء نظریہ ثانی سے تعلق رکھتا ہے۔

اس طور پر عرب فلسفہ کی اسی شاہ راہ پر چلے جس پر اہل چین و اہل ہند غرض مشرق کی تمام قومیں چلی تھیں۔ اس فلسفہ کے معرکتہ الاراسایل کا انحصار اس واقعہ کے اعتراف پر تھا کہ مادہ اور قوت کو فنا نہیں۔ اس نے جب دیکھا کہ قدرت میں جو بے پایاں ذخیرہ مادہ کا وجود ہے اوس سے انسان کا جسم ترکیب پاتا ہے اور فنا ہونے پر اسی میں جا کر مل جاتا ہے تو لامحالہ اسے یہ نتیجہ نکالنا پڑا کہ انسان کی روح بھی عقل کل یا ذات باری تعالیٰ سے صادر ہوتی ہے اور بالآخر اوس میں جا کر جذب ہو جاتی ہے۔

مسئلہ انفصال و انجذاب کی فلسفیانہ خصوصیات پر کافی وضاحت کے ساتھ نظر ڈالنے کے بعد ہم اب اس کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ یورپ میں اس مسئلہ نے اندلسی عربوں کی بدولت رواج پایا۔ اسپین وہ مرکز تھا جہاں سے اس کی شعاعیں نکل نکل کر یورپ کے علمی و عقلی حلقوں میں پھیل گئیں اور اسپین ہی میں اس کا حسرت ناک خاتمہ ہوا۔

فلسفائے اندلس نے مشرقی عیش و عشرت کے کل لوازم فراہم کر رکھے تھے۔ اون کے قہ و ایوان شان و شوکت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے۔ اون کے دلفریب باغوں کی فضائیں دیکھ کر آنکھوں میں طمسات کا نقشہ پھر جاتا تھا۔ اون کی حرم سراؤں میں ایسی ایسی نازنینیں موجود تھیں جن کا حسن چاند اور سورج کو شرماتا تھا۔ یورپ کی تہذیب آج کے دن

بھی اوس سلیقہ اوس قربہ اور اوس لطافت مذاق سے معرا ہے جو اندلسی عربوں کی پایہ تخت میں اپنی جھلک دکھاتی تھی۔ اون کے شہروں میں کوئی ٹرک ایسی نظر نہ آتی تھی جس پر کنکر کٹے ہوئے نہ ہوں اور جورات کے وقت قندیلوں سے نہ جگمگاتی ہو۔ اون کے مکانات نقش و نگار سے مزین اور قالینوں کے پر تکلف فرش سے آراستہ ہوتے تھے۔ جاڑوں میں اونہیں دہکتے ہوئے تابدان گرم رکھتے تھے اور گرمیوں میں معطر اور مغنبر ہوا جو پھولوں کی کیاریوں سے چل کر زمین و وزنوں میں سے ہوتی ہوئی آتی تھی اونہیں خوش گوار ٹھنڈک پہنچاتی تھی۔ نفیس حمام۔ شاندار کتب خانے۔ کھانا کھانے کے فرحت افزا کمرے۔ پانی اور سیلاب کے دلربا نورے اون کے تمدن کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ ہر شہر اور ہر قریہ میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ بانسری اور چنگ کی تال پر جا بجا محفل رقص و نشاط گرم نظر آتی تھی۔ لیکن ان پر لطف صحبتوں میں اوس بدستی و بد تمیزی کا رنگ نظر نہ آتا تھا جو مسلمانوں کے پھوٹے اور گنوار شمالی ہسپانوں کے جلسوں میں عام طور سے پایا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے ہاں شراب قطعاً ممنوع تھی۔ اندلس کی دل فریب چاندنی راتوں کا لطف مسلمان امر اطرح طرح سے اڑاتے تھے۔ کوئی چین میں بیٹھا ہوا داستان گویوں کے افسانوں جی بہلاتا تھا۔ کوئی باغ کی روشن میں دوست احباب کے ساتھ ٹہکتا ہوا فلسفیانہ مباحث میں اپنا وقت گزارتا تھا۔ غرض اون کا وقت نہایت لطف سے گزرتا تھا اور اگر کبھی اونہیں اس زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کا خیال آتا تھا تو یہ سوچ کر اون کو تسکین ہو جاتی تھی کہ نیکی کا اجر اسی دنیا میں مل جائے تو عالم عقبی بیکار ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے کبھی نہ گھبراتے تھے بلکہ اس خیال سے دل کو تشفی دے لیتے تھے کہ گو اس دودن کی زندگی میں ہم محنت اور تکلیف اٹھا رہے ہیں لیکن موت کے بعد جب ہم دوسری زندگی کی سر زمین میں قدم رکھیں گے تو وہ آرام ہمارے حصہ میں آئے گا جس کے بعد کوئی محنت نہیں۔



دسویں صدی میں خلیفہ حاکم ثانی نے اندلس کو فردوس عالم بنا دیا تھا۔ عیسائی مسلمان اور یہودی بے روک ٹوک آپس میں ملتے تھے اور ایک عالمگیر برادری قائم ہو گئی تھی جس کا شیرازہ مساوات سلوک نے باندھ رکھا تھا۔ اس زمانہ کے جن مشاہیر کے نام ہم تک پہنچے اون میں جربرٹ کا نام بھی شریک ہے جو آگے چل کر پاپائے اعظم ہو گیا۔ پیٹر الملقب بہ مقدس اور دوسرے بہت سے عیسائی پیشوایان مذہب بھی اسی عہد کے خرمین فضل و کمال کے خوش چین تھے۔ پیٹر کا بیان ہے کہ میں نے ایسے علما کو یہاں دیکھا جو فن ہیئت کی تحصیل کر لیے برطانیہ سے چل کر آئے تھے۔ ارباب فضل و کمال کا عام اس سے کہ وہ کہیں کو ہوں یا کیسے ہی مذہبی عقاید کیوں نہ رکھتے ہوں نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ خود خلیفہ کے محل میں کتابوں کا ایک بہت بڑا کارخانہ موجود تھا جس میں کتابوں جلد سازوں اور نقاشوں کی ایک جماعت کثیر ملازم تھی۔ ایشیا اور آفریقہ کے ہر بڑے شہر میں خلیفہ کے گشتے مقرر تھے جن کا یہی کام تھا کہ جو نادر کتاب ملے فوراً خرید لیں۔ اوس کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں موجود تھیں جن کے منقش اوراق اور پرتکلف جلدیں بصارت کے لیے سرمہ کا حکم رکھتی تھیں۔

لیکن ایشیا کے تمام اسلامی ممالک اور نیز آفریقہ و اسپین کے ادنیٰ طبقہ کے مسلمان علم کے جانی دشمن تھے۔ جن کا زہد و التقاؤ زیادہ بڑا ہوا تھا اور جنہیں پابندی شرع کا دعویٰ شد و مد کے ساتھ تھا، وہ نہیں تو خلیفہ المامون تک کی نجات میں شک تھا۔ چنانچہ اون کا یہ قول تھا کہ اس شریر خلیفہ نے ارسطو اور دوسرے یونانی کفار کی تصانیف کو رواج دے کر مذہب خلق خدا میں ایک ہل چل ڈال دی ہے بلکہ بہشت اور دوزخ کے وجود کو بھی یہ کہہ کر گونہ گونہ میں گول ہے اور ناپی جاسکتی ہے وہی و خیالی ثابت کرنے کی کوشش کی ہو۔ ان لوگوں کی تعداد چونکہ بہت زیادہ تھی لہذا وہ انتظام سلطنت میں بھی دخل ہو گئے تھے۔ المنصور نے جو حاکم کے بیٹے کو بے دخل کر کے خلافت خود غصب کر بیٹھا تھا خیال کیا

کہ اگر مین مذہبی جماعت کا ساتھ دین کا تو میرے قدم جم جائیں گے۔ لہذا اس نے حکم دیا کہ حاکم کے کتب خانہ میں جتنی علمی یا فلسفیانہ کتابیں پائی جائیں سب ضائع کر دی جائیں۔ چنانچہ ہزار ہا کتابیں مشایخ عام پر جلادی گئیں یا محل کے حوضوں میں ڈبو دی گئیں اور اس طور پر علم و حکمت کا وہ نادر ذخیرہ جو حاکم ثانی کے مذاق سلیم نے سالہا سال کی محنت اور لاکھوں روپیہ کے خرچ سے جمع کیا تھا منصور کی خود غرضی اور جہلا کے تعصب کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ اسی طرح کے ایک درباری انقلاب کے باعث ابن رشد (المتوفی ۵۲۰ھ) بڑھاپے میں اسپین سے ملک بدر کیا گیا۔ مذہبی جماعت نے فلسفی جماعت پر فتح پائی اور ابن رشد دشمن مذہب قرار دیا گیا۔ تمام اسلامی دنیا میں فلسفہ کی مخالفت کی جانے لگی۔ ایک بھی فلسفی اس زمانہ میں ایسا نہ تھا جسے سزا نہ ملی ہو۔ بعض سزایاب ہوئے بعض جان سے مار ڈالے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا بھر میں اسلام برباد ہو گیا۔

اطلی۔ جرمنی اور انگلستان میں ابن رشد کا فلسفہ چکے چکے پہنچ گیا تھا۔ فرانسیسکن فرقہ کے پادریوں نے اس فلسفہ کو خاص وقت کی نظر سے دیکھا اور پیرس کی یونیورسٹی اس کا مرکز بن گئی۔ بہت سے لوگوں نے جنہیں مبداء فیاض سے جوہر فکر سلیم عطا ہوا تھا اسے تسلیم کر لیا اور اس کا حلقہ اثر وسیع ہو گیا۔ لیکن آخر کار فرقہ ڈائینکن نے جو فرقہ فرانسیسکن کا قریب تھا اس کی مخالفت شروع کی۔ اور ان کا اعتراض یہ تھا کہ ابن رشد کا فلسفہ ذات اور شخصیت کے تصور کو مٹا دیتا ہے جبر یہ خیالات کی اشاعت کرتا ہے اور عقول منفردہ کے اختلافات مدافع اور ترقی کی کوئی توجیہ نہیں پیش کر سکتا۔ یہ دعویٰ کہ کائنات میں صرف ایک عقل کا وجود ہے غلط محض ہے اس لیے کہ اس سے اولیا کی کرامت اور تصرفات روحانی کی نفی ہو جاتی ہے اور انسانوں کے مدافع میں کوئی فرق قائم نہیں رہتا۔ کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ پیٹر کی مقدس اور یہود کی ملعون روح میں کوئی فرق نہ ہو بلکہ دونوں کا درجہ برابر ہو؟ ابن رشد کا یہ محمدانہ مسلک پیدائش۔ تائید ایزدی۔ الہام۔ اقا نیم ثلثہ۔ استجابہ دعا۔ ثواب

خیزات اور قبولیت استغفار کا منکر ہے۔ خسر اجسام اور بقاے روح کو باطل قرار دیتا ہے اور محض حظ نفس کو موجب سعادت و اربین خیال کرتا ہے۔

اسی طرح یہودیوں میں بھی جو اس زمانہ میں صدر الشیخان بزم اور اک متصور ہوئے تھے فلسفہ ابن رشد عام طور سے پھیل گیا تھا۔ مشہور یہودی فیلسوف موسیٰ بن میمون نے اس فلسفہ کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور اس کے شاگرد اسے دنیا کے ہر حصہ میں پھیلاتے جاتے تھے۔ لیکن دفعۃً یہودیوں کے اس طبقہ نے جس کا میلان مذہب کی طرف تھا اس فلسفہ کی مخالفت بڑے زور و شور سے شروع کی یہی وہ پہلے وہ ازراہ فقر "راس العلماء فرزانہ دوران۔ مایہ نازش سرزمین مغرب۔ آفتاب ارض مشرق" کا لقب دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان انون میں اس کا درجہ اگر کسی سے کم ہے تو صرف حضرت موسیٰ سے۔ لیکن اب انہوں نے کہنا شروع کیا کہ تمہوں دین ابراہیم چھوڑ بیٹھا ہے۔ پیدائش کے امکان سے منکر ہے۔ دنیا کی ابدیت کا منکر ہے۔ دہریت کے عقاید کی اشاعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکا ہے۔ خدا کو اس کی صفات سے محروم کیے دیتا ہے۔ اور خدا کو غلام یا جوت قرار دے کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ نہ دعا کو سن سکتا ہے اور نہ اس سے انتظام عالم میں دخل ہے۔ انٹ پلیر بائسکلو نا اور ٹالیڈو میں یہودیوں کی ہر دینی مجلسیں قائم تھیں انہوں نے یہیوں کی تصانیف کو آگ میں جلا دیا۔ اور اس طور پر فلسفہ ابن رشد کو ایک اور بہت بڑا صدمہ اٹھانا پڑا۔

فرڈیننڈ اہر اسٹیل کی فتوحات نے عربوں کی حکومت اندلس کا خاتمہ کیا ہی تھا کہ پاپا نے ان فلسفیانہ عقاید کے استیصال کی تدبیر اختیار کرنی شروع کیں کیونکہ پیشوایان مذہب عیسوی کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ عقاید یورپ میں مسیحیت کی جڑہ کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

پاپا انوسنت چہارم (۱۲۳۴ء) کے عہد تک ملحدوں کی سزا دی کے لیے اس وقت کی دینی عدالتوں کے علاوہ کوئی خاص محکمہ موجود نہ تھا۔ لیکن جب مذہبی قوت ایک مرکز پر

اگلی تو ایک محکمہ احتساب عقاید بنام ”انکویزیشن“ قائم کیا گیا۔ اس محکمہ نے جسے پاپا کی صدر عدالت فوجداری کہنا چاہیو قدیم مقامی عدالتوں کو مٹا کر خود اداون کی جگہ لے لی۔ چونکہ اس محکمہ نے اس وقت کو اقتدارات سلب کر لیے تھے لہذا ادھنوں نے اسے نہایت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ مگر پاپا کی طاقت کے مقابلہ میں اداون کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی بے اثر محض تھی۔ اس نئی عدالت کے مرکز آٹلی۔ اسپین۔ جرمنی اور فرانس کے جنوبی صوبوں میں قائم کئے گئے۔

• دینی فرمانرواؤں نے ”انکویزیشن“ کو اپنی ملکی اغراض کی تکمیل کا آلہ بنانا شروع کر دیا۔ یہ بات دینی فرمانرواؤں یعنی پاپاؤں کو سخت ناگوار گذری اور ہر پاپا نے اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھانا نہ رکھا۔ وہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ یہ طاقت پادریوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔ فرانس کے جنوبی صوبوں میں ”انکویزیشن“ کا قیام استیصال الحاد و زندہ کے لیے نہایت موثر ثابت ہوا تھا۔ ایرلینڈ کے صوبہ میں بھی یہ عدالت قائم کی جا چکی تھی۔ اب یہودیوں کا قلع و قمع کرنے کی خدمت اس کے سپرد ہوئی۔

قدیم زمانہ میں جب قوم وزیگا تھے کہ فرمانرواؤں کا دور دون تھا یہودی بہت خوشحال تھے لیکن جب وزیگا تھوں نے ایرٹس کا وہ موحدانہ مسلک جس کی تلقین یہودیوں نے کی تھی چھوڑ کر خالص تثلیث پرستی اختیار کی تو یہودیوں کے ساتھ بجائے ترقی کے نہایت سختی کا برتاؤ ہونے لگا اور اداون کے بسے ہوئے گھرانے اچڑنے لگے۔ یہودیوں کے لیے نہایت ظالمانہ اور وحشیانہ قوانین وضع کئے گئے۔ چنانچہ ایک قانون اس مضمون کا نافذ کیا گیا کہ ہر ایک یہودی غلام سمجھا جائے گا اور اسے آزادی کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔ پس مقام تعجب نہیں ہے کہ جب عربوں نے اسپین پر حملہ کیا تو یہودیوں نے دل و جان سے حملہ آوروں کی مدد کی۔ عربوں کی طرح وہ بھی مشرقی نسل سے تھے۔ دونوں کانسب حضرت ابراہیمؑ سے جو ان کے مورث اعلیٰ تھے ملتا تھا۔ دونوں خدا کی وحدانیت کو معتقد تھے۔ اور اسی مسئلہ کی حمایت فراون کر وزیگا تھ آقاؤں کو اداون کا دشمن بنا دیا تھا۔

مسلمانوں نے عہد میں یہودیوں کے ساتھ نہایت ہی شہرت و کھیا گیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اپنی دولت اور علم کی وجہ سے مشہور ہو گئے۔ ادن میں سے اکثر ارسطو کے مقلد تھے۔ ادنہین نے بہت سے دروس اور کالج قائم کیے۔ چونکہ ادن کے تجارتی تعلقات ہر ملک کے ساتھ تھے لہذا دنیا کے ہر حصہ میں ادن کو سفر کرنے کا موقع ملتا رہا۔ علم طب کی تحصیل کا ادنہین خصوصیت کے ساتھ شوق تھا۔ ارسنہ وسطیٰ میں یورپ کے طبیب اور جمہا جن ہر جگہ یہودی ہی تھے۔ معاملات انسانی کو فلسفیانہ انتقاد کی نظر سے جانچنے کا شرف صرف ادنہین کو حاصل تھا طب اور فلسفہ کے علاوہ وہ ریاضی اور ہیئت میں بھی دستگاہ دانی رکھتے تھے۔ الفانسو کی زمین ادنہین کی مرتب کی ہوئی تھی اور ڈی گاما کو سفر روئے زمین کا خیال ادنہین نے دلایا فن ادب میں بھی ادنہین کمال حاصل تھا۔ دسویں سے لے کر چودھویں صدی تک وہ انشا پردازی میں یورپ کے استاد سمجھے جاتے رہے۔ سلاطین کے درباروں میں وہ طبیب کی حیثیت سے باریابیت ہوتے تھے اور سرکاری خزانوں کے انتظام کے لیے بطور صدر محاسب یا افسر اعلیٰ مامور ہوتے تھے۔

ملک کیونٹ کے کٹر یہودیوں نے عوام الناس کو یہودیوں کے برخلاف بہت کچھ بھڑکایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص نے ان عیادوں کی ایذا دہی پر کمر باندھ لی۔ ان مظالم سے بچنے کے لئے بہت سے تو بظاہر عیسائی ہو گئے لیکن عیسویت قبول کرنے کے بعد پھر اپنے آبائی مذہب کی طرف عود کر آئے۔ پاپا کے سفیر متعینہ دربار کیسٹیل نے محکمہ ”انکو نیشن“

لے الفانسو دوم ستہ دیان کیسٹیل سے مراد ہے جو ۱۲۵۰ء میں تخت پر بیٹھا۔ فن ہیئت سے اوسے ایک خاص لگاؤ تھا۔ جالیس ہزار اشرفیوں کی لاگت سے اوس نے ہیئت کی وہ شہرہ آفاق زمینیں تیار کرائیں جو حالہ سن میں دیا گیا۔ ان زمینوں کو تہہ رومی کا ڈبی نے نظرائی کرکشتہء امین از سر نو مرتب کیا۔ مترجم

تھ زمانہ سابق میں ایک مستقل بادشاہت تھی۔ آج کل اسپین کا ایک صوبہ ہے جس کی شمالی سرحد فرانس ہے۔ اس کا رقبہ کوئی چار ہزار چوالیس میل ہوگا۔ مترجم

کے قائم کیے جانے پر بہت کچھ زور دیا۔ غریب اور غیر استطیع یہودیوں پر تو یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ عید الفصح کی تقریب پر واقعہ تصلیب کی تضحیک کے لیے عیسائی بچوں کی قربانی دیتے ہیں اور دہشتناک یہودیوں سے یہ جرم منسوب کیا جاتا تھا کہ وہ ابن رشد کے پیرو ہیں۔ ڈائمنین فرقہ کا ایک راہب ٹارکوئی میڈانامی ملکہ آسا میلکا پاوری تھا۔ اس کی ترغیب سے ملکہ نے پاپائی کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ احتساب عقاید کا مقدس محکمہ دولت اسپین میں قائم کرنے کی اجازت اسے عطا فرمائی جائے۔ چنانچہ نومبر ۱۸۸۷ء میں پاپا کا فرمان صادر ہوا کہ کفر و زندقہ کی سراغ برآری اور استیصال کی غرض سے ”انکویزیشن“ کی مقدس عدالت قائم کی جائے۔ اس عدالت کی پہلے سال یعنی ۱۸۸۷ء کی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہزار اشخاص اندلس میں زندہ جلائے گئے اور ان کے علاوہ کئی ہزار مردے قبروں کو نکال کر جلائے گئے اور سترہ ہزار اشخاص کو جرمانہ یا جس دوام کی سزا دی گئی مظلوم یہودیوں میں جس سے بن پڑا جان سلامت لے کر بھاگ گیا باقی تختہ مشق ستم بنا کر گئے۔ ٹارکوئی میڈا نے جواب کیسٹیل اور لیان کا صدر محتسب مقرر ہوا و احتساب وحشیانہ خونخواری سے دی۔ گستاخیاں کی بنا پر ملزم کو پھڑپھڑایا جاتا تھا۔ اس کے مواجہ میں کوئی شہادت نہیں لی جاتی تھی۔ اسے گواہوں پر جرح کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ اقبال جرم کے لیے ملزم کو شکنجہ میں دے دیا جاتا تھا۔ اور شکنجہ کا جانفزا عذاب زمین و وزتہ خانوں میں پہنچایا جاتا تھا جہاں سے بچا رہے ستم رسیدن کی چیخ پکار کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ رحم کا منہ اس طرح چڑھایا جاتا تھا کہ حکم دے دیا جاتا تھا کہ مجرم کو شکنجہ میں دوسری مرتبہ نہک جائے۔ فیاضی کی نقل اس طرح اتاری جاتی تھی کہ ملزم سے کہہ دیا جاتا تھا کہ آج تمہاری ہڈیوں کا چور اچھی طرح نہیں ہوا اس لیے کل تک کے بے شکنجہ کی سزا سنو کی جاتی ہے۔ بد نصیب مجرموں کے لئے بنی اسرائیل کے فراعنہ مصر کی غلامی سے آزاد ہونے کی خوشی میں عتوبہ ہار یہودی ہر سال سنا تین ادس کا نام عید الفصح ہے۔ مترجم

تباہ شدہ خانہ النون کی مصیبت کا اندازہ کرتے ہوئے دماغ لرزتا ہے۔ لارنٹ نے ”جوائنکولیشن“ کا مورخ ہے اندازہ لگایا ہے کہ ٹمار کوئی میڈا اور اوس کے شہر کا لے اٹھا رہ سال کی مدت میں دس ہزار دوسو سیس اشخاص کو زندہ جلا یا چھ ہزار اٹھ سو ساٹھ اشخاص کی سورتین بنا کر جلا بین اور ستانوسے ہزار تین سو اکیس اشخاص کو دوسرے طریقہ سے مختلف منزئین دین۔ اس منجوط الحواس پادری نے انجیل کے عبرانی نسخے جہاں کہیں ملے ضائع کر اڈے اور سیلیسٹیکا میں علوم مشرقیہ کی چھ ہزار کتبیں یہ کہہ کر آگ میں جھونک دین کہ ان میں یہودی مذہب کی تعلیم مندرج ہے۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم یہ سنتے ہیں کہ پاپا کی حکومت دولت مند یہودیوں سے روپیہ لے کر اونہین ”انکویزیشن“ کے اقداب سے مستثنیٰ کر دیتی تھی اور تذکرات الغفران کی فروخت سے بہت کچھ روپیہ پیدا کرتی تھی تو ہماری نفرت اور حقارت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

لیکن اس خوفناک ظلم اور وحشیانہ جبر کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بہت کم یہودی ایسے تھے جنہوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر مذہب عیسوی قبول کیا۔ لہذا ٹمار کوئی میڈا لے اس بات پر زور دیا کہ ہر غیر اصطباغ یافتہ یہودی فوراً ملک بدر کیا جائے۔ حکومت سے اوس نے یہ بات بھی منوا کر چھوڑی۔ بتاریخ ۳۰ مارچ ۱۹۴۷ء یہودیوں کے اخراج کے فرمان پر دستخط ہو گئے۔ تمام یہودیوں کو جو اصطباغ یافتہ نہ تھے بلا لحاظ عمر یا جنس یا حالت حکم دیا گیا کہ آئندہ جولائی کی آخری تاریخ تک ملک سے نکل جائیں۔ اور اگر واپس آئیں گے تو مزائے موت پائیں گے۔ اس فرمان قہر تو امان کی رو سے اگرچہ وہ اس کے مجاز کئے گئے تھے کہ اپنا مال اور املاک فروخت کر کے اوس کی قیمت اپنے ساتھ لیتے جائیں لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی گئی تھی کہ یہ قیمت نقد ہی کی شکل میں نہ ہو بلکہ یا تو سامان تجارت یا ہنڈی کی شکل میں ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے مال یا جاہداد کی بازار میں کیا قیمت اٹھ سکتی تھی جن کے سر پر قضاے مہرم کی حرج یہ حکم سوار تھا کہ تین مہینے کے اندر اندر ملک سے نکل جائیں اور ملک بھی وہ ملک جو اون کا زاد بوم تھا جہاں وہ پہلے اور بڑھے تھے جس میں اون کے آبا و اجداد صد ہا سال ہو

بستے چلے آئے تھے۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ اوس مال کو جو جولائی کے مہینے کے بعد کوٹریوں کے داموں بلکہ مفت ملنے والا تحار و پیہ دے کر خریدتا۔ جب بیکس اور مظلوم یہودیوں کی جلاوطنی کی دردناک گھڑی قریب آئی تو ایک طرف تو نگلی کوچون مین اون کے نالہ و بکا کی جگر خراشش آواز میں امید اور انصاف کی مرثیہ خوانی کرتی ہوئی ہوا میں رہ رہ کر گونجتی تھیں دوسری طرف ناخدا ترس پادری سڑکوں اور نگلی کوچون مین کھڑے ہوئے اپنی جوش فصاحت کو اس نصیب قوم کی خسیہ کاریاں اور بد اعمالیاں گننانے میں مصروف کرتے ہوئے نظر آتے تھے یہی تماشائی ملک اس دردناک اور زہرہ گداز نظارہ کو دیکھ کر روتے تھے لیکن کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا اس لئے کہ طار کوئی میڈا کی قسادت قلبی اس فرمان کی تعمیل کر کر رہی کہ یہودیوں کو کوئی شخص کسی طرح کی مدد نہ دے۔

جو یہودی اس طور پر جلا وطن ہوئے اون مین سے کچھ تو افریقہ اور کچھ اٹلی چلے گئے۔ جو جماعت اٹلی گئی تھی وہ اپنے ساتھ جہازی بخار کی و بالیتی گئی جس نے نیپلز کے بیس ہزار باشندوں کو صفحہ ہستی سے محض غلطی طرح مٹا کر اس جزیرہ نما کو ویران کر دیا۔ کچھ یہودی ترکی کو بھی ہجرت کر گئے اور علیٰ ہذا القیاس اون کی ایک جماعت نے انگلستان میں جا بود و باش اختیار کی۔ سفر کی گونا گون مصیبتوں کی تاب نہ لا کر ہزاروں رستہ میں مر گئے جن میں زیادہ تر فرخوار بچے اور اون کی مائیں۔ کم سن بچے اور سن رسیدہ ضعیف اشخاص تھے۔ بہت سے ایسے تھے جنہوں نے پانی کے میسر نہ آنے سے تشنہ لہی کی حالت میں تڑپ تڑپ کر جان دی۔

یہودیوں کی اس یخ کنی کے بعد مسلمانوں کی باری آئی۔ ماہ فروری سنہ ۱۱۷۰ء میں ایک فرمان بمقام اشبیلیہ صادر ہوا جس میں اس تمہید کے بعد کہ دشمنان خدا کو ملک سے نکال دینا ہر مسیحی کا مقدس فرض ہے یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہر غیر اصطباغ یافتہ عرب جس کی عمر سن شیر خوارگی سے تجاوز ہو ملک کسٹیل ولیان سے اور ماہ اپریل تک ملک سے نکال دیا جائے۔ یہودیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی اپنا مال و متاع فروخت کرنے کی اگرچہ اجازت تھی



لیکن جائیداد فروخت شدہ کی قیمت سونے چاندی کی شکل میں ہمراہ لے جانے کی ممانعت تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممانعت کی گئی کہ کوئی مسلمان اسلامی ممالک کو ہجرت نہ کرے اور یہ جتلا دیا گیا کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائے موت دی جائے گی۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کی حالت یہودیوں سے بھی بدتر تھی۔ کیونکہ یہودیوں کو تو پھر بھی یہ اجازت دی گئی تھی کہ جہان اون کے سینک ساٹھ چلے جائیں لیکن مسلمان اس حق سے بھی محروم کر دیئے گئے۔ ہسپانوی مسیحیوں کی شیطنت آمیز سفاکی اسی حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ یہ تک کہتے ہوئے خدا سے نہ ڈرتے تھے کہ مسلمانوں کی بے غیرتانه بے دینی کی پاداش میں اگر حکومت اون سب کی گردن مار دے تو کچھ بے جا نہ ہو۔

افسوس مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں عیسائیوں کے ساتھ جس رواداری اور مسالمت کا سلوک کیا تھا اوس کا معاوضہ ناسپاس اور حق ناشناس عیسائیوں نے اون کو دیا تو یہ دیا! ا! مظلوم مسلمانوں کے ساتھ سخت بدعہدی اور بے ایمانی روارکھی گئی۔ غرناطہ کی اسلامی حکومت نے جب ہتھیار ڈالے تھے تو عیسائیوں سے یہ اقرار صالح لے لیا تھا کہ اون کو تہنی اور مذہبی حقوق میں کسی طرح کی دست اندازی نہ کی جائے گی۔ لیکن پادری زمینزر کے اغوا پر یہ وعدہ توڑ دیا گیا اور آٹھ سو سال تک آباد رہنے کے بعد مسلمان اس ملک سے نکال دیئے گئے۔

اندلس میں تین مذاہب یعنی عیسائیت موسویت اور اسلام کے پہلو بہ پہلو موجود ہونے سے فلسفہ ابن رشد کو نشوونما پانے کا موقع ملا تھا۔ یہ گویا اوسى واقعہ کا اعادہ تھا جو کئی صدی پیشتر رد امین ابس وقت پیش آیا تھا جبکہ ممالک مفتوحہ کے تمام دیوتا اور دیبیاں پایہ تخت قیصر میں لاکر جمع کر دی گئی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ان کی طرف سے عام بد اعتقادى پھیل گئی تھی۔ خود ابن رشد پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اول مسلمان تھا پھر عیسائی ہوا پھر یہودی بنا اور انجام کار وہ یہودی ہو گیا۔

از سنہ وسطیٰ میں دو تصانیف اپنے طہانہ مضامین کے لحاظ سے شہرہ آفاق تھیں۔ ایک کا نام ”دوسری ایورلاستیک کیمپل“ (انجیل لازوال) تھا اور دوسری کا ”دوسری ٹراٹیس اسپاسٹریس“ (جماعت کا ذہن)۔ ثانی الذکر کتاب کے مصنف کے متعلق مختلف اقوال تھے۔ بعض لوگ انصیف کو پانچویں جبرٹ سے منسوب کرتے تھے بعض فریڈرک ثانی سے اور بعض ابن رشد سے۔ چونکہ ڈائمنیک فرقہ کے پادریوں کو ابن رشد سے قلبی عداوت تھی لہذا اس زمانہ کے ہر طہانہ عقیدہ کو وہ بلاتامل اس کے سر تھوپ دیتے تھے۔ چنانچہ مسئلہ عشاخو ربانی کی تحقیر و تضعیف کا ذکر ادوں کے حلقوں میں جب آتا تھا تو ابن رشد کے نام پر سینکڑوں گالیوں پر جاتی تھیں۔ ابن رشد کی تصانیف کا علم سبھی یورپ کو اول اول تیرہویں صدی کے شروع میں میکائیل اسکاٹ کے تراجم کی وساطت سے ہوا لیکن ایشیا کی طرح یورپ میں بھی اس قسم کے خیالات مدتوں پہلے سے شائع ہو چکے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایتھینا کا فلسفہ انہیں کس شرح و بسط کے ساتھ نظر کرتا ہے۔ عربوں پر مذاق فلسفہ سے آشنا ہوتے ہی ان خیالات کا اثر پڑنے لگا تھا۔ اور تینوں خلافتوں کے دارالعلوم میں بھی فلسفہ رائج تھا۔ اگر ان خیالات پر اس پہلو سے نظر نہ ڈالی جائے کہ عقلی نشوونما کے ایک خاص مقام تک پہنچنے کے بعد ہر انسان کا ان سے خود بخود متاثر ہو جانا یقینی ہے بلکہ ارسطو کو ان کا مبداء و منشا قرار دیا جائے تو تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ ہر اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ طبقہ نے ان کو بہ نظر استحسان دیکھا۔ ان خیالات کی جھلک ہمیں رابرٹ گراسٹھٹ۔ راجر بیکن اور اسپانور کی تصانیف میں نظر آتی ہے۔ ابن رشد ان خیالات کا موجد نہ تھا بلکہ محض شاعر اور مفسر تھا۔ تیرہویں صدی کے یہودیوں کو استاد کی سند پر صرف شاگرد بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ ارسطو کی جگہ فلسفہ مشائخہ کے شاعر اعظم ابن رشد نے لے لی تھی۔ مسئلہ انصال و انجذاب کے سبھی ماننے والوں کی تعداد یورپ میں اس قدر بڑھ گئی کہ پاپائی گنزڈر رابن (۱۲۵۵ء) کو مجبوراً مداخلت کرنی پڑی۔ چنانچہ اس کے حکم سے آلبرٹس میگنس نے ایک کتاب مسئلہ وحدت عقل کل کے رد میں لکھی۔ اصلیت و ماہیت

روح پر بحث کرتے ہوئے اوس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ”یہ مسئلہ کہ ایک عقل  
مجرد اپنے نور سے افراد انسانی کو ادون کے پیدا ہونے سے پہلے منور کرتی ہے اور ادون کے  
فنا ہونے کے بعد قائم رستی ہے ایک قابل نفیر غلطی سے آلودہ ہے۔“ لیکن ارسطو کے  
زندہ جاوید مشایخ کا سب سے بڑا مخالف سینٹ ٹامس ایکویناس تھا جس نے وحدت  
عقل کل۔ انکار توفیق ایزدی۔ عدم امکان پیدائش اور اسی قسم کے دوسرے عقاید کی جو لحدانہ  
کبھی جاتے تھے شد و مد کے ساتھ تردید کی اور اپنے ہم معیرون یعنی ڈائینیکن فرقہ کی پادریوں  
کی رائے میں گویا ان الحادات کا قلع و قمع کر ڈالا۔ سینٹ ٹامس نے جب اپنے مسیحی بھائی  
بندون کو ابن رشد کے عقاید اختیار کرتے ہوئے دیکھا جو اوس کی نظر میں مسلمانوں سے بھی  
بدتر تھا تو اوس کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی اور ڈائینیکن پادریوں کے قول کے مطابق  
اس ”فرشتہ خصال عالم جید“ نے اپنے مخالف پر وہ نمایان قلبی فتوحات حاصل کیں جن کی یادگار  
فلارنس اور پائیس کے نقاشوں نے پر وہ تصویر پر چھوڑی ہیں۔ ڈائینیکن پادریوں کے  
مندیٹش پر یہ خیال تازیا نہ باری کرتا تھا کہ فرانسیسک فرقہ کے پادری جن سے اوہنیں رقابت  
تھی ابن رشد کے عقاید رکھتے تھے۔ چنانچہ ڈیٹیلی نے جو فرقہ ڈائینیکن کا طعن دار تھا ابن رشد  
کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ایک نہایت خطرناک مذہب کا بانی ہے۔ غرض ابن رشد پر تینوں بڑے مفسرین  
کی طعن سر مستفہ تکفیر کا فتویٰ جاری کیا گیا اور یہ خطرناک قول اوس سے منسوب کیا گیا کہ ”تمام  
مذہب اگرچہ غالباً مفید ہیں لیکن ادون کے باطل ہونے میں شک نہیں“۔ وین کی کونسل میں  
بالاتفاق یہ قرار پایا کہ اوس کی تعصبات کی اشاعت مطلقاً روک دی جائے اور تمام عیسائیوں کو  
ادون کے مطالعہ کی ممانعت کی جائے۔ ڈائینیکن فرقہ کے پادریوں کو ”انکویریشن“ کا سامہیب آئے  
ہاتھ آگیا تھا اور ادون کے سفاکانہ جبر و تشدد سے تمام یورپ کانپ رہا تھا۔ اس زمانہ میں جو  
بے دینی پمیلی ہوئی تھی اوس کا ذمہ دار یہ فرقہ ابن رشد ہی کے فلسفہ کو قرار دیتا تھا لیکن مخالفوں  
کے عقائد میں اوس کے طرفداروں کی بھی ایک جماعت موجود تھی۔ نہ صرف پیرس بلکہ شمالی اطلی

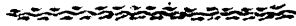
کے تمام شہروں میں فرانکسکن فرقہ کے عیسائی اوس کے پیرو تھے اور کل مسیحی دنیا میں ان مناقشوں کی وجہ سے ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔

ڈائمنیکن فرقہ کے پادریوں کی زبانی ابن رشد کے کافرانہ و لحدانہ کارناموں کا ذکر سنتے سنتے اٹلی کے نقاشوں اور مصوروں کی نظروں میں وہ بیدنی کی مجسم علامت بن گیا تھا۔ اٹلی کے اکثر شہروں اور قریوں میں روز قیامت اور دوزخ کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ ان میں ابن رشد کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا ہے۔ چنانچہ پائیس کے ایک اسی طرح کے مرقع میں جہان حضرت محمد اور ایریس اور دجال کی تصاویر ہیں وہاں ابن رشد بھی موجود ہے۔ ایک اور مرقع میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ابن رشد زمین پر گرا ہوا ہے اور سینٹ ٹامس اوس کی چھاتی پر سوار ہے سینٹ ٹامس کی فتح اور ابن رشد کی شکست لازم و ملزوم ہو گئی تھی۔ اٹلی کے مصوروں کی مذہبی تصاویر سولہویں صدی تک ابن رشد کے بغیر مکمل نہ بھی جاتی تھیں۔ اور اوس کے فلسفیانہ عقاید پیٹروا کی یونیورسٹی میں سترہویں صدی تک بدستور قائم رہے۔

فلسفہ ابن رشد کے اسپین سے اٹھ کر یورپ پر حملہ آور ہونے کی داستان ہم بالا حمال سنا چکے۔ اب صرف اتنا بیان کرنا باقی رہتا ہے کہ فریڈرک ثانی کی سرپرستی میں اس فلسفہ نے تسلی میں بھی سر اٹھایا لیکن اس طرف سے اس کی پیش قدمی زیادہ کامیاب نہ ثابت ہوئی۔ فریڈرک ثانی نے اسے پوری طرح سے تسلیم کر لیا تھا۔ اپنی کتاب ”سیلیین کونسپنس“ میں اس نے اوس کے ابدیت عالم اور ماہیت روح پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان مسائل کے متعلق اوس کے تمام شکوک ابن سبین کے جوابات سے رفع ہو گئے جو ابن رشد کا پیرو تھا۔ لیکن فریڈرک ثانی کی یہ آزاد خیالی چند روزہ ثابت ہوئی۔ وہ باپائیکو عظمیٰ کی مخالفت کی تاب نہ لاسکا اور اوس کے مغلوب ہونے پر ان فلسفیانہ خیالات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اٹلی کے شمالی حصہ میں فلسفہ ابن رشد مدتوں قائم رہا۔ ونیس کے طبقہ اعلیٰ میں اس کا اثر یہاں تک تھا کہ ہر وضع و شریعت اس کے اتباع پر مجبور تھا۔ آخر کار کلیسا نے اس کی تسمت

کا فیصلہ کر دیا۔ یعنی لیٹرن کونسل نے ۱۵۶۴ء میں یہ قومی صادر کیا کہ جو شخص ان قابل نفرن عقاید کی حمایت کرے گا وہ عمدہ بے دین سمجھا جائے گا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم اوپر لکھا آئے ہیں ویٹیکن کونسل نے بھی اپنے گذشتہ اجلاس میں ان عقاید کو مورد سب و شتم ٹھہرایا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام مطامع و ملامن کے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ خیالات بنی نوع ان ان کے ایک جزو غالب کے نزدیک صحیح ہیں۔



# چھٹا باب

## نزاع مذہب و سائنس دربارہ ماہیت عالم

ماہیت عالم کی نسبت مذہبی خیال یعنی زمین چٹی ہے۔ بہشت اور دوزخ۔ اہل سائنس کا خیال یعنی زمین گول ہے۔ زمین کی جسامت کی دریافت۔ نظام شمسی میں اس کا درجہ اور نظام شمسی کے دوسرے اعضاء کے ساتھ اس کے تعلقات۔ کوئبرس۔ ٹی گا۔ اور میگلیک کے تین بڑے بھری سفر۔ سیاحت گرد زمین۔ ایک درجہ کی پیمائش اور رقا ص ساعت کے ذریعہ سے کر دیت زمین کی تعیین۔ کوپرنیکس کے اکتشافات۔ دور بین کی ایجاد۔ گلیڈیو ”انکویزیشن“ کے اجلاس میں حاضر کیا جاتا ہے۔ اوس کی سزا یا بی۔ سائنس کی فتح کلیسا پر۔ جسامت نظام شمسی کی تحقیق کی کوشش۔ سیارہ زہرہ کے مردہ منطقۃ البروج کی بنا پر آفتاب کے زاویہ اختلافات منفرد کی تعیین۔ کرہ زمین اور الفسان کی بیچ میرزی۔

خیالات دربارہ جسامت کائنات۔ زوایا سے اختلافات مناظر کو اکب۔ بردنویہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی آباد دنیا میں موجود ہیں۔ محکمہ ”انکویزیشن“ اوسے گرفتار کر کے قتل کر دیتا ہے۔

اب ہم ادن مباحث کو خیر تحریر میں لانا چاہتے ہیں جو فلسفہ کے تیسرے مہم بان شان مسئلہ یعنی ماہیت عالم کے متعلق پیدا ہوئے۔

اگر ہم صحیفہ قدرت کا مطالعہ بنظر انتقاد نہ کریں۔ تو ہمیں بظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ زمین ایک وسیع پیٹی سطح ہے جو قبة آسمان کو سہارے ہوئے ہے۔ اور یہ قبة نیلگون فوقانی و تحتانی دریاؤں کے مابین حد فاصل ہے۔ اجرام فلکی یعنی آفتاب ماہتاب اور ستارے مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ ان کے قامت کی کہتری اور غیر متحرک زمین کے گرد اداں کا حرکت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا درجہ زمین سے بمراتب حقیر اور ہد ارج کم ہے۔ جو حیوانات روئے زمین پر موجود ہیں اداں میں علوشان کے لحاظ سے ایک بھی انسان کا مد مقابل نہیں اور اس لیے اس کا یہ قیاس حق بجانب ہے کہ کائنات کی ہر چیز اداں کے فائدے کے لیے بنائی گئی ہے۔ آفتاب اس مقصد سے پیدا کیا گیا ہے کہ دن کے وقت اداں سے روشنی پہنچائی جائے اور ستارے اس غرض سے بنائے گئے ہیں کہ اندھیری راتوں میں اداں کا اجالا اداں کی رہبری کرے۔

مختلف ادیان و مذاہب کی روایات کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم نے سر منزل عقل و ادراک میں قدم رکھتے وقت مظاہر فطرت کے متعلق یہی تصورات قائم کیے ہیں۔ تمدن کے دور اول میں انسان نے زمین کو اکبر و اعظم موجودات سمجھ کر مرکز کائنات خیال کیا ہے۔ اور انسان کو افضل و اشرف مخلوقات مان کر زمین کی مرکزی ہستی سمجھا ہے۔ اور نتیجہ انسان نے دنیا کو ایک سرسری نظر سے دیکھ کر بلا غور و تعمق ہی قائم نہیں کیا بلکہ مختلف آسانی و سہولت بھی جو دنیا و وقتاً انسان پر نازل ہوئے ہیں من حیث التفلسف اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ اور انسانی صحیفہ نے انسان کو یہ بھی بتایا ہے کہ آسمان کے بلورین گنبد کے اوپر نورالازوال اور عیش مخلد کا ایک عالم ہے جسے بہشت کہتے ہیں۔ اس عالم میں خدا کو تعالیٰ اور ملائکہ رستے ہیں اور ممکن ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو بھی یہی جگہ رہنے کو ملے۔ زمین کے نیچے ابدی تاریکی اور عذاب کا مستقر جہان بدن کو رکھا جائے گا۔ اس طرح عالم مرئی کے پردہ میں گویا عالم غیر مرئی کی تصویر دکھا دی گئی ہے۔

ترکیب عالم کے اس تصور کی بنا پر بڑے بڑے مذاہب کی ہمارتیں قائم کی گئی ہیں اور چونکہ اس کے قیام کے ساتھ بہت سی زبردست مادی اغراض وابستہ تھیں لہذا اس کے استحکام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ جو کوششیں پیردان سائنس کی طرف سے اس کی مسئلہ غلطیوں کی تصحیح کے لیے عمل میں لائی گئیں اور ان کی مخالفت بعض دفعہ یہاں تک ہوئی کہ کوئی فریزی تک نوبت پہنچتی ہے۔ اور یہ مخالفت محض اس خیال سے کی گئی ہے کہ اگر مخالفین کو کامیابی ہوئی تو بہشت و دوزخ کے مواقع کی تعیین کا ستون مرکز نقل سے ہٹ جائے گا اور اس اخلاقیات و اکیلیت کو جو کائنات کے موضوع اعظم ہونے کے لحاظ سے انسان سے منسوب کی جاتی ہے بہت بڑا صدمہ پہنچے گا۔

لیکن اس قسم کی کوششوں کا عمل میں آنا ایک نتیجہ اور لازمی امر تھا۔ جب انسان اس مسئلہ پر نور و وضوح کرنے کے قابل ہو گیا تو اس کو ان دعوت کے تسلیم کرنے میں تامل ہو نہ سکا کہ زمین ایک سطح غیر محدود ہے۔ کسی شخص کو اس امر میں کام نہیں ہو سکتا کہ جو آفتاب آج ہماری دیکھنے میں آیا ہے یہ وہی آفتاب ہے جسے ہم نے کل دیکھا تھا۔ اس کے نورانی ترص کا ہر صبح از سر نو نمودار ہونا یہ خیال پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ زمین کے نیچے سے گزرا ہے۔ لیکن اگر یہ خیال صحیح ہو تو وہ دوسرا مفروضہ کہ زمین کے نیچے ہمیشہ تاریکی چھائی ہوئی ہے باطل ہوا جاتا ہے۔ غرض آفتاب کا زمین کے نیچے سے ہو کر گذرنا مشکل زمین کا کرہ زمین کا خیال کم و بیش وضاحت کے ساتھ فرور پیدا کرتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ زمین کا پھیلاؤ سمت تختانی میں غیر محدود نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آفتاب کا نمودار اس کے جرم میں ممکن نہیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی ایسا سوراخ یا منفذ زمین میں موجود ہو جس کی راہ سے آفتاب نکل آتا ہو اس لیے کہ سال کے مختلف موسموں میں اس کے طلوع و غروب کے مقامات مختلف ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ستارے بھی زیر زمین مختلف اطراف میں حرکت کرتے ہیں پس ضرور ہے کہ زمین کے نیچے ایک صاف رسد موجود ہو۔



آیات الہامی کو اس جدید استقرا کے ساتھ تطبیق دینے کے لئے اوس قسم کی توجہات کو وقتاً فوقتاً کام لیا گیا جن کی مثال کاساس انڈیکا پلوسٹینز کی کتاب ”کرپچین ٹاپو گرافی“ (جغرافیہ سیسی) میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں۔ اس کتاب میں جیسا کہ ناظرین کو یاد ہو گا یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ زمین ایک چپٹی سطح ہے جس کے شمالی حصوں میں ایک بہت بڑا پہاڑ واقع ہے۔ آفتاب جب اس پہاڑ کے پیچھے چلا جاتا ہے تو رات ہو جاتی ہے۔

ایک نہایت دور دراز تاریخی زمانہ میں انسان کو کسوف و خسوف کی حقیقت کا علم ہو چکا تھا۔ چاند گہن کے مشاہد سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ زمین کا سایہ ہمیشہ مدور ہوتا ہے۔ اس مشاہدہ سے یہ بدیہی نتیجہ نکلا کہ زمین کی شکل بھی گول ہوگی اس لیے کہ جو جسم ہر حالت میں گول سایہ ڈالتا ہو وہ خود بھی گول ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ دوسرے قرائین و دلائل سے بھی جن کو آج کل بچہ بچہ جانتا ہے یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی کہ زمین گردی شکل ہے۔

لیکن شکل زمین کی تعیین اسے اوس مسند عظمت سے بٹانا سکی جس پر نظا ہر مین انکھون نے اسے بٹھا رکھا تھا۔ چونکہ وہ نظا ہر تمام دوسری اشیا کے مقابلہ میں ہر ارب بڑی نظر آتی تھی اور کسی محسوس ہو سکنے والی شے کی اوس کے سامنے کوئی بستی نہ تھی لہذا نظا ہر مینون ذہن صرف اسے مرکز عالم بلکہ خود عالم تصور کیا۔

اگرچہ اون بتایا گئے جو زمین کو گردی شکل ماننے سے پیدا ہوئے مرد و جنہ صبی نقاید پر نہایت گہرا اثر ڈالا لیکن جو بتایا جسامت زمین کی تعیین سے مترتب ہوئے وہ کمین زیادہ اہم تھے۔ علم ہندو کا مبتدی بھی اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ زمین کی جسامت کا صحیح حال سطح زمین کے ایک درجہ کی پیمائش سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے غالباً نہایت قدیم زمانہ میں متعدد کوششیں ملائے گئے ہست کی طرف سے ہوئیں جن کو بتایا جے ضایل

ہو گئے ہیں۔ لیکن اتنا ہلکو تحقیق کے ساتھ معلوم ہے کہ ایرانیہ استھین نے مصر میں کثرت اور سین کے درمیان یہ سمجھ کر کہ سین ٹھیک خط سرطان کے نیچے واقع ہے ایک درجہ راضی کی پیمائش کی کوشش کی تھی۔ لیکن چونکہ یہ دونوں مقامات نصف النہار کے ایک ہی خط پر واقع تھے لہذا ان کے باہمی فاصلہ کا صرف اندازہ لگا لیا گیا۔ پیمائش نہیں کی گئی۔ اس کے دو صدی بعد پاسیڈونیس نے اسکندریہ اور آڈس کے درمیان اس قسم کی دوسری کوشش کی۔ یہیل نامی روشن ستارہ مقام ثانی الذکر پر افق کو مس کرتا تھا اور اسکندریہ میں افق سے ساڑھے سات درجہ اونچی تھا لیکن اس مرتبہ بھی ان دونوں مقامات کے درمیان سمندر کا حامل ہونا پیمائش کو مانع آیا اور فاصلہ کا صرف تخمینہ قائم کر لیا گیا۔ بالآخر جبکہ ہم سابق میں بیان کر آئے ہیں خلیفہ المامون نے درجہ ارضی کی دو پیمائشیں کرائیں۔ ایک ساحل بحر قزح پر دوسری عراقی عرب میں شہر کوفہ کے قریب ان مختلف تجربوں کا عام نتیجہ یہ نکلا کہ زمین کا قطرسات اور آٹھ ہزار میل کے درمیان ہے جسامت زمین کے اس تخمینہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عظمت و جبروت کے اس درجہ پر جس پر وہ ابھی تک خوش عقیدہ لوگوں کے نزدیک فائز تھی گر گئی اور دینیات میں اس کی وجہ سے ایک ہل چل پڑ گئی۔ اس ہل چل میں ارتسارکس متوطن بیتاں کی تحقیقات نے بہت بڑا حصہ لیا۔ ارتسارکس مدرسہ اسکندریہ کا متبحر ہنر دان تھا جس نے نہایت کازمانہ پایا ہے۔ شمس و قمر کی مقادیر و ابعاد پر اس نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں وہ اس قابل تعریف مگر ناقص طریقہ کو بوضاحت بیان کرتا ہے جس کے ذریعہ سے اس نے اس مسئلہ کے حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے بھی کئی قرن پیشتر فیثاغورث کے ذریعہ سے ایک نیا خیال ہندوستان سے یورپ میں پہنچ چکا تھا۔ اس خیال کے مطابق آفتاب مرکز کائنات تھا۔ آفتاب کے گرد اگر عطارد، زہرا، زمین، مریخ، مشتری اور زحل اپنے اپنے محوروں پر گھومتے ہوئے درجہ بدرجہ گردش کرتے تھے۔ بقول سیسرو

ناسیاس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے تو گردش فلک کی ناقابل خیال سرعت کی وجہ سے جو مشکل پیش آتی ہو وہ مرفع ہو جاتی ہے۔

قیاس چاہتا ہے کہ آسٹارکس کی تصانیف جو کتب خانہ اسکندریہ میں موجود تھیں جو کتب خانہ کی آتش زنی میں جل گئی ہوں۔ اُسکی صرف ایک تصنیف ”مقادیروا بجا دتس و قمر“ جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے دستبرد روزگار سے بچی بچائی ہیتم تک پہنچی ہے۔

آسٹارکس نے نظام فیثاغورث کو ایک حقیقت نفس الامری سمجھ کر تسلیم کر لیا۔ آفتاب کا سیرت انگیز فاصلہ اور اس لحاظ سے اُسکا نظم شان جرم اس اعتراف کا دار علیہ تھا۔

نظام فیثاغورث نے آفتاب کو مرکز کائنات قرار دی کہ زمین کا درجہ بہت ہی گھٹا دیا اور اسے اُن چاند کے زمرہ میں شریک کر دیا جن کا کام یہ ہے کہ آفتاب کے گرد گردش کیا کریں۔ لیکن آسٹارکس نے فن ہیت کی ایک ہی خدمت نہیں کی یہ دیکھ کر کہ زمین کی حرکت سے کوکب کے ظاہری یا اعتباری مقامات و مواقع پر کوئی نمایان اثر نہیں پڑتا۔ اُس نے یہ استدلال کیا کہ اُن کا اور زمین کا باہمی فاصلہ سورج اور زمین کے باہمی فاصلہ سے بھی بدھیا زیادہ ہے۔ لیبلیس کا قول ہے کہ کائنات کے جلال و عظمت کا صحیح خیال جیسا آسٹارکس کو تھا ویسا ہندسین زمانہ قدیم میں سے اور کسی کو نہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فاصلہ ثابت کو مد نظر رکھنے کے بعد زمین کی حقیقت ایک ذرہ ناچیز سے زیادہ باقی نہیں رہتی۔ اُس کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے اوپر جو فضا بسیط اور کوکب کے اور کچھ نہیں ہے لیکن اجسام فلکی کے مقامات حقیقی و اعتباری کے متعلق آسٹارکس کے خیالات کو قدامت نے تسلیم نہیں کیا بلکہ نظام بطلیموسی میں حیثیت سے کہ اُس کی تصریح المجسطی میں کی گئی ہے عام طور پر رائج ہو گیا۔ اُس زمانہ کا فلسفہ طبعی نہایت ناقص و غیر مکمل تھا۔ مثلاً نظام فیثاغورث پر بطلیموس کا ایک اعتراض یہ تھا کہ اگر زمین متحرک ہو تو ہوا اور دوسرے

لطیف اجسام کو پیچھے چھوڑ جاے۔ اسی لیے اُس نے زمین کو مرکز کائنات قرار دے کر یہ ظاہر کیا کہ قمر، عطارد، زہرہ، شمس، مریخ، مشتری اور زحل درجہ بدرجہ اُس کے گرد گھومتی ہیں اور زحل کے مدار کے بعد نقطۃ الثوابت ہے۔ ایک خیال اُس زمانہ میں بھی تھا کہ دو مٹھوس بلورین کرے ہیں جن میں سے ایک مشرق سے مغرب کی طرف اور دوسرا شمال سے جنوب کی طرف حرکت کرتا ہے لیکن یہ محض ایک فرضی خیال تھا جو یوڈاکس کا پیدا کیا ہوا تھا اور اُس کا بطلیموس حوالہ تک نہیں دیتا۔

اس لحاظ سے نظام بطلیموس ویاارضی المرکز ہے اس نے زمین کا تقوق قائم رکھا اور اس لیے مسیحی با اسلامی عقاید کو برا فروختہ ہونے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بانی کی مسئلہ شہرت اور اُس غیر معمولی قابلیت نے جو اُسکی تصنیف متعلقہ ساخت آسمانی پر صرت کی گئی ہے۔ نظام بطلیموس کو چودہ سو سال یعنی دوسری سے لیکر سولہویں صدی تک پایہ اعتبار سے ساقط نہ ہونے دیا۔

مسیحی دنیا میں اس زمانہ دراز کا زیادہ تر حصہ ماریت ذات باری کے مباحث اور مذہبی اقتادات کے حصول کی غرض سے یار یوں کی رقیانہ کشمکش میں گملا۔ مسیحی بزرگان دین کے اجتہاد نے اس عام عقیدہ کے ساتھ شامل ہو کر کہ انجیل جملہ علوم و فنون کی مخزن ہے مشاہدہ و تجربہ اور علمی اکتشافات کا رستہ رکے یا اگر مہیت کے کسی مسئلہ کی تحقیق کا شوق اتفاق سے کسی کو کچھ دیر کے لیے پیدا ہو بھی گیا تو ثوابت و دیار کے مہندسانہ مشاہدہ کے بجائے اگٹائن یا لکٹنٹس کے سے بزرگواروں کی تصانیف کی درق گردانی سے سائل کی تشفی کر دی گئی۔ روایت کو درایت پر یہاں تک ترجیح دی گئی کہ عیسائیت نے باوصفیکہ اُسے وجود میں آئے جو پندرہ صدیان گزر چکی تھیں ایک بھی مہیت دان پیدا نہ کیا۔

لیکن اسلام کی حالت اس بارے میں مسیحیت سے بہت بہتر ہے۔ مسلمانوں کا کتاب

علوم و فنون کا دور فتح اسکندریہ کی تاریخ یعنی ۳۳۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جناب رسالت آپؐ کو رحلت فرمائے ہوئے صرف چھ سال کی مدت منقضي ہوئی تھی۔ دو صدیوں کے اندر اندر مسلمان نہ صرف یونان کے حکماء طبعیین کی تصانیف سے واقف ہو گئے بلکہ ہر علمی مسئلہ کے مالد و ماعلیٰ پر نظر انتقاد ڈالنے کے قابل ہو گئے جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں اُس معاہدہ کی رو سے جو سیکائل ثالث شہنشاہ یونان اور المامون عباسی مین ہوا تھا مامون نے بطلمیوس کی تصنیف ”سنٹکسس“ کا ایک نسخہ حاصل کر کے اس کا ترجمہ لاطینی کے نام سے عربی مین کر لیا تھا۔ یہ کتاب ہنیت دانان عرب کے لیے مستشار اعظم بن گئی۔ اور اس کو پندرہم علم کی بنا قرار دے کر انہوں نے سائنس کے بعض ہنایت ہی اہم مسائل حل کئے انہوں نے زمین کی جسامت دریافت کی۔ اُن تمام ستاروں کی فہرستیں تیار کیں جو اُس حصہ آسمان پر نظر آتے جو اُن کے مقابل تھا اور بڑے بڑے ستاروں کے نام رکھے جو آج تک تبدیل نہیں ہوئے۔ انہوں نے سال کی صحیح مدت کا اندازہ لگایا۔ انعطاف ضیاء کو کبھی کے اصول کی تحقیق کی۔ ”پنڈلم“ (رقاص) والی گھڑی ایجاد کی جن آلات سے ستاروں کی روشنی کا اندازہ کیا جاتا ہے اُن کو بہت کچھ ترقی دی۔ یہ اصول دریافت کیا کہ شعاع نور ہوا میں شل تو س گزرتی ہے۔ چاند اور سورج کے افق پر نظر آنے کی توجیہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اجرام قبل از طلوع و بعد از غروب کیوں نظر آتے ہیں۔ کرہ ہوا کی بلندی کو ناپا اور یہ بلندی اٹھاون میل قرار دی بحث پٹے کی اصلی کیفیت اور ستاروں کو کھیلانے کی صحیح وجہ بیان کی۔ یورپ مین اول اول جو رصد گاہ قائم ہوئی وہ مسلمانوں ہی کی بنائی ہوئی تھی۔ اجرام فلکی کے نقل و حرکت کے متعلق اُن کی باریک بینی و دقیقہ سنجی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ زمانہ حال کے قابل سے قابل مہندسون نے اُن کے رصدی نتائج سے استناد کیا ہے۔ مثلاً لیبلیس اپنی کتاب ”نظام عالم“ مین لبتانی کے مشاہدات کی سند اس امر کے قطعی ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے کہ مرکز آفتاب اور مرکز مدار ارض کا درمیان

فاصلہ کم ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ مسئلہ اعوجاج طریق الشمس اور مشتری و زحل کی عدم مساوات ہائے اکبر کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے ابن یونس کے مترتبہ نتائج کو مدد لیتا ہے۔

عقدہ اہمیت عالم کے حل کرنے میں بنییت و انان اسلام نے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں ہم نے ان کا عشر عشر بھی بیان نہیں کیا۔

بہر حال اس زمانہ میں سائنس کچھ ترقی حاصل ہوئی مسلمانوں کی بدولت ہوئی۔ عیسائی دنیا پر جہل و اداہام کی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ مسیحیوں کو علمی مسائل کی ہوائ تک نہ لگی تھی۔ وہ مجسمہ پرستی۔ گنہ پرستی۔ عشا سے ربانی۔ کرامات ادلیا۔ معجزات تصرفات ارواح اور خوش عقیدگی کے اسی طرح کے دوسرے گورکھ و دھندوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اس خواب غفلت سے مسیحی دنیا پندرھویں صدی کے خاتمہ تک بیدار نہ ہوئی۔ اس وقت بھی شوق علم اس کے جاگنے کا باعث نہ ہوا۔ بلکہ اسباب ترغیب کچھ اور ہی تھے یعنی اقوام یورپ میں تجارتی رقابت پیدا ہو گئی۔ اور کو لمبس ڈچی کا ما اور فرڈیننڈ میکسلین کی جہاز رانی مسئلہ شکل زمین کے تصفیہ کا اجیر باعث ہوئی۔

مشرقی ایشیا کی تجارت نے ان مغربی اقوام کو جو اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئی، جہن ہمیشہ مالا مال کیا ہے۔ ازمنہ وسطی میں اس تجارت کا مرکز اٹلی کا شمالی حصہ تھا۔ یہ تجارت شمال و جنوب دو طرف سے ہوتی تھی اور اس کے مرکز علی الترتیب ہنوا۔ اور وینس تھے۔ جو اسے مال تجارت جہازوں میں بھر کر براہ تجیرہ اسودہ و بحیرہ خزر ایران کے شمالی ساحلوں پر اُتارا جاتا تھا اور وہاں سے اونٹوں پر بار کر کے آگے بھیجا جاتا تھا۔ جنوبی صدر مقام یعنی وینس سے جو مال روانہ ہوتا تھا وہ یا تو شامی اور مصری بندرگاہوں پر اُتار کر براہ خشکی اندرون ملک میں بھیج دیا جاتا تھا یا تجیرہ قلمرو اور بحیرہ عرب کی راہ سے مشرقی ممالک کی طرف روانہ کر دیا جاتا تھا۔ جن سوداگروں کا صدر

مقام دینس تھا اُنھوں نے دورانِ حروب صلیبیہ میں ذرائعِ بار برداری کی بھرپوری سہولت سے بہت بڑی دولت کمائی تھی۔

اہل دینس کی زمانہِ شبابی نے اُن کے تعلقات کو چونکہ شام اور مصر کی اسلامی دولتوں کے ساتھ بگڑنے نہ دیا تھا لہذا اُن کو اسکندریہ اور دمشق میں اپنے سفارت خانے قائم رکھنے کی اجازت تھی۔ اور باوجودیکہ ان ممالک میں حیدال و قتال کے ہنگامے آئے دن پہاڑتے رہتے تھے پھر بھی دینس کی تجارت ترقی پر تھی۔ لیکن شمالی شاخِ تجارت جس کا صدر مقام جنوا تھا کچھ تو تاتاریوں اور ترکوں کی حملہ آور سی اور کچھ اون ممالک کے اندرونی فسادات کی وجہ سے جن میں سے اس کے مال کو گزرنا پڑتا تھا ویران ہو چلی تھی۔ اور وہ وقت قریب آگیا تھا کہ یہ تجارت بالکل ہی مٹ جائے۔

افن طاہری کی مدد و شکل۔ سمند میں اس کا ڈوبا ہوا نظر آنا۔ جہازوں کا کھلے سمند میں تہہ رنج نمودار ہونا اور رفتہ رفتہ غایب ہو جانا یہ تمام ایسے واقعات ہیں جن کے مشاہدے وہ جہازران جن کو مبداءِ فیاض سے جو ہر فکرِ سلیم عطا ہوا ہے اس نتیجہ کی طرف مائل ہوتے بغیر نہیں رہ سکتے کہ زمینِ کردی شکل ہے مسلمان مہندسین و فلاسفہ کی تصنیفات نے اس خیال کو مغربی یورپ میں عام طور سے شائع کر دیا تھا لیکن دین مسیحی کے پیشواؤں نے اسے کبھی استحسان کی نظر سے نہ دیکھا اور اُن سے بجز اس کے توقع بھی اور کیا ہو سکتی تھی جب جنوا کی تجارت تباہی کے قریب پہنچ گئی تو یہاں کے بعض جہازرانوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر زمین حقیقت میں گول ہو تو ممکن ہے کہ جنوا کا آفتاب تجارت جو لبِ بام ہے پھر نصف النہا پر چمکنا جو نظر آئے۔ اس لیے کہ جو جہاز آجائے جبل الطارق میں سے ہوتا ہوا بحرِ اوقیانوس کے بیچون بیچ سمت مغربِ ناک کی سیدہ چلا جائے وہ ضرور ہے کہ ہندوستان کے مشرقی ساحل پر پہنچ جائے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑا فائدہ اس میں یہ بھی تھا کہ مالِ تجارت جہازوں کے ذریعہ سے خشکی کے سفر کی محنت شاقہ اور مصارفِ کثیر کے بغیر

منزل مقصود پہنچ سکتا تھا۔

جنوا کے جن ناخداؤں کو یہ خیال پیدا ہوا ان میں کرسٹوفر کولبس بھی شریک تھا جس کے مقدر میں ایک عظیم الشان حقیقت کا عملی انکشاف لکھا تھا۔

کولبس بیان کرتا ہے کہ اس مسئلہ کی طرف اس کی توجہ ابن رشد کی تحریرات نے منطقت کی اسکے علاوہ اس کا ایک درست ٹاسنلی نامی فلازنس کا رہنے والا تھا جس کو فن ہیئت کے مطالعہ کا درجہ فائیت شوق تھا۔ ٹاسنلی مسئلہ کو دیت شکل زمین کا بہت بڑا حامی تھا اور کولبس کے خیالات پر اس کی تعلیم کا بھی قوی اثر پڑا۔ لیکن جنوا میں کولبس کی حوصلہ افزائی بہت کم ہوئی۔ کئی سال تک وہ مختلف ممالک کے فرمانرواؤں اور امرا کو اپنے مجوزہ ارادہ کی تکمیل کی سرپرستی پر آمادہ کرتا رہا لیکن اس کی کوششیں رایگان گینیں۔ اسپین کو بادریوں کو اس کے ارادہ میں کفر اور زندہ کی ڈراہ فی صورت نظر آئی۔ اور سیلیسکا کی مسیحی کونسل نے اس پر بدعت سید کا فتویٰ لگایا۔ چارون طرف سے بادریوں کی یہ آوازیں آنے لگیں کہ جو شخص زمین کو گول مان کر اس کے گرداگرد سفر کرنے کی محاذ کوشش کرتا ہے وہ عہد عتیق۔ عہد جدید۔ زہر۔ رسولوں کی پیشین گوئیوں۔ اور سینٹ کریسٹم۔ سینٹ اگسٹائن۔ سینٹ جروم۔ سینٹ گرگوری۔ سینٹ ہیل اور سینٹ ایمرز کے نوشتجات و ملفوظات کو جھٹلاتا ہے۔

لیکن اس کی مساعی جلیلہ آخر کار بار آور ہو کر رہیں۔ اسپین کی بلکہ آسٹریا نے اس کی ہمت بڑائی اور ناخدا یان پیلاس کے ایک دولتمند خاندان مینزان نامی نے روپیہ سے اس کی مدد کی۔ اس خاندان کے کچھ لوگ اس کے ساتھ چلنے کے لیے بھی آمادہ ہو گئے۔ شاعر ڈینیڈ نے اسے ماتا کے خانہ عظم کے نام ایک چٹھی اپنے خاص دستخط سے لکھ کر دی۔ اور ایک بحری نقشہ جو ٹاسنلی کے مرتبہ نقشہ کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا اپنی رہنمائی کے لیے اس ساتھ لیا۔ غرض کیل کاغذ سے پوری طرح بس ہو کر اس نے ہر گشت و گشت میں



چھوٹے چھوٹے جہازوں کے بیڑے کے ساتھ لنگر اٹھانیا۔ سو اوور ہینے کے مسلسل سفر کے بعد ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو آدھی رات سے ذرا دیر پہلے اُس نے اپنے جہاز کے مشینوں سے کچھ فاصلہ پر ایک متحرک روشنی دیکھی۔ دو گھنٹے کے بعد دوسرے جہاز سے توپ کے دھنکے کی آواز آئی جو اس بات کی علامت تھی کہ اہل جہاز نے خشکی کو دیکھ پایا ہے۔ جب آفتاب طلوع ہوا تو جہاز ساحل پر پہنچ گئے اور کولمبس نے نئی دنیا میں قدم رکھا۔

جب وہ یورپ واپس آیا تو سب نے بھی خیال کیا کہ جس ساحل پر وہ لنگر انداز ہوا وہ ایشیا کا مشرقی حصہ تھا اور اس لحاظ سے اس کا سفر علی سیدل انفرکا سیاب رہا۔ خود کولمبس کو مرتے دم تک اسی بات کا یقین رہا۔ لیکن متعدد بحری سفر جو بعد میں کئے گئے اُن سے ساحل امریکہ کی عام حدود بہت جلد معلوم ہو گئیں۔ اور جب بلبو اس نے بحر اعظم جنوبی کو دریافت کیا تو اصل حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا وہ مٹا اٹھ گیا اور وہ غلطی رفع گئی جس میں ٹاسنلی اور کولمبس دونوں کو دونوں مبتلا تھے یعنی مغربی بحری سفر میں یورپ اور ایشیا کا درمیانی فاصلہ اُس فاصلہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا جو ٹاسلی سے خلیج گنی تک جانے میں طے کرنا پڑتا ہے اور یہ سفر کولمبس نے بلایا کیا تھا۔

کولمبس نے اپنے پہلے سفر میں ۱۴ ستمبر ۱۴۹۲ء کو رات کے وقت جبکہ وہ مجمع الجزائر ازورس کے ایک جزیرہ کو روڈ سے ۲۰ درجہ مشرق کی جانب تھا یہ بات مشاہدہ کی کہ جہازوں

نے جہاز کے اگلے حصہ میں ایک مرتفع مقام کا نام جہان سے ناخذا کو مد نظر تک سب کچھ دکھائی دے سکتا ہے ۱۲ ستمبر کو بحرادتیونس شمالی میں پہنچاں سے کوئی آٹھ سو میل جاب مغرب واقع ہے۔ اس مجمع الجزائر میں کل نو جزیرے ہیں مجموعی رقبہ ایک ہزار میل اور آبادی کوئی تین لاکھ نفوس ہوگی۔ دار الحکومت کا نام آگلا ہے جو جزیرہ ٹرینیٹین واقع ہے۔ ان جزائر میں بہت سے آتش فشاں پہاڑ ہیں جن کی وجہ سے آؤڈن اٹاک جان و مال ہوتا رہتا ہے۔

آب و ہوا نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے چنانچہ جو لوگ امراض صدر میں مبتلا ہوتے ہیں وہ بغرض تبدیل دآب و ہوا و تکمیل صحت پھین جاتے ہیں۔ انگور۔ نارنگیان اور نیبو میو دن بین اور گیہون اور کی انماج میں وہاں کی نمایاں

کی کمپاس کی سوئیوں کا رخ حسب معمول یابل بہ شمال و مشرق نہیں ہے بلکہ یابل بہ مغرب ہے جو کہ جون جہاز آگے بڑھتے گئے یہ انحراف بھی نمایاں ہوتا گیا۔ اگرچہ کو کمپاس ہی پہلا وہ شخص نہیں ہے جس کی نظر اس انحراف پر پڑی لیکن اس میں شک نہیں کہ خط عدم انحراف کو سب سے اول اسی نے دریافت کیا۔ اس سفر سے واپس آتے وقت اس کو برعکس حالت پائی گئی یعنی کمپاس کی سوئی کا مغربی میلان کم ہوتا گیا تاکہ اس خط نصف النہار پر پہنچ کر جہان انحراف باقی نہیں رہتا سوئی کا رخ پھر شمال کی طرف ہو گیا۔ اس کو بعد جون جہاز یورپ کا ساحل قریب آتا گیا سوئی کا مشرقی میلان بڑھتا گیا۔ اس سے کو کمپاس نے یہ نتیجہ نکالا کہ خط نصفی میلان یا عدم انحراف ایک مقررہ جغرافیائی خط ہے جو نصف کرہ مشرقی و نصف کرہ مغربی کے درمیان بمنزلہ حد فاصل ہے۔ جب اسپین اور پرتگال میں مقبوضات خارجہ کے متعلق جھگڑا ہوا تو پاپا کے اکثر رسلوں نے اس نزاع کے تصفیہ کی غرض سے ایک فرمان ۱۵۰۰ء مئی ۱۵۰۰ء میں جاری کیا۔ جس میں یہ خط ان دونوں اقوام کے مقبوضات کی دوامی حد فاصل قرار دیا گیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خط بتدریج مشرق کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۵۰۰ء میں لندن کے خط نصف النہار پر منطبق ہو گیا۔

پاپا کے فرمان کی رو سے پرتگال کے مقبوضات کی حدود خط عدم انحراف کا مشرقی حصہ قرار دی گئی تھیں۔ بعض مصری یہودیوں کی زبانی دولت پرتگال کو معلوم ہوا کہ براعظم افریقہ کے گردا گرد جہاز پر سفر کرنا آسانی ممکن ہے۔ اس سبب کہ براعظم مذکور کے منہائے جنوب میں ایک راس ہے جس کا عبور آسانی سے ہو سکتا ہے۔

نوٹ متعلقہ صفحہ ۲۲۴۔ پیداوار سے۔ اہل کاتھولک کو ان جزائر کا علم ہو چکا تھا جس کا جوہر۔ یہ سبب کہ جہان سے کاتھولک کے سکے برآمد ہوئے نہ تھے۔ علیٰ ذہن اقیاس مسلمان جہاز راؤن کے بہانے کی جہر بکترت۔ شہادت بہم پہنچ سکتی ہے۔ مترجم ۱۲

اس اطلاع کی بناء پر تین جہازوں کا ایک مختصر سا پڑا بسر کردگی واسکوڈی گاما ۹ جولائی ۱۴۹۸ء کو پنگال سے روانہ ہوا اور بتاریخ ۲۰ نومبر پراہس امید کو قطع کرنے کے بعد ۱۹ مئی ۱۴۹۸ء کو کاکئی کٹ بین لنگر انداز ہوا جو ہندوستان کے ساحل پر واقع ہے۔ پاپا کے اُس فرمان کی رو سے جسکا حوالہ دیا جا چکا ہے مشرق کے اس سفر کی بدولت اہل پنگال کو ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔

اس امید کا چکر کاٹنے سے پہلے واسکوڈی گاما کے جہازوں کا رخ عموماً جنوبی سمت میں تھا۔ بہت جلد یہ بات اہل جہاز کے دیکھنے میں آئی کہ سطح افق سے قطب تارے کا ارتفاع کم ہو رہا ہے اور فطرتاً سواہر پہنچنے کے بعد تو یہ ستارہ نظر سے بالکل ہی غائب ہو گیا اور ستارے جن میں سے بعض شاندار برج کی شکل میں تھے نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔ یہ وہی ستارے تھے جن کا تعلق نصف کرۂ جنوبی کے آسمان سے ہے۔ تمام واقعات سے اُن نظری قیاسات کی تائید ہوتی تھی جو شکل زمین کی کریت کے متعلق قائم کئے گئے تھے۔

ان جدید اکتشافات کے سیاسی نتائج نے پاپا کے روم کو گرداب تشویر و تذبذب میں ڈال دیا۔ جن مذہبی روایات اور ملکی مصالح پر پاپا کی حکومت کا انحصار تھا وہ کسی طرح اس کے مقتضی نہ تھے کہ زمین کی کوئی اور شکل بجز شکل سطح کے جسکا ذکر کتب الہامی میں تھا تسلیم کی جائے۔ اخفات و انقاعات ممکن نہ تھا اور سوسفٹا نیانہ تاویلین بیکار تھیں۔ دینس اور جہا کی تجارت کا چراغ گل ہو گیا۔ یورپ کی شکل تبدیل ہو گئی۔ بحری طاقت اُن ممالک سے جو بحرِ روم کے سواہل پر واقع تھے رخصت ہو گئی۔ اور وہ ملک جو بحرِ ادقیانوس کے اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے تھے جہاز رانی کے مرکز بن گئے لیکن دولت اسپین نے اپنے تجارتی رقیب کی اس کامیابی کے آگے ہاتھ پاذن مارے بغیر تسلیم کرنا گوارا نہ کیا۔ فرڈیننڈ میگیلن نامی ایک اولوالعزم نافدانے

اراکین دولت سے یہ عرض کیا کہ اگر اُس نئی دنیا میں جو اب براعظم امریکہ کے نام سے موسوم ہے کسی نئی آبنائے کا پتہ معلوم ہو جائے تو مغربی سمندرون کو قطع کرنے کے بعد ہندوستان اور اسپانیا آسٹریلیا (جزائر الاقتران) تک پہنچ جانا ممکن ہے اور اگر یہ مہم طے ہو جائے تو پاپا کے فرمان کی رو سے اسپین کو بھی ہندوستان کی تجارت میں اُسی قدر حصہ مل سکتا ہے جس قدر پرتگال کو یہ نیگیلین کی ان باتوں کو حکومت اسپین نے دل کو کا لائون سے سنا اور پانچ جہازوں کی ایک جم جس کے ساتھ دو سو ستریس آدمی تھے اُس کی سرکردگی میں ۱۰ اگست ۱۵۷۸ء کو اشبیلیہ سے روانہ کی گئی۔

میگیلین نے سیدہ جنوبی امریکہ کے ساحل کا رخ کیا اور تین ہفتہ پر اس امید پر بڑا چلا گیا کہ اُسے کوئی قدرتی آبی منہذ براعظم میں سے مل جائے گا جس کے ذریعہ سے وہ بحر اعظم جنوبی میں داخل ہو سکے گا۔ خطا عدم اغراض پر پہنچ کر ہوا چلتی بند ہو گئی اور کابل دو ہفتے دس دن تک بند رہی۔ جہاز کے لاجون کو یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں وہ ایسے منقطعہ میں نہ چلے آئے ہوں جہاں ہوا کبھی چلتی ہی نہ ہو۔ اور اونکا بڑا اس خوفناک سمندر کی ساکن وغیرہ متحرک موجوں سے کبھی پار ہی نہ ہو سکے۔ یہ خوف بغاوت سے مہل ہو گیا۔ اور جب خدا خدا کر کے ہوا کے جموں نگوں نے سمندر کے طلسم خموشی کو توڑا تو جھکڑ چلنے لگا۔ اور ایسا طوفان اُٹھا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ لیکن سمندر کا سکون۔ طوفان کا جوشن لاجون کی بغاوت دابل جہاز کی بونائی اُسکی جبین استقلال پر بل تک نہ ڈال سکی ایک سال سے زیادہ کی بحر لوردی کے بعد اُس نے وہ آبنائے دریافت کی جواب اُسکے نام سے منسوب ہے۔ آسٹریلیا کا ایک باشندہ چگافٹی جو اُسکے ہمراہ تھا بیان کرتا ہے کہ جب میگیلین کی نظر بحر جنوبی یعنی بحر الکاہل کی عظیم الشان پہنائی پر پڑی تو فطرت سے اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈھبڈھب آئے اور اُسکے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اُس خدا کا لکھ لکھ شکر ہے جس نے مجھے اس محیط اعظم کے نامعلوم خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے آخر

سیہان تک پہنچا دیا۔

خط کی شدت کا یہ علم تھا کہ روٹی کے بجائے اُسے چمڑے کے وہ ٹکڑے چبانے پڑے جن کی چھٹے ہوئے بادبازن مین گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ پانی اُسے ایسا پینا پڑا جس میں کیڑے پڑ گئے تھے اور بو آنے لگی تھی۔ اُس کے جہاز کے ملاح بھوک سے جان بلب اور مرض احراق خون میں مبتلا تھے مگر یہ کوہِ دقار شخص جسے زمین کے کردی شکل ہونے کا کامل یقین تھا ان جان فرسا مصائب سے مطلق متاثر نہ ہوا۔ وہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے جہاز کو برابر سمت شمال و مغرب میں بڑا رہے چلا گیا اور چار مہینے تک کسی آبادی پر اُسکی نظر نہ پڑی۔ اُس نے اندازہ لگایا تھا کہ بحر الکہل کی سطح پر اُسے بارہ ہزار میل سے کم مسافت نہ طے کی ہوگی۔ خط استوا سے گزرنے کے بعد اُسے قطب ستارہ پھر دکھائی دیا اور آخر کار جزائر لیڈرونس کے ساحل پر اُس نے لنگر ڈالا یہاں اُسکی ملازمین، سمارٹا کے بعض باشندوں سے ہوئی جو قسمت آزمائی کے لیے وطن سے نکلے تھے لیکن انہوں نے اُس کے مقدورین یہ نہ لکھا تھا کہ اس عظیم الشان بحری مہم کو اپنے ہاتھوں انجام تک پہنچائے۔ انہیں جزائر میں یا تو یہاں کے وحشیوں نے یا خود اُس کے ہمراہیوں نے اُسے مار ڈالا۔ اُس کے بعد اُس کے مددگار سبائین ڈاکاؤ نے جہاز کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور اس امید کا رخ کیا۔ رستے میں جو مصیبتیں اُسے جھیلنی پڑیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے اس امید آئی جس سے گزر کر اُس نے چوتھی مرتبہ خط استوا کو عبور کیا۔ ۷ ستمبر ۱۵۲۲ء کو تین سال سے زیادہ کے بحری سفر کے بعد اُس کا حبیب و سین و ڈوریا نامی سینٹ لور کے بندرگاہ میں۔ جو اسٹیبیلیہ کے متصل واقع ہے لنگر انداز ہوا۔ اس جہاز کا سفر بنی نوع انسان کی تاریخ میں سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس لئے کہ زمین کے گرد اگر سفر کرنے کا پہلا شرف اسی کو حاصل ہوا۔

سین و ڈوریا مغرب کی سمت میں سفر کرتے رہنے کے بعد اُسی نقطہ پر پہنچ گیا

تھا جہاں سے چلا تھا۔ اس سے زیادہ ممکن التزوید ثبوت زمین کے گول ہونے کا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اب سحیت کو یہ مجال نہ رہی کہ یہ دعوے کرے کہ زمین چپٹی ہے۔ لقولہ السطح ارض انسانی دماغ سے ہمیشہ کے لیے محو ہو گیا۔

میگیلن کے بحری سفر کی تکمیل کے پانچ سال بعد مسیحی دنیا نے تحقیق جسامت ارض کے متعلق پہلی کوشش کی جو ایک فرانسیسی طبیب فرئل کے حصہ میں آئی۔ فرئل نے اول حساب لگایا کہ پیرس میں ارتفاع قطب کس قدر ہے۔ اس کے بعد وہ شمال کی طرف روانہ ہوا تا آنکہ وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں پیرس کے مقابلہ میں ارتفاع قطب ایک درجہ زیادہ تھا۔ ان دونوں مقامات کے درمیان جس قدر فاصلہ تھا اس کی پیمائش اُس نے اپنی گاڑی کے ایک پہیے کے چکر دن کے ذریعہ سے کی جس کے ساتھ اُس نے ایک مقیاس المسافت لگا دیا تھا۔ جب ایک درجہ کا فاصلہ اس طریقہ پر معلوم ہو گیا تو اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین کا دور حسب پیمانہ آٹلی بعد چوبیس ہزار چار سو اسی میل کے ہے۔

اس کے بعد مختلف ممالک میں با احتیاط تمام پیمائش کی گئی۔ اسٹینل نے ایک درجہ ارضی کی پیمائش ہالینڈ میں کی۔ ناروڈ نے لندن اور یارک کے درمیان انگلستان میں پکارڈ نے "فرینچ اکاڈمی آف سائنسز" (مجلس ترقی علوم: فنون) کی سرپرستی سے فرانس میں۔ پکارڈ کی ترکیب یہ تھی کہ مشنوں کے ایک سلسلہ کے ذریعہ سے دو نقطوں کو باہم ملا کر دائرہ نصف النہار کے اُس قوس کو جو ان نقطوں میں جاؤں پیمائش کیا جائے اور اس کا مقابلہ عرض البلد کے اوپر اختلاف کے ساتھ کیا جائے جو مشاہدات فلکی سے حاصل ہو۔ اتصال نقاط کے لیے جو مقامات اس طور پر تجویز کیے گئے وہ بلواژن اور سردون تھے۔ اول الذکر نواح پیرس میں واقع ہے۔ اور ثانی الذکر آمینس کی قریب اختلاف عرض البلد کی تعیینیں برج ذات الکمر سی کے بعد سمت الراس کے مشاہدہ سے کی گئی۔ پکارڈ کے طرز عمل میں دو امور خاص طور سے توجہ کے قابل ہیں۔ اول تو

اس طریقہ کے عمل میں لاتے وقت جو آلات استعمال کئے گئے ادن میں دور بین بھی شامل تھی۔ ثانیاً اس سے جو نتائج مستنبط ہوئے انہوں نے جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا نیوٹن کے لیے اصول کثرت ثقل کی ہمہ گیری کا ثبوت بہم پہنچایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اصول علم الحركات خصوصاً ان اصول نے جو نیوٹن کے دریافت کیے ہوئے تھے وہ بات ثابت کر دی تھی کہ چونکہ زمین ایک جرم دور ہے لہذا اس کی شکل کابل کر دی گئی ہو سکتی بلکہ شیل کر دی یا سطح الطرفین ہوئی چاہے یعنی ضرور ہے کہ وہ قطبین پر چبڑی ہو۔ اس سے لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ اس کا طول خط استوا کے اطراف و جانب کے مقابلہ میں قطبین کے قریب زیادہ ہونا چاہیئے۔

”فرنج اکاڈمی“ نے فیصلہ کر لیا کہ پکارڈ کے عمل کو وسعت دی جائے اور پیمائش کا سلسلہ ہر عزت قائم کر کے فرانس کا ایک ایسا نقطہ مید کیا جائے جو نسبت زیادہ صحیح ہو۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل چیز التوا میں پڑی رہی اور کہیں ۱۷۹۰ء میں جا کر فرانس کی شمالی حد یعنی ڈنکرک سے لیکر جنوبی حد تک کی پیمائشیں ختم ہوئیں۔ ان پیمائشوں کی تاویل اختلاف آراء کا باعث ہوئی۔ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ان پیمائشوں سے کرہ زمین کا مستطیل الطرفین ہونا پایا جاتا ہے لیکن بعض کی رائے اس کے خلاف تھی وہ ان پیمائشوں کو زمین کے سطح الطرفین ہونے کا ثبوت سمجھتے تھے۔ شکل اول کو عام طور پر نیوٹن سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور شکل ثانی کو نارنگی سے اس اختلاف کا تصفیہ کرنے کے لیے حکومت فرانس نے ”اکاڈمی“ کی مدد سے دو علمی نفاذ دائرہ نصف النہار کے ایک ایک درجہ کی پیمائش کے لیے خط استوا اور شمال کی طرف روانہ کیے۔ پہلا نفاذ پیر دوگیا اور دوسرا سویڈن ویپ لینڈ کی طرف دو لو جاہاتون کو بہت کچھ دشمن اور زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن شمالی جامعیت نے جو ویپ لینڈ کو گئی تھی اپنا کام پیر دوالی جامعیت سے جو نو سال تک اپنے فرائض مفوضہ کی انجام دہی میں مصروف

رہی بہت پہلے ختم کر لیا۔ بہر حال دو دن جماعتوں کے نتائج کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ کرہ زمین سطح الطرفین یعنی قطبین پر چپٹا ہے۔ اس وقت سے لیکر اب تک اس پیمائش کا نہایت وسیع اور صحیح پیمانہ پر بار بار اعادہ ہوتا رہا ہے۔ انگریزوں نے انگلستان اور ہندوستان میں پیمائش کی اور فرانسیسیوں نے اوزان و پیمائش کے طریقہ مطبق کو جاری کرتے وقت جو پیمائش کی وہ اپنی دقیقہ منجی اور موثر گائی کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس پیمائش کو ڈیلا میر اور مستائن نے ڈنکرک سے شروع کر کے بارسلونا تک پہنچایا اور وہاں سے بائیٹ اور آراگونے اس کے ساتھ کہ جزیرہ فارسیئر تک مسافت دی جو تار کا کے قریب واقع ہے۔ اس پیمائش کا طول ساڑھے پانچ درجہ تھا۔

پیمائش کے اس بلاد اسطہ طریقہ کے علاوہ زمین کی شکل مختلف عروض السبلہ میں ایک معینہ طول کے رفاص ساعت کے بہتر اوقات کی اختلافات تعداد سے معلوم ہو سکتی ہے۔ ان بہتر اوقات سے اگرچہ نتائج سابقہ کی تصدیق و توثیق ضرور ہوتی ہے لیکن پیمائش درجات کے مقابلہ میں ان کے ذریعہ سے زمین کی بقیہ زیادہ بڑھی ہوئی قرار پاتی ہے۔ چون چون خط استوا قریب آتا جاتا ہے رفاص کی بہتر اوقات رفاص میں آہستگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا فاصلہ زمین کے مرکز سے قطبین کے مقابلہ میں خط استوا پر زیادہ ہے۔

سب سے زیادہ معتبر و موثق پیمائش کی بنا پر زمین کی جسامت حسب ذیل اندازہ فرانسسیسی اندازہ یہ تھا کہ ایک قطر قطب سے خط استوا تک کے درمیانی فاصلہ کا ایک لاکھ و چھ سو۔ یہ اندازہ نو عشرت الذیق غیر صحیح ثابت ہوا لیکن پھر بھی وہ سر سے اندازوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہونے کے باعث عام طور سے فاصلہ کا یہی پیمانہ علمی مقاصد کے لیے استعمال ہونے لگا ایک قطر ۳۶۰۰ ۳۶۹۰ انچ کے مساوی ہے۔ مترجم



مین ظاہر کی جاسکتی ہے -

قطر اکبر یا قطر استوائی ۴۹۲۵ میل

قطر اصغر یا قطر قطبی ۴۸۹۹ میل

دو دنوں کا فرق یعنی انضباط قطبین ۲۶ میل

یہ وہ نتائج ہیں جو اس بحث سے پیدا ہوئے کہ زمین کی شکل کیسی ہے اور جہات کس قدر تھیں ابھی یہ بحث ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک اور بحث جس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ اہم نتائج دابستہ تھے پیدا ہو گئی - یہ بحث اس سلسلہ کے متعلق تھی کہ آفتاب اور دوسرے سیاروں کے مقابلہ میں زمین کا درجہ اور حیثیت کیا ہے -

پرویشیا کے ایک مہندس کوپرنیکس نے مشہور عہد میں ایک کتاب "اودار اجرام فلکی" کے عنوان سے لکھی تھی - جو ان کے زمانے میں اُس نے آسمان کا سفر کیا تھا اور فن بہت کی تکمیل کے بعد روم میں ریاضیات کا درس بھی ایک عرصہ تک دیا تھا - نظام بطلیموس و نظام نیشا غورث کا یہ اعلان نظر مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ نظام ثانی الذکر صحیح ہے اور اس کی تصنیف کا مقصد اسی کی تائید و توثیق تھا - چونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے خیالات حقایق الہامی کی نفی و مطلق کرنے کے لحاظ سے اُسے مورد عقاب کیسے عیسوی بائبل گے - لہذا اُس نے اپنی کتاب کا مقدمہ جب کاروے خطاب پایا ہے پال ثالث کی طرف ہے حزم و اعتیاد کی راہ سے معذرت کے پیرایہ میں اس طرح شروع کیا ہے "میں نے صرف بطور تجربہ اس بات کے تحقیق کرنے کی جرات کی ہے کہ اگر زمین کو مستحکم فرض کر لیا جائے تو آیا یہ ممکن ہے کہ اجرام سماوی کی گردش کی جو توجیہات قدمائے کبریا نے اُن سے کوئی زیادہ تر معقول توجیہ ہمارے ہاتھ آجائے - قیاسات کے قایم کرنے کا حق ایک ایسا حق ہے جو دوسروں کو بھی اس سے پہلے عطا کیا جا چکا ہے - اور میں نے بھی

اس کتاب کی تصنیف میں اسی حق سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اس ڈر کے ارے کہ خدا جانے کتاب کے شائع ہوتے ہی کیا آفت اُس پر  
 ٹوٹ پڑے اُس نے چھتیس سال تک اس اشاعت نہ کی اور اسی شنش و پنج میں رہا کہ  
 ممکن ہے کہ مصلحت اسی میں ہو کہ جس طرح فیتا عورت اور دوسرے حکما اپنے معلومات  
 کو سیدہ بسیدہ منتقل کرتے چلے آئے ہیں اور اُن کے عقاید بجز اُن کے خاص خاص اجاب  
 کے اور کسی کو معلوم نہیں ہوئے اسی طرح میں بھی اپنے اصول کی تلقین کا حلقہ اپنے دوستوں  
 تک جی محمد و رکھون اور آئندہ نسلاں تک اُنہیں بذریعہ روایت ہی پہنچاؤں لیکن آخر کا  
 اپنے دوست پادری شو مبرگ کے بجدا ہمار پر اُس نے اسے مسئلہ میں شائع کیا۔  
 جب مطبع سے اس کا ایک نسخہ چھپ کر اُس کے پاس پہنچا تو وہ بستر مرگ پر پڑا ہوا دم توڑ  
 رہا تھا۔ کتاب کا حشر وہی ہوا جس کا اُسے ڈر تھا۔ وہ انکو یزیشن نے اسے ملحدانہ قرار دیا  
 اور اُس حکم متنازعی میں جس کی رو سے اس کتاب کا پڑھنا جرم قرار دیا گیا نظام کو پرنکس  
 کی نسبت یون در افشانی کی گئی۔ یہ وہ باطل فیتا عورتی مذہب ہے جو کتب مقدسہ کی ضد  
 ہیت و انون کا یہ قول بالکل درست ہے کہ کو پرنکس کی کتاب نے علم ہیت کی شکل  
 ہی بدل ڈالی۔ اس نے نظریہ شمس المکر کے حق میں قول فیض بن کر آفتاب کو نظام اجرام کا  
 مرکز قرار دیا اس نے ثابت کر دیا کہ ثواب کا فاصلہ زمین سے اس قدر ہے کہ ہمارا وہم و گمان  
 بھی دہن نہیں پہنچ سکتا اور زمین فضا سے غیر متناہی ہیں بسنر لہ ایک چھوٹے سے نقطہ  
 کے ہے۔ نیوٹن پر کو پرنکس کو یہ تقدم حاصل ہے کہ اُس نے آفتاب کو مرکز قرار دیا اور دوسرے  
 اجرام سماوی میں کشش کش کا موجود ہونا تسلیم کیا۔ اگرچہ اس بات کے فرض کرنے سے  
 وہ غلطی میں پڑ گیا کہ اجرام سماوی کی حرکت شکل دائرہ ہونی چاہیے۔ یہ خیال کو پرنکس کو  
 دوسری طرح کے مشاہدہ سے یہ دیکھ کر کہ مختلف اوقات میں اُس کے قطر کا طول مختلف ہوتا ہوا  
 پیدا ہوا تھا۔

نظام کو پرنیکس پر اس الزام کے لگانے میں کہ وہ کتب مقدسہ کے الہامی حقائق کی نفی کرتا ہے پیشوایان دین نے غالباً منطقیانہ استدلال سے کام لیا۔ انہوں نے یہ سوچا کہ اگر زمین کو جواب تک مرکز مدار کائنات سمجھی جاتی تھی غلطت و جلال کی اس مسند سے نیچے اُتار دیا جائیگا اور ایسے کثیر التعداد اجرام فلکی کا وجود تسلیم کر لیا جائے گا جن میں سے بیشتر اُسکے ہم درجہ اور اکثر اُس پر فوقیت رکھتے ہیں تو اس کے گویا یہ معنی ہونگے کہ زمین عنایات ایزدی کی مورد خاص نہیں ہے۔ بیشمار ثوابت میں سے اگر ہر ایک بمنزلہ آفتاب ہو اور اُس کے گرد سیارے گھومتے ہوں جن میں ہمارے جیسی مکلف اور ذمہ دار ہستیوں آباد ہوں تو اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ ہمکو تو خیر بعد ہبوط خدا کے بیٹے کی قیمتی قربانی کے کفارہ کے ذریعہ سے نجات مل گئی لیکن اُن بچاؤں کا کیا حشر ہوا ہوگا؟ کیا اُن میں کوئی ایسی قوم نہیں جو ہماری طرح گناہ میں مبتلا ہوئی ہو یا ہو سکتی ہو؟ اور اگر ہے تو اُسکے لیے نجات دہندہ کہاں سے آئے گے؟

۱۶۰۰ء میں ہالینڈ کے ایک باشندے لپرنشی نامی نے دریافت کیا کہ اگر بلور کے دو گولہ زون کو ایک خاص طریقہ پر باہم ملایا جائے اور اُن میں سے دیکھا جائے تو دور کی چیزیں بڑی ہو کر بہت صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ اسی ایجاد کا نام دور بین ہے۔ دو سو سال فلائرس کے ایک باشندے گھلیلو کو جس نے ریاضیات اور علوم طبیعیہ پر کتنا جتن لکھ کر بہت بڑا نام پیدا کیا تھا یہ واقعہ معلوم ہوا۔ لپرنشی کے ایجاد کیے ہوئے آلہ کی ترکیب کا اگرچہ اُسکو مطلق علم نہ تھا لیکن اُس نے اپنے لیے اُسی قسم کا ایک نیا آلہ اپنی ترکیب سے ایجاد کیا۔ رفتہ رفتہ اُس نے اپنی ایجاد کو ترقی دی۔ یہاں تک کہ سب سے آخر میں جو دور بین اُس نے بنائی اُس میں اشیائیں جسے بڑی ہو کر نظر آتی تھیں۔ جب اسکے ذریعہ سے اُس نے چاند کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ سطح قمر پر زمین کی

طرح وادیاں اور پہاڑ موجود ہیں۔ چنانچہ پہاڑوں کا سایہ بھی اُسے نظر آیا۔ زمانہ سابق میں یہ کہا جاتا تھا کہ عقد ثریا میں پہلے سات ستارے تھے۔ لیکن ایک ستارہ نامعلوم طور پر غائب ہو گیا۔ دور بین لگا کر جب گلیڈو نے اس بُرج کو دیکھا تو بجائے سات کے چالیس ستارے نظر آئے۔ غرض جب طرف اُس کی نظر پڑتی تھی نئے ستارے جو مجبوراً نگاہ کو نظر آ سکتے تھے دکھائی دیتے تھے۔

ماہِ جنوری ۱۸۸۷ء کی رات کو اُس نے تین چھوٹے چھوٹے ستارے ایک خط مستقیم میں بارہ مشتری کے نزدیک دیکھے اور کچھ دن بعد ایک چوتھا ستارہ اور دیکھا۔ ان ستاروں کو اُس نے مشتری کے گرد گردش کرتے ہوئے پایا۔ اور جب اُس کو یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ ایک چھوٹے سے پیمانہ پر نظام کو پرنیکس کا نمونہ پیش کرتے ہیں تو اُس کی خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی۔

ان عجائبات کا مشہر ہونا تھا کہ تمام دنیا ادھر جھک پڑی۔ پادریوں کے گھر میں بھی ان اکتشافات نے ہل چل ڈال دی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کے اس مذہبی اصول کا اب خدا ہی حافظ ہے کہ کائنات محض انسان کے فائدہ کی غرض سے پیدا کی گئی ہو۔ ممکن نہ تھا کہ وہ بے شمار ثوابت جو اب تک نظر سے مخفی تھے انسان کے دل میں یہ خیال نہ پیدا کریں کہ ان کے پیدا کرنے سے خدا کا مقصد یہی نہیں ہے کہ انسان کو شب کے وقت روشنی پہنچائی جائے بلکہ اور ہی کچھ ہے۔

نظام کو پرنیکس پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ اگر عطار اور زہرہ آفتاب کے گرد دور زمین کے اندر گردش کرتے ہوں تو منور ہے کہ اُن میں قمر کی طرح تبدلات نظر آئیں اور زہرہ میں قمر کی روشنی اور چمک دکھ اس درجہ نمایاں ہے یہ تبدیلیاں اور بھی بہتر ہونی چاہئیں۔ خود کو پرنیکس نے اس اعتراض کی معقولیت کو تسلیم کیا تھا اور اُسے اس کا کوئی شافی جواب نہ بن پڑا تھا۔ گلیڈو نے جب دور بین لگا کر زہرہ کو دیکھا تو اُسے

معلوم ہوا کہ تبدلات مسترقہ حقیقت میں موجود ہیں یعنی ایک وقت میں تیار ہال تھا پھر اربعہ ماہ ہوا اس کے بعد محذب التوزیر ہوا یعنی اس کا تین چوتھائی حصہ روشن ہو گیا۔ اور بالآخر بدر کمال بن گیا۔ کو پرنیکس کے زمانہ سے پہلے یہ خیال تھا کہ سیارے بذات خود روشن ہیں لیکن زہرہ اور مریخ کے تبدلات یعنی مدارج تنویر نے ثابت کر دیا کہ وہ مستنیر ہیں یعنی ان کی تابانی آفتاب کی روشنی کا عکس ہے۔ ارسطو اور اُس کے پیروان کے اس عقیدے کو کہ اجسام سماوی اجسام ارضی کی طرح فساد پذیر نہیں ہیں گلیلیو کے ان اکتشافات نے سخت صدمہ پہنچایا کہ زمین کی طرح جہاں زمین بھی پہاڑ اور وادیوں میں اور آفتاب اربعہ نہیں ہے بلکہ اُس کا چہرہ داغدار ہے اور بجائے اس کے کہ دو شان و دقار کے ساتھ ایک جگہ قرار پذیر ہوا اپنے محور کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ نئے ستاروں کے منظر نے بھی اس عقیدہ کو بہت کچھ متزلزل کر دیا تھا۔

ان نظریہ دور بینی اکتشافات نے اور بہت سی تحقیقاتوں کے ساتھ ملکر نظام کو پرنیکس کی صحت کو یقین ثبوت پر پہنچا دیا اور کلیسا نے عیسوی کی تشویش و اضطراب کی کوئی انتہا نہ رہی رومی درجہ کے جاہل پادری ان اکتشافات کو کمزور اور فریب التباس سے تعبیر کرتے تھے۔ بعض کا یہ قول تھا کہ دور بین پر اجسام ارضی کے متعلق تو اعتبار کیا گیا جاسکتا ہے لیکن اجرام سماوی کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان اجرام کا جو علم ہمیں بذریعہ دور بین ہوتا ہے وہ محض فریب نظر ہے۔ ایک گروہ ایسے بزرگ داروں کا بھی تھا جو یہ ارشاد فرماتے تھے کہ دور بین کی ایجاد ارسطو کے اس قول کی دوسری شکل ہے کہ ستارے روز روشن میں ایک گہرے کنوین کی تہ سے نظر آ سکتے ہیں۔

گلیلیو پر اس مقدس برادری نے التباس بدعت الحاد اور زندہ کا الزام لگایا۔ اس علی سمیل ابراہم اُس نے ایک خط پادری کیسٹیلی کے نام لکھا جس میں پٹا ہر کیا کہ کتب مقدسہ کی تفسیر کا منشا یہ نہیں ہے کہ علمی مسائل میں ان سے استناد کیا جائے

بلکہ اُن کا مقصد انسان کی اخلاقی رہبری ہے۔ مخالفت کی جو آگ پہلے ہی بجڑ گئی تھی اُس پر اس خط نے اور تیل ڈال دیا۔ مقدس محکمہ احتساب عقاید یعنی ”انکوئریشن“ نے وارنٹ گرفتاری جاری کر کے گلیلیو کو پکڑ بلوایا۔ اس حکم نامہ میں اُس پر الزام یہ لگایا گیا تھا کہ وہ اس اصول کی تعلیم دیتا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔

حالانکہ یہ عقیدہ کتب مقدسہ کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے جب وہ اس دینی عدالت کے اجلاس میں حاضر ہوا تو اُس سے کہا گیا کہ اپنے لمحدانہ عقیدہ سے توبہ کر کے قید کر دیا جائیگا۔ اُس کو یہ حکم دیا گیا کہ کوپرنیکس کے اصول کی تائید اور تلقین سے باز آجائے اور آئندہ کے لیے عہد کرے کہ ان اصول کی حمایت و اشاعت میں حصہ نہ لے گا چونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ سچائی خود بخود ظاہر ہو کر رہتی ہے اور اُسے شہدائی صبر و استقامت نہیں جو اپنی جان اُس پر قربان کر دینا اُس نے ”انکوئریشن“ کے حابراۓ اہل علم کی تعمیل کا اقرار کر لیا۔ اور وعدہ کیا کہ کچھ اُسکو ہدایت کی گئی ہے اُس پر عمل کرے گا۔

اس کے بعد سولہ سال تک کلیسا کو چین سے سونا نصیب ہوا۔ لیکن ۱۶۱۶ء میں جب گلیلیو سے نہ رہا گیا تو اُس نے اپنی کتاب موسوم بہ نظام عالم شائع کر دی۔ اس کتاب کا مقصد کوپرنیکس کے اصول کی تصدیق و توثیق تھا۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ”انکوئریشن“ کے پیادے پھر دوڑے اور اس الزام میں کہ اُس نے آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا دعویٰ کیا ہے وہ مکر ”انکوئریشن“ کے اجلاس میں حاضر کیا گیا۔ اور اس مقدس عدالت کے صدر نشین نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ ملزم نے جرم الحاد و زندقہ کے ارتکاب سے اپنے آپکو اُن تعزیرات کا مستوجب قرار دیا ہے جو اس جرم کے سزا و ابتہ ہیں۔ اُسے مجبور کیا گیا کہ گھٹنوں کے بل کھڑکھوکھرا اصول حرکت زمین کے قائل ہونے سے توبہ کرے اور اُس پر لعنت بھیجی۔ اشد اکبر! کس درجہ عبرت ناک نظارہ ہے کہ ایک واجب العظیم بزرگ کو جو علم و فضل میں اپنے اقران و امثال کا سر تلخ ہو

سوت کی دہکی دیکر اُن واقعات کے انکار پر مجبور کیا جا رہا ہے جنہیں وہ خود تو صحیح سمجھتا ہے مگر طرہ یہ ہے کہ خود اُس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تک درست خیال کرتے ہیں۔ اس کے بعد گلیلیو قید میں ڈال دیا گیا جہاں اپنی زندگی کے باقی دن سال اُس نے طرح طرح کی غلو جٹوں اور سختیوں کے ساتھ کاٹے اور جب اُس کا انتقال ہوا تو اُس کی لاشیں تک کو سبھی قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا گیا۔ اس واقعہ کی یاد سے ہماری آنکھوں میں خون اتر اتر آتا ہے۔ اُس عقیدے کے باطل ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے جسے اپنی تائید کے لیے اس قدر کروفر فریب اس درجہ سفاکی اور وحشیانہ میں سے کام لینا پڑے۔ وہ عقاید جن کی حمایت ”آکوزیشن“ نے اس شد و مد کے ساتھ کی تھی آج کے دن تمام مہذب دنیا میں استحقار و استعزاز کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

زمانہ حال کے ایک بہت بڑے مہندس نے اس واقعہ پر نظر افتاد ڈالتے ہوئے بیان کیا ہے کہ امر باہ التمزاع اس بحث میں ایسا تھا جس کے ساتھ انسان کو حد درجہ کی دلچسپی ہے۔ اس لیے کہ اس امر کے تصفیہ پر اُس کرہ کے مرتبہ اور حیثیت کا انحصار ہے جس میں ہم آباد ہیں اگر زمین کا ثبات کے وسط میں ایک جسم غیر متحرک و قائم ہو تو انسان کو یہ حق ہر طرح سے حاصل ہے کہ اپنے آپ کو صانع قدرت کی توجہ کا مہبط اکبران لے لیکن اگر زمین کی حقیقت اس سے زیادہ نہ ہو کہ وہ محض ایک سیارہ ہے جو آفتاب کے گرد گھومتا ہے اور نظام شمسی کے ارکان میں بھی اُس کا درجہ کچھ بہت زیادہ قابل وقعت نہیں تو اس کے معنی یہ ہون گے کہ وہ افلاک کی اُس غیر محدود عظمت میں جہاں یہ نظام شمسی بھی باہر ہر درخشاں و پہنائی ہمنزلہ ایک نقطہ غیر محسوس کے ہے بالکل ہی غائب ہو جائے گی۔

نظام کو پرنیکس کی سلسلہ کامیابی کا دور تاریخ ایجاد دور میں سے شروع ہوتا ہے۔ اس ایجاد کے بعد زیادہ زمانہ نہ گزرے پایا تھا کہ یورپ کے ہر بہت دان نے اس نظریہ کو

بطور اصول موضوعہ تسلیم کر لیا کہ آفتاب مرکز عالم ہے اور زمین اس کے گرد گردش کرنے کے علاوہ اپنی محور پر بھی گھومتی ہے۔ آفتاب کے گرد زمین کے گردش کرنے کے وقت کی تصدیق کے لیے اگر کسی مزید ثبوت کی ضرورت تھی تو وہ بریڈلی کے عظیم انٹرنال کشاں اختلال ثوابت سے ہم پہنچ گیا۔ ثوابت کے اس اختلال کا انحصار کچھ تو حرکت نور کے تدرج یا تسلسل پر ہوتا ہے اور کچھ زمین کی گردش پر۔ بریڈلی کا اکتشاف بلحاظ اہمیت استقبال اعتدالین کی دریافت سے کم نہ تھا۔ تدرج حرکت نور کی تحقیقات جو دیر کی وقت نظر کا نتیجہ ہے اگرچہ اول اول غلط سمجھی گئی۔ چنانچہ فائنیل نے اس کو قریب نظر سے تعبیر کیا اور کیریسنی جیسے شخص نے اسے تسلیم نہ کیا لیکن رفتہ رفتہ تمام دنیا نے اس کی صداقت و حقیقت کے آگے سر جھکا دیا۔

اس کے بعد ہیئت و انون کے البعاد نظام شمسی کے متعلق صحیح حالات دریافت کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ بلکہ اس مسئلہ کو اگر محدود شکل میں پیش کیا جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ انہوں نے یہ دریافت کرنا چاہا کہ زمین سے آفتاب کا فاصلہ کس قدر ہے۔

کوپرنیکس کے زمانہ میں مہندسین کا یہ خیال تھا کہ آفتاب کا فاصلہ پچاس لاکھ میل سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بعض کی رائے میں تو یہ اندازہ بھی بہت کچھ مبالغہ آمیز تھا۔ لیکن ٹائیکو برہی کو ارضیادات پر نظر ثانی کرتے ہوئے کپلر نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ اندازہ بہت کچھ اضافہ کا محتاج ہے۔ اور آفتاب کا فاصلہ ایک کروڑ تیس لاکھ میل سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتا۔ <sup>۱۶۸۶ء</sup> میں کیسینی نے ظاہر کیا کہ یہ اندازہ ابھی اصل سے بالکل متعاقبت نہیں رکھتے۔ اصلی فاصلہ آٹھ کروڑ پچاس لاکھ میل ہے۔ علمائے ہیئت یہ پیشین گوئی کر چکے تھے کہ ۳ جون ۱۶۹۷ء کو سیارہ زہرہ کا مرور روئے آفتاب پر ہوگا اور بعد شمس

لے اٹلی کا ایک مشہور ہیئت دان جسے لونی چہاردہم شاہ فرانس نے رصد گاہ پیرس کا مستم مقر کیا تھا۔ مترجم ۱۲





کہ حقیقی فاصلہ نو کروڑ ستر لاکھ تیس ہزار میل ہے۔ سب سے آخر میں فو کا اور نیر و نے  
طبعی تجربات سے جو سرعت رفتار نور کے اندازہ پر مبنی تھے اور اس لیے بلحاظ نوعیت  
اُن مشاہدات سے بالکل مختلف تھے جن کا انحصار مرد زہرہ پر تھا یہ نتیجہ نکالا کہ فاصلہ آفتاب  
نو کروڑ چودہ لاکھ میل ہے۔ تا وقتیکہ سال آئندہ (۱۹۰۷ء) کے مردر کے نتائج معلوم نہ ہوں  
یہی تسلیم کرنا چاہیے۔ کہ آفتاب سے زمین کا فاصلہ نو کروڑ بیس لاکھ میل سے کسی قدر کم ہے  
اس فاصلہ کے معلوم ہو جانے کے بعد نظام شمسی کے اجزاء و مقادیر کا اندازہ آسانی  
اور صحت کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے۔ صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہوگا کہ بیچون جو نظام  
شمسی کا بعید ترین سیارہ معلوم ہے آفتاب سے بمقابلہ زمین تیس گنا زیادہ دور ہے۔

ان اعداد کی مدد سے ہم اس مسئلہ کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کی قابلیت پیدا کر سکتے  
ہیں کہ کائنات انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ آفتاب پر سے اگر دیکھا جائے تو زمین  
ایک نقطہ سوہوم رہ جاتی ہے گویا خاک کا ایک ذرہ بے مقدار ہے جو اُس کی شاعون میں مقبض  
کر رہا ہے۔ اگر ناظرین اس بارہ میں زیادہ تر صحیح اندازہ قائم کرنا چاہتے ہوں تو وہ اس کتاب  
کو نگاہ سے گزبھر کے فاصلہ پر رکھ کر اس کی عبارت کے کسی نقطہ کو دیکھیں یہ نقطہ زمین کی  
اُس سطح سے جو دیکھنے والے کو آفتاب پر سے نظر آئے گی۔ مقدار میں کئی سو حصہ بڑا ہے۔

پس کیا حقیقت ہو سکتی ہے ایک ایسے جزو و یقرا طبعی ایک ایسے ذرہ بے مقدار کی  
اُس ان گنت دنیاؤں کی غیر محدود کائنات میں جس کی پہنائی کا اندازہ کرتے ہوئے دماغ  
دیوانہ ہوا جاتا ہے؟ اگر یہ ذرہ ناچیز اپنی جگہ سے ہٹا بھی دیا جائے بلکہ معدوم بھی ہو جائے  
تاہم کوئی فرق موجودہ حالت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیا ہستی ہے اُن انسانی اجزائے

۱۷ تازہ ترین اکتشافات نے اس اندازہ میں کسی قدر ترمیم کی ہے اور اس وقت کہ ۱۹۰۷ء سے مہندسین  
عالم کے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے کہ سورج کا فاصلہ زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔

ترجمہ

ناتجربہ کی جو دس ارب سے بھی زیادہ کی تعداد میں اس قریب قریب نہ نظر آنے والی ذرہ خاک پر آباد ہیں اور جن میں سے لاکھوں صفحہ روزگار سے ایسے مٹیں گے کہ گویا انکا کبھی نام و نشان ہی نہ تھا ہا کیا حقیقت ہے انسان کی یا اُس کے رنج و راحت کی؟

جب نظام کو پرنیکس کے اصول کی عام طور سے اشاعت ہوئی تو موافقین و مخالفین سبھی نے اس پر طرح طرح کے اعتراض کیے۔ چنانچہ ایک اعتراض ہالینڈ کے مشہور ہیئت دان ٹاگور ہیہی نے بھی کیا جو دراصل اسٹارکس نے فیثا عورت کے مذہب پر کیا تھا یعنی اگر زمین خفیت میں سورج کے گرد گھومتی ہو تو مناظر فواید کی سمت میں تغیر پیدا ہونا چاہیے ایک وقت خاص میں ہر کو بقدر دور زمین کے قطر کی مسافت کے افلاک کے ایک مقام معینہ سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے نسبت اُس قرب کے جو ہمیں چہرے پہلے حاصل تھا لہذا ثابت کی ہیئت اعتباری بر اس قرب و بعد کا اثر پڑنا چاہیے اور اُن کے مناظر میں تغیر واقع ہونا چاہیے یعنی جو ان جو ہم اُنکے قریب آتے جائیں وہ جدا جدا نظر آنے چاہئیں اور جو ان سے دور ہوتے جائیں وہ آپس میں ملے ہوئے نظر آنے چاہئیں یا بمصطلح ہیئت ان ستاروں کا سالانہ زاویہ اختلاف منظر ہونا چاہیے کسی ستارہ کا زاویہ اختلاف منظر وہ زاویہ ہے جو ان دو خطوط کے ملنے سے پیدا ہوتا ہے جو اس سے علی الترتیب سورج اور زمین کی طرف کھینچے جائیں۔

ہم زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں زمین سے سورج کا فاصلہ بہت کم خیال کیا جاتا تھا۔ اگر اُس وقت یہ معلوم ہوتا جیسا کہ اب معلوم ہے کہ یہ فاصلہ نو کروڑ میل سے بھی زیادہ ہو یعنی دور زمین کا قطر اٹھارہ کروڑ میل سے اوپر ہے۔ تو اعتراض متذکرہ بالابلا شبہ نہایت قوی سمجھا جاتا۔

اس اعتراض کا جواب ٹاگور کو یہ دیا گیا کہ چونکہ اجرام سماوی کا زاویہ اختلاف منظر اسی نسبت سے گھٹتا جاتا ہے جس نسبت سے کہ ان کا فاصلہ بڑھتا جاتا ہے لہذا ممکن ہے

کہ کوئی ستارہ اس قدر دور و دراز فاصلہ پر ہو کہ اس کا زاویہ اختلاف منظر محسوس و معلوم ہی نہ ہو سکے۔ یہ جواب اس کے چل کر صحیح ثابت ہوا۔ نوابت کے زاویاے اختلاف منظر کا معلوم ہونا آلات پیمائش زوایا کی ترقی پر منحصر تھا اور جب اس قسم کے آلات ایجاد ہو گئے تو ان زاویوں کی پیمائش آسان ہو گئی۔

ستارہ انتافطوریس جو نوابت میں سب سے زیادہ نزدیک خیال کیا جاتا ہے نصف کرہ جنوبی کا ایک سا روشن ذہرا ستارہ ہے۔ اس کا زاویہ اختلاف منظر جو قدر ۳۰ ثانیہ کے برابر ہے سب سے پہلے ہندرسن اور مکلیئر نے بمقام راس امید  $۳۳-۳۴$  ع میں دریافت کیا تھا اس حساب سے لیا یہ ستارہ ہم سے آفتاب کی بہ نسبت دو لاکھ تین ہزار گنا زیادہ دور ہے اس کی سطح سے اگر آفتاب کو دیکھا جائے تو خواہ قرص آفتاب دور زمین کے مساوی ہی کیون نہ ہو یعنی اس کا قطر خواہ اٹھارہ کروڑ میل ہی کیون نہ ہو پھر بھی وہ محض ایک نقطہ دکھائی دے گا یہ ستارہ اور اس کا ہمزا اپنے مشترک مرکز ثقل کے گرد ایک سو سال میں گھومتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کا متفقہ جرم آفتاب کے جرم سے کم ہے۔

ستارہ ۶۱ گنگی کا تعلق نوابت طبقہ سادس سے ہے یہ ستارہ بھی دھرا ہے۔ اس کا زاویہ اختلاف منظر جو پیمائش نے  $۳۳$  ع میں دریافت کیا تھا  $۱۱$  ثانیہ کے قریب ہے۔ اس حساب سے اس کا فاصلہ سطح زمین سے آفتاب کے فاصلہ کی بہ نسبت پانچ لاکھ حصہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ ستارہ اور اس کا ہمزا اپنے مشترک مرکز ثقل کے گرد پانچ سو

سال دور میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نوابت مضاعف ہیں۔ اس کی توجیہ اول اول اس طرح کی گئی تھی کہ ممکن ہے کہ دو نوابت تقریباً اُسی خط مستقیم پر واقع ہوں جس پر زمین واقع ہے اور اس لیے بغیر دُہرے نظر آتے ہوں مگر مسلسل رصدات سے یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ یہ دُہرے نوابت آپس میں اسی طرح مربوط و منوط ہوتے ہیں جن طرح ارض و قمر اور ایک کوکب دوسرے کوکب کے گرد جناس کا ہمزا ہے ایک وقت میں گھومتا ہے۔ مزید

بیش سال میں گھومتا ہے۔ ان دونوں کا سفق وزن تقریباً وزن آفتاب کے ایک ثلث کے مساوی ہے۔

ستارہ سیریس جو اپنی چمک دمک کے لحاظ سے آسمان میں سب نوابت سے زیادہ نمایاں ہے آفاقی طور سے بھی چھ حصہ زیادہ دور ہے اس کا قطر غالباً ایک کروڑ بیس لاکھ میل ہے اور جو نور کی شعاعیں اس کے جرم سے نکلتی ہیں وہ تابانی و درخشانی میں سورج کی روشنی سے دس حصہ زیادہ ہیں لیکن دور ہیں میں سے دیکھنے پر بھی اس کا قطر نا پائیدار جاسکتا بلکہ وہ ایک نہایت چمکتی ہوئی چنگاری کی شکل میں نظر آتا ہے۔

پس نوابت نہ صرف بلحاظ ظاہری عظمت کے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ باعتبار جماعت اصلی بھی ان میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آٹھ اسپیکٹرو سکوپ (مقیاس) الوان نور منشور سے معلوم ہوتا ہے ترکیب کیمیاوی و طبیعی کے لحاظ سے بھی ان میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ آٹھ ان تیز رفت کے ظاہر کرنے سے جو نوابت کی شعاع نور کی قابلیت انکسار و انحراف میں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کے دوران عمر کی کیفیت پر بھی روشنی ڈال رہا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قریب ترین ستارہ ہم سے اتنا دور ہے کہ اس کے فاصلہ کی پیمائش کرنا قریباً محال ہے لیکن ہمارے قیاس کی یہ ابھی پہلی منزل ہے۔ کائنات فلکی میں ایسے نوابت بھی ہیں جن کی روشنی کی شعاعوں کو ہماری زمین تک پہنچنے میں ہزاروں بلکہ سٹیکھو سال کی مدت صرف ہوئی ہے۔ جب خود ہمارے ہی نظام شمسی کی حدود ہماری بڑی سے بڑی دور بین کی رسائی سے باہر ہیں تو ان نظامات کا تو ذکر ہی کیا جو ان حدود سے پرے واقع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں خاک کے ذروں کی طرح فضا کے میدان نامتناہی میں پھیلی ہوئی ہیں۔

لے اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ روشنی کی رفتار دو لاکھ پچیس ہزار میل فی ثانیہ ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان شمس باؤں کا فاصلہ زمین سے کس قدر ہوگا۔ مترجم

کیا یہ عظیم الشان اجرام جن میں سے ہزاروں لاکھوں کا فاصلہ ہم سے اس قدر دور ہے کہ مجروح گاہ دور بین کی مدد کے بغیر ان کو دیکھنا تک نہیں سکتی اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ ہم ان کی روشنی سے مستفید ہوں؟ اور جیسا کہ ہمارے پیشوایان دین ارشاد فرماتے ہیں کیا ان روشن دہاناک کواکب کی تخلیق کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ انسان کو روشنی پہنچائیں؟ کیا ان کے جرم کی عظمت اور جسامت کی پہنائی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس طرح ان میں سے ہر ایک فوت کا مرکز ہے اسی طرح اسے حرکت کا بھی مرکز ہونا چاہیے؟ یہ الفاظ دیگر کیا ان کا وجود اس امر پر دال نہیں ہے کہ وہ شمس بہن جن میں سے ہر ایک ایک جدا گانہ نظام عالم کا مبداء ترکیب ہے؟

۱۔ علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب ”الکلام“ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ مہات اصول پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ انسان کی تمام ترقیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ وہ اعلیٰ ترین مخلوق ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لیے ہے کہ انسان اس سے متبع اٹھائے۔ یہ لکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے قرآن مجید نے اس اصول کی تعلیم کی ”اور ان آیات کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش فرماتے ہیں۔

(۱) اَللّٰهُ خَلَقَ الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ -

(۲) وَ سَخَّرَ لَكُم مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَمَا فِیْ الْاَرْضِ جَمِیْعًا -

ہمیں ڈر ہے کہ ڈر تیر اور اُس کے ہم خیال مولانا کے اس دعوے کو بلا ترمیم تسلیم کرنے میں متال ہوں گے۔ کائنات سے اگر مولانا کی مراد کہ ارض سے ہے تو یقیناً انسان اس خیال میں حق بجانب ہے کہ وہ اعلیٰ ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لیے ہے کہ انسان اس سے متبع اٹھائے۔ لیکن اگر کائنات کے مفہوم میں وہ ان کو درون روشن دہاناک دنیاؤں کو بھی داخل کرتے ہیں جن کے وجود پر جناب باری کی غفلت و حکمت بے با بیان گواہ ہے اور جن کا ثبوت انسان باوجود اپنی برصغرتی کے دینے پر قادر ہو گیا ہے تو ڈر تیر کے اس سوال کا معقول جواب شاید پیش نہ کیا جاسکے گا کہ کیا ان دنیاؤں

ابھی ان واقعات کا علم بہت ہی ناقص تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس علم کا وجود سراسر پردہ تخیل سے باہر نہ نکلا تھا کہ اعلیٰ کرکٹ باشندے گارڈینز بروڈنامی نے جو کوپرنیکس کی دفات کے سات سال بعد پیدا ہوا ایک کتاب کائنات اور دنیاؤں کے عدم انہیات ہونے پر لکھی چند کتابیں اور بھی اسکی تصنیف سے ہیں۔ مثلاً "یونگ کا نور سیشن آف ایش وڈ ٹٹ"

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۴۵۔ کا جوہم سے اس قدر فاصلہ پر ہیں کہ جو دنگ و بلا مد دور ہیں اور نہیں دیکھ سکتے ہیں کسی چیز اس کے اور کوئی مشابہتیں کہ ہم ان سے قس اٹھائیں۔ اور ان کے نور سے مستفید ہوں؟

قرآن مجید میں جو صرت کرہ ارض کے باشندوں کی اخلاقی رہبری کے لیے نازل کیا گیا ہے اور جس کا ور سے سخن صرت ان عقیدہ فہم ہستیوں کی طرف ہے جو فہم شمس کے اس دوسرے دکن پر آباد ہیں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ کائنات فلکی کا مشابہت انسان کو فائدہ پہنچانے کے اور کچھ نہیں خواہت و سیار کی تخلیق اور جو مقاصد غاب باری کے پیش نظر ہوں گے وہ تو بجز اس کے اور کون جان سکتا ہے لیکن اگر ان میں سے بعض کا ذہنی و معنوی مقصد یہ بھی ہو کہ کرہ ارض کے کمین ان کے نور سے مستفید ہوں تو اس سے دوسرے مقاصد کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی لیے اس عالم ہم ہر ایہ میں جو جناب مدبری انسان کے دل میں اس جذبہ احسان مندی و شکر گدزی کے برانگیختہ کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے جو عبد کو مسعود کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہے اس نے کمین تو یہ کہا ہے کہ چاند سورج اور ستارے نہیں روشنی دیتے ہیں کمین یہ کہا ہے کہ خدا نے کائنات سماوی کو تیار تامل کر دیا ہے۔ لیکن ان الفاظ کی حکمت آفرین جامعیت پھر بھی اس قابل اعتراض دعوت کی گروڑ ہے دامن کو کمال دقیقہ رسی کی راہ سے بچا گئی ہے کہ کائنات فلکی کا مشابہت بجز انسان کے اور کچھ نہیں۔ و مستحق لکم مافی السموات سے یہی مراد نہیں ہے کہ وہ تمام اجرام روشن و تاریک جو فضا سے بیحد میں پھیلے ہوئے ہیں بلکہ اسود مندی انسان کے تامل و روئے گئے ہیں بلکہ ان الفاظ کا مرجع مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو وہ عقل دقیقہ سیخ معائناتی ہے جس کی بدولت اسے اس کائنات کے پوشیدہ اسرار معلوم ہو گئے جہاں وہ جسم کے ساتھ نہ پہنچ سکتا تھا۔ تسخیر جسمانی ہی نہیں تہ تیغ عقلی و ذہنی بھی ہوتی ہے اور یہی اس کا درجہ کمال ہے۔ کیا دوربین کے ذریعہ

(اسمار اربعار البر ماد) میں میں نظام کو پرنیکس کی حمایت کی گئی تھی۔ اور دوسری دن سول کا ذات  
تھنگز (وحدت علت العلل) ان تصانیف پر ایک اور رسالہ کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے جو  
اوس نے علی سبیل التمثیل لکھا اور ۱۸۵۵ء میں شائع کیا۔ اس رسالہ کا نام ”دوسری اسپلشن  
آف دی ٹرایکٹ بیٹ“ (رفیع مند وحشی کا اخراج) تھا۔ اس کے علاوہ ہیئت و انون کی  
آئندہ نسلوں کے لیے اُس نے ایک جدید ستارے کے متعلق اپنے مشاہدات فنیکی کو سپر  
معلم کیا۔ یہ ستارہ ۱۸۵۵ء میں دفعۃً برج ذات الکریسی میں نمودار ہوا اور اُس کی تابانی درخشاں  
روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ باقی تمام کو اکب اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ یہ ستارہ  
روز روشن میں جی صاف نظر آتا تھا۔ اسے نومبر کو اُس کی چمک زہرہ کی منتہا سے درخندگی کو  
برابر ہو گئی۔ مارچ ۱۸۵۷ء میں اُس کا شمار ثوابت طبقہ اولین میں ہونے لگا۔ چند مہینے  
تک اُس نے مختلف رنگ بدلے اور مارچ ۱۸۵۷ء میں غائب ہو گیا۔

کپلر کے زمانہ (۱۶۰۹ء) میں جو ستارہ دفعۃً برج ثعبان میں نمودار ہوا تھا ابتداً زہرہ  
سے بھی زیادہ درخشاں تھا۔ اس نے ایک سال سے زیادہ عمر پائی اور پھر ارغوانی زرد و سرخ  
مختلف رنگ بدلتا ہوا فنا ہو گیا۔

ابتداءً ہر دن کا یہ قصد تھا کہ اپنی زندگی کلیسا کی خدمت گزاری کے لیے وقف کر دے  
چنانچہ ڈائمنین فرقد کے راسخوں میں وہ داخل بھی ہو گیا تھا لیکن مسئلہ غنا سے ربانی اور  
مسئلہ جبل بلادنس یعنی امکان استقرار محل بحالت دوشیزگی پر غور کرنے سے اُس کا ایمان  
مبدل بہ شکوک ہو گیا۔ چونکہ اُس نے اپنے خیالات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی لہذا  
اُسے بہت جلد پیٹریاں دین کا مور دعتاب ہونا پڑا اور اُن کے چنچہ عقوبت سے بچنے کے

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۴۸۔ سے الفا قنطوس کا کشت کچھ کم شہر آسمان ہے جو ہم کو یہ دعویٰ کرنے کی ضرورت ہے  
کہ شمس ابداً اُس کی روشنی ہادی ہر ذکا کو بمثل نظر آتی ہے اس غرض سے ہمارا مانع کیا گیا ہے کہ ہم کو روشنی  
پہنچائے۔ ناغہ اور ادا ولی الا بصار۔ مترجم۔



لیے اول سوسٹر لینڈ پھر فرانس پھر انگلستان پھر جرمنی میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن انکو برٹن کے خوشخوار تازی کہتے جن کی قوت شامہ بلا کی تیز تھی برابر اُسکے پیچھے لگے رہے۔ اور آخر جب وہ اٹلی واپس آیا تو اُسکا کھوج لگا کر رہے۔ وہیں میں وہ گرفتار کیا گیا اور پیاپی کے جیل خانہ میں چھ سال تک اس سختی سے قید رکھا گیا کہ نہ اُسے لکھنے کے لئے قلم و دات کاغذ دیا جاتا تھا نہ پڑھنے کے لیے کوئی کتاب دی جاتی تھی اور نہ اُس کے کسی دوست کو اجازت تھی کہ اس قید تنہائی میں آکر گھڑی دو گھڑی کے لیے اُس سے ملے اور اس کا غم غلط کرے۔

بروڈ نے زمانہ قیام انگلستان میں نقد و عوالم پر لکھ پڑھتے تھے اور اپنی سب سے زیادہ مشہور کتابیں بزبان اطالوی تصنیف کی تھیں۔ پادری یہ دیکھ دیکھ کر اور بھی کھپانے ہوتے تھے کہ وہ جہان جاتا تھا اُن کی ریاکاری اور بد باطنی کی پردہ درسی کرتا تھا اور غلے دوس الا شہاد یہ کہتا پھرتا تھا کہ اہل مذہب کے تشاک پر مہانت اور منافقت کا ملمع چڑھا ہوا ہے اُن کے ظاہر اور باطن میں بُعد المشرقین ہے اور اُن کے عقاید زور و العباس اور نفاق و ریا کی اُس متزلزل بنا پر قائم ہیں جسے اخلاق حسنہ یا ایمان بالغیب چھو بھی نہیں گیا ہے۔

”اسماہار لبعار الرماہ“ میں اُس نے اس بات پر زور دیا تھا کہ متزلزل کا مقصد سائنس کی تعلیم ہرگز نہیں ہے بلکہ اُس سے محض خلاق کی ہدایت مقصد ہے۔ اناجیل مقدسہ ہیئت یا طبعیات کے مسائل کے متعلق ذریعہ استناد نہیں ہو سکتیں خصوصاً ان کی یہ تعلیم تو بالکل ہی غلط اور ناقابل قبول ہے کہ زمین ایک سطح مستوی ہے جو ستونوں پر قائم ہے اور آسمان ایک قبة جادہ ہے جو فردوس کا معن ہے۔ بروڈ کہتا ہے کہ ان پادروں کی دیلات کو پس پشت ڈال کر ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کائنات غیر محدود و لامتناہی ہے جو منہر و غیر شغاف دنیاؤں سے معمور ہے اور ان دنیاؤں میں سے اکثر آباد ہیں۔ ان مسایل پر غور کرتے کرتے وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ابن رشد کے خیالات حقیقت سے دور نہیں ہیں ضرور ہے کہ ایک ایسی عقل کل موجود ہو جس نے اس تمام کائنات میں جان ڈال رکھی ہے۔

اور جس کا یہ عالم ظاہری محض ایک شمع یا منظر ہے۔ اس عقل کی قوت اس کائنات ظاہری کی سکون و قیام کا باعث ہے اور اگر یہ قوت ہٹ جائے تو تمام چیزیں معدوم ہو جائیں۔ اسی علم و ناظر اور ساری دنیا عقل کل کا نام خدا ہے جو تمام چیزوں میں خواہ وہ زندہ نظر نہ بھی آتی ہوں موجود ہے اور ہر شے میں ترکیب پذیر ہونے اور زندگی قبول کرنے کی صلاحیت ہر وقت پائی جاتی ہے۔ پس خدا تمام موجودات کی علت واحد اور اُس کا مدار علیہ ہے۔

اس لحاظ سے فلاسفہ میں ہر دو کا درجہ ابن رشد اور اسپانیزا کے میں ہیں۔ اسپانیزا کا یہ مذہب تھا کہ خدا اور کائنات ایک ہی وجود کے دو مختلف نام ہیں۔ ہر واقعہ قدرت کے ایک غیر تغیر پذیر قانون کے اقتضا سے مجبوراً پیش آتا ہے۔ اور خدا بالکل کائنات موجود فی الاصل غیر متغیر اور غیر ممکن الاندفاع توانائی کے اقتضا سے لازمی حرکات یا افعال کا ایک سلسلہ پیدا کرنے میں ہر وقت مصروف ہے۔

پیشوایان مذہب کے مطالبہ پر ہر دو دینیوں سے روم کو منفل کیا گیا اور اس الزام کی پاداش میں کہ وہ محد ہی نہیں بلکہ اس الملاحہ ہے۔ ”انکوئزیشن“ کے محبس میں قید کیا گیا۔ سب سے بڑا الزام اس پر یہ تھا کہ وہ تقدیر و عالم جیسے ناپاک مسئلہ کا قائل ہے جو کتب مقدسہ کے سیاق اور آیات الہامی خصوصاً ان آیات سے متناقض کلی رکھتا ہے جنہیں انسان کی سبیل نجات سے تعلق ہے۔ دو سال تک قید کاٹنے کے بعد وہ حاضر عدالت کیا گیا اور حکام عدالت نے اُس پر فرد قرار دے جرم لگا کر اُسے مسیحی برادری سے خارج کر دیا اور جب مقدس عدالت کے اس حکم کی تعمیل سے اُس نے ازراہ غایت غرارت نفس انکار کیا کہ اپنے گناہ سے توبہ کرے تو کارفرمایان قضا و قدر یعنی حکام ”انکوئزیشن“ نے اس سفارش کے ساتھ اُسے دنیوی حکام کو سپرد کر دیا کہ اُسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اُس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے۔ ”عدالت انکوئزیشن“ کے اس خوفناک فقرہ کا مطلب ایسے برقعوں پر یہ ہوا کرتا تھا کہ مجرم کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چونکہ ہر دو اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے

وشمس اگرچہ اُس کے جسم کو فنا کر سکتی ہیں۔ لیکن اُس کے خیالات کی اشاعت کو نہیں روک  
 سکتے۔ لہذا اُس نے اپنے جیون سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہارے اس فیصلہ کو سن کر میری قلب  
 پر اُس خوف کا عشرِ شیر بھی طاری نہیں ہوا جو خود تمہارے دل میں اس کے صادر کرتے  
 وقت پیدا ہوا ہوگا۔ اس فیصلہ کی تعمیل ۶ فروری سنہ ۱۹۰۱ء کو ہوئی اور برنڈو زندہ جلا دیا گیا۔  
 اُن بے شمار شہداء کے مصائب و لواہب کی یاد ہمارے دلوں میں رجم و پھر درمی پیدا  
 کیے بغیر نہیں رہ سکتی جنہیں محض اپنے مذہبی عقاید کی وجہ سے نریق مخالف کے تعصب کے  
 ہاتھوں آگ میں جلنا پڑا ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کو آخری وقت میں جبکہ اُسکی روح  
 بعدِ دُرُکِ رب جسم سے علیحدہ ہو رہی تھی ایک بہت بڑی زبردست طاقت کا سہارا تھا۔  
 اُن کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ اس دنیا میں گو اُن کی زندگی مصیبت سے کٹی اور عقبی کی دہلیز  
 پر قدم رکھتے وقت بھی اُنہیں گرفتار عذاب الیم ہونا پڑا لیکن دوسری دنیا میں پہنچتے ہی  
 اُن کا رنجِ مبدل بہ راحت ہو جائے گا اور اُن کی تکالیف لذتِ اے جاویدانی سے تبدیل  
 ہو جائیں گی۔ موت کی جھانک اور اندھیری وادی میں سے گزرتے وقت شبیدہ کو کم از کم  
 یہ اطمینانِ قلب تو میسر ہوتا ہوگا کہ ایک جیم و شفیق نظردن سے پوشیدہ ہستی اُس کی رہنما  
 بن کر اُسے ابدی زندگی کی روشن اور پرفضا منزل میں صحیح و سلامت لے جاوے گی۔ لیکن  
 برنڈو اس سہارے سے بھی محروم تھا۔ وہ فلسفیانہ عقاید جن کی خاطر اُس نے اپنی جان ہی  
 اُس کے لیے کسی طرح موجب تسکین و شفی نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے مزور تھا کہ مرتے  
 دم تک اُس کو اپنی قوتِ بازو ہی پر بھروسہ ہو اور وہ کسی کی تائید سے سروکار نہ رکھے۔ کیا  
 اس بے یار و مددگار شخص کی استقامتِ عزم کو دیکھ کر جو توں تنہا ایک تاریک مکان میں  
 اپنے خونریز اور بے درد جیون کے سامنے محض اُس اصول کی تائید کے لیے بوجھل  
 اُٹھا ہوا ہے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے۔ ہمارا جی بے اختیار اُس کی تعریف کرنے کو نہیں چاہتا اس  
 لیے اگر یقین ہو کہ خدا کی ہستی کا منکر تھا تو ہم ہرگز اُس کے مرت نہیں ہو سکتے۔ انسان ضعیف البنان کا

ڈرائف کرنے میں نہ کوئی الزام لگانے والا موجود ہے نہ گواہ حاضر ہے نہ دلیل نظر آتا ہے۔  
 بلکہ محکمہ مقدس کے صرف کارندے ہیں جو سیاہ لباس پہنتے، دیے پاؤں موت کے سایہ کی  
 طرح نقل و حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں نیچے کے زمین دوز حجروں میں شگنج  
 رکھا ہوا ہے اور مجرموں کو انواع و اقسام کے عذاب دینے کے شیطانی آلات اور ان آلات  
 کے سفاک استعمال کرنے والے پس پی موجود ہیں۔ ملزم سے صرف اس قدر کہا جاتا ہے  
 کہ اس کی نسبت لحدانہ عقاید رکھنے کا قوی شبہ ہے۔ پس کیا وہ اس بات پر تیار ہے کہ  
 اپنے قصور کا اعتراف اور اپنے گناہوں سے توبہ کرے لیکن جن عقاید کو وہ صحیح سمجھتا ہے ان  
 سے وہ منہ ابرا کر سکتا ہے اور نہ کرتا ہے بلکہ پہلے کی طرح اپنے ایذا دہندوں سے کہتا ہے کہ  
 دل میں تم بھی انہیں بانوں کے قابل ہو جن کو صحیح سمجھنے کی پاداش میں اس وقت تم مجھے  
 سزا دے رہے ہو۔ ایک تو تصویر کا یہ رخ ہے جس میں شرافت نفس بہت مروانہ استقامت  
 خیر متزلزل اور اعتصام بالحق کے خطا و خلل صاف صاف نظر آ رہے ہیں تصویر کا اگر دوسرا  
 رخ دیکھنا منظور ہو تو تاریخ عالم کی پندرہ صدی پہلے کا ایک ورق لوٹو۔ سردار کاہن کیانوس  
 کے مکان کا ایک کمرہ ہے۔ انٹیمسی میں آگ دکھ رہی ہے مرغ مسیح اذان دے رہا ہے۔

۲۵۔ نو صفحہ۔ جس کی حقیقت اس عالم متناہی کی بے پایانی میں ایک جزو لایعجزی سے زیادہ نہیں  
 ہے عقل غیر محدود پر جس کے کرشمے ہر وقت اس کی نظر کے سامنے ہیں بھروسہ نہ کر کے اپنی عقل محدود پر تکیہ کیے  
 رکھنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ باطنی اور سرکش ہے اور لغات اور سرکشی سے کسی بھی بددوی نہیں ہو سکتی لیکن  
 برتو جیسا کہ خود مصنف کو اعتراف ہے ذہن پر نہ تھا۔ وہ خدا کی ہمت کا قابل تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خدا کو  
 بشکل اتانیم نمونہ نہ اٹا ہوا لیکن وہ اس کا تو قائل تھا کہ ایک ایسی عقل کل مزرر موجود ہے جس نے اس تمام کائنات  
 میں جان و مال رکھی ہے اہ جس کا یہ عالم ظاہری محض ایک رشتہ یا منظر ہے وہ اسی عقل کو تمام موجودات کی است  
 واحد و مانتا تھا۔ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو وہ خدا کا منکر نہیں سمجھا سکتا اور اس لیے ہمیں بغیر اسے من قابل لا الہ  
 الا اللہ خلخل الجنہ اس کی نجات میں شک نہیں۔ مترجم۔

اور خداوند خدا محسوس بھری نگاہوں سے پلٹ کر پطرس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "الوقا باب برست  
دودم آیت ۶۱) خدا کی نشان ہے کہ کلیسا کو برونو کے ساتھ اس طرح کے سلوک کرنے کا حق جس کی  
برہمیت حاصل ہوا وہ خود پطرس کی ذات ہو!!

لیکن شاید وہ دن قریب آ رہا ہے جبکہ آئندہ نسلیں باور یون کے اس گناہ عظیم کا کفارہ ادا  
کریں گی۔ اور برونو کا مجسمہ کلیسا سے سینٹ پیٹر واقع رومین نصب ہو کر بے نقاب کیا جائے گا۔

۱۰۔ یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے حواری پطرس نے جو عیسیٰ دینامین سینٹ پیٹر کے لقب  
سے لقب ہے کمال کوڑنکی دیدان استغاسی کی ماہ سے اپنے آقا سے اعراض کیا تھا۔ پطرس کو آپ کی وفات کی  
کا بڑا دعویٰ تھا اور جب آپ نے ایک دفعہ اُس سے کہا کہ ذیبر انکرو جگا اور اُس نے اس پر اپنی غیر خواہی  
جٹائی جا ہی تو آپ نے کہا کہ ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ تین دفعہ چنانچہ ہ قول سچ ہو کر رہا۔ جب حضرت مسیح  
یہودیوں کے سامنے ان خواہ سے رومی عدالت کے سامنے لائے گئے اور پطرس نے جو بدگواہ حاضر تھا دُعا  
کیا گیا کہ تو اس شخص کو مانتا ہے تو ان حضرت نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا۔ لقب ہے کہ باوجود اس کے  
نفرانیت بین پطرس کا آنا بڑا مرتبہ کیوں ہے۔ مترجم۔

# ساتواں باب

## نزاع در بارہ عمر زمین

بائبل کی دوسری زمین کی عمر صرف چھ ہزار سال ہونا اور اس کا ایک ہفتہ کی مدت میں بنایا جانا۔ پادریوں کے علم التاریخ کا انبیاء و سلف کی عمروں پر مبنی ہونا۔ بائبل کے مختلف نسخوں میں مختلف تخمینوں کی وجہ سے تناقض۔  
تعدد طوفان ذبح۔ دوسری زمین کا از سر نو آباد ہونا۔ مینارہ بابل۔ اختلاف السنۃ انسان کی قدیمی زبان۔

کیسینی کا یہ اکتشاف کہ سماہ مشرقی وسطیٰ الطرفین ہے۔ یونین کا یہ اکتشاف کہ کرہ ارض وسطیٰ الطرفین ہے۔ اس اکتشاف سے اس نتیجہ کا استخراج کہ زمین نے حرکات زمین کے سانچے میں ڈہل کر موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ احباب آبی کی طبقات الارضی تحقیقات سے اس نتیجہ کی تصدیق ہمارا اجسام ذوی الاعضاء سے اس نتیجہ کی مزید توثیق۔ زمین کی عمر کا اندازہ کرنے میں مدت ہا سے مدید کے تسلیم کرنے کی ضرورت۔ مسئلہ پیدائش کی جگہ مسئلہ ارتقاء لے لینا ہے۔ اکتشافات دربارہ قدامت انسان۔

کائنات کے پیمانہ زمان و مکان کا غیر محدود ہونا۔ زمین کی عمر کی بحث میں افراط و تفریط سے احتراز۔

کائنات میں جو درجہ کرہ ارض کو حاصل ہے اسکی حقیقت کا اعتراف ایک مول و طویل کشمکش کے بغیر نہ ہو سکا۔ کلیسا نے اس کی مخالفت میں تاخون تک کا زور لگایا اور اپنے

عقاید کے برقرار رکھنے کی کوشش میں لوگوں کو سزا سے موت تک دی۔ لیکن اُس کی تمام کوششیں رائگان گئیں۔ نظام کو پرنکس کی تائید میں نامکن التروید شہادتوں کا انبار لگ گیا۔ آخر کار تمام دنیا نے بالاتفاق اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ آفتاب اُس نظام کا جس کو انسان سے قلعن ہے مرکزِ جرم ہے اور زمین کا شمار اُن سیاروں میں ہے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں اور ان میں بھی زمین سب سے بڑی نہیں ہے۔

چونکہ اس بحث کا سبق کلیسا کو نہ بھولا تھا لہذا جب مسئلہ عمرِ عالم کی جدید بحث پیش ہوئی تو پاورٹن نے اُس شدید مخالفت کا اظہار نہ کیا جو پہلی بحث کے وقت اُن کی طرف سے ظاہر ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کلیسا کی روایات کے ایوان میں اس نئی بحث نے پھر سترزل ڈال دیا لیکن پتروایانِ دین کی رائے میں یہ حملہ سختی میں پہلے حملہ کی بہ نسبت برابرت کم تھا۔ چنانچہ حامیانِ مذہب اس موقع پر یہ کہتے ہوئے پاسے گئے کہ زمین کو اُس کمرخت عظمت و جلال سے نیچے اُتار دینا تو یہ معنی رکھتا ہے کہ حقایقِ الہامی کی بنیاد میں سترنگ لگا دی جائے البتہ تاریخِ تکوینِ عالم پر بحث کرنے کی اجازت خاص حدود کے اندر دی جاسکتی ہے۔ لیکن اہل مناظرانِ حدود سے بہت جلد تجاوز کر گئے اور اس لیے یہ جدید بحث بھی ویسی خطرناک ہو گئی جیسی پہلی بحث ثابت ہوئی تھی۔

تکوینِ عالم کے مسئلہ کے متعلق فلاطون نے اپنی کتاب ”ٹائیمیس“ میں فریقِ بمقابل کو حسبِ ذیل مشورہ دیا تھا:

”وہ مناسبت بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اور آپ جو آخر انسان ہیں اس امر کو ذہن نشین رکھیں کہ روایاتِ مذہبی کے احتمالات میں مزید نقص سے احتراز کرنا ہی اولیٰ ہے۔“

لیکن ان میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس مشورہ پر کاربند ہونا ممکن نہ تھا۔ سینٹ اگسٹائن کے زمانہ سے سناس کے ہر مسئلہ کی سند کتبِ مقدسہ میں ڈھونڈی جانے لگی تھی اور اہل مذہب نے آیاتِ انجیل سے تاریخ اور جغرافیہ کے ایسے ایسے خیالی نکات کا استخراج کیا

تھا جنھوں نے حقیقی علم کی چلتی گاڑی میں روڑے اکٹادئے تھے۔

ہم اس مقام پر پادری صاحبوں کی ان تاریخی و جنرالی معلومات کا جن کا وار و مدار آیات انجیل پر ہے صرف سرسری سا حوالہ دینے پر اکتفا کریں گے۔ ان کی خصوصیات ایسی ہیں جن کے پہچاننے کے لیے زیادہ تفصیل و وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ انجیل میں یہ لکھا ہوا تھا کہ دنیا چھ دن میں بنائی گئی اور ساتویں دن جو یوم السبت ہر خدا نے آرام لیا اور ایک دن خدا کے نزدیک بمنزلہ ہزار سال کے ہے لہذا مقدس مورخوں نے یہ استدلال کیا کہ دنیا کی عمر کل سات ہزار سال کی ہوگی جس میں سے چھ ہزار سال تو مصیبت میں کیٹن گئے اور ایک ہزار سال کا زمانہ عیش و راحت اور سکون و اطمینان میں بسر ہوگا۔ عام طور سے یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ حضرت مسیح کی ولادت کے وقت دنیا کی عمر تیار ہزار سال تھی لیکن یورپ سنین عالم کے مطالعہ کی طرف سے اس درجہ غافل اور بے پروا تھا کہ ۱۷۵۰ء سے پہلے اسے سن عیسوی کے قایم کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ اس زمانہ میں روم کے ایک پادری ڈائیونیسس اکیگوس کو یہ فرد گزشت محسوس ہوئی اور اُس نے بجائے عام بت پرستانہ سن کے موجودہ عیسوی سن کو رواج دیا۔

قدیم ترین واقعات عالم کے سنین کا اندازہ لگانے میں ان تخمینوں سے کام لیا گیا جو زیادہ تر انبیاء سے سلف کی عمر دن پر مبنی تھے اور اس طور پر اعداد میں جو بڑا نقص پیدا ہوئے ان کی تطبیق میں بے حد دقتیں پیش آئیں۔ فن امتداد سے تو اُس زمانہ کے اصحاب جس سے ہمیں بحث ہے مطلقاً بیگناہ تھے اور اسی لئے حضرت موسیٰ کو ان صحائف کا حامل تسلیم کر لیا گیا جو ان سے منسوب ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت موسیٰ ان صحائف کے مصنف تھے تو اس اجتماع صنفین کی کیا تاویل ہو سکتی ہے کہ وہ ایسے واقعات کے راوی ہیں جن میں سے اکثر ان کی ولادت سے دو ہزار سال قبل پیش آپہنچے تھے تو رات کا ہر حصہ بادی النظر میں الہامی دسمجھا جاسکتا تھا اس لئے کہ اس کو تحریف سے بچانے



کی کوئی تدبیر اختیار نہ کی گئی تھی۔ مختلف نسخوں میں جو زمانہ کی دست برد سے بچے بچائے باقی چلے آتے تھے بہت کچھ اختلاف تھا۔ مثلاً سامری نسخہ میں پیدائش یعنی آفرینش عالم سے طوفان تک کا زمانہ ایک ہزار تین سو سات سال درج تھا عبرانی نسخہ میں یہ مدت ایک ہزار چھ سو چھپن سال تھی۔ حالانکہ نسخہ سبعینیہ میں یہی مدت دو ہزار دو سو تریسٹھ سال مذکور تھی۔ نسخہ سبعینیہ میں پیدائش سے حضرت ابراہیم تک کا زمانہ عبرانی نسخہ کے مقابلہ میں ڈیڑھ ہزار سال زیادہ تھا۔ لیکن اس اندازہ میں ان سب کا اتفاق تھا کہ واقعہ طوفان پیدائش سے تقریباً دو ہزار سال بعد پیش آیا اور اس پر جب اور دو ہزار سال گزر گئے تو حضرت مسیح تولد ہوئے۔ جن لوگوں نے اس مضمون کی اچھی طرح سے چھان بین کی تھی ان کا یہ قول تھا کہ حضرت مسیح کی تاریخ ولادت کے بارے میں ایک تنویس مختلف اقوال موجود ہیں اور ایسی حالت میں کتب مقدسہ کے شمار و اعداد پر پورا بھروسہ کرنا قرین مصاحت نہیں ہے اس لیے کہ مختلف نسخوں کے اختلافات ظاہر کر رہے ہیں کہ خدا نے خود صحیح نسخہ کی حفاظت نہیں کی نہ کوئی ایسا نشان یا علامت موجود ہے جس سے انسان کو معلوم ہو سکے کہ فلان نسخہ صحیح اور غیر محروم ہے۔ وہ علم جسے جنہیں خاص وقت کی نظر سے دیکھا جائے ایسی ایسی غلطیوں سے بھرے پڑے ہیں جن کا اعتراف کیے بغیر جاہل نہیں۔ مثلاً نسخہ سبعینیہ میں درج ہے کہ مئیسلا طوفان کے بعد بھی بقید حیات موجود تھا جو ایک مصرع غلطی ہے۔

یہ خیال عام طور سے پھیلا ہوا تھا کہ دنیا سے قبل طوفان میں سال تین سو ساٹھ دن کا ہوا تھا اور ان کے کو تین سو ساٹھ درجن میں تقسیم کرنے کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ لیکن جب اس کے مقابلہ میں قرآن مجید کو دیکھو جس کا ایک ایک حرف ایک ایک لفظ ایک ایک سطر کسی تحریف و تبدیلی کے بغیر وہی ہے جس کا اٹھ ہزار سو و کائنات پر ہوا تھا اور جس کو دست برد اور گار سے بچانے کا وعدہ خداوند جل و علے نے خود ان الفاظ میں کیا ہے۔ ”وَأَنَّا لَآلِحَا فُلُوحًا“۔ مترجم۔

طوفان آیا تو آفتاب کی حرکت میں تغیر واقع ہو گیا اور سال کی مدت بقدر پانچ دن اور بچہ گھٹنے کے بڑھ گئی۔ بعض پشویان دین کی یہ رائے تھی کہ دنیا کا یہ عظیم الشان واقعہ مسئلہ انجیل عالم میں نمبر کی دوسری تاریخ کو پیش آیا۔ ڈاکٹر ولسٹن جن کی وقت نظری اور دقیقہ سنجی کو اس تاریخ میں تعظیمی سی غلطی محسوس ہوئی۔ ازراہ غایت تدقیق دیکھا جاتا ہے کہ اس واقعہ کی اصلی تاریخ ۲ نومبر نہیں بلکہ ۲۸ نومبر ہے۔ بعض بزرگواروں کا یہ خیال تھا کہ طوفان سے پہلے قوس قزح دیکھنے میں نہیں آئی تھی بلکہ طوفان کے فوراً بعد اول بطور ایک آسمانی نشان کے ظاہر کی گئی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کشتی نوح سے باہر آنے کے بعد آدمیوں کو گوشت کھانے کی اجازت ملی۔ اور طوفان سے پہلے انسان نباتات خوار تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ طوفان کی وجہ سے دوسری زمین پر کوئی نہایان جبرائیلی تبدیل نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی اُن معنومات کے بھروسے پر جو اُنہیں قبل طوفان حاصل تھیں زمین کو اپنے تین بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا یعنی یورپ یافت کو دیا۔ ایشیا سام کو اور افریقہ آم کو۔ چونکہ اُنہیں امریکا کے وجود کا علم نہ تھا اس لیے اُس کے از سر نو آباد کرنے کی کوئی گنجائش نہ نکالی۔ حضرت نوحؑ کے ان سعادتمند فرزندوں نے اپنے والد ماجد کے حکم کی تعمیل بسر و چشم کی اور دل میں مطلق یہ ہراس لائے بغیر کہ جن خوفناک ویرانوں میں ہم جا رہے ہیں وہاں ہو کا عالم چھایا ہوا ہے اور طوفان کی وجہ سے جو اولین پیدا ہو گئی ہیں وہ خشک بھی نہیں ہونے پائیں اپنے اپنے منومند مقبوضات میں نو آبادیاں قائم کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

تشر سال میں ایغیائی خاندان کے بال بچوں کی تعداد بڑھ کر کئی سو ہو گئی یہ سب کے سب دشت نوردی و باد یہ گردی کرتے ہوئے سو پوٹیلیا میں جا پھنسے تھے۔ جہاں انہوں نے کسی مصلحت سے جس کا علم ہمیں نہیں ہے۔ ایک مینارہ تعمیر کرنا شروع کیا جس کی اُن مصلحت ظاہر ہے کہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی تھی۔ کہ تیندہ جب طوفان آنے کو کشتی کی مڑوٹ نہ پڑے بلکہ

جو ملی کو وہ آسمان تک پہنچانا چاہتے تھے۔ یوسیبس رقم طراز ہے کہ اس سینارہ کی تعمیر کا کام چالیس سال تک جاری رہا اس وقت خدا نے دفعتاً اُن کی زبانوں میں اختلاف پیدا کر دیا اور وہ مجبوراً سینارے کا کام چھوڑ کر روئے زمین پر منتشر ہو گئے۔ سینٹ امبروز اور شاہ فرماتے ہیں کہ اس اختلاف السنہ کا باعث انسانی طاقت نہ تھی۔ اور آریجن کا قول ہے کہ فرشتے بھی اس اختلاف کی تکمیل نہ کر سکے بلکہ خود خدا نے اس قوم کی زبانوں کو بدل ڈالا۔

اختلاف السنہ کی بنا پر علماء مذہب نے انسان کی ابتدائی زبان کے متعلق عجیب و غریب قیاس آرائیوں سے کام لیا ہے۔ ایک گروہ ایسے علماء کا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ حضرت آدم کی زبان مطلقاً اس پر مشتمل تھی اور یہ اسما و احوال تھا۔ جب اسماے کثیر الہجاء کی اشاعت و تردید ہوئی تو زبان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگواروں نے یہ رائے قائم کرتے وقت اُن متعدد مکالمات کو نظر انداز کر دیا جن کا ذکر کتاب پیدائش میں موجود ہے۔ چنانچہ خدا نے حضرت آدم اور سام نے حضرت حوا سے جو گفتگو کی اُس کی روداد و تراش میں تمام و کمال مندرج ہے۔ اس گفتگو میں کلمہ کی سبھی اقسام و اصناف پائی جاتی ہیں۔ بہر حال یہ امر متفق علیہ تھا کہ انسان کی ابتدائی زبان عبرانی تھی۔ اور جن اصول پر پادریوں کے علوم و فنون کا احضار تھا اُن کی رو سے یہی مناسب بھی تھا۔

کلیہ سے یونان کے پادریوں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ جب اختلاف زبان کی وجہ سے اقوام میں تفرق پڑا تو بابل کی آبادی بہتر قوموں میں منقسم ہو گئی اور اس اندازہ سے سینٹ آگسٹائن کو بھی اتفاق ہے۔ لیکن عقل سلیم کو اس تخمینہ کے صحیح تسلیم کرنے میں جن وقتوں کا سامنا تھا وہ اپنا رنگ لائے بغیر نہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر شکسٹن نے اپنی

لہجہ نوٹ صفحہ ۲۵۷۔ یہ نوک سینارے کی چھت پر چاہا لین۔ مترجم

قابل قدر کتاب مین جو "عالم کی تاریخ پاک و نجس کا مقابلہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔  
متذکرہ بالا تمام مباحث پر نظر انتقاد ڈالتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ان بہتر انعام مین سے  
ہر ایک کی آبادی مرد و عورت بچے سب ملا کر اکیس بائیس نفوس سے زیادہ کسی حالت مین نہ  
ہو سکتی تھی۔

مشہور و عوام کے اس تاریخی تخمینہ مین جو انبیاء و اولیاء سلف کی عمروں پر مبنی تھا،  
سب سے زیادہ قابل غور بات ان بزرگوں کی عمروں کی غیر معمولی اور فوق العادہ طوالت  
تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ طوفان نوح سے پہلے مزاج کائنات مین دائمی ایتال پابا جاتا  
تھا باغ عالم مین ہر وقت بہار جلوہ گر رہتی تھی اور قدرت کے انقلابات و تغیرات معقود  
تھے۔ لیکن طوفان کے بعد یہاں عمر فقیر و ضعف کے خالی ہو گیا۔ اور صاحب زبور کے زمانہ  
مین انسان کی عمر کا اوسط اور بھی گھٹ کر ستر سال تک پہنچ گیا جو آج کے دن تک قائم  
ہے۔ چونکہ طوفان کے وقت زمین کا محور اپنی جگہ سے ٹل گیا لہذا موسموں مین سختی پیدا  
ہو گئی اور صیف وشتا و برشکال کے اشتداد کو طوفان کے واقعہ مانڈ کی اُن ہمہ گیر بلاؤں  
نے اور زیادہ بڑا دیا جن کی وجہ سے سطح زمین ایک وسیع دلدل بن گئی اور خون مین احتراق  
اور اعصاب مین استرخا پیا ہو گیا۔

انبیاء سلف اور قرون اولیٰ کے شیوخ قبائل کے عمروں کی حیرت انگیز طوالت  
سے جو مشکلات استقرار کو پیش آتی تھیں اُن سے بچنے کے لیے بعض علماء دین نے  
تاویل کا یہ پہلو اختیار کیا کہ کتب مقدسہ مین جن سنین کا ذکر کیا گیا ہے وہ شمسی سال نہ تھے  
بلکہ قمری سال تھے اس تاویل نے اُن بزرگوں کو اروں کی عمر کو اگرچہ آج کل کی مدت حیات  
کے برابر کر دیا۔ اور ایک مشکل رنج ہو گئی لیکن ایک دوسری بہت بڑی مشکل یہ آئی  
کہ پانچ چھ سال ہی کی عمر مین وہ سن بلوغ کو پہنچ کر صاحب اولاد بھی ہو گئے۔

بیٹوایان کلدیسا نے مقدس سائنس کو جن معارف و حقائق کا منہج قرار دیا ہے اُن کا

المقادہ ذیل کے مہات مسائل کی شکل میں کیا جا سکتا ہے :-

(۱) تاریخ پیدائش یعنی مکوہنِ عالم کو کچھ بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا یعنی ظہورِ مسیح علیہ السلام سے یہی کوئی چار پانچ ہزار برس پہلے (۲) عالم کو پیدا کرنے میں چھ سو لی دون کی مدت صرف ہوئی۔ (۳) طوفانِ عالم گیر تھا اور جو نباتات اسکی تباہی سے بچے وہ ایک کشتی کے ذریعہ سے محفوظ رہے (۴) حضرت آدم پیدائش کے وقت اخلاق اور عقل میں کامل تھے لیکن اس پائے عقلی اخلاق سے انہیں گناہ سے گرا دیا۔ اور ان کی اولاد و احفاد کو ان کی مہصیت و سبب طین شریک ہونا پڑا۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض مسائل ایسے پیش کیے جا سکتے ہیں جو کلیسا کی فہرست عقاید میں شامل ہیں۔ ان میں سے دو مسائل ایسے تھے جن کی حقیقت پر مشورایانِ دین عیسوی کو اصرار کیے بغیر مفر نہ تھا۔ اول یہ کہ آفرینشِ عالم کو کچھ بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ مسیحیت کی بقا کے لیے یہ عقیدہ لازمی تھا اس لیے کہ آفرینش کا زمانہ جس قدر بعید ہوگا اسی قدر خدا کے عدل و انصاف کو ثابت کرنے کے لیے زیادہ قوی دلائل کی ضرورت عاید ہوگی جس نے بنی نوع کے ایک حصہ کثیر کو اس کی قسمت کے حوالہ کر کر نجات کی نعمت صرف انہیں چند نفوس کو بخشی جو ظہورِ مسیح کے بعد یعنی عالم کے دورِ آخر میں پیدا ہوئے مسیحیت کا دوسرا رکن اعظم یہ تھا کہ حضرت آدم پیدائش کے وقت انسان کامل تھے یہ عقیدہ مسئلہ ہو ط و مسئلہ نجات کی تاویل کے لیے نہایت ہی ضروری تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ عداوتِ دینِ عیسوی ہر اس کوشش کی مخالفت پر مجبور تھے جو اس بات کے ثابت کرنے کے لیے عمل میں لائی جائے کہ زمین کی ابتدا ایک نالیہ دور و دراز زمانہ میں ہوئی جبکہ بعد از بونی کثرتِ تعین نہیں ہے اور مسلمانوں کے اس قیاس کو دیکھی طرح نظرِ استحسان نہ دیکھ سکتے تھے کہ انسان طبقہ سافل کی اشکالِ حیوانی کی ترقی یا صورت ہے یعنی قریباً قرن تک بتدریج نشو و نما پا کر موجودہ درجہ کو پہنچا ہے۔

عبارت مذکورہ الصدر جن مہلات و لمویات و اصناد سے معمور ہے ان سے اس مقدس

سائنس کی حقیقت روز بروز سن کی طرح آشکارا ہے۔ اور عجب نہیں کہ ہمیں بھی وہی راستے ظاہر کرنی پڑے جو بیچارے ڈاکٹر سٹکسٹون نے جن کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے اس علم پاک کے ذائقہ میں شان و افاق و معقولیت پیدا کرنے کی بے سود کوششوں کے بعد مجبوراً ان الفاظ میں ظاہر کی ہے گھلیا۔ کے پیشوا ان قرون اولیٰ کی نسبت ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نیکو کاری میں شک نہیں لیکن ان کی معلومات بصر سے عاری تھیں۔ روایات مقدسہ کی رو سے خدا زمین کی ترکیب و تنظیم کی بلا واسطہ علت ہے۔ روایات مذکور کو آفرینش عالم میں علل ثانیہ کی وادعت سے انکار ہے۔

علم ترکیب کائنات کا دنا کیسینی کے اس دور میں اکتشاف سے شروع ہوتا ہے کہ سیارہ مشتری کرہ نہیں ہے بلکہ ایک سطحِ اعظمین جرم مینوسی ہے۔ علم الحركات والجبیل نے ثابت کر دیا کہ اس قسم کی شکل ایک مادہ قابل الجبیل کی گردش کا لازمی نتیجہ ہے اور گردش جس قدر زیادہ تیز ہوگی اسی قدر جرم دوار کے قطبین زیادہ سطح ہوں گے با الفاظ دیگر اس کے استوائی حصے باہر کو زیادہ نکلے ہوئے ہوں گے۔

علم الحركات ہی کے اصول کی بنا پر نیوٹن نے حکم لگایا تھا کہ کسی قدر زرمیم کے ساتھ زمین کی بھی اسی طرح کی شکل ہونی چاہیے۔ شرط قدر استوائیہ کائنات و اندلاع یعنی بچک کر باہر کو نکلا ہوا ہونا استقبال اعتدالین کا باعث ہے جس کے دور کی تکمیل پچیس ہزار آٹھ سو اسی سال میں ہوتی ہے اور اسی اندلاع سے محور زمین کا بہتر از پیدا ہوتا ہے جسے بریڈلی نے دریافت کیا تھا۔ اس سے پہلے ایک مقام پر ہم لکھے چکے ہیں کہ زمین کا قطر استوائی قطر قطبی سے بقدر چھ بیس میل کے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر سٹکسٹون کے اس خیال کو غلام مولانا اکبر حسین صاحب، الدنابادی نے ازراہ سسٹم طرغی ذرا زیادہ تسہیم کے ساتھ اس طرح ظاہر کیا ہے :-

کچھ شک نہیں کہ حضرت واعظ جن خوب شخص یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہیں

مترجم

زمین کی تسطح قطبین سے دو واقعات منکشف ہوتے ہیں اول یہ کہ وہ زمانہ سابق میں جاہل دلتین یعنی بصورت خمیرہ چکی ہے۔ دوم یہ کہ وہ حرکت کے سانچے میں ڈھلی ہے اور اس لحاظ سے گویا اسکی ترکیب میں کسی علت ثانیہ نے حصہ لیا ہے۔

تو انہیں حرکات و میل کا یہ اثر کہ زمین کی ترکیب خارجی و ظاہری ہی میں نمایان نہیں ہے یعنی اس اثر نے اُس کے قطبین کی تسطح اُس کی بیضیت اور اسکی حرکت دواری ہی میں حصہ نہیں لیا بلکہ اگر ان اجزاء کا معائنہ کیا جائے گا جن سے زمین مرکب ہے تو یہی اثر ان میں بھی نظر آئے گا۔

اگر ہم احبار آبی کے طبقہ کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ اُس کا دل کئی میل کا ہے لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان چٹانوں کے التام و انطباق کا عمل بہت آہستہ آہستہ ہوا ہے جس مادہ سے یہ چٹانیں مرکب ہیں وہ قرنہا قرن پہلے کے اجزاء ارضی کی تحلیل و تثلیث سے حاصل ہوا ہے جنہیں نائون اور نڈیون کے ہواؤ نے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے از سر نو تہ بہ تہ جمادیا۔ اس قسم کا عمل تحلیل و انطباق ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے لیکن تادقیقہ مدت ہاے مدید منقضی نہ ہو جائیں کوئی نمایان اثر اس سے مترتب نہیں ہو سکتا۔ پانی کی روانی کے عمل سے مٹی کے اجزاء تحلیل شدہ کی جوتہ کسی دریا کے دہانہ پر جم جاتی ہے اُس کی موٹائی ایک صدی میں چند انچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پس اسی قسم کی جس تہ کی موٹائی کئی ہزار گز ہو اُس کے انطباق میں کس قدر زمانہ صرف ہوا ہوگا؟

مصر کے ساحل کی ہیئت ترکیبی کا علم انسان کو دو ہزار سال قبل اس سے بھی پہلے سے ہے۔ اس زمانہ میں ان اجزاء ارضی کے حصین دریاے نیل کی موجیں اپنے ساتھ بہا لاتی تھیں اس ساحل میں ابک نمایان اصنافہ کر کے بحرِ روم کو کچھ دور پیچھے بٹھا دیا ہے لیکن معرکہ تمام نشانی حصہ اسی طرح سمندر کو پاٹ پاٹ کر بنا ہے۔ دریاے میسیپی کے دہانے کے

قریب خلیج میکسیکو کا ساحل تین سو سال سے ماہرین فن طبقات الارض کے پیش نظر ہے لیکن اس مدت میں خط ساحل نے کوئی نمایاں پیش قدمی نہیں کی حالانکہ مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا جبکہ اس دریا کا دہانہ سینٹ لوئیس کے قریب موجودہ مقام سے سات سو میل کر فاصلہ پر تھا۔ مصر دارمیکہا ہی پر کچھ موقوف نہیں۔ تمام ممالک میں دریا انچہ و انچہ خشکی کو تری میں بڑھاتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور ان کی آہستگی عمل اور اس عمل کے عظیم اثرات انہوں سے ہم دونوں کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس عمل تراکم اجزات و انطباق طبقات کے لیے اور امدیدہ و درون البیدہ کا انقضا لازمی ہے۔

یہی نتیجہ ہیکوئس وقت بھی نکالنا پڑتا ہے جب ہم جھیلوں کے پائے جانے پانی کے قطران سے اجزائے کلیہ یعنی چوڑے اور کھار کے متحجر ہونے۔ بارش کے عمل سے کہاروں کے حل ہو کر رہنے۔ سمندروں کی موجوں کے تعبیرٹوں سے ساحل کے کٹنے۔ سنگلاخ ٹیکروں کی بنیادوں میں پانی کے سنگ لگانے اور باد و باران کے اثر سے چٹانوں کے فرسودہ ہونے پر غور کرتے ہیں۔

تراکم اجزات سے اجدادی کے جوہر تملے اوپر جم گئے ان کے انطباق کی سطح مزہ ہے کہ ابتدائیں تقریباً افقی السمست ہو لیکن کثیر التعداد طبقات یا تو کسی ایسے بعش شدید کی وجہ سے جس کا ظہور باوقات مختلف ہوا اور یا تدریجی حرکت کے باعث زوایا سے مختلف لمبایاں بنانے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ان عظیم اثرات اعمو جاجات و انحرافات کی اصلی وجہ خواہ کچھ ہی ہو لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ ان طبقات کے ترکیب پذیر ہونے کے لئے اس قدر مدت مدید کا گزرنہ لازمی ہے۔ جس کے اور اک سے فہم قاصر ہے۔

دیکھو کہ ان طبقات ارضی کا عمق جن سے پتھر کا کوئلہ برآمد ہوتا ہے بتدریج قدر زمین میں غرق ہوتے ہوئے بارہ ہزار فٹ ہو گیا ہے اور نوا سکونیائین ان طبقات کا دل چودہ ہزار پانچ سو ستر فٹ ہے دیکھئے کہ یہ عمل اس آہستگی اور مواعظت سے ہوا کہ ہر طبقہ کے درخت



تھے اور ہر جون کے نوں کھڑے ہوئے ہیں۔ اور چار ہزار یا پنج سو پندرہ فٹ کی موٹائی میں سترہ طبقے اس قسم کے گنے جا سکتے ہیں۔ درختوں کی عمر کا اندازہ ان کی جسامت سے ہو سکتا ہے چنانچہ بعض کے تنہ کا قطر چار فٹ ہے۔ دہشتی جو فی زمین کے ساتھ ساتھ جب درخت بھی آہستہ آہستہ زمین میں سلتے گئے تو ان کے گرد وہ پودے اُگتے گئے جنہیں اصطلاح فن طبقات الارض میں "کیلیمائٹ" (ذنب الفرس) کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ پودے غرق شدہ درختوں کی طرح درجہ بدرجہ ہر طبقہ میں پائے جاتے ہیں۔ سڈی کے طبقہ زغال میں اسٹینڈرڈ بے ہوئے بنگلے تھے اور پھر۔۔۔ ہوئے ہیں۔

بحرین گہونگون کی سیپیوں کو برا خطیوں کے اندرونی حصہ کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دیکھ کر علماء سے مذہب اپنی تصانیف میں یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ان سیپیوں سے طوفان نوح کی ہڈیوں کی حجت قاطعہ ہم پہنچتی ہے۔ لیکن جب علم طبقات الارض کے مسائل صحت کے ساتھ معلوم ہوئے۔ لگے تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ زمین کے خول بیرونی زمین وہ طبقات جو آب شیریں کے عمل سے بنتے ہیں ان طبقات کے ساتھ جنہیں آب شور نے بنایا ہے علی التوالي والتسلل کسی کتاب کے اوراق کی طرح ملے ہوئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک ہی طوفان ان مختلف مظاہر کا باعث نہیں ہو سکتا بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی قلعہ زمین اپنی سطح کے مدبر کی تعزیت اور اپنے جغرافیائی حوالی کی تبدیلیوں سے کبھی تو بالکل خشک تھا کبھی آب شیریں کے تھے ڈوب گیا اور کبھی آب شور کے نیچے آگیا اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی روز روشن کی طرح آشکارا ہو گئی کہ ان تغیرات و انقلابات کی تکمیل کے لیے ہزاروں لاکھوں سال کی مدت مطلوب ہے۔

قدامت ارض کی اس شہادت پر جو اس کے طبقات کی دست - عمق اور تنوع سے خود تھی ان زبردست شہادتوں کا اعتراف ہو گیا جو اس کے آثار متجربہ پر مبنی تھیں زمین کے ہر طبقہ کی عمر جب متحقق ہو گئی تو اس بات کا ثبوت دینا آسان ہو گیا کہ نباتی و حیوانی ہر

طرح کے اجسام ذوی الاعضا نے قدیم ترین اشکال سے لے کر جدید ترین اشکال تک بتدریج ترقی کی ہے اور وہ نباتات و حیوانات جو ہمارے زمانہ میں سطح زمین کی آبادی کا باعث ہیں ان کثیر التعداد اشکال نباتی و حیوانی کا محض ایک جزو متعین ہیں جو یہ زمانہ سابق عالم ہستی میں آچکی ہیں۔ یعنی اگر ایک نوع اس وقت زندہ ہے تو ہزار ہا انواع فنا ہو چکی ہیں۔ اگرچہ طبقات ارض سے متحجرات کے جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان میں سے حیوانات کی بعض انواع اپنی خصوصیات مخصوصہ کے لحاظ سے اس درجہ نمایان ہیں کہ ہماری زبان پر درحیوانات مفصلیہ (بے پرہ) کی ڈی کے جاندار) درحیوانات الارض (زمین پر رہنے والے دو جاندار جو پرہ کی ڈی رکھتے ہیں) در ذوات المذی (دوہ پلانے والے جاندار) کی اصطلاحیں چرہ لگئی ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہر نئی نوع ایک بیک نمودار ہو گئی تھی۔ ہر نوع کا بطور بتدریج دور سابق میں ہوا اور اپنے دور میں جو اس کے نام سے منسوب و مخصوص ہے منتہاے نشوونما پر پہنچ کر وہ بتدریج دور آئندہ میں معدوم ہو گئی۔ نوری پیدائش یعنی کسی شے کا ایک بیک کامل و مکمل صورت میں نمودار ہو جانا خارج از امکان ہے۔ ہر وجود کمال آہستگی سے اپنا پورا تبدیل ہوتا ہے اور ایک سابقہ شکل سے ترقی کرتا ہوا موجودہ شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کے لیے سبھی ایک بہت بڑے طویل و مدید زمانہ کا انقضا لازمی ہے۔ جب سے انسان نے ہوش سمجھا لیا، یعنی جس زمانہ سے تاریخ کی روشنی انسان کے تمدن پر پڑی ہے۔ اس قسم کے انبدال یا استحالہ نشوونما کی کوئی بین مثال ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی۔ علیٰ ہذا القیاس الغد امر نوع کی کوئی تاریخی مثال و تکرار سے بھی ہم کچھ بہت زیادہ و نواقظ ظاہر نہیں کر سکتے لیکن ان قرون داد و دار میں جنہیں حقایق طبقات الارض سے تعلق ہے مد ہزار ہا کون و فساد اور ارتقا و انعدام پیش آپکے ہیں۔

چونکہ انسان کا تجربہ تبدیل ہئیت یا ارتقا کی کسی مثال پر حاوی نہیں ہے لہذا بعض اصحاب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس قسم کا تبدیل یا ترقی خارج از امکان ہے۔ اور

حیوانات و نباتات کی مختلف نوعیں علیحدہ علیحدہ پیدا کی گئی ہیں۔ لیکن ان اصحاب کو یہ تو سوچنا چاہیے کہ ہر نوع کا ایک نوع سابقہ سے بہ تبدیلی و ترمیم اعضا ترقی پا کر درجہ کمال پر فائز ہونا اس کے مقابلہ میں زیادہ قریب وانش ہے کہ وہ نوع یک بیک عدم سے وجود میں آجائے۔ یہ قول بھی کچھ بہت زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ کسی انسان نے کسی نوع کے کسی فرد کو ارتقا کا چو لاہرتے ہوئے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا شاید وہ لوگ جن سے اس ادعا کو نسبت ہے اس امر کی طرف سے خالی الذہن ہیں کہ آج تک کسی شخص نے اپنی آنکھ سے یہ بھی تو نہیں دیکھا کہ کوئی جسم ذوی الاعضاء بغیر کسی صورت کے خود بخود اور یک بیک پیدا ہو گیا ہو۔

آفرینش کے اُن افعال سے جو بغیر مصادروں اور جن میں مغائر لقاؤں ہونے کے علاوہ کوئی ربط نہ پایا جاتا ہو۔ گو قدرت ایذوی ظاہر ہوتی ہو لیکن اجسام ذوی الاعضاء کا وہ غیر منقطع سلسلہ و طبقات قدیمہ و جدیدہ کے استجرات سے لے کر طبقات جدیدہ و قوانین تک پھیلا ہوا ہے اور جس کا ہر ایک حلقہ ایک حلقہ سابق سے متعلق اور ایک حلقہ مابعد کا سہارا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر ایک کے جاذبہ ہستیوں کا وجود میں آنا ایک ایک متعہ ضابطہ کے تابع ہے اور یہ وہ ضابطہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ قانون ہزاروں لاکھوں سال سے اپنا عمل کر رہا ہے۔ لیکن آج تک اس میں کوئی تغیر اور کوئی رکاوٹ نہیں واقع ہوئی۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے اُس شبہات کے ایک حصہ کی نوعیت معلوم ہو سکتی ہے جس سے مسئلہ عمر و زمین پر بحث کرتے وقت ہمیں سابقہ پڑنا ضرور ہے۔ علمائے فن طبقات الارض نے حقیقت یہ ہے کہ خدا کی صنعت و حکمت کا جو ثبوت اس ضابطہ غیر ممکن التیغیر سے ملتا ہے وہ کسی ایسے منر سے بزرگ نہیں ہے جو پہنچ سکتا جس میں نمونہ آمیز جہروت کی شان پائی جاتی ہو۔ دنیا کے ترقی یافتہ مسک دینی اسلام نے اسی خیال کو بار بار ان الفاظ میں ظاہر کر کے حقیقت قدرت ایذوی کے چہرہ سے پردہ اٹھایا ہے۔ لا تبدل یل لخلق اللہ۔ لن تجد لسنة اللہ تبدل یلا۔

کی مسلسل و مسلسل کوششوں نے اس شہادت کا اتنا بڑا انبار جمع کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے کئی ضخیم جلدیں مطلوب ہیں۔ یہ شہادت اُن تمام احجار کے اجزاء کی ترکیبی و ہئیت لکھائی کا حاصل ہے جن میں سے بعض تو آبی ہیں یعنی پانی کے عمل سے بنے ہیں۔ بعض آتشی ہیں یعنی جو زمین کے کھولے ہوئے خارج شدہ مادے سے مرکب ہیں اور بعض سطحی یعنی حرارت اور دباؤ کے متفقہ عمل سے ترکیب پذیر ہوئے ہیں طبقات احجار آبی کے متعلق یہ تحقیقات کی گئی ہے کہ اس کی سوٹائی کس قدر ہے۔ اس کے مختلف پرتوں کا میلان کس سمت میں ہے۔ ہر ایک پرت دوسرے پرت پر بے ڈھنگے پن سے کس شکل میں قائم ہے۔ وہ طبقات جو آب شیرین کے عمل سے بنے ہیں اُن طبقات کے ساتھ جن میں آب شور کا اثر پایا جاتا ہے کس طرح ملے ہوئے ہیں۔ تقریب و تحلیل کے بعدی العمل اسباب نے مادہ ارضی کے کو دیگر انباروں کو کیوں کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے وسیع و عریض جغرافیائی رقبوں کی شکل تبدیل کر دی ہے۔ براعظموں کی سطوح میں الجھنے اور دھنسنے کی وجہ سے کس طریقہ پر نشیب و فراز پیدا ہو گیا ہے یعنی اُن کے سواحل کیونکر نکریا تو سمندر میں غرق ہو گئے ہیں اور یا خشکی میں بہت دور اندر تک چلے گئے ہیں۔ حیوانات و نباتات کے حال سے بھی علم طبقات الارض کی شہادتوں کو بحث ہے یعنی اس مسئلہ پر نظر ڈالی گئی ہے کہ ہر دور میں کون کون سی حیوانی اور نباتی شکلیں موجود تھیں اور کیونکر نہایت ترتیب و تسلسل کے ساتھ اجسام ذوی الاعضاء یعنی نباتات و حیوانات کا سلسلہ عالم ابداع کے مبہم و مبہوم نقطہ آغاز سے ہمارے زمانہ تک پہنچا ہے۔ حشیش و متحجر سے جس کی اصل برصورت میں نباتات ذابل ہے۔ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نہ صرف زمین کے کربہ ہوا ہی میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں بلکہ موسم میں بھی ہمہ گیر انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ بعض دوسرے واقعات متعلقہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ روئے زمین کی حرارت میں بھی مدوجز ہوتا رہا ہے۔ یعنی بعض زمانوں میں حرارت کا اوسط بہت بڑھ گیا ہے اور

بعض مین قطبین کی برت و پنج کے تودے موجودہ براعظموں کے ایک بہت بڑے حصہ پر چھا گئے ہیں۔ چنانچہ ان ادوار کو از منہ زمہر یہ یہ کہتے ہیں۔

ماہرین فن طبقات الارض کا ایک گروہ جس کی دلائل کا مدار علیہ نہایت زبردست شہادت ہے یہ رائے پیش کرتا ہے کہ کل جرم ارض ابتدائیں ایک جسم گداختہ یا سیال تھا بلکہ شاید فرو حرارت سے بحالت دغان تھا۔ لاکھوں فرزون کے گزرنے کے بعد تبخیر کے ذریعہ سے اس کی حرارت کا اشتداد کم ہوتا گیا تا آنکہ اس کے مزاج میں موجود اعتدال پیدا ہو۔ علم ہیئت کے مشاہدات خصوصاً نظام شمسی کے اجرام سیارہ کے حالات اس تاویل کی تائید و توثیق کرتے ہیں بعض دوسرے واقعات سے بھی اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے مثلاً اوسط کثافت ارض کی کمی۔ زیادتی عمق قعر زمین کی نسبت سے حرارت کا ازادیا دکھولنے پر سے مادہ کا آتش افشان پہاڑوں اور دراڑوں کی راہ سے اخراج۔ احجار آتشی و مستحیلہ کا وجود۔ ان طبعی تغیرات کی تکمیل کے لیے جو علماے طبقات الارض کی اس جماعت کے پیش نظر ہیں بے انتہا صدیان مطلوب ہیں۔

لیکن نظام کو پرنیکس کے حقایق کا اعتراف اس ضرورت کا مستلزم ہے کہ زمین کی ابتدا و سرگزشت کے واقعہ پر انفرادی حیثیت سے نظر نہ ڈالی جائے۔ ضرور ہے کہ اس واقعہ پر بحث کرتے وقت اس نظام یا خاندان کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے جس کا کرہ زمین ایک رکن ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اپنی بحث کو نظام شمسی تک بھی محدود نہیں کر سکتے اس بحث میں ہمیں ثوابت کی دنیاؤں کو بھی شریک کرنا چاہیے۔ اور چونکہ اس برتر از قیاس فاصلہ کی غرابت سے ہمارا دماغ اب مانوس ہو چکا ہے جو ان ثوابت کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے لہذا ہم انکی تکوین کے زمانہ میں بھی بعد کے اس عنصر کے اعتراف کے لیے آمادہ ہیں جس کی پیمائش محالات سے ہے۔ کائنات میں ایسے ایسے کو اکب بھی موجود ہیں جو ہم سے اس قدر دور ہیں کہ باوجودیکہ روشنی اس نیزی سے حرکت کرتی ہے پھر

بھی اُن کی شعاع نور کو ہم تک پہنچنے میں کئی ہزار سال کا زمانہ صرف ہوا ہے جس سے یہ پتہ  
نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن کو وجود میں آئے ہوئے اگر زیادہ نہیں تو کم از کم کئی ہزار سال کی مدت  
تو ضرور منقضى ہوئی ہوگی۔

علمائے طبقات الارض جب بالاتفاق تسلیم کر چکے کہ تاریخ تکوین الارض بہت زیادہ وسیع  
کی محتاج ہے تو یہ کوششیں ہونے لگیں کہ اس تاریخ کو معین کیا جائے۔ ان کوششوں  
میں سے بعض اصول ہیئت پر مبنی تھیں اور بعض اصول طبیعیات پر۔ مثلاً سب سے آخری  
دور زمہبرریہ سے اس وقت تک کی مدت کے دریافت کرنے کی غرض سے جو تخمینہ مرکزدار  
ارض و مرکز آفتاب کے درمیانی فاصلہ کی سندوسہ تبدیلی کی بنا پر قائم کیا گیا ہے اُس کا حاصل  
دو لاکھ چالیس ہزار سال ہے۔ اگرچہ اس عام اصول کے صحیح ہونے میں شک نہیں کہ  
ازمنہ طبقات الارض کی مدت غیر الاحصاء ہے لیکن اس قسم کے تخمینے ایسے غیر یقینی قیاسات  
پر مبنی ہیں کہ وہ کسی طرح موثق و معتبر نہیں ٹھہر سکتے۔

تاہم اس مسئلہ کے مادہ و ماحلیہ پر علمی پہلو سے نظر ڈالنے کے بعد اس میں تو مطلق  
شک نہیں رہتا کہ علمائے مذہب نے نسخیہ موسیٰ سے جن واقعات کا استقصا کیا ہے وہ  
واقعات تسلیم ہیں۔ اگرچہ اکتشافات جدیدہ و واقعات متحققہ کے ساتھ واقعات الہامی کو تطبیق  
دینے کی ستوا ترکوشش کی گئی ہے لیکن وہ لا حاصل ثابت ہوئی ہے۔ تواریخ کا زمانہ  
حد سے زیادہ قلیل ہے۔ ترتیب طبع و مخلوقات بالکل خلاف واقعہ ہے اور خدا کی طرف سے  
جو مداخلت ہوئی ہے اُس میں شان انسانی معمول سے زیادہ اپنی جھلک دکھا رہی ہے  
اور اگرچہ سبیل زیر بحث اُن خیالات سے توافق و تطابق رکھتے ہیں جو انسان کے دماغ  
میں اُس وقت پیدا ہوئے تھے جب اُس کو اول اول صحیفہ فطرت کی درق گردانی سے اپنی  
معلومات میں اصنافہ کرنے کا شوق پیدا ہوا لیکن اُن کو زمین کی ہیج میرزہ اور کائنات  
کی عظمت و شان کے موجودہ تصورات سے مطلق ربط نہیں۔

حال کے طبقات الارضی اکتشافات میں سے ایک اکتشاف خصوصیت کے ساتھ ہمارا توجہ کا محتاج ہے۔ یعنی اُن طبقات میں جن کو اگرچہ طبقات الارضی اعتبار سے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری لیکن تاریخی اعتبار سے ایک عرصہ دراز منقضي ہو چکا ہے۔ انسانی جسم کے ڈھانچ اور انسانی صنفت کے آثار پائے گئے ہیں۔

انسان کے آثار متعجبہ یعنی اُس کے جسم کے ڈھانچ اور کھردرے یا ترشے ہوئے مجلات پتھر اور پٹلی وغیرہ کا انسانی اکر اور یورپ میں غاروں میں پتھر اور سنگریزوں کے تودوں اور حشیش متعجبہ کے طبقوں میں پائے گئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اُس زمانہ میں وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا اور جنگل کے جانوروں اور مچھلیوں کے شکار سمیت قوت برسی کرتا تھا۔ جو تحقیقات حال میں کی گئی ہیں اُس سے اس واقعہ کی صریح شہادت بہم پہنچتی ہے کہ انسان دورِ ثنائی میں بھی موجود تھا اور جنوبی یا شمالی تھوٹھنی والے گینڈے اور غلیظ الجھنہ دریائی گھوڑے کا ہم عصر تھا۔ بلکہ شاید دورِ ثنائی وسطیٰ کے مشہور ڈاڑھوں تھن۔ لکھنے والے نیل نامی حیوان "مسٹوڈان" کا بھی معاصر تھا اور یہ وہ حیوان ہیں جن کی نسلیں معدوم ہو چکی ہیں۔

دورِ ثنائی کے اختتام پر بوجہ ان اسباب کے جو ابھی تک متحقق نہیں ہوئے زمین کو نصف کرہ شمالی کی حرارت میں غیر معمولی کمی واقع ہو گئی۔ یعنی منطقہ حارہ سے وہ منطقہ بارہ ہو گیا اور تابستان کی جگہ برفستان نے لے لی۔ ایک مدتِ ممتد کے بعد حرارت پھر بڑھ گئی اور برت کے وہ پہاڑ جو سطح زمین پر دور دور چھا گئے تھے پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد پھر حرارت میں کمی ہو گئی اور تودہ ہا سے برت آگے بڑھ آئے۔ لیکن اس مرتبہ اُنہوں نے زیادہ پیش قدمی نہ کی۔ اب دورِ البرہ کا آغاز ہوا اور موسم بہتر درج بدلتا ہوا موجودہ حالت پر پہنچ گیا۔ تراکم اجرات کے عمل کو جو پانی کی مدد سے برابر جاتھا طبقاتِ آبی کے انطباق کے لیے ہزار ہا صدیوں کی منہورت تھی قرونِ البرہ کے ادیل میں خرس کہنی۔ اسد کہنی۔

قرس البحر و عنصرین۔ کرگدن، مشک، المنار اور فیل شغرائی (میتھ) کی نسلیں زندہ تھیں۔ ان کو ہیکل یا تھیون کے کثیر التعداد غول جنگلوں میں آباد تھے۔ اور ان کے پیشے کو لیے نصف کرہ شمالی کا موسم نہایت موزون تھا۔ رفتہ رفتہ برقیانی بارہ سینگون گھوڑوں، جیلوں اور انہوں نے بھیسنوں کی نسلیں ترقی کر گئیں۔ اور قدرت کو جس کا دسترخوان پہلے صرف ایک اکیلے فیل شغرائی کے لیے وقف تھا اب اتنے بہت سے مہانوں کی تواضع کرتی پڑی۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ روز افزون حرارت کے باعث فیل شغرائی معدوم ہو گیا۔ وسطیورپ سے برقیانی بارہ سینگ رخصت ہو کر اقطاع شمالی کی طرف جہاں زیادہ سردی تھی چلا گیا۔ اُس کا نقل مکان قرونِ رابعہ کے خاتمہ کی علامت ہے۔

پس رو سے زمین پر انسان کے ظاہر ہونے کی تاریخ سے لکر اب تک بہت سے قرن گزرے ہیں جن کی مبادیرون اذقیاس اور برتر اذ احصا ہے۔ ان قرونِ متمدنہ میں انقلابِ آب و ہوا اور تغیراتِ انواع حیوانات اُن بطی الاثر اسباب سے ہوئی تھیں جو آج کے دن بھی اپنا عمل برابر کر رہے ہیں۔ شمار و اعداد سے ہم ان مدتِ بائے دراز و ازمنہ بعیدہ کا اندازہ ہرگز نہیں کر سکتے۔

یہ امر بایہ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ انسان کی ایک نسل جو قوم باسک سے مشابہت

لے اسپین کا وہ وسیع علاقہ جو کورستان پر مینیز کے جنوب و مغرب میں واقع ہے صوبہ باسک کہلاتا ہے جس کا رقبہ تین ہزار مربع میل اور آبادی پانچ لاکھ ہوگی۔ اس صوبہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں ایک قدیم نسل کے لوگ جو باسک کے نام سے موسوم ہے آباد ہیں۔ ماہرین علم الاقوام کا خیال ہے کہ اسپین میں قوم کلت کے اگر آباد ہونے سے قبل پورے جزیرہ نما میں ایک قوم بستی تھی جس کا نام آئیری تھا چنانچہ اسپین کو آئیریہ اسی لیے کہتے ہیں باسک انہیں آئیریوں کی نسل سے ہیں۔ اس نسل کا تعلق اقوام کے اُس خانواده سے تھا جو آریہ اقوام کے ظہور سے پہلے یورپ میں آباد تھیں۔ باسک قوم کی زبان جو آریہ زبانوں کی عنصر کی آمیزش سے باطل پاک ہے غالباً ذرا فی الاصل ہے۔ تمدنِ جدید کا اس قوم پر کچھ کچھ اب پڑنے لگا ہے۔ ورنہ



رکھتی ہے زمانہ حجریہ جدید میں رو سے زمین پر آباد تھی۔ اس زمانہ میں جزائر برطانیہ کی سطح اسی طرح زیر انقلاب تھی جس طرح فی زمانہ جزیرہ نما سے اسکندریہ یا متغیر ہو رہا ہے۔ اسکا ٹلیٹڈ ابھر رہا تھا اور انگلستان دھنس رہا تھا۔ طبقہ ثانیہ الثالثہ جدید کے زمانہ میں وسطیورپ شکار یون اور ماہی گیروں کی ایک وحشی نسل سے آباد تھا جو اسکیما نسل سے ملتی جلتی ہے۔

نوٹ صفحہ ۲۶۱ پچاس سل اڈریک ان کی زندگی نیم وحشیانہ تھی۔ مترجم  
 لے ایکما اُس وحشی نسل کا نام ہے جو شمالی امریکہ کے منطقہ باروہ میں گرین لینڈ اور لبرٹیا کے ساحلوں اور  
 دوسرے برفانی علاقوں میں آباد ہے۔ اگرچہ اس ساحلی علاقہ کا طول پانچ ہزار میل سے کم نہ ہوگا۔ لیکن  
 اس کی آدھی اپنی شکل صورت۔ عادات و اطوار۔ رسم و رواج۔ بول چال اور روایات و خیالات کے  
 اعتبار سے آپس میں بہت کچھ مشابہ ہے اور دنیا میں دوسری کوئی قوم نہ ہوگی جس کا خون اس درجہ خالص  
 اور بلا آمیز سرش ہو اور جس کی قومی خصوصیات میں بیرونی اثرات نے اتنا کم تغیر پیدا کیا ہو۔ یہ لوگ ہزاروں  
 سال سے ایک ہی طرح رہتے بہتے چلے آئے ہیں۔

ان کی زندگی کا دار و مدار دریائی پھرتوں اور دوسرے دودھ پلانے والے بحری جانوروں اور پھلیوں پر ہے  
 ان جانوروں کی چربی ان کی عام غذا ہے جس کی وجہ سے وہ سردی کی سختی چھیل سکتے ہیں۔ اور ان کا لباس  
 بھی انہیں جانوروں کے چمڑے کا ہوتا ہے۔ دریائی پھرتوں اور پھلیوں اور دوسرے جانوروں کے  
 خشک رہن انہیں ایسی مہارت ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لباس اور غذا کے علاوہ وہ اپنی زندگی  
 کی باقی تمام ضرورتوں کو بھی انہیں جانوروں کے ذریعہ سے پورا کرتے ہیں ان کی بٹویوں سے خشک  
 کے لیے ہتھیار بناتے ہیں ان کی سنوں سے تاگے اور ڈوری کا کام لیتے ہیں۔ ان کی بے بہتیت  
 کی برکت پر چلنے والی گاڑیاں بھی جن کے آگے کتے جوتے جاتے ہیں بٹویوں ہی کی بنی ہوئی ہوتی  
 ہیں۔ دس دس بارہ کنوئوں کے جڑے ایک جگہ آباد ہوتے ہیں۔ جاڑوں کے موسم میں جہاں  
 یہ جڑے رہتے ہیں وہی ان کا اصلی گھر ہے۔ کیونکہ گرمی کے موسم میں وہ خانہ بدوش بن جاتے ہیں  
 اور ادھر ادھر جگہ دکاتے پھرتے ہیں۔ اس زمانہ میں علاوہ دریائی پھرتے پھلی وغیرہ کے شکار کے

ریت مٹی اور خس و خاشاک کے اُن انباروں میں جو اسکا ٹمینڈ کو دور زمہریر یہ جدید سے  
 ترک زمین پہنچ رہی ہیں انسان اور ہاتھی کے متحیرات پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جس کا ذکر  
 بقیہ نوٹ صفحہ ۲۷۲۔ وہ بر فانی بارہ سینکے کا بھی ٹھکا کر گرتے ہیں اور تھوڑی بہت تجارت بھی کرتے ہیں جو تباہ  
 اجناس کے اصول پر مبنی ہوتی ہے۔ جاڑے کی آمد کے ساتھ وہ اپنے قشلاق کو لوٹ جاتے ہیں۔  
 اگرچہ گوشت وہ کچا بھی کھاتے ہیں لیکن عام دستور یہ ہے کہ گوشت ایک پتھر کی ہنڈیا میں جو ایک چراغ کر  
 اور لٹکا دی جاتی ہے ابالی لیا جاتا ہے اس چراغ میں تیل دریا کی بچھڑوں اور دیل مچھلیوں کی چربی کا ہوتا ہے  
 اور جی کاٹی کی ہوتی ہے۔ گرمی کا موسم دھنوں میں بسر کرتے ہیں جو کھانوں کو کسی کرتیا کر لیے جاتے ہیں  
 اور جاڑوں میں گھروں کے اندر رہتے ہیں جن کی ساخت حالات مقامی کا پتہ دیتی ہے یعنی یا تو پتھر اور گھاس  
 پھوس کے ہوتے ہیں یا پتھر اور ڈھون یا برکائی ہوئی لکڑیوں کے یا رخ کی اینٹوں کے جو تیل اور پس  
 ترکیب سے بن دی جاتی ہیں کہ ایک گندنا جو پتھر بن جاتا ہے۔ اسکیا قوم کا مذہب بت پرستی کی ایک شکل ہے۔  
 وہ ایک بہت بڑی ہستی عالیہ پر ایمان رکھتے ہیں جس کا نام اُن کی زبان میں ڈورنڈک ہے اس کے علاوہ وہ کئی  
 محافظ دیوتاؤں کے قائل ہیں جن کا نام اسکیائی اصطلاح میں توڑات ہے اُن کے اس سلسلہ رادوت میں  
 تیسرا درجہ بعض انسانوں کو حاصل ہے جو آٹھا کوٹ کہلاتے ہیں اور فوق القدر عقل و ثروت سے مستفید ہیں  
 اُن کا عالم عقیدتی پر بھی ایمان ہے یہ عالم اُن کے عقیدہ کی رو سے دو طبقوں میں منقسم ہے۔ فوقانی و تحتانی  
 طبقہ فوقانی گنگار اور بدست روجن کا ٹھکانا ہے جو ہمیشہ سردی سے ٹھنھرتی رہتی ہیں اور بھین کھانے کو کچھ  
 نہیں لیتا۔ طبقہ تحتانی کا موسم گرم ہے اور اُس میں غذا باخراط میسر آتی ہے۔ یہ طبقہ خوش نصیب روجن کا ممکن  
 ہے اسکیا متواضع خوش اخلاق ملن سارا درمہان نواز ہوتی ہیں۔ اور اُن کی خاندانی زندگی نہایت اچھی طرح سے  
 بسر ہوتی ہے۔ سادات جائدا کا اصول عام طور سے اُن میں رائج ہوا ایک جرگہ جو معاش پیدا کرتا ہے اُس میں  
 سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ موجودہ تمدن نے اُن کے حال پر انتہائی عنایت کی ہے کہ شرب اور دوسرے  
 فواحش کی معرفی اُن سے نہیں کرائی اور یہی وجہ ہے کہ اب تک یہ قوم بدستور قائم ہے دہ امریکہ اور آسٹریلیا  
 کی قدیم نسلوں کی طرح ان کا بھی کبھی کا صفایا ہو گیا ہوتا۔ مترجم۔

ہم اوپر کر آئے ہیں نہ ہی جب یورپ کا بہت بڑا حصہ برص کے اُن تودہ ہا۔۔۔ سے عظیم سے دھمک گیا تھا جو قطب شمالی سے کھسکتے ہوئے جنوبی ممالک کی طرف بڑھ آئے تھے اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے اُنتر کر میدانون میں چھا گئے تھے۔ حیوانات کی بے شمار انواع بربت اور بچ کے اس طوفان میں تباہ ہو گئیں لیکن انسان بچ رہا۔

قدیم وحشیانہ حالت میں جب کہ انسان بھل پھلا سی جنگل کی جڑی بوٹیوں اور گھونگھون پر زندگی بسر کرتا تھا۔۔۔ اسے ایک بات ایسی معلوم تھی جس کی وجہ سے کبھی نہ کبھی اُس کا تمدن و مہذب ہو جانا لازمی تھا یعنی اُسے آگ جلانی آتی تھی۔ سطح زمین کے بالائی پرت کے اُن شکلات میں جہاں سکود نے چریشیں متحجر کا پائیدہن نکلتا ہے ابھی تک انسان کے آثار پائے جاتے ہیں اور اُن کے اوزاروں سے اُس کا تاریخی زمانہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے۔ سطح زمین سے تھوڑی دور پر کالسنی کے اُس سے کچھ نیچے بڑی باسیلیک کے اس سے بھی نیچے ترشے ہوئے مچلا پتھر کے اور سب نیچے کھردرے ان گھڑ پتھر کے اوزار پائے جاتے ہیں۔ جن طبقات میں سے یہ اوزار برآمد ہو سکے ہیں اُن میں سے بعض کا زمانہ کسی طرح چابیس چاس ہزار سال سے کم نہیں ہے۔

فرانسیس اور دوسرے ممالک میں ماہرین جن طبقات الارض۔۔۔ نے جن غاروں کا معائنہ کیا ہے اُن میں سے زمانہ حجریت کے اوزار مثلاً گھماڑیان۔ چھریاں۔ برجھون اور تیروں کے پھل۔ رانیاں اور ہتھوڑے برآمد ہوئے ہیں۔ ان گھڑ پتھر کے زمانہ یعنی عہد حجریت قدیم کا تبدیل ہو کر ترشے ہوئے پتھر کے زمانہ یعنی عہد حجریت جدید میں نہم ہو جانا بہت ہی آہستگی کے ساتھ عمل میں آیا۔ یہ تبدیلی کتے کے پالے جانے کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوئی گویا یہ وہ دور تھا جب انسان نے خفاہی زندگی شروع کی یہ دور بھی ہزاروں ہی صدیوں تک رہا۔ تیروں کے پھلوں سے اس امر کی شہادت ہم پہنچتی ہے کہ انسان نے کمان ایجاد کر لی تھی اور دھنساہٹ زمانہ و بود سے ترقی کر کے معاصرانہ طریقہ زندگی اختیار کر لیا تھا۔ خادوار پیکانوں

سے ثابت ہوتا ہے کہ قوت ایجاد و روبہ ترقی تھی۔ ہڈی اور سنگ کی ٹکلی بھالیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے جانوروں کے علاوہ انسان چھوٹے جانوروں بلکہ شاید پرندوں کا بھی شکار کرنے لگ گیا تھا۔ ہڈی کی سیٹھوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اُس کے ساتھ دوسرے شکاری بھی ہوتے تھے یا کم از کم اُس کا کتا تو ضرور اُس کا رفیق ہوتا تھا۔ سنگ کی رانیوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے لباس کے لیے چمڑے کا استعمال کرنے لگ گیا تھا اور بھدے لٹچوں اور سوئیوں سے لباس کی سلائی کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ چمڑی ہوئی سپیوں سے جو چوڑیوں اور لالوں کے لیے کام میں لائی جاتی تھیں آرائش جسمانی کے مذاق کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ آلات رنگ سازی کا وجود تلوین و توخیم بن پر گواہ ہے۔ اور اعلیٰ مرتبہ کے ظاہر کرنے والے عصائدن کی تلوین و تنظیم کی علامات ہیں۔ ان قدیم انسانوں کی صنعت و دستکاری کا پہلا نمونہ ہمارے لیے نہایت ہی دلچسپی کا موجب ہے۔ مانتھی دانت کے ٹکڑوں اور ہڈی کی تختیوں پر انہوں نے اُن جانوروں کی بھدی تصویریں کھینچی ہیں جو اُن کے زمانہ میں موجود تھے۔ اسی طرح ان جانوروں کی صورتیں بھی اُن کی سنگ تراشی اور کندہ کاری کی ابتدائی کوشش کو ظاہر کرتی ہیں۔ زمانہ قبل تاریخ کی ان تصویروں میں جو بعض صورتوں میں اصلیت سے کچھ بہت زیادہ منسار نہیں ہیں۔ فیلاں شعری اور برستانی بارہ سنگوں کی لڑائی کا نظارہ دکھایا گیا ہے۔ ایک تصویر میں ایک آدمی چھلی کا شکار برچھے سے کر رہا ہے۔ ایک اور تصویر میں چند برہمنوں کو دکھائے گئے ہیں جو ہاتھ میں بھالے لیے شکار کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ فقط انسان ہی وہ حیوان ہے جو انکال خارجی کے امتیاز کی قابلیت رکھتا ہے اور آگ کا استعمال کر سکتا ہے۔

گھونگھوں کے ٹکڑوں میں جو ہڈیوں اور سپیوں سے مرکب ہیں اور جن میں سے بعض بہت بڑے بڑے اور ازمنہ نحاسیہ سے بھی پہلے کے ہیں اور پتھر کے اوزاروں سے

سمور ہین ہر جگہ آگ کے استعمال کے آنا۔ پائے جاتے ہین۔ یہ ٹیلے اکثر تو موجود ہوں۔  
 سے ملتی ہین لیکن بعض صورتوں میں سمندر کے ساحل سے چالینس چالینس بچاؤ پنچاؤ  
 میل اور خشکی میں بہت آئے ہین۔ ان کے اجزائے ترکیبی اور محل وقوع سے پایا جاتا  
 ہے کہ ان کا زمانہ دودھ پلانے والے معدوم چوپایوں سے بعد لیکن بالوجہ ان دنوں سے پہلے  
 کا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان ٹیلوں میں سے بعض کی عمر کسی طرح ایک لاکھ سال سے کم نہیں  
 سوئٹزر لینڈ کے آب و ہوا میں یعنی ان جھونپڑوں میں جو جھیل کے اندر لکڑی  
 کے موٹے موٹے لٹھے گاڑ کر درختوں کی پھینوں کے گونٹھوں سے بنائی جاتی تھیں کچھ اوزار  
 پائے گئے ہین جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جھونپڑیاں ازمنہ حجرہ میں بنی  
 شرف ہوئیں اور ازمنہ نحاسیہ تک قائم رہیں۔ ازمنہ نحاسیہ کے جو آثار موجود ہین ان سے  
 پایا جاتا ہے کہ انسان نے اس دور میں مزارعہ زندگی اختیار کر لی تھی۔

یہ سمجھنا چاہیے کہ علمائے طبقات الارض نے اپنی آسانی کے لیے انسان کے زمانہ  
 رتی تمدن کو جن ادوار میں تقسیم کر لیا ہے ان کا آغاز و انجام بغتہ ہوا اور بنی نوع انسان  
 کے کل افراد ہر دور کو ایک ساتھ ملے کہتے گئے۔ امریکہ کی خانہ بدوش وحشی اقوام ان  
 حجرہ کی وادی سے اب باہر نکل رہی ہین۔ بہت سے مقامات میں ابھی تک یہ لوگ ایسے  
 تیز روں سے مسلخ نظر آتے ہین جن کے پھل پتھر کے ہین۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ان میں  
 سے بعض نے گورے رنگ کی مہذب اقوام سے لوہے بدوق اور گھوڑے کا  
 استعمال سیکھا۔

غرض جس قدر تحقیقات اب تک ہوئی ہے اس سے یہ بات بلا امکان تردید ثابت  
 ہوتی ہے کہ انسان آج سے کئی لاکھ سال پہلے کرہ زمین پر آباد تھا۔ محض نہ رہے کہ اس  
 تحقیقات کو کچھ بہت عرصہ نہیں گزرا اور جغرافیائی حدود کے لحاظ سے بھی اس کا دائرہ  
 عمل بہت تنگ ہے۔ ان مقامات میں ابھی تک کوئی انکشاف نہیں کیا گیا جن کی

نسبت عقل سلیم کو اسی دیتی ہے کہ انسان اولین کامسکن یہ نہیں ہوگا۔

اس طور پر ہم چھ ہزار سال کی اُس مدت سے جو باور یون کا مبلغ تاریخ ہے قرونِ اولیٰ سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ دورِ زمہریر یہ جدید یعنی یورپ کی گزشتہ تیسویں صدی کا زمانہ کسی طرح ڈالائی لاکھ سال سے کم نہیں ٹھہر سکتا اور انسان کا اس زمانہ سے بھی پہلے دنیا میں موجود ہونا ثابت ہو گیا لیکن ایک غلطی ہی عظیم انسان حقیقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے بلکہ ہم کو اس واقعہ کا بھی حواہی بخو اہی اعتراضات کرنا پڑتا ہے کہ انسان سے بھی پہلے حیوانی زندگی موجود تھی اور ہر جسمِ ذوی الحیا نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ ارتقاء پذیر ہوا۔

ایک طرف تو روایت کو اصرار ہے کہ ہمارے جدِ امجد بابرؑ عدن میں جامعہ اکیلیت زیب تن کیے ہوئے فردوس کی لذتوں سے بہرہ اندوز تھے اور دوسری طرف روایت علیؑ رُوس الاشہاد انسانِ اولین کی بے بسی اور بے کسی اور وحشیانہ حالت کا ثبوت دے رہی ہے۔

بہین تفادیت رہ از کجاست تابجا

روایت کے اس ادعا نے مسئلہ بہو ط آدم کو جو چرکا لگایا ہے اس سے ممکن نہیں کہ وہ جانبر ہو سکے۔

ہم نے اس فصل کے مومنوع کو بیراہہ ترتیب تاریخی سے اس لیے غاری کر دیا ہے کہ مسئلہ ماہیتِ عالم کے متعلق جو کچھ ہمیں کہنا تھا اُس کے مالد و علیہ سے ہمیں مختلف مقامات بحث نہ کرنی پڑے۔ ورنہ مسئلہ عمر زمین مسئلہ معیارِ حق و صدق سے مدتوں بعد چھڑا یعنی ”رفا مین“ (اصلاح گینہ) کے بعد اس مسئلہ پر بحث ہونی کہ حق کی ماہیت کیا ہے بلکہ ہمیں یون کہنا چاہیے کہ یہ بحث انیسویں صدی تک چھڑی رہی۔ اس بحث میں فریقین نے غیر معمولی اعتدال سے کام لیا چنانچہ اس پر بجائے متنازعہ کے مناظرہ کا لفظ زیادہ موزوں طور پر صادق آتا ہے علمِ ہیئت کی مخالفت جس معاندانہ و منتقہانہ شان کے ساتھ کی گئی تھی علمِ طبقات الارض کو اُس سے سابقہ نہیں پڑا اور اگرچہ علماء طبقات الارض نے کرہ زمین کی بے انتہا قدامت

کے تسلیم کیے جانے پر زور دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ جن اعداد کے ذریعہ سے عمر زمین کا اندازہ قائم کیا گیا ہے وہ ناقابل اعتبار ہیں۔ جن ناظرین نے اس فصل کو توجہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے ان اعداد کے عدم تصابقت کو نظر انداز نہ کیا ہو گا۔ جن کا حوالہ جا بجا دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اعداد دقیق و محکم و عاری ہیں لیکن اس دعوے کی تائید ان سے پھر بھی بخوبی ہوتی ہے کہ زمین نہایت قدیم ہے اور ان کی بنیاد ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عالم کا پیمانہ زمان اس کے پیمانہ مسکان کا جواب ہے۔



# آٹھواں باب

## نزاع در بارہ معیار حق

فلسفہ قدیمہ کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کے پاس احقاق حق کا کوئی ذریعہ نہیں۔  
قدیم ہیمن میں عقاید کے اختلافات۔ کلیسائی کونسلین میں اختلافات۔ کسے شائستگی کی فرسودہ  
کوششیں کرتی ہیں۔ محبت مجنوںہ محبت ابتلا کی ترویج۔

پاپا سے روم طریقہ اعتراض ستری کو جاری کرتا ہے اور محکمہ احتساب عقاید کو پناہ آگاہ اقتدار بخلا  
اور اختلافات عقاید کے رفع کرنے کے۔ یہی حقیقتہً مفاد پر اثر آتا ہے۔

تیسرے جیسٹین کے مجملۃ الفوائد میں کی دریافت اور قانون دینہ کے نشوونما کا اثر نوعیت پر دست  
شہادت پر۔ قانون شہادت میں روایت کی شان نمودار ہونے لگتی ہے۔

اصلاح کنیہ کی بدولت ہر انسان کو اپنی عقل اور سمجھ کے لحاظ سے رائے قائم کرنے کا حق  
حاصل ہو جاتا ہے۔ کلیسائی رومن کیتھولک دعویٰ کرتا ہے کہ حق و صدق کا معیار خود کلیسا ہے۔  
فہرست کتب محرمہ کے اجراء سے وہ کتابوں کے مطالعہ کی ممانعت کرتا ہے اور حکم امتناعی کی  
خلاف ورزی کرنے والوں کا قلع و قمع سینٹ بریٹھام لایو کے قتل عام کے سے ذرا آج  
کرتا ہے۔

پرائسٹ مذہب نورات کو معیار حق تسلیم کرتا ہے بڑا ذات کی موافقت پر ختم ہوتا ہے  
سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محرم ہے۔

سائنس کی رو سے معیار حق انکشافات فطرت میں پرائسٹ کے نزدیک یہ معیار کتب  
مقدسہ میں موجود ہے اور رومن کیتھولک کی رائے میں پاپا سے معلوم اس کا مورد وہی ہے۔



ایک موقع پر جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے صنعتِ تاریخ پر بوجھ جلی کھے جانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ وہ کے ایک گورنر نے بیتاب ہو کر یہ سوال کیا کہ حق کسے کہتے ہیں۔ لیکن اُس الٰہیت ناب شمع نے جو گورنر کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور جس سے یہ استفسار کیا گیا تھا جواب میں کچھ نہ کہا۔ شاید غمخونی ہی اس سوال کا بہترین جواب تھی۔

یہ سوال بارہا پہلے بھی کیا گیا تھا لیکن بے فائدہ اور آج تک اس کا اعادہ وہ رہ کر مہر ہا ہے مگر بے سود۔ کسی شخص سے اس کا شافی جواب آج تک بن نہیں پڑا۔

جبہ افقِ یونان پر صبحِ علوم و فنون کی روشنی نمودار ہوئی اور قدیم مذہب کی ظلمت کا نور ہونے لگی۔ تو اس ملک کے متقی و پرمہنر گار اور فطین و فہیم شخصِ دماغی یاس کی حالت میں مبتلا ہو گئے۔ انکسٹورٹ فرط حسرت و تاسف سے کہتا ہے:۔ کوئی چیز معلوم نہیں ہوئی کسی حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اُٹھ سکتا۔ کوئی امر یقینی نہیں ہو سکتا۔ تو اسے حسیہ محدودِ ذہن تو اسے عقلمندِ کرور ہیں۔ حیات مستعارِ قلیل ہے۔ "زوفونیز کا دعویٰ ہے کہ ناممکن ہے کہ ہم حق بات کو بھی یقینی تصور کریں۔ بار میناٹڈز کا قول ہے کہ انسان کی دماغی ساخت ہی ایسی نہیں ہے کہ وہ حق مطلق کی تحقیق کر سکے۔ اسپڈاکلیز کی رائے ہے کہ معزور ہے کہ کل فلسفہ اور مذاہب ناقابلِ اعتبار ہوں اس لیے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی معیار

نہیں جس سے ہم ان کو جانچ سکیں۔ دسی مفرطیس کا بیان ہے کہ حقایق بھی ہمارے ذہن میں یقین کا اٹھانہیں کر سکتے۔ انسانی تحقیقات کا انتہائی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان علمِ مطلق کو دستِ شناس ہونے کی قابلیت نہیں رکھتا اور اگر حقیقت اُسکی ٹمھی میں بھی ہوتا ہم اُسکو اس کی موثوقیت پر یقین نہیں ہو سکتا۔ فیروزہ میں یہ علاج دیتا ہے کہ چونکہ ہمارے پاس حق و باطل کا کوئی معیار نہیں ہے اس لیے ہم ہر شے کی نسبت اظہارِ رائے میں تامل کرنا چاہیے۔

اس فیلسوف نے اپنے شاگردوں کو تشکک کی اس حد تک تلقین کی تھی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے بلکہ یہ دعویٰ بھی نہیں کرتے کہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ یہ کیوں

نے اپنے شاگردوں کو یہ سبق دیا تھا کہ حق کی تکشیف ہرگز عقل کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی۔  
 آرسیمیلیس کو معلومات حسیہ و عقلیہ دونوں سے انکار تھا اور اُس نے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ  
 ایسے کسی شے کا علم نہیں یہاں تک کہ اپنی لاعلمی کا بھی علم نہیں۔ غرض جس علم نتیجہ پر فلسفہ یونان  
 پہنچا تھا وہ یہ تھا کہ چونکہ جو اس کی غبادت نقطہ اتصال نقیضین ہے لہذا ہم حق و باطل میں تمیز  
 نہیں کر سکتے اور عقل اس درجہ ناقص ہے کہ ہم کسی فلسفیانہ نتیجہ کی صحت کے فحاش نہیں ہو سکتے  
 قیاس چاہتا ہے کہ ایسے موقع پر ایک ایسا مدلل و مبہر منہجیہ آسمانی منجانب اللہ انسان پر نازل  
 ہو کہ شک و شبہ کا خاتمہ ہو جائے اور کشتی شخص کو اُس سے یا اسے اختلاف و مقاومت نہ ہو۔  
 یونان کے ایک فلسفی نے جس کی مایوسی اپنے ہمصحفروں کی بہ نسبت ذرا کم تھی ایک دفعہ یہ کہنے  
 کی جرأت کی تھی کہ دو مختلف الاشکال مذاہب کا ایک ساتھ موجود ہونا اور طہم من اللہی کا دعویٰ  
 کرنا دو وزن کے بطلان پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادنیٰ دمری اشیاء تک کی  
 نسبت انسان ایک رائے بمشکل قائم کر سکتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ ایک ہی پہلو سے ان اشیاء کو نہ دیکھو  
 پھر مابعد الطبیعیات کا ٹھکانا ہی کیا! حضرت مسیح کے ظہور سے تین سو سال پہلے اگر فلسفہ  
 اختلاف و ارتباب کی جولان گاہ تھا تو آپ کی وفات کے تین سو سال بعد مذہب بھی اسی  
 شش و پنج میں مبتلا تھا۔ بانی شیر ذکا اسقف ہلاری اپنے مشہور و معروف مضمون میں جو  
 اُس فرناںیسم کی کونسل کے انعقاد کے وقت لکھا تھا ایک مقام پر کہتا ہے:-

”یہ واقعہ جس قدر افسوس ناک ہے اُسی قدر خطرناک بھی ہے کہ لوگوں کی جتنی راہیں ہیں  
 اُن سے ہی مذاہب ہیں۔ جتنی خواہشیں ہیں اتنے ہی عقاید ہیں اور جس نسبت سے اُن میں  
 عیوب پائے جاتے ہیں اُسی نسبت سے اُن کے اسباب کفر و الحاد کا شمار ہو سکتا ہے۔ اس کی  
 وجہ یہ ہے کہ ہم نے عقاید قائم کر لیتے ہیں۔ اور جو جی میں آتا ہے ان کی تاویل کر دیتے  
 ہیں۔ ان دیکھے اور ان بوجھے اسرار و رموز کی تاویل و تفسیر کے لیے ہم آئے دن نئے مذاہب  
 تراشا کرتے ہیں۔ ہم اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔ پچھانے والوں کی حمایت کرتے ہیں

جن کی حمایت کرتے ہیں انہیں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ دوسروں کے عقاید کا باوجود ان عقائد کے پیرو ہونے کے ابطال کرتے ہیں اور اپنے عقاید کو بھی باوجود یکہ دوسرے لوگ ان کے پیرو ہیں جو ملنا قرار دینے ہیں۔ غرض اسی طرح باہم دست درگربان ہو کر ہم آپس میں ایک دوسرے کی تخریب و تباہی کا باعث ہو رہے ہیں۔

یہ محض لفظ ہی لفظ نہیں ہیں، بلکہ اس خود لامتی سے بوسے حقیقت آتی ہے اور وہ شخص جو اس زمانہ کی کلیسا کی تاریخ سے واقف ہیں اس کا مفہوم پوری طرح سے سمجھ سکتے ہیں جو دو کرم اور خیر و برکت کے مسلک ہونے کے لحاظ سے جب مسیحیت کا پہلا جوش فرو ہو گیا تو نزاع وفاق نے اپنا جھنڈا آگاہ کیا۔ تیسری صدی میں یونین کا بیان ہے کہ دوسری صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ ایمان و عقل مذہب و فلسفہ اتفاق و قنطرت میں جنگ چھڑ گئی۔ ان اختلافات و تنازعات کے اندفاع اور امتحان حق کی غرض سے مجالس مشاورت کا انعقاد ہونے لگا جنہوں نے بالآخر مجالس عمومیہ کی شکل اختیار کر لی۔ ایک عرصہ دراز تک ان مجالس کے اقتدارات مشورہ دہی کی حد تک آگے نہ بڑھنے پائے۔ لیکن جب چوتھی صدی میں مسیحیت منہ نہنشا ہی پر جلوہ افروز ہوئی تو ان مجالس کے احکام کی تعمیل لازمی ہو گئی اور احکام کا نفاذ بزرگوں کو مست ہونے لگا۔ اس واقعہ نے کلیسا کی سکایا ہی پلٹ دی۔ مجالس عمومیہ یعنی مسیحیت کی پارلیمنٹیں جن میں دنیا بھر کے گرجاؤں کے عہدہ دار بطور ارکان شریک ہوتے تھے شہنشاہ کے حکم سے منعقد ہوتی تھیں۔ وہ اصالتاً برائے نام ان مجالس کی خدمت و صدارت انجام دیتا تھا۔ اور امور مابہ النزاع کا تصفیہ کرتا تھا۔ گویا وہ مسیحی دنیا کا باپا ہوتا تھا۔ شیم سورج جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے اس زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ تیسری صدی میں ہونے پر جابلون اور عامیون کے امور ہونے کو کوئی چیز مانع نہ آ سکتی تھی۔ وحشی اور بے علم جماعت جو علم و فضل کو عموماً اور فلسفہ کو خصوصاً دشمن مذہب و اتفاق خیال کرتی تھی بڑھتی جاتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ناسیاء کی کونسل یعنی مجلس

عمومی میں جہالت اور بڑی بلی خیالات کی جو شان علی الخصوص اُن بزرگواروں کی تفسیر اور دلائل میں پائی جاتی ہے جنہوں نے اس کونسل کے فیصلہ کو نہ نظر استحسان دیکھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ باوجود اُس وسیع اثر کے جو اس کونسل نے مسیحی دنیا پر ڈالا ہے تبصرہ نگاران عہد قدیم کو نہ تو اس بارے میں اتفاق ہے کہ اس کونسل کا انعقاد کب اور کس مقام پر ہوا اور نہ یہی ٹھیک معلوم ہے کہ اس کے ارکان کی تعداد کس قدر تھی اور صدر نشین کونسل کو بنا باطن تھا اس کے مشہور و معروف فیصلہ جات کو سپرد قلم کرنے کی زحمت تک گوارا نہ کی گئی۔ یا اگر کی بھی گئی ہو تو وہ وہ یاد۔ یہ ضبط تحریر ہم تک نہیں پہنچی۔ زمانہ حال کے مدبرین کی اصطلاح میں کلیسا نے اس زمانہ میں جس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ”ریاستہائے جمہوری متحدہ“ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کونسل کے فیصلہ کا انحصار کثرت رائے پر ہوتا تھا۔ اور اس کے لیے ہر طرح کی سازشیں اور افتراء پروردانِ اُپان اور دغا بازیانِ علی میں لائی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ دہار شاہی کی خواتین کے دسوخ بلکہ ارتشابلکہ دھینگا مشتی تک سے کام لیا جاتا تھا۔ نایب الی کونسل کو چیز اتوائین پڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اُن سب لوگوں نے جنہیں کسی کی رود رعایت مد نظر نہ تھی بالاتفاق یہی رائے قائم کی کہ مذہبی معاملات میں معیار حق و صدق قائم کرنا اس قسم کی مجنون کے بس کا روگ نہیں۔ فریق مغلوب کو کوئی حق ایسا حاصل نہ تھا جس کا فریق غالب کو پاس ہو۔ بہت سے نیک نفس اور راست کردار اشخاص نے جب یہ عذر پیش کیا کہ ایسی کثرت رائے جس میں ان وکلا کی آراء کا عنصر غالب شریک ہو جن کا حق رائے دہندگی مسلم نہ ہو کسی طرح حق و باطل کا ذریعہ تعین نہیں ہو سکتا تو اُن کے عذر کو بمقارنتِ نظر انداز کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کونسل پر کوئی مسلح منعقد ہو نہ لگی جن کے متباہن اور متناقض فیصلوں کو مسیحی دنیا کو حیران و پریشان کر دیا۔ ایک نقطہ جو تھی ہر صدی میں تیرہ کونسلین آئیرلینڈ کے مخالف پنڈتوں کو کونسلین اُس کے موافق اور سترہ کونسلین اُن لوگوں کی تائید میں منعقد ہوئیں جن کے عقائد آئیرلینڈ سے فٹے جلتے تھے۔

گو یا کل پینٹا لیس کونسلوں کا انعقاد اس ایک مسئلہ کے تصفیہ کی غرض سے ہوا۔ ان کونسلوں کے اراکین کے طرز عمل پر یہ واقعہ روشنی ڈالتا ہے کہ جس قوت کا فریق غالب نے جیسا استعمال کیا تھا اسی سے ذلیق مغلوب بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا تھا۔

جس موخ کی بے تصبیانہ تحریر سے ہم نے اوپر اتفاق کیا ہے اُسی کا یہ بھی بیان ہے کہ چوتھی صدی میں عیسائی دہلا کی سنگین غلطیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اول یہ کہ دہوکا دینا اور جھوٹ بولنا داخل حسنات ہے بشرطیکہ اس سے کلیسا کی اغراض کو کوئی فائدہ پہنچے دوم یہ کہ اگر کافی سرزنش اور زجر و توبیخ کے بعد بھی کوئی شخص اپنی مذہبی لغزشوں پر اڑا رہے تو وہ مستوجب سزا کئے قانونی و عقوبت جسمانی ہے۔

جب ہم اُن امور پر جنہیں عوام اُس زمانہ میں معیار حق سمجھتے تھے نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بالخصوص تعجب ہوتا ہے۔ کسی مسئلہ کی حقیقت کی سب سے بڑی دلیل اُن شہد کی تعداد ہوتی تھی جنہوں نے اسے سچ مانا ہو یا وہ معجزے یا کرامتیں اُسکی صحت پر گواہ ہوتی تھیں جو اُس کی تائید میں پیش کی جا سکیں یا اوداع غیبیہ یا سحائین یا اشخاص آسیب زدہ کا اقبال اُس کی سچائی کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سینٹ امبروز کو جب کبھی پیر دان آیرئیس سے مناظرہ کا اتفاق ہوا تو ان بزرگوار نے جھٹ سے آسیب زدہ اشخاص کو پیش فرما دیا۔ جنہوں نے بعض مسیحی شہدائے تبرکات کی صورت دیکھتے ہی یہ پکارنا شروع کیا کہ نائسیا کی کونسل کا مسئلہ اتنیم ثلثہ برحق ہے۔ لیکن پیر دان آیرئیس بھی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے۔ اُنہوں نے سینٹ امبروز پر یہ الزام لگایا کہ اُس نے ان خبیث گواہوں کو بہت بڑی رشوت دے کر جھوٹی شہادت دینے پر آمادہ کیا ہے۔ وہ عدالتین بھی اس زمانہ میں قائم ہو چلی تھیں جن میں ابتلا کا طریقہ جاری کیا گیا تھا۔ یعنی ملازم کے خطا دار یا بے خطا ہونے کا فیصلہ اُسے انواع و اقسام کی جسمانی آزمائشوں میں ڈال کر نتیجہ کے لحاظ سے منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا۔ چھ صدی تک یہ عدالتیں ملازم کی گنہگاری یا بے گناہی کا ثبوت آب سرد۔ مبارزت۔ جلتی آگ اور صلیب کے گونا گوں ذرائع تحقیقات سے دیتی

ہین -

شہادت کی ماہیت اور اُس کے قوانین کے متعلق اس جہالت اور لاعلمی کی بھی کوئی حد ہے  
 لازم پانی کے طالب میں بھینک دیا جاتا ہے اور وہ یا تو ڈوب جاتا ہے یا تیرنے لگتا ہے۔ اُس کے  
 ہاتھ میں سرخ چلتی ہوئی کوہرے کی ایک سلاخ تھادی جاتی ہے جس سے وہ یا تو جل جاتا ہے یا  
 بچ رہتا ہے۔ جس مبارک کو اُس نے اجرت دے کر اپنی طرف سے لڑنے کے لئے منتخب کیا ہے وہ یا تو  
 مغلوب ہو جاتا ہے یا غالب آتا ہے وہ اپنے بازوؤں کو صلیب کی شکل میں اُس شخص کی بہ نسبت جس نے  
 اُس پر لازم لگایا ہے کم دیر تک پھیلانے ہوئے رکھ سکتا ہے یا زیادہ دیر تک۔ لیکن انہیں  
 آزمائشوں کے نتائج کے لحاظ سے کسی علت منسوبہ کے متعلق اُس کی قصور داری یا بے قصوری  
 مسلم قرار پاتی ہے۔ کیا یہی طریقے معیار حق و راستی ہو سکتے ہیں ؟

ایسی حالت میں مقام تعجب نہیں کہ یورپ میں صد سال تک جمہور کی اکثریتوں کا بازار گرم رہا  
 اور یہ وہ کرامات ہیں جو انسان کی عقل و تمیز کے لیے باعث ننگ و عار ہیں۔

لیکن وہ دن جو نہ مل سکتا تھا آخر آج پہنچا۔ وہ ادعا اور وہ عقاید جو اس قسم کی نامعقول شہادت پر  
 مبنی تھے اُس بے اعتباری کی خاک میں مل گئے جس کا پیوند خود یہ شہادت ہو چکی تھی۔ جب  
 تیرہویں صدی شروع ہوئی تو چاروں طرف تشکک اور بد اعتقادی کی ہوا چلنے لگی۔ اول اس  
 بد اعتقادی سے پادریوں کا طبقہ متاثر ہوا اور اس کے بعد یہ بد اعتقاد تمام عوام الناس میں پھیل  
 گئی۔ پادریوں نے اپنے تشکک کی بھڑاس ”انجیل لازوال“ کی سی کتابیں تصنیف کر کو نکالی  
 اور عوام الناس ”کیتھرٹ“ ”دکٹنسین“ اور ”پٹرورشسن“ کے سے فرقوں میں متفرع  
 ہو گئے۔ ان سب کو اس امر میں اتفاق تھا کہ مذہب مسلمہ و مردہ اخلاط و اداہام کا ایک مجموعہ  
 بے ربط ہے۔ پاپا نے عیسائیوں پر جو جبری حکومت قائم رکھی ہے وہ ناجائز اور ظالمانہ ہے  
 اور روماکا یہ دعویٰ کہ پاپا سے روم دنیا کا حکم اٹھا سکتا ہے اور کسی بادشاہ یا قیس یا دینی ڈیوی  
 حکمران کو کوئی جائز مذہبی یا سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ وہ پاپا ہی کا عطا کیا ہوا نہ ہو

بالکل بے بنیاد اور حقوق انسان کے لیے ہمنٹرل خاصانہ دستبرد کے ہے۔

بیدینی کے اس سیلاب کی روک تھام کے لیے پاپے روما کی حکومت نے دو محکمے قائم کیے۔ (۱) ”انکوئٹریشن“ یعنی محکمہ احتساب عقاید اور (۲) محکمہ اعتراف سہری ثانی الذکر تفتیش اور سراغ برآری کا ذلیعہ تھا اور اول الذکر سزا دہی کا۔

عام الفاظ میں ”انکوئٹریشن“ کا مقصد یہ تھا کہ تحویف و ترہیب کے ذریعہ سے مذہبی اختلافات کا استیصال کیا جائے اور بدعت زندقہ کو نہایت خوفناک سزاؤں کے تصور سے وابستہ کر دیا جائے۔ اس کے یہ معنی تھے کہ ”ادبائے انکوئٹریشن“ ہی کو بدعت زندقہ کی تعریف و تسمین کا اختیار حاصل ہو۔ اس طور پر معیار حق محکمہ ”انکوئٹریشن“ کے ہاتھ آگیا اور پاپا کی طرف سے یہ محکمہ مجاز کیا گیا کہ ”ان کا واحد و زندہ حق نسبت بعد سراغ برآری تجویز مناسب صادر کرے جو مشہور مکاتون و خانوں جو گلوں غاروں اور کھیتوں میں چھپے ہوئے ہوں۔“

اغراض مذہبی کے تحفظ کی اس خدمت کی انجام دہی میں اس محکمہ نے ایسی وحشیانہ مستعدی ظاہر کی کہ ۱۶۷۷ء سے لیکر ۱۷۸۸ء تک اس نے تین لاکھ چالیس ہزار اشخاص کو مختلف سزائیں دیں اور اشخاص سزایاب میں سے تقریباً تیس ہزار نفوس زندہ جلا دئے گئے اول ادل جب جان فدا یق کو اس کی دشمنانہ سزاؤں کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کی جرأت اور مجال نہ تھی تو بسا اوقات ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ آمر اہل قلم قسٹیس راتب اور ہر طبقہ کے عوام الناس الزام عاید ہوتے ہی بلا اس کے کہ انہیں پیل کا موقع دیا جائے اسی دن مار ڈالے جاتے تھے۔

زباب فکر و دانش کی جدہر نظر پڑتی تھی انہیں بھیانک اور ڈراؤنی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کوئی شخص بلا خوف سزایابی آزادانہ اس کے اظہار پر قادر نہ تھا۔ ”انکوئٹریشن“ کا طرز عمل ایسا خوفناک اور مہیب تھا کہ پگلیاں لیسائی کا یہ فقرہ ہزار ہا نفوس کی صدے باز گشت بن گیا تھا۔ مد ممکن نہیں کہ کوئی شخص سچی ہوا و اطمینان سے اپنی موت مرے۔“

”انکوئٹریشن“ نے جنوبی فرانس کے عیسائی فرقوں کا تیرہویں ہی صدی میں خاتمہ کر دیا۔

تھا۔ اس کی غلا ارانہ سفاکی نے اٹلی اور اسپین میں پراٹھنٹ مذہب کو بیچ دین سے اکھاڑ پھینکا۔ مذہبی امور کے علاوہ اس نے پولیٹیکل شورش کے فرو کرنے کی خدمت بھی خود ہی انجام دینی شروع کی۔ نکوٹس امپیرک جو حکومت آیریگان کا پچاس سال تک صدر محاسب رہا اور جس کا انتقال ۱۳۹۹ء میں ہوا۔ اپنی کتاب "رویداد" محکمہ احتساب عقاید" میں اس محکمہ کے ہیبت انگیز اور کھلیا دینے والے مظالم کی داستان قلم بند کر گیا ہے۔

یہ محکمہ جو سمیت بلکہ بنی نوع انسان کے لئے موجب ننگ و جار ہے۔ مختلف ممالک میں مختلف جیتون سے قائم تھا یا ہے۔ روانے اس کے جا رہا ہے اور مطلق العنان اختیار قائم رکھ کر بالآخر قدیم قیسی محکمہ جات، احتساب کو موقوف کر دیا۔ اور وہ اختیارات جو ہر اسقف کو بزبان سابق اس بارہ میں حاصل تھے چھین کر اپنے اقتدار میں ضم کر لیے۔ اس طرح محکمہ انکوئزیشن "براہ راست پاپا کی ماتحتی میں آ گیا اور پاپا ہی کے کارندے اور گماشتے اسکو چلانے لگے۔

چوتھی ٹرن کونسل (۱۵۴۵ء) کے فیصلہ نے "انکوئزیشن" کے اقتدار میں ایک خونخوار اضافہ کر دیا یعنی یہ بات ہر شخص کے فرائض میں باضابطہ طور پر داخل کر دی گئی کہ اپنے حلقہ کے پادری کے سامنے اپنے تمام افعال و اعمال کا اعتراف کیا کرے۔ اس کا نام طریقہ اعتراف ستری ہے۔ اس طریقہ کی بدولت جس حد تک کہ خانگی زندگی کو تعلق تھا محکمہ "انکوئزیشن" ہمہ بین دہمہ دان ہو گیا کوئی شخص اپنے آپ کو مامون و مضمون نہ تصور کر سکتا تھا۔ حلقہ کے پادری کو یہ قدرت حاصل تھی کہ اُس کی بی بی یا ملازمین کے خفیہ سے خفیہ اور پوشیدہ سے پوشیدہ دلی راز بـطریقہ جرج یا برسپیل جبر دریافت کرے اور اس لحاظ سے بی بی اپنے خاوند اور نوکر اپنے آقا کے گویا جاسوس بنادئے گئے تھے۔ اس خونخوار عدالت کے سامنے وہ بکربلایا جاتا تھا اور اُس سے صرف اسی قدر کہا جاتا تھا کہ کلیسا کو کہا ہے عقاید نہایت مشتبہ معلوم ہوتے ہیں۔ کسی الزام لگانے والے کا نام لازم کو نہیں بتایا جاتا تھا۔



بلکہ یہ کی انگوٹھے کو بچھی کرنے والے پیچ۔ بدن کو تاشنے والے رستے۔ پاؤں کی ہڈیوں کو چوراچورا کرنے والے بوٹ۔ انگلیوں کو توڑنے والے فانے اور دوسرے عقوبت آفرین شکنجون سے بہت جلد پوری کردی جاتی تھی اور خواہ وہ معصوم ہوتا تھا خواہ غافل ہر حالت میں اُسے جرم کا اعتراف کرتے ہی منتی تھی۔

لیکن باوجود ان تمام اقتدارات کے ”انگوٹیزیشن“ کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب ملاحظہ و زنادقہ اس کی تاب نہ لاسکتے تھے تو اس سے بچنے کے لیے سوسو طرح کے چیلے نکالتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تشنگ اور بد اعتقادی کا تمام یورپ میں چپکے چپکے عمل دخل ہو گیا۔ لوگ ذات باری تعالیٰ، بقائے روح انسانی اور اختیار ارادہ بشری کے منکر ہو گئے اور یہ سمجھنے لگے کہ انسان جبر مطلق کی مدافعت نہیں کر سکتا اور اُن مقدرات سے جن کا دل بادل اُسکے چاروں طرف چھایا ہوا ہے کسی طرح گریز نہیں۔ اس قسم کے خیالات غمو منی کے ساتھ اُن ہزاردن لاکھوں آدمیوں کے دلوں میں گھر کر گئے جو تیسیت کے مظالم سے تنگ آکر مجبور تھے کہ اس مایوسانہ تخیل کی آڑ میں پناہ لیں۔ وہ ولد نسیر ہنوتہ کے پیرو باوجود اُن انواع و اقسام کی سختیوں کے جو ان کی بیچ کنی کے لیے عمل میں لائی گئیں اس خیال کی اشاعت میں کامیاب ہو کر رہے کہ کلیسا سے روم قسطنطین کے عہد کی پاکیزگی اور تقدس سے کوسوں دور جا پڑا ہے۔ انہوں نے تذکرہ غفران کی فروخت کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی اور یہ ظاہر کیا کہ اس فیہ مغفرت نے دعا روزہ اور خیرات کا تقریباً خاتمہ کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ مرے ہوؤں کی روحوں کے لیے دعائے مغفرت کرنا ایک فعل عبث ہے اس لیے کہ وہ بہشت و دوزخ میں پہلے ہی داخل ہو چکے ہوں گے۔ اگرچہ جام طور سے سمجھا جاتا تھا کہ فلسفہ یا سائنس سچیت یعنی انتہائے خالص کی اغراض کے منافی ہے پھر بھی اسلامی تصانیف جو اُس زمانہ میں اندلس میں رائج تھیں ہر طبقہ کے لوگوں کے عقاید پر اپنا زبردست اثر ڈال رہی تھیں۔ یہ اثرات

ہم کو اُن فرقوں میں صاف صاف نظر آتے ہیں جو اس زمانہ میں قائم ہو چکے تھے چنانچہ فرقہ  
 "ابن ابی بنات حریف" کا یہ عقیدہ تھا کہ "کائنات کا خروج ذات باری تعالیٰ سے ہوا ہے اور  
 بالآخر اسی ذات میں اس کا انضمام ہو جائے گا۔ نفوس مطلقہ انسانی جناب باری کے اجزا  
 ہیں اور کائنات ہی بحیثیت مجموعی خدا ہے۔ یہ وہ خیالات ہیں جو بجز ترقی یافتہ دماغوں کے  
 اور کہیں نہیں سما سکتے۔ اس فرقہ کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ ان میں سے اکثر خوشی خوشی  
 "انکوئٹریشن" کی آگ میں جل گئے مگر زبان پر آت اور ماتھے پر بل تک نہ لائے پار یون نے  
 ازراہ عناد اس فرقہ پر یہ الزام لگا کر اپنا جی ٹھنڈا کر لیا کہ آدھی رات کے وقت اس فرقہ کی عورتیں  
 اور مرد بربہ نہ ہو کر تاریک کمرؤں میں جاتے ہیں اور دہان حطافنہانی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں  
 اسی قسم کا الزام جیسا کہ ہمیں اچھی طرح سے معلوم ہے روم کی رنگین مزاج سوسائٹی نے قدیم  
 مسیحیوں پر بھی لگایا تھا۔

ابن رشد کے فلسفہ کا افران فرقوں میں سے اکثر کے عقاید میں صاف نظر آتا تھا۔ سچی  
 نقطہ بخیال سے اس اسلامی مسلک کا لازمی نتیجہ یہ زندیقانہ عقیدہ تھا کہ ارکانِ مسیحیت کا حاصل  
 بحر لکے اور کچھ نہیں کہ روح انسانی ذات باری تعالیٰ میں داخل ہو جائے۔ خدا اور کائنات  
 کو آپس میں وہی تعلق ہے جو روح کو جسم کے ساتھ ہے۔ صرف ایک عقل واحد منفرد کا عالم  
 میں وجود ہے اور بنی نوع انسان کی روحانی و عقلی استعداد کی ذمہ دار ایک ہی روح ہے جب  
 اصلاحِ کینیڈہ کا زمانہ قریب آیا اور "انکوئٹریشن" کے مصیطروں نے ابن رشد کے اطالوی پیرو  
 کے عقاید کی تفتیش شروع کی تو ادھونوں نے یہ تابع کرنا چاہا کہ فلسفیانہ اور مذہبی حقیقت میں  
 ایک بون بید ہے۔ ممکن ہے کہ ایک بات از روئے فلسفہ برحق ہو لیکن از روئے مذہب باطل  
 ہو۔ یہ وہ تبریری جملہ تھا جسے "ایئرٹن کونسل" نے پاپے لیو دہم کے زمانہ میں ناجائز قرار دیا۔  
 لیکن باوجود اعتراضاتِ مسری و احتسابِ عقاید کے یہ بدعتیانہ رجحان بدستور قائم رہے  
 اس تولی کی صداقت میں شک نہیں کہ اصلاحِ کینیڈہ کے وقت یورپ کے مختلف مقامات

میں ایسے بہت سے لوگ چھپے ہوئے تھے جنہیں مسیحیت سے قلبی عداوت تھی ان خانہ  
برائے اذان مذہب میں پاپوشیٹس کی طرح اکثر تو پیروان ارسطو تھے۔ باؤن ریمیلس اور  
ماتین کے مانند بہت سے فلاسفہ اور بزرگ سچ نکلتے دان تھے اور لیو دہم جیو اور برولڈ کے  
مثل بہت سے آزاد خیال اطالوی تھے۔

کراتی شہادت گیا رہوین اور بارہوین صدی میں پائے اعتبار سے ساقط ہو چلی۔ اندکس  
کے سلمان فلاسفہ کے مطاعن و مضاحک سے متاثر ہو کر بہت سے روشن خیال پادری  
قابل ہو گئے کہ اس قسم کی شہادت کی حقیقت ایک خیالی ڈیکر سٹل سے زیادہ نہیں۔ سٹالے  
میں، مقام اعلیٰ جیسٹینین کے مجملۃ القوانين کا مکمل نسخہ برآمد ہوا جس نے لوگوں کے دلوں میں  
علم اصول قانون روم کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا اور قانونی یا فلسفیانہ شہادت کی نوعیت  
کے متعلق لوگوں کی معلومات زیادہ وسیع ہو گئیں۔ ہیکلم نے اس نسخہ کے برآمد ہونے کے  
مشہور و معروف واقعہ کو کسی قدر شبہ کی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن اس امر کا اسکو بھی اعتراف  
ہے کہ فلائش کے کتب خانہ ”لارنشین“ میں جو نسخہ مجملۃ القوانين کا موجود ہے صرف  
ایک وہی ایسا نسخہ ہے جو پوری پچاسوں جلدوں پر متضمن ہے۔ غرض مجملۃ القوانين کی  
دریافت کے بیس سال بعد گریشین نامی ایک راہب نے مختلف پاپاؤن کے فراہم کونسلوں  
کے فیصلہ جات بزرگان و علمائے کلیسا کے ملفوظات ایک کتاب میں جس کا نام ”ڈیکرٹم“  
(قدادی) ہے جمع کیے چنانچہ یہ کتاب قانون و مینیہ پر سب سے زیادہ قدیم تصنیف ہے۔ اس  
بعد کی صدی میں بابائے رگوری ہنم نے ”ڈیکرٹیل“ (کتاب الاوامر) پانچ حصوں میں شائع  
کی اور بائیس ہشتم نے ان پر ایک حصہ کا اور اضافہ کیا۔ اس کے بعد رگوری سینر دہم  
نے ”کیمینٹین“ کا ”سٹیوٹوشنز“ (دوسا کیمینٹ) کتاب الاوامر کی ساتویں جلد اضافہ  
کے ”کیمینٹین“ (کتاب الاوامر) کو ایک جگہ کر کے ”کارپس جیورس کیمینٹین“  
(مجموعہ قوانین دینیہ) کے نام سے شائع کیا۔ قانون شرعی کو وصیت نامہ جات

ولایت یتامیٰ نکاح اور طلاق پر قابو پانے کی وجہ سے رفتہ رفتہ بہت بڑا منت دار حاصل ہو گیا تھا۔  
 کراماتی شہادت کے انکار اور اُس کے بجائے قانونی شہادت کے قیام سے اصلاح  
 کینسہ کی ساعت بہت قریب آگئی۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ کنٹر بری کے لاٹ پارسی  
 اٹلم کا مقرر کیا جوا یہ قاعدہ مسیحی دنیا میں نافذ تھا کہ ہم کو پہلے بے سوچے سمجھے بے دیکھے بھلا  
 یقین کر لینا چاہیے اُسکے بعد ہمیں اختیار ہے کہ اپنے یقین کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش  
 کریں۔ لیکن اس قاعدہ پر اس وقت عمل درآمد ہونا ممکن نہ تھا۔ کمیٹیوں نے تو ہر سے کہا تھا کہ  
 سچہ کو اس بات پر ایمان لا مچا جیسے کہ یسوع مسیح کے خون کا ایک قطرہ کل بنی نوع انسان کے  
 کفارہ ذنوب کے سیلے کافی ہے۔ باقی جس قدر خون باغ میں اور صلیب پر گرا وہ پاپے  
 روا کو ترکہ میں ملاتا کہ اس نجات کی روشنائی سے تذکرات الغفران لکھے جاسکیں۔ اگر اگلا  
 سا زمانہ ہوتا تو تو تھوکر اس قول کی صداقت کے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہ ہوتا۔ مگر آجادی  
 خیال کی ہوا چلنے لگی تھی۔ اور بزم داغ میں شمع دانش جلنے لگی تھی۔ کمیٹیوں کی ہر وہ سرانی کو  
 اس دلیر جرمین راہب نے استمقار و استکراہ کی نظر سے دیکھا اور اگر کمیٹیوں اپنے دعوے  
 کی تائید میں ہزار معجزے اور کرامتیں بھی پیش کرتا تب بھی وہ اُسکو تسلیم نہ کرتا۔ معصیت پر خط  
 عفو کینچنے کے لیے تذکرۃ الغفران کی فروخت کے ناپاک اور بشر مناک طریقہ کی ابتدا اُن  
 اساقف نے کی تھی جنہیں اپنی ادبانیوں اور عیاشیوں کے لیے جب اور کسی طریقہ سے  
 روپیہ نہ ملتا تھا تو مسیح کے گلے کی کالی بھیر دین کے ہاتھ پر وہ نہ مغفرت ہی بیج بیج کر روپیہ وصول  
 کرتے تھے جن قسیدوں اور راہبوں کو اس سود مند تجارت سے ہاتھ رکنے کی ممانعت  
 تھی وہ تبرکات ہی کے جلوس نکال کر اپنی حبیبین بھرتے تھے یعنی جو شخص بغرض حصول ثواب  
 ان تبرکات کو چھونا چاہتا تھا اُس سے ایک خاص رقم بطور زندانہ رکھوا لیتے تھے۔ حضرت  
 پاپا کا مالی تانیہ جب تنگ ہوا اور آپ نے دیکھا کہ تذکرات الغفران کے بیوپار میں بہت  
 بڑا فائدہ ہے تو آپ نے اساقف کو حق تذکرہ فروشی سے محروم کر کے اس حق کا استمقا

اپنی ذات کے لیے مخصوص کر دیا اور اپنے گناہوں سے تندرست و فروشی کے لیے جا بجا مقرر کر دئے۔ اس گناہنگی اور کارندگی کے لیے زیادہ تر گناہی پیشہ طبقوں کے راہبوں کا انتخاب ہوتا تھا۔ ان طبقوں میں مسابقت اور رقابت کا بازار بہت جلد گرم ہو گیا۔ ہر طبقہ فخر یہ اعلان کرتا تھا کہ چونکہ ہمارا اثر آسمانی دربار میں زیادہ ہے اور مقدس مریم عذرا اور دوسرے اولیائے کرام کی جناب میں ہمیں زیادہ تقرب حاصل ہے اس لیے ہمارے تذکرے عفو و غفران کا زیادہ موثر ذریعہ ہیں۔ خود کو متحیر پر جس کا تعلق طبقہ اگسٹائن کے راہبوں سے تھا یہ بہتان باندھا گیا کہ جب شاہ ۱۷۷۷ء میں پایا سے لیوڈہم اسی ذریعہ سے سینٹ پیٹر کے گرجا کی تعمیر کے لیے روپیہ جمع کر رہا تھا تو بجائے اس کے کہ بخشش کے بردانون کی فروخت کا ٹھیکہ لو تھر کی برادری کو دیا جاتا ڈامینکن فرقہ کے راہبوں کو دیا گیا۔ جس کی وجہ سے لو تھر نے ناراض ہو کر کلیسا سے قطع تعلق کر لیا۔ ”اصلاح“ کے ابتدائی ایام میں خود لیوڈہم بھی اس الزام کو صبح تصور کرتا تھا۔

اس طور پر واقعہ ”اصلاح“ کی فوری محرک فزوت تذکرات الغفران ہوئی لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ سبب اصلی بھی جو اس کشمکش کی روح دروان تھا ظاہر ہو گیا۔ حقیقی بحث جس پر اس تمام جدوجہد کا دارومدار تھا یہ تھی کہ آیا انجیل کی حقیقت کا دار و مدار کلیسا پر ہے یا کلیسا کی حقیقت کا دار و مدار انجیل پر ہے ؟ بالفاظ دیگر معیار حق کا اخذ ہے تو کوئی شے واقعہ اصلاح کینہ کی مشہور و معروف جزئیات اور ان فوئزیر لڑائیوں کی تفصیل جو بکی وجہ سے یورپ میں مروتون چٹری زمین ہم اس مقام پر سپرد قلم کرنا ضروری نہیں خیال کرتے لو تھر کا ڈیبرگٹ کے گرجا کے دروازے پر ۹۵ مسائل نصب کرنا اور اس جرم کی جواب دہی ۱۷۷۷ء جرمنی کا ایک متوسط درجہ کا شہر ہے جو دریائے الب کے دہنے کنارے واقع ہے۔ ۳۱ اکتوبر ۱۷۷۷ء کو لو تھر نے اس شہر کے گرجا کے دروازے پر درجہ مشہور استفتا کیلون سے جزو دیا جس کے ۹۵ مسائل نے سنی دنیا کو ردمن کیتھولک اور پرائسٹنٹ درمیان میں تقسیم کرنے کی بنیاد رکھی۔

کے لیے رد مین طلب کیا جانا۔ اُس کا پاپا کو یہ لکھ بھیجا کہ آپ اس وقت حقیقت حال سے خالی الذہن ہیں جب آپ کو پوری کیفیت معلوم ہوگی تو جو جرم مجھ سے منسوب کیا جانا ہے وہ جرم نہ رہے گا بلکہ ایک حقیقت نفس الامری سمجھا جائے گا۔ اُس پر بدعت اور زندگی کا الزام لگایا جانا اور اُس کا ایک عام کونسل مین اسپیل دائر کرنا۔ مسائل بطور عشا سے ربانی۔ اغتراف سری وغفران و توب کی بیچ و بیچ بخون میں سے اصلی بحث یعنی ذاتی رائے کے اظہار کے استحقاق کا چھٹ کر نکل آنا۔ سٹیمین لوٹھر کا سیمی جاسٹس خارج کیا جانا اور اس کے جواب میں اُس کا فرمان اخراج اور نیز مجموعہ قوانین دینیہ کو یہ کہہ کر کہ اس کا مقصد سب ملکی و دیوانی اقتدارات کے استیصال اور پاپا سے روم کی شوکت و سطوت کے اعتلا کے اور کچھ نہیں جلا ڈالنا۔ اس دانشمندانہ چیلے سے اُس کا جرمنی کے سٹیمین کو اپنا ہم خیال بنالینا۔ مجلس شاہی میں جو بمقام ورس منعقد ہوئی اُس کا طلب کیا جانا اور اپنے عقاید سے تائب نہ ہونا۔ ڈرٹبرگ کے قلعہ میں اُس کا کچھ مدت کے لیے رہ پڑنا ہونا اور اس عرصہ میں اُس کے عقاید کا اطراف و اکنات ملک میں پھیلنا اور سوشلزمین میں زوننگلی کی کوششوں سے اصلاح کفیسہ کی ایک جداگانہ تحریک کا بارور ہونا۔ تحلیل مل و شعیث نکل کے اُس اصول کا جو تحریک اصلاح میں مضمر تھا اہل جرمنی و سوشلزمین کی باہمی رقابت کا باعث قرار پانا۔ بلکہ سوشلزمین زوننگلی اور کیلون کی سرکردگی سے دو مخالف گروہ پیدا کروینا۔ ماربرگ اسپائرس اور آگبرگ کی مجلسوں کا ان اختلافات بقیہ نوٹ صفحہ ۲۹۲ سے لے کر جابین دفن ہے۔ سٹیمین گربا کے دروازے پر لے گئے

اور کا نسی کے نیچے دروازے لگائے گئے جن میں ۹۵ سال کھدے ہوئے ہیں۔ تیرجم  
 ۱۔ پاپا کا فرمان لوٹھر نے ڈرٹبرگ میں جس مقام پر تبارج ۱۰ ستمبر ۱۵۲۰ء جلایا تھا وہاں شاہ بلوط کا ایک  
 سالنوزہ درخت کھڑا ہے جو اس لحاظ سے اصلاح کفیسہ کی پرانی یادگار سمجھا جاتا ہے۔

مستہجم

وزراعات کے مٹانے کی کوشش میں ناکام رہنا۔ اور مصلحانِ جبرمینی کا بمقام آسمان کا لڑائی  
اتحاد قائم کر کے اصلاح کو سیاسی رنگ میں رنگ دینا۔ پیروان کو متحد پیروان کیلیون کی باہمی  
نزاعات سے روم کو اپنے نقصانات کی تلافی کی امید بندھنا۔ یہ تمام واقعات ایسے ہیں  
جن کی جزئیات کا اعادہ اس مقام پر غیر ضروری ہے۔

کیونکہ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ کوشش کی پیدا کی ہوئی تحریک فروخت تذرکات العفران کے  
مناہج کی بابت چند شور و سر اور دنیا دار پادریوں کا جھگڑا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں  
بہت زیادہ اندیشہ ناک اور نتیجہ خیز اسباب چھپے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اُس نے پوری بابائی  
قوت کو باغی جماعت کی سرکوبی پر صرف کرنا شروع کیا۔ پاپائے روم کے اس جوڑ توڑ نے وہ  
خوفناک اور تباہ کن لڑائیاں چھڑوا دیں جنہوں نے ساہا سال تک یورپ میں قتل و خونریزی  
کا ہنگامہ بپا کئے رکھا اور مسیحی اقوام میں اُن علوتوں کا بیج بودیا جن کو نہ عہد نامہ و سفیلیب  
مٹا سکا اور نہ ٹرٹ کی کونسل ہی باوجود اٹھارہ سال کے مسلسل بحث و مباحثہ اور افہام و تفہیم  
کے فرو کر سکی۔ واقعہ سینٹ برٹھالوميو (۱۵۷۲ء) نے جس میں فرانسیسی پراٹسٹنٹوں کا قتل عام  
ہوا اور یورپ بھر کو مہووت و سراپیمہ کر دیا اور کیا پراٹسٹنٹ کیا روسن کیتھولک سب کے جسم پر ٹوٹ  
کھڑے ہو گئے۔ خدا دانہ عہد ہی اور وحشیانہ خونریزی کے لحاظ سے یہ واقعہ تاریخ عالم میں اپنی  
مثال آپ ہے۔

۱۵۷۲ء قتل عام جو بڑا بدھہینے تک جاری رہا اور جس میں پچاس ہزار پراٹسٹنٹ مارے گئے ہمارا گت  
مشہور کی شام کو شروع ہوا جو ایک مسیحی بزرگ سینٹ برٹھالوميو کے عرس کی تاریخ ہے اس زمانہ میں چارلس  
نہم فرانس کا بادشاہ تھا لیکن حکومت کی باگ اصل میں اُس کی ان ملک کیتھرائن ڈیسی کے ماتحتین تھے جو تعصب  
کی تہی اور جبر و بے عنوانی کی زندہ تصویر تھے۔ کیتھولک فریق نے کیتھرائن کی شہ پاکر یہ منصوبہ کانٹھا کہ پراٹسٹنٹوں  
کے سرداروں کو جمع کر کے قتل عام کر دیا جائے اور اُس کے بعد اُن کے ساتھیوں کو قلع و قمع کیا جائے۔  
اس منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے طے طے کے جوڑ توڑ کیے گئے۔ کیتھرائن اپنی بیٹی کی شادی نیویر

پاپا سے رومانے مخالفین کی بیچ کنی کے لیے سبھی طرح کے جتن کیے بغیر جنگیوں کی آگ بھڑکانے کے لیے ہمیں کشتی کی۔ قتل عام کر دے۔ اہل خلافت کو چین کمر و ڈالا لیکن ان یا یوسانہ کوششوں سے کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ ٹرنٹ کی کونسل کی جدوجہد بھی بیکار گئی۔ اس کونسل کے انعقاد کا منشا اب ظاہر اگرچہ یہ تھا کہ کلیسا کی عیسوی کے عقاید کی اصلاح و توسیع و تحکیم و تعمین کرے اور احیاء و تادیب سے پیشوایان دین عیسوی کی اخلاقی اور علمی حالت کو سدھارے لیکن امکان کونسل کے انتخاب میں یہ چالاکی کی گئی تھی کہ عنصر غالب اطالوی اور اس لحاظ سے پاپا کے زیر اثر تھا۔ اسی لئے ممکن نہ تھا کہ پراٹسٹنٹ فرقہ اس کونسل کے فیصلوں پر کاربند ہو۔ اصلاح کینسہ کا لب لباب یہ مسئلہ تھا کہ بائبل ہر مسیحی المذہب شخص کی ہدایت کے لیے کافی و کفایتی ہے اور یہی مسئلہ تمام پراٹسٹنٹ کلیساؤں کے مسلمات میں داخل ہو گیا۔ روایت کی بسا منہدم ہو گئی اور یہ امر تسلیم کر لیا گیا کہ ہر شخص کو بذات خود مذہبی معاملات میں رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ غرض یہ خیال عام طور پر پھیل گیا کہ حق و باطل میں تمیز کرنے کا رستہ آخر انسان کے لیے کھل گیا ہے۔

کتاب مقدس سے استہداد و استناد کرنے کا جو اصول اس طور پر قائم کیا گیا تھا اس کا تعلق

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۹۴ کے فرانز وانشہ ہنریٹی جو پراٹسٹنٹ تھا کرنے پر عائد ہو گئی۔ اور شاہی کی تقریب پر تمام بڑے بڑے پراٹسٹنٹ اور امرا و اعیان کو دعوت دی گئی۔ جب یہ سب پیرس میں جمع ہو گئے تو آدھی رات کے وقت شاہی محل سے گہنٹہ بجایا اس کا مطلب یہ تھا کہ قتل عام شروع ہو۔ چنانچہ کیتھولک تلواریں لیکر اٹھے اور جس پراٹسٹنٹ کو جہان پایا ذبح کر ڈالا۔ کشت و خون کا یہ ہنگامہ پیرس تک ہی محدود نہ تھا بلکہ مملکت فرانس میں جہاں جہاں پراٹسٹنٹ موجود تھے گلائی کی طرح کاٹ ڈالے گئے۔ پاپا سے گریگوری سیزدہم اس وقت جلوہ افروز مسند قدس و عصمت تھے۔ اس قتل عام کی خبر جب آپ کو پہنچی تو آپ نے سجدہ شکر ادا کیا اور گرجا میں جا کر شکرانہ کی نماز پڑھی اور اس مبارک واقعہ کی یادگار میں ایک تمثیل تیار کرایا جو موسنین باک عیسائی پراٹسٹنٹوں کے قاتلوں کو عطا فرمایا گیا۔ مترجم



خالص مذہبی یا اخلاقی معاملات ہی سے نہ تھا بلکہ فلسفیانہ حقائق کا انکشاف اور رموز فطرت کا انکشاف بھی اسی اصول کی حامل میں داخل تھا۔ بہت سے لوگ تو اس بارے میں ایپیمنس کے نقش قدم چلے جس نے زمانہ قدیم یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بائبل میں مدنیات کے بھی تمام اصول و فروع شامل ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اہل اصلاح کسی علم کو رواداری کی نظر سے نہ دیکھ سکتے تھے جو کتاب پیدائش کے ساتھ تطابق رکھتا ہو۔ ان میں سے اکثر بزرگواروں کی یہ رائے تھی کہ اتنا دینداری علم و حکمت سے جدا ہوے بغیر کبھی سرسبز نہیں ہو سکتی۔

ٹرٹلین اور سینیٹ اگسٹائن کا یہ قدیم ہلک اصول موضوعہ کہ بائبل ان تمام معلومات کا مجموعہ اور خلاصہ ہے جو انسان کو حاصل ہو سکتی ہیں یا اُسے فائدہ پہنچا سکتی ہیں ابھی تک سختی کے ساتھ قائم تھا۔ لو تھر اور ملنگٹھان نے جو اصلاح کینس کے بانی مبنی تھے عزم بالجرم کر لیا تھا کہ فلسفہ کو کلیسا کی سرحد سے خارج کر دیا جائے۔ لو تھر کا بیان تھا کہ ارسطو کی تصانیف کا مطالعہ بے سود محض ہے۔ ارسطو پر سب دشمن کا اُس نے جو جھڑباند ہے وہ صنعت تمبر کی ایک انوکھی صفت بجا جاسکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس ضمن میں یون گہر افشانی فرمائی ہے۔ "اس میں دراز خاک نہیں کہ یہ ملعون ابدی و شقی ازلی یعنی ارسطو بڑا خناس ہے۔ انفرادی پر دلازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا خبیثانہ ہرزہ سرائی کے فن کا موجد ہے۔ سرگروہ شیاطین ہے فلسفہ کا ایک حوت بنین جانتا۔ جھوٹا ہے۔ فریبی ہے۔ دغا باز ہے۔ بھٹکتا ہے۔ بکرا کر نفس پرست ہے۔ عیاش ہے۔" فلاسفہ طریقہ مشائیہ لو تھر کے نزدیک "مڈیان ہیں۔ ریگنے والے کبوتر ہیں۔ مینڈک ہیں۔ جوئین ہیں۔" ان فلاسفہ کو وہ جس نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا وہ بیان سے باہر ہے۔ اگرچہ کیلون نے ان خیالات کو بوصاحت اعادہ نہیں کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ بھی اس بارے میں لو تھر ہی کا ہم صنف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعہ اصلاح کا سائنس کے سر پر ذرا سا بھی احسان نہیں ہے سائنس کو ابھی ایک بہت کمزور منزل کا سامنا تھا۔ یعنی وہ اپنے پاؤں تورات کی اُس چادر کے مطالبی پہیلانے پر ابھی

تک مجبور تھا جو طول میں پردہ کر سٹینز کے ضرب المثل ولے فولادی پلنگ سے نہ کم تھی نہ زیادہ  
 مسیحیت کی تاریخ میں سب سے زیادہ نامبارک وہ دن ہے جبکہ اُس نے اپنے آپ کو  
 سائنس سے علیحدہ کر لیا۔ اُس نے آریجن کو جو اُس زمانہ دسٹلر عہدین کلیسا کی طرف سے سائنس  
 کا بہت بڑا وکیل اور سرپرست تھا مجبور کیا کہ اسکندریہ چھوڑ کر قیصریہ چلا جائے۔ اس کے بعد  
 پیشوایان دین عیسوی صد ہا سال تک اس کو شش میں مصروف رہے کہ حقیقت اشیا کی تلویل  
 بذریعہ آیات انجیل کریں لیکن اس کو شش میں جو نامیائاں اُنہیں نصیب ہوئیں ان کی پردہ  
 درمی تیسری سے لیکر سولہویں صدی تک کی تاریخ عالم کر رہی ہے۔ قرون متوسطہ کی ظلمت کا  
 باعث یہی مہلک طرز عمل تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس تاریخی بین بین کہیں کہیں روشنی  
 کی ایک جہلکی سی نظر آجاتی ہے یعنی فریڈرک ثانی اور الفانسو دہم جیسے مشاہیر کے قابل قدر  
 کارناموں سے ہماری نگاہ دوچار ہوتی ہے جنہوں نے وسیع الخیالی و آزاد روی کے بلند  
 مینار پر کھڑے ہو کر ایک نظر میں دیکھ لیا تھا کہ تمدن کو علم و فضل کی کس قدر محتاج ہے اور  
 جنگو اُس وادی بق و ق میں بھی جہان پادریوں کی تاریک خیالی کے باعث جہالت اور نقص  
 کا اندھیرا چھایا ہوا تھا اس ضرورت کا احساس ہو گیا تھا کہ صرف سائنس ہی انسان کی سعادت  
 کی اصلاح کر سکتا ہے لیکن ان چند نفوس کی کوششوں سے کیا ہو سکتا تھا۔ اکیلا سورا چنا  
 بھاڑ پھوڑنے سے رہا۔

لے پردہ کر سٹینز ایک یونانی ڈاکو ڈسٹینز نامی کا عرف تھا۔ پردہ کر ڈو ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی کہنچاد  
 یا تار کے ہیں۔ پردہ کر سٹینز اسی سے مشتق ہے یہ نام اس ڈاکو کو اس لیے دیا گیا تھا کہ جو مسافر اُس کو رخصتے  
 چڑھ جاتا تھا اُسے ایک فولادی پلنگ پر لٹا دیتا تھا۔ اور بد نصیب مسافر کا کھڈا اگر پلنگ سے چھوٹتا تھا  
 تو اُس کے جسم کو شکنجہ میں برہان تک کہنچتا تھا کہ وہ پلنگ کے برابر ہو جاتا تھا اور اگر بڑا ہوتا تھا تو اُس  
 بیچارے کی ٹانگیں اسی نسبت سے کاٹ ڈالا کرتا تھا۔ اسی لیے پردہ کر سٹینز کے پلنگ سے استعارتاً  
 ناجائز لفظ دتی یا کمی مراد لی جانے لگی۔ مترجم

اختلاف رائے ابھی تک ایک ایسا جرم سمجھا جاتا تھا جس کی بادشاہ میں سزا سے موت دی جاتی تھی جب کیلون نے سر دیش کو جنوا میں زندہ جلوا دیا تو ہر شخص سمجھ گیا کہ جابرانہ ایذا رسانی کے سانپ کا سرا بھی نہیں کچلا گیا۔ سر دیش کا جرم صرف اسی قدر تھا کہ اُس کے عقاید فلسفیانہ تھے یعنی اُس کا خیال یہ تھا کہ مسیحیت کے اصلی عقاید ناسیائی کی کونسل کے انعقاد سے پہلے ہی مٹ چکے تھے۔ روح القدس روح عالم کی طرح تمام کائنات میں ساری ودھائے اور خاتمہ کائنات پر مسیح کے ساتھ وہ جو ہر ذرات باری میں جس سے اس کا صدور ہوا تھا ضم ہو جاتا ہے۔ اسی عقیدہ کی بادشاہ میں سر دیش کو دہمپی آج پر کباب کی طرح بہون ڈالا گیا۔ ایسی حالت میں کون کہہ سکتا ہے کہ پرائسٹنٹ فوٹو سے اور اُس کیتھولک فوٹو سے کچھ بھی فرق ہے جس کی رو سے دینی کو ۱۶۲۵ء میں حکام محکمہ احتساب عقاید نے بمقام ٹوٹو اس علت میں زندہ جلوا دیا کہ اُس نے کتاب ڈایالاکز کنسرننگ نیچر (مکالمات در بارہ حقایق فطرت تصنیف کی تھی۔

چھاپے کی ایجاد اور کتابوں کی اشاعت سے وہ خطرات پیدا ہو گئے جن کے آگے "انکوئریشن" کے مطالعہ کی کوئی ہستی نہ تھی۔ ۱۵۵۹ء میں پاپا سے پالی چہارم نے محکمہ ترتیب فہرست کتب مجرہ قائم کیا جس کے حالات ہم ایک مورخ کے الفاظ میں حسبِ قلمبند کرتے ہیں؛ "اس محکمہ کا فرض یہ ہے کہ کتب و مسودات مقصود الاشاعت کی جانچ پڑتال کر کے یہ فیصلہ کرے کہ آیا عامہ خلایق کو ان کے مطالعہ کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں۔ ان کتابوں میں جن میں بے شمار غلطیاں نہ ہوں بلکہ بعض مفید و نتیجہ خیز حقایق پائے جائیں ایسی اصلاح کرے جس سے وہ عقاید کلیسا کے مطابق ہو جائیں۔ ان کتابوں کو جن کے اصول خدا نہ و زندیقانہ ہوں ممنوع الاشاعت قرار دے اور لمحا نہ تصانیف کے مطالعہ کا خاص حق خاص خاص اشخاص کو عطا کرے۔ اس محکمہ کے ارکان مجلس انتظامی کا اجلاس بعض دفعہ ہوا ہے پاپا سے اعظم لیکن عموماً کر دینال کے محل میں ہوتا تھا۔"

کر دینا موصوف ہوتا ہے اس کے اختیارات محکمہ احتساب عقاید کے اقتدارات سے بہت زیادہ وسیع ہیں۔ اس لیے کہ اس کو نہ صرف انہیں کتابوں کی اشاعت میں دست اندازی کرنے کا اختیار حاصل ہے جن میں رومن کیتھولک مذہب کے مخالف عقاید مندرج ہوں بلکہ ان تصانیف کی اشاعت بھی اُس کے دائرہ اقتدار سے باہر نہیں جن کا موضوع فرایض و وجوب اخلاق۔ انضباط تاویسات کلیسا اور مصیبات مقاصد خلق اللہ ہو۔ اس محکمہ کی ذمہ تسمیہ ملحدانہ تصانیف اور اُن کے مصنفین کے اسما کی فہرست ہے جو بہ ترتیب حروف تہجی اس کے حکم سے تیار کی جاتی ہے ۛ

فہرست کتب محرمہ میں اول اول اُن کتابوں کا نام درج تھا جن کا مطالعہ ناجائز قرار دیا گیا تھا لیکن جب اس سے کام نہ نکلا تو یہ قید لگا دی گئی کہ ہر اُس کتاب کا مطالعہ ممنوع ہے جس کے پڑھنے کی صریح اجازت نہ دی گئی ہو۔ اس بے باکانہ و شوق چشمانہ حکم کا مقصد یہ تھا کہ بجز اُن معلومات کے جن کو اغراض کلیسا کے ساتھ تطابق و توافق ہو اور کسی قسم کا علم لوگوں میں پھیلنے نہ پائے۔

اس سے واضح ہوا کہ کلیسا سے سچی کی دو حریف جماعتیں یعنی پراٹسٹنٹ و کیتھولک باوجود باہمی رقابت کے اس امر میں متفق و متحد تھیں کہ بجز اُن علوم کے جو اُن کی رائے میں کتب مقدسہ کے تفسیر نہ ہوں اور کسی علم کو مسالمت اور رواداری کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔ کیتھولک فریق کی قوت کا چونکہ ایک مرکز موجود تھا اس لیے جہاں اُس کی حکومت قائم تھی وہ اپنے فیصلہ کی تعمیل بہ جبر کر سکتا تھا اور فہرست کتب محرمہ کے نفاذ میں سختی کے زور سے کام لے سکتا تھا لیکن پراٹسٹنٹ فریق کا اثر مختلف اقوام میں پھیلا ہوا تھا اور اُس کی قوت مختلف المکز تھی۔ لہذا وہ کوئی ایسی نتیجہ خیز کارروائی نہ کر سکتا تھا۔ اُس کا طرز عمل یہ تھا کہ مجرم کو راندہ درگاہ کلیسا قرار دیکر اُسے برادری سے خارج کر دیا جاتا اور یہ طریقہ شاید دوسرے طریقہ کی بنسبت کچھ کم موثر نہ تھا۔

ہم ابواب سابقین میں ظاہر کر چکے ہیں کہ مذہب اور سائنس میں ادویل عیسائیت ہی سے مخالفت چلا آتا تھا۔ اس مخالفت کے کرشمہ میں ہر صدی میں نظر آتے ہیں عجائب اسکندریہ کی بربادی اسی کا نتیجہ تھی۔ اریجینا اور وکلفٹ کی فلسفیانہ روشن خیالی میں اسی کی جھلک پائی جاتی ہے تیسرے ہجریں صدی کے ملاحظہ ورنادقہ کا قورات کے بیان پیدائش کو فرط استعقار سے لغو و مہمل قرار دینا اسی کا کام تھا۔ لیکن کہیں کو پرنیکس کپلر اور گلیلیو کے زمانہ میں جا کر اُس آہنی زنجیر کے حلقوں نے جو سائنس کے پاؤں میں عیسائیت نے ڈال رکھی تھی مشق گستگی شروع کی کلیسا کی سیاسی قوت ہر ملک میں بہت کچھ گھٹ گئی تھی اور سربراہ اور دکان کلیسا دیکھ رہے تھے کہ وہ ربلی زمین جس پر مسیحیت کے عالیشان محل کی بنیاد قائم تھی اس کو پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے۔ جبروتندی کے ساتھ مخالفین کی جنگی کرنے کا طریقہ جو زمانہ سابق میں بہت کچھ کارگر ثابت ہوا انتخاب بیکاروبے انز تھا۔ اکا دکا فلاسفون کا آگ میں جلا دیا جانا بجا ہے اس کے کہ اُس کی اغراض کے لیے مفید ثابت ہوتا اور الٹا موجب نقصان ہو رہا تھا۔ ہیئت کے دنگل میں جب مذہب عیسوی خم ٹھونک کر اُترا تو اُس کا مد مقابل ایک اکیلا گلیلیو تھا لیکن اس یکہ و تنہا پہاوان نے اُسے اڑانگے پر لا کر ایسی بیٹھنی دی کہ اُس کا سارا زعم باطل ہو کر خاک میں مل گیا اور جب نیوٹن کی غیر فانی تصنیف شائع ہوئی تو باوجودیکہ لائبنٹز نے یورپ بھر میں پکار کر کہہ دیا کہ نیوٹن نے خدا سے اُس کے بعض بڑے بڑے اوصاف چھین کر طبعی مذہب کی جڑ کھوکھلی کر دی ہے لیکن کلیسا ایسی ہٹی بھولا کہ اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

نیدرلینڈ کے زمانہ سے لے کر آج کے دن تک اُس دریا کا پاٹ جو معتقدات کلیسا اور سلمات سائنس کے درمیان حایل ہے روز بروز زیادہ چوڑا ہوتا چلا آیا ہے۔ کلیسا نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز اور اجرام کائنات میں سب سے بڑا جسم ہے۔ ادا فتاب ماہتاب اور ستارے اس کے تابع ہیں۔ اُس کا یہ دعویٰ علم ہیئت نے باطل کر دیا۔ اُس نے نہایت

د نوح کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ رو سے زمین پر ایک عالمگیر طوفان چھا گیا تھا جس کے فرو ہونے پر صرف ہی حیات زندہ رہے جو کشتی نوح میں موجود تھے۔ علم طبقات الارض نے اُس کے اس وقیعا نو سی طلسم کو بھی توڑ دیا۔ اُس نے بڑے شد و مد سے اس عقیدے کی تطقین کی حتیٰ کہ اول اول صرف ایک انسان موجود تھا جو کوئی سات آٹھ ہزار سال پہلے جانی و انسانی کمال کی حالت میں پیدا کیا گیا مگر اس پایہ اکملت سے بوجہ اپنے گناہوں کے گر گیا۔ علم الارض نے اُس کے اس ادعا کی بھی تلخی کھول دی اور ثابت کر دیا کہ انسان لاکھوں سال سے کر زمین پر آباد ہے اور اُس کی ابتدائی حالت وحشیانہ بین جنگل کے درندوں سے کچھ ہی بہتر تھی۔ بہت سے بھلے لوگوں نے جن کی نیت کے اچھے ہونے میں شک نہیں کوشش کی ہے کہ کتاب پیدائش کے بیانات کو سائنس کے اکتشافات سے تطبیق دین لیکن اُن کی کوشش سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مسیحیت اور سائنس کا اختلاف اتنا بڑا کہ اُس پر عینا لعنت کا اطلاق ہونے لگا اب بجز اسکے چارہ نہیں کہ ان حریفوں میں سے ایک کو ہارمانی پڑے۔

جب صورت واقعات یہ ہے تو کیا ہو کہ یہ استحقاق حاصل نہیں ہے کہ اس کتاب کو جو دوسری صدی عیسوی سے حقائق علمیہ کی سیرا کطور پر پیش کی جا رہی ہے بے نظر انتقاد و کھین اور اس کے دعوے اہم من الہی کو کھینچیں جس کتاب کا دعویٰ ایسا بڑا اور درجہ اتنا اونچا ہو اسے اپنی یحیثیت برقرار رکھنے کے لیے انسان کے ناقدرانہ تبصرہ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مسیحیت کے ابتدائی دور میں بہت سے سربراہ اور وہ پیشوا یاں کلیسا کو تورات کی پہلی پانچ کتابوں کے مصنف کی شخصیت کے متعلق بہت سے شکوک و شبہات دانگیہ تھے قلت گنجائش اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس مقام پر اُن واقعات و دلائل کو بتفصیل درج کریں جو آج تک اس بارے میں پیش کی جاتی رہی ہیں اس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں اور ایک بہت بڑا ذخیرہ اس کے مالہ و ماعلیہ کے متعلق جمع ہو گیا ہے۔ ناظرین کو اگر اس بحث سے دلچسپی ہو تو وہ تقدس آب و فضیلت انساب پادری پر بڑو کی کتاب

”دوسری اولڈ اینڈ نیو ٹیسٹمنٹ کنکٹڈ“ (ربط ہو و عتیق و جدید) ملاحظہ فرمائیں جو اٹھارہویں صدی کی انٹاپروڈنسی کی ایک قابل تکرار دگاری ہے۔ پادری کوئنز نے بھی حال میں اسس سمون پر شرح و بط سے بحث کی ہے نفرت ذیل سے اس بحث کی موجودہ کیفیت پوری طرح سے واضح ہوگی:-

کہا یہ جاتا ہے کہ عہد عتیق کی پہلی بائبل کتاہون کو حضرت موسیٰ نے خدا کے الہام سے قلمبند کیا۔ پس اس لحاظ سے کہ یہ نسخہ خدا کا تصدیق کیا ہوا اور لکھوایا ہوا ہے ضرور ہے کہ نہ صرف سائنس اسے صحیح و موثق تسلیم کرے بلکہ تمام دنیا اس کی موثوقیت کی معترف ہو۔

لیکن اس موقع پر یہ سوال ہوے لیبر نہیں رہ سکتا کہ وہ کون کون شخص بتھاجس نے تورات کی نسبت ایسا براہ دہی کیا یا وہ کون سی ایسی بات ہے جسکی بنا پر یہ دعویٰ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خود یہ کتاب تو اس ادعا سے عاری ہے۔ کسی مقام پر بھی اس میں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ اس کا مصنف ایک شخص واحد ہے اور کہیں بھی یہ کفر امیر تندی اس میں موجود نہیں ہے کہ یہ کتاب خدا کا کلام ہے۔

بنی نوع انسان کی سریل الاعتقادی پر یہ دست تصرف کہیں دوسری صدی عیسوی میں ماکرور کیا گیا۔ اس دعوے کی ابتدا اعلیٰ طبقہ کے مسیحی فلاسفہ سے ہند ہوئی بلکہ ان جو شکر پادریوں سے ہوئی جن کی تحریرات ثابت کر رہی ہیں کہ وہ تاجر علمی سے عاری اور فن تنقید سے نا آشنا تھے۔

دوسری صدی لکرا ج تک ہر زمانہ میں مسلم الثبوت قابلیت کے مسیحی و یہودی علما ایسے پیدا ہوتے رہے جن جھون زبان دعوائی کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان علما کا فیصلہ خود تورات کی اندرونی شہادت پر مبنی ہے جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف زیادہ نہیں تو دو مصنفین سے تو ضرور منسوب کی جاسکتی ہے اور ان دونوں کا نام اویہیم و یہوہادہ۔ یہ فیصلہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہود اٹنی قصہ کی عبارت سے جا بجا اس

امر کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ کسی اصلی نسخہ کی نقل ہے اور الوہی ہی قصہ سے بالکل جدا ہے۔ جن دو ناخداؤں سے یہ قصے لیے گئے ہیں وہ کئی ایک اعتبار سے متضاد و متباہن ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عہد عتیق کی پہلی پانچ کتابیں عبرانی نسخوں یا عبرانی بائبل کے مطبوعہ نسخوں میں کہیں بھی حضرت موسیٰ سے منسوب نہیں کی گئیں اور نہ انہیں نسخہ سبعینیہ یا ترجمہ لا طلیث، بی بین "صحف موسیٰ" کہا گیا ہے بلکہ یہ نام انہیں جدید تراجم ہی میں دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تورات کے منزل الہی صرف حضرت موسیٰ ہی نہیں ہو سکتے، کیونکہ آپ کی وفات کا واقعہ بھی اس میں مذکور ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تورات اس واقعہ کے کئی سو سال بعد قلمبند کی گئی اس لیے کہ اس میں ان واقعات کے حوالے موجود ہیں جو یہودیوں میں مسلمہ و مانورہ کے قیام کے بعد پیش آئے۔

وہ شخص بڑا ہی بے باک ہے جو تورات کو خدا کا الہامی کلام سمجھتا ہے اس لیے کہ اس میں ایسے ایسے اصدا و نواقض اور امور غیر عادی و غیر ممکن بھرے پڑے ہیں جن کا خدا کے پاک کے کلام میں پایا جانا ممکن نہیں اور یہ وہ اصدا و نواقض ہیں جن کی حقیقت کا انکشاف نامت جرنی اور انگلستان کے بہت سے متقی و راسخ ائمہ عقائد علما کرچکے ہیں۔ ان تنقید نگاروں نے فیصلہ کیا ہے کہ کتاب پیدائش ایک قصہ ہے جس کا ناخذ سنی سنائی فرضی روایات ہیں۔ مصر سے بنی اسرائیل کا خروج تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ تورات کی پانچوں کتابیں باہم اعتبار تاریخی سے ساقط اور غیر موسمی الاصل ہیں۔ اس میں ایسے ایسے خلاف قیاس متضاد اور متناقض امور درج ہیں جو کل تورات کی تغلیط و تکذیب کے لیے کافی ہیں اور ایسے ایسے عیوب و اسقام پاگئے جاتے ہیں جو اگر زمانہ حال کی کسی تاریخی تصنیف میں موجود ہوں تو اس کے اعتبار کو فوراً زایل کر دیں۔

ہنگ سٹنگ نے ایک کتاب اس بحث میں لکھی ہے کہ تورات اصلی ہے یا حرف اس میں

لے ایک جرمن عالم جو ۱۸۵۷ء میں یونیورسٹی برلن میں الہیات کا پروفیسر تھا۔ مترجم۔



وہ ایک مقام پر لکھتا ہے: ہر تاریخی تصنیف جس میں التباس و تدلیس سے کام لیا گیا ہو ضرور ہے کہ کبھی نہ کبھی اجتماع ضدین کی الجھن میں پڑے اگر تورات اصلی نہیں ہے تو لامحالہ اس کا بھی یہی حشر ہونا چاہیے۔ اگر تورات متیس اور محرف ہے تو جو تاریخی واقعات اور قوانین اس میں مذکور ہیں وہ ظاہر ہے کہ مختلف زمانوں میں وضع کیے گئے ہیں اور کئی صدیوں کے دوران میں مختلف اشخاص نے انہیں سپرد قلم کیا ہے۔ جس کتاب کا طرز تصنیف یہ ہو اُس کا اصداً و نوافض سے معرا ہونا ممکن نہیں اور کوئی شخص جو بعد میں اُسے بہ تصرف شائع کرے خواہ وہ کیسا ہی قابل کیون نہ ہوں اصداً کے نشانات پوری طرح سے ہرگز نہیں مٹا سکتا۔

عبارت مندرجہ بالا پر اس قدر اصرار کیا جاسکتا ہے کہ عذرانے صداقت الفاظ میں بیان کیا ہے (لاحظہ ہو کتاب عزرا بنی باب دوم آیت ۱۴) کہ اُس نے پانچ دوسرے اشخاص کے ساتھ مل کر تورات کی پہلی پانچ کتابوں کو چالیس دن کی مدت میں کھلا وہ بیان کرتا ہے کہ جب یہودی بابل میں قید تھے تو اُن کی مقدس کتابیں جلادی گئی تھیں۔ اس کے بعد اُس نے تورات کے قلمبند کئے جانے کی مفصل کیفیت بیان کی ہے۔ اور ظاہر کیا ہے کہ آفریض عالم سے لیکر اُس وقت تک جتنے واقعات پیش آئے تھے اُن سب کو اُس نے سپرد قلم کیا۔ شاید اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ کتاب عزرا منجھلا سفر محرف ہے لیکن اس کے جواب میں یہ الزامی استفسار کیا جاسکتا ہے کہ کیا اس دعوے کی تائید ایسی براہین و دلائل ہیں جو موجودہ فن تنقید کے حلق کی تاب لاسکیں ہیں؟ مسیحیت کے ابتدائی دور میں جب کہ قصہ ہبوط آدم مسیحیت کے ارکان میں داخل نہ تھا اور مسئلہ کفارہ بتدقیق و تحکیم اُس درجہ کو نیچے نہ تھا جس پر اسے بالآخر اسلام نے پہنچا دیا پیشوایان کلیسا کو اس امر کا عام طور سے اعتراف تھا کہ بغیر غالب عذرانے تورات کی پہلی پانچ کتابوں کو حسب بیان خود حقیقتاً تصنیف کیا چنانچہ سینٹ جروم کہتا ہے: ”تم خواہ یہ دعویٰ کرو کہ تورات کی پہلی پانچ کتابیں موسیٰ نے لکھیں خواہ یہ کہو کہ عزرا نے ان کتابوں کو دوسرے قلمبند کیا

مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، علیٰ ذہانتیاس کلیمیں الگز نڈریس کا قول ہے کہ جب آئینہ  
نہر نے یہودیوں کو قید کر رکھا تھا اور تورات کا نسخہ صنایع کر دیا گیا تھا تو عزرا نبی نے الہامی  
طاقت سے اسے از سر نو قلمبند کیا۔ آئینہ کو بھی اس قول کے ساتھ اتفاق ہے۔

کتاب پیدائش کے پہلے دس باب سائنس کے ساتھ تعلق رکھنے کے اعتبار سے  
تورات کے دوسرے مقامات کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہم اور نایاب چیز ہیں۔ ان ابواب  
میں جن واقعات کا ذکر ہے وہ مختلف صنفین کی روایات کے ناتمام اجزائے ماخوذ معلوم ہو  
ہیں۔ لیکن تدقیق و تنقید کی نظر سے دیکھا جائے تو ان سب میں ایسی خصوصیات پائی جاتی  
ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب پیدائش صحرا سے عرب میں بیٹھ کر نہیں لکھی گئی تھی  
بلکہ دریائے فرات کے کنارے تصنیف کی گئی تھی۔ اس میں بہت سے کلدانی محاورات اور

سریانی مختصریات موجود ہیں۔ مثلاً کوئی مصری بچہ روم کی نسبت یہ نہ لکھے گا کہ یہ سمندر مغرب کی  
سمت میں واقع ہے۔ لیکن سریانی ضرور لکھے گا اس کے علاوہ اگر کتاب پیدائش کو ایک تخیل  
فرض کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تخیل کے پردے اور باقی سب سامان مصری الاصل  
ہیں۔ بلکہ سریانی مصنوعات سے ہے پیدائش کے پہلے دس ابواب میں جو داستان  
مندرج ہے وہ ان قصوں سے ملتی جلتی ہے جو سریانی مسلمانوں کی خشتی کتا بان کی شریانی  
عبارات میں لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ سریانی آثار قدیمہ کے ماہرین کا بیان  
ہے کہ ایک روایت جو طوفان سے تعلق رکھتی ہے اور آرمہ جو بھی چکی ہے۔ اور عجب نہیں کہ باقی روایات

سکے ساتویں صدی قبل مسیح میں آسمانی پال اسیر یا کا ایک بادشاہ تھا۔ اُس کا بایع تخت شہر نینوا تھا جس کے  
کنڈر مشرقین یورپ کی ان تھک کاوشوں کو ایک قدیم تمدن کی عبرت ناک داستان بنا رہے ہیں۔ اسور  
بنی پال کے محل میں ایک عظیم الشان خشتی کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانہ کے جواہر آرمہ ہوئے ہیں ان میں  
سے چند اینٹوں پر کسی قدیم سامی زبان میں ایک روایت مندرج ہے جسکے واقعات طوفان لغج سے ملزوم  
جلتے ہیں۔ سریانی آثار کے ماہرین نے بالاتفاق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بوروایت ان اینٹوں پر لکھی ہوئی ہے

بھی اسی طرح آگے چل کر دبے دبے کھنڈروں میں سے نکل آئیں۔

پیدائش زمین و آسمان۔ بارغ عدن۔ اوطین کے غیرستہ مرد اور مردکی ایک پسلی سے عورت کی تخلیق۔ سانپ کا اغوا۔ سمیرہ حیوانات۔ ملائکہ۔ شعلہ زن تلوار۔ طوفان اور کشتی۔ آب طوفان

نوٹ صفحہ ۲۰۵۔ وہ کسی قدیم تفسیر کی نقل ہے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح سے درہزار سال قبل یہ روایت اسیر بامین زبان زد خاص و عام تھی اس روایت کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

”کئی ہزار سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ سو پونہ بیابین ایک شہر آباد تھا جس کا نام سہرنگ تھا۔ اس شہر میں جیسی نامی ایک شخص رہتا تھا ایک رات اس شخص نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ عالم خواب میں اسے معلوم ہوا کہ عفریہ ایک بڑا طوفان آیا جا رہا ہے اور اسے اشارہ ہوا کہ فوراً ایک جہاز بنا شروع کرے جس میں طوفان کے نواز ہونے کی خبر پڑے ہی وہ اپنے خاندان اور احباب و اقارب سمیت کچھ بچے اور کچھ جنگلی جانور اور کچھ نباتات کے کچھ لیکر سوار ہو جائے اور تباہی سے بچ جائے۔ جیسی سدا نے جانگتے ہی اس اشارہ غیبی کے مطابق عمل کرنا شروع کیا۔ اس نے ایک مضبوط عرش کا جہاز تیار کیا جس کو اندر اور باہر تیر سے بیس دیا گیا۔ اس کے بعد اس جہاز کو پانی میں چلا کر دیکھ لیا گیا کہ وہ پاکی موجوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ اور جب اطمینان ہو چکا تو ضروری سامان، مائش جہاز پر بار کر دیا گیا اور ایک ہوشیار و معتبر نازد مقرر کیا گیا۔

”آخر طوفان کی آمد کی موعودہ خبر جیسی سدا کو دی گئی اور وہ اپنے بال بچوں اور اعزاء و اقربا سمیت کشتی میں سوار ہو گیا۔ اس نے احتیاط کی راہ سے کشتی کا دیرپہ بندر کیا اور کس جہا کو بونا خدا تھا عرش پر چھوڑ دیا کہ جس طرح میں چاہوں طوفان کا مقابلہ کرے۔ اس کے بعد باد و باران کا طوفان شروع ہوا۔ مینہ موسلا دار برسنے لگا۔ زمین کے چشے پھٹ پڑے۔ کھجوریں پانی میں غرق ہو گیا۔ ہوا کے تھپتھپان سے موجیں اٹھنا ہو کر آسمان سے باہر نکلنے لگیں۔ زمین و آسمان و ہندکار بادل سے ایک ہو گئے۔ چھ دن اور سات رات تک جھک چلا رہا اور مینہ برستا رہا۔ لیکن کشتی سلامت رہی۔ آخر ساتویں دن طوفان تھا اور جیسی سدا عرش پر گیا۔ دیکھا تو جہاز نہ صرف پانی ہی بانی تھا اور اسے لایا اور جانوروں کی لاشیں

کا ہوا کے چلنے سے خشک ہو جانا۔ مینا اور بابل کی تعمیر۔ اختلاف السنہ یہ تمام دور و ایات ہیں جو عزرا کو سر بانی کتبوت اور تحریر و ن سے بہم پہنچی تھیں۔ کتاب پیدائش کے گیارہویں باب میں وہ دفعۃً و بغتۃً یہودیوں کی تاریخ کھینچی شروع کر دیتا ہے گویا یہاں پہنچ کر اس کی تاریخ عالم

نوٹ صفحہ ۳۰۶۔ موجود پر تیرتی بحر قنین۔ اپنی قوم اور ملک کی یہ تباہی دیکھ کر جی سدا بہت روایا بہت دور سفر کے پہلا نظر سے کشتی اُن کی طرف چلائی گئی اور اُس کا پیندا اور اپنی زمین پر جا کر ٹک گیا۔ جب اور سات دن گزر گئے تو جی سدا نے ایک فاختہ چھوڑی جو کوئی آواز نہ پا کر بوٹ آئی۔ اس کے بعد اپنی اڑائی کئی دہ بھی خشکی کے موجود نہ ہونے سے واپس آ گئی۔ سب سے آخر میں ایک کوچھوڑا گیا اس کی پرنڈ سے یہ معلوم کر لیا کہ طوفان ٹھم گیا ہے اور بانی بابا ہو گیا ہے اس لیے وہ کشتی کے قریب تو آیا مگر اندر داخل ہوا۔ یہ دیکھ کر جی سدا نے باقی کے جنگلی جانوروں کو چھوڑ دیا جو چاروں طرف منتشر ہو گئے اور وہ خود اپنے کنبہ اور دوستوں سمیت ایک پہاڑ کی چوٹی پر جو باس ہی تھا چڑھ گیا جہاں اس نے اپنی سلامتی کے شکرانہ میں دیوتاؤں کو قربانی دی۔ ”جی سدا کی داستان“ از پروفیسر کبلے مندرجہ سالانہ سنٹیمنٹل سچری ایسٹ جون ۱۸۹۱ء

جی سدا کا یہ قصہ طوفان نوح کی روایت سے اس قدر مشابہ ہے کہ قیاس یہی چاہتا ہے کہ دونوں قصے ایک ہوں۔ اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ طوفان وادی فرات میں واقع ہوا اور حضرت نوح بھی اسی سرزمین میں مبعوث ہوئے تھے تو اس قیاس کو مزید تقویت ہوتی ہے کہ نوح اور جی سدا ایک ہی شخص کے دو مختلف نام ہیں یا ممکن ہے کہ تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہو اور جی سدا کی سرگزشت نوح کو پیش آئی ہو۔ پروفیسر کبلے نے اس مضمون میں جس کا ہم نے حوالہ دیا ہے بولال قاطع ثابت کر دیا ہے کہ جی سدا والا طوفان مقامی تھا عالمگیر نہ تھا۔ جن حضرات کو ان دلائل سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہو وہ چھوٹے متذکرہ کا مطالعہ فرمائیں۔ پس اگر جی سدا اور نوح ایک نہ ہوں تو طوفان نوح بھی جی سدا کا طوفان سے بعد میں آیا ہو گا ضرور کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے صرف مقامی ہو۔

ان خلاف عقل قیاسات کی ذمہ دار تورات ہے کہ طوفان عالمگیر تھا جس نے روئے زمین کے حیوانات

ختم ہو جاتی ہے۔ وروہ صرف ایک خاندان یعنی نسلِ سام کے حالات کی تفصیل کر لئے اپنے قلم کو وقت کر دیتا ہے۔

ڈیوک آف آرگل نے اپنی کتاب ”براہیمبول مین“ (انسانِ اولین) میں اسی تحدید پر قلم اٹھا کر

نوٹس صفحہ ۳۰۷۔ دہانات کو تباہ کر دیا اور حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں نے زمین کو از سر نو آباد کیا۔ اسلیٰ قصہ کی حقیقت جو عوامِ عامی کو غالباً کسی سرِ پانی افسانہ سے ملا ہے صرف اسی قدر ہے کہ حضرت نوحؑ یا جو کچھ بھی اُن کا دوسرا نام ہو اُس مصیبت سے پیش از پیش آگاہ ہو گئے جو اُن کی قوم میں بھلے طوفان آنے والی تھی اور ایک کشتی تیار کر کے مع اپنے قبائل و رزق کے اُس میں سوار ہو گئے اور اس طور پر تباہی سے بچ گئے۔ جب تورات میں تحریف شروع ہوئی تو اس قصہ پر تحریفیں کی سرِ پلے لگائی اور اداہم پرستی نے بہت کچھ لا حاصل ولا یعنی افسانے کر دیے۔

قرآن مجید میں بھی قصص احکامات موجود ہیں لیکن باوجودیکہ اُن کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ ان قصوں کے پڑھنے والے ان سے محض ایک اخلاقی سبق یا پیرائیشیل حاصل کریں پھر بھی دور از کار اور پاور ہوا سبالتہ کے عنصر کو ان میں سے نہایت احتیاط کے ساتھ خارج کر دیا گیا ہے جو آج کل یورپ کے علم و تفریح کا آماجگاہ بنا ہوا ہے اور جس کی وجہ سے تورات اہل سائنس کی نظروں میں لغویات و مزیخانات کے ایک مجموعہ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی۔

واقعہ طوفانِ نوح کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید تورات کی تصدیق کرتا ہے لیکن صرف اُس حد تک جس حد تک حقیقت نفس الامر ہی کو تعلق ہے۔ وہ اس کے تحریفی مقامات کا تصدیق نہیں کرتا بلکہ جہنمی کا نشانہ نہیں بنا۔ اُس نے یہ کہہ کر کہ ”لقد ارسلنا نوحا الی قومہ فقال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ“ صاف بتا دیا ہے کہ حضرت نوحؑ اپنی قوم یا امت کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے کل دنیا کی رہبری کے لیے امور نہ ہوئے تھے اور اس لیے طوفان کا عذاب اُن کو جھٹلانے کی پاداش میں عالمگیر نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی توضیح ایک دوسرے مقام پر اس طرح کی گئی ہے۔

فلن بوءا فاجبینا و اللذین معہ فی الفلاک واعزتنا الذین کنز بآیتنا انہم کانوا قوماً

معانی کے پھول یوں برساتے ہیں کہ سام کے خاندان کا شجر نسب ہمارے لیے بجز اس واسطے  
 اعلام کی ایک فہرست کے اور کوئی مسمی نہیں رکھتا۔ یہ ایک ایسا شجر ہے جس میں خاندان  
 کروڑوں انسانی خاندانوں کے جو اُس وقت روئے زمین پر پہلے سے آباد تھے صرف  
 گنتی کے چند خاندانوں کی سلسلہ سلسلہ نسب شمار کی گئی ہے۔ بجز اس ترتیب نسب کی  
 اور کچھ نہیں بتایا گیا اور اس ترتیب کا مسلسل و مکمل ہونا بھی یقینی نہیں ہے۔ زمین یہ مطلق نہیں  
 بتایا گیا کہ اُس سیادہ پردے کے پیچھے کیا ہے جس پر یہ چند نام کسی فائوس خیالی کے  
 نقوش کی طرح گزرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں لیکن باہر یہ پردہ کچھ کچھ دیر کے  
 لیے اٹھ جاتا ہے اور ہمیں اُن عظیم الشان واقعات کی تشکیل دکھائی دے جاتی ہیں جن کا  
 عمل مدت ممتد سے جاری ہے۔ یہ تشکیل بالکل و عندلی اور مدہم ہیں اور اُن کی صرف پرچھائیں  
 سی نظر آتی ہے۔ ان کی حرکت کا رخ بھی ہم کو صاف صاف محسوس نہیں ہوتا۔ البتہ آوازین  
 سنائی دے رہی ہیں جو کان میں بہت سی امواج آب کے شور کی طرح پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں  
 پتھلے نے اس بارہ میں حسب ذیل رائے ظاہر کی ہے جس کے ساتھ ہمیں پورا  
 اتفاق ہے: یہ تحقیقات کہ نورات کی پہلی پانچ کتابچوں مختلف تصانیف سے تالیف کی گئی  
 ہیں نہ صرف عہد عتیق کے تاریخی مقامات کی تاویل یا مناسب ہوگا اگر یوں کہا جائے کہ  
 کل الہیات و تاریخ کی تاویل کے لیے نہایت ہی ضروری ہے بلکہ فن انتقاد و ادب کی تاریخ  
 میں بھی اس سے زیادہ یقینی اور موثق تحقیقات کا ہونا ممکن نہیں۔ جو فریق کو یہ تنقید سے  
 نا بلند ہے وہ خواہ کیسی ہی تاویلات بار دہ عذرات رکھے کہ یوں نہ پیش کرے لیکن اس میں شک

نوٹ بقیہ صفحہ ۳۰۸ عین۔ جس سے ثابت ہے کہ صرف وہی لوگ تباہ ہوئے جنہوں نے آیات ربانی  
 کو جو بواسطہ نوح علیہ السلام نازل کی گئی تھیں جیتلایا کشتی کے بنائے جانے حضرت نوح اور اُن کے  
 اہل ایمان پیروں کے اُس پر سوار ہونے اور طوفان کفر و کفر نے پرکشتی کے ایک ایسے مقام پر جاکر ٹھہرے اور اُن  
 سب لوگوں کے بچ جانے کا واقعہ قرآن میں بہ تفصیل درج ہے لیکن یہ تفصیل ایسی نہیں ہے جو نورات کی تفصیل کی طرح  
 خستہ و برباد ہے۔

نہیں کہ جب تک امتقاد کے اصول قائم ہیں اس وقت تک اس حقیقت کے مسلم الثبوت ہونے میں کوئی رخصۂ نہیں پر سکتا۔ لکنہ آفرینی و وقیعہ سنجی کی بس بلندی پر صدیوں کی تدقیق و تحکیم کے بعد ہم آج پہنچے ہیں اس پرچہ کو اگر کوئی غیر متعصب اور حقائق آشنا شخص اس حقیقت پر نظر ڈالے گا تو ممکن نہیں کہ وہ اس کے نتائج سے متاثر نہ ہو۔

ایسی حالت میں کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم ان صحائف سے ابا کرین؟ کیا اس امر کا اعتراف کر باغ عدن کے مہبوط کی داستان ایک فرضی روایت ہے مسیحیت کے سب سے زیادہ مقدس و متعقن عقیدے یعنی کفارہ کے مسئلہ کو نیست و نابود نہیں کر دیتا؟

بہین چاہیئے کہ ٹھنڈے دل سے اس حقیقت پر غور کریں مسیحیت کو قرون اولیٰ میں جبکہ وہ دنیا کو اپنا حلقہ گوش بنارہی تھی یا مسخر کر رہی تھی اس عقیدہ کا یا تو مطلق علم نہ تھا یا تھا تو اس قدر تھا کہ اس کا مہونا نہ ہونا برابر تھا ہم دیکھ چکے ہیں کہ ترمیلین نے اپنے جواب میں جہاں مسیحیت کے اہل ارکان گنا سے ہیں وہاں مسئلہ کفارہ کا کہیں ذکر نہیں کیا جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اگر اس کو اس مسئلہ کا علم تھا بھی تو اس کے نزدیک مسیحیت کے اصول میں شمار ہونے کے قابل نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کفارہ کے مسئلہ کو اول اول فرقہ اداریہ کے اہل بدعت نے رواج دیا۔ اسکندریہ کے طبقہ متاہدین کو اس کا اعتراف نہ تھا۔ پیدشویان کلیسا نے کبھی اس پر زور نہ دیا جس پادری نے کفارہ کو اس العقاید بنا دیا وہ اسلم تھا فلو جوڈیس لکھتا ہے کہ قصہ مہبوط محض ایک تمثیل ہے۔ آریجن کی اسے میں واقعہ مہبوط ایک رمز مجازی ہے۔ شاید بعض پرانے کلیساؤں پر مصوٰلیت کے ساتھ مہابست و مناقضت کا الزام لگایا جاسکتا ہے اس لیے کہ وہ اسے ایک لحاظ سے مجازی اور ایک لحاظ سے حقیقی تصور کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم ان کے ہم آہنگ ہو کر یہ تسلیم کر لیں کہ سانپ سے کتا یہ شیطان مراد ہے تو کیا کل قصہ ایک استعارہ میں تحلیل ہو جائے گا؟

افسوس ہے کہ کلیسا سے عیسوی نے تورات کی حمایت کی بلا کو خود ہلا کر اپنے گلے لگالیا

ہے اور اس کی سرحدی اضداد و اغلاط کی ذمہ داری برضا و رغبت خود اپنے اوپر عاید کر لی ہے اس کتاب کو برحق ثابت کرنے کی کوشش بصورت امکان یہودیوں کے لیے چھوڑ دی گئی چارویں تھی کہ ادھنیں کی یہ کتاب ہے اور انہیں سے عیسائیوں تک پہنچی ہے۔ زیادہ تر افسوس اس بات کا ہے کہ تورات کی پہلی پانچ کتابیں جو اپنے اسقام و نقایص کی وجہ سے زمانہ حال کے انتقادی حلقوں کی تاب نہیں لاسکتیں سائنس کے حق میں بمنزلہ قول فیصل سمجھی گئیں۔ مخفی نہ رہے کہ ان کتابوں کی تعلیمی حکمرانوں نے والے مخالفین و معاندین نہیں مین بلکہ ایسے ایسے صاحب زبرد و درع علماء مسیحی ہیں جن میں سے بعض کی جہالت قدر مسلم ہے۔

پرائٹنٹ کلیساؤں نے نو کتب مقدسہ کو میثاق قرار دیا لیکن کیتھولک فرقہ کے لوگ اس زمانہ میں بھی باپاے روم کے معصوم ہونے کے قابل میں شاید یہ کہا جائیگا کہ اس عصمت کا اطلاق صرف اخلاقی یا مذہبی امور پر محدود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دینی اور دنیوی امور کا خطا فاصل کس مقام پر کھینچا جائے گا؟ معرفت مطلق یعنی ہمہ دانی کا حصر چند خاص خاص مسائل پر نہیں ہو سکتا ایسی معرفت کی نوعیت ہی کل اشیاء کے خفایاں کے ادراک کی مستلزم ہے اور اس لحاظ سے عصمت عن الخطا ہمہ دانی کی مترادف ہے۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر اطالوی مسیحیت کے اصولی عقاید کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ باپاے روم کا خاظمی ہونا ممکن نہیں۔ ہمارے لیے یہ ضرور نہیں ہے کہ منطق کی اس شکل کی غیر فلسفیانہ نوعیت پر بیٹھیں جو سے غور کیا کریں۔ باپا بیت کی سیاسی تاریخ اور باپاؤن کے سوانح عمری کی تہذیب اس شکل کو مسخ کیے دیتی ہے تاریخ پر تہذیب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ غلطیاں اور خطائیں دکھائی دیتی ہیں جن سے انسان کی سرشت مرکب ہے اور باپا پان روم کی بیہوشی کے مطالعہ کا جب ہم کو اتفاق ہوتا ہے تو بے کاری اور بغیر غیبتی کی داستان پیشہ میں آتی ہے۔

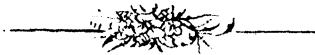
مکن نہ تھا کہ روشن خیال اور باطنی نظر کیتھولک عقیدہ عصمت باپاوی کو بلا چون و چرا



تسلیم کر لیں۔ جن لوگوں کو اس عقیدے کے تسلیم کرنے میں تاہل ہے اُن کی نارنما مندی  
 وسست و اشتداد کے لحاظ سے روبرو ترقی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو عقیدہ فطرت انسانی  
 سے اس درجہ مغایرت رکھے گا اُس کا یہی حشر ہوگا۔ بہت سے کیتھولک ایسے ہیں جن کا  
 یہ خیال ہے کہ عصمت اگر فی الاصل موجود ہے تو بجز مجالس عمومیہ مسیحیہ کے اُن کا وجود  
 اور کہیں نہیں۔ لیکن واضح ہے کہ خود ان مجالس کو بھی اتفاق اجماعی کی نعمت ہمیشہ نصیب  
 نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ بہت سے لوگوں کو فراموش نہیں ہوا کہ کونسلوں نے باپا پان روم کو  
 معزول بھی کیا ہے اور اُن کے ہفتوات و خطبیا کی نسبت مخالف تجاویز بھی صادر  
 کی ہیں۔ پرائسٹنٹون کا یہ سوال بے وجہ نہیں ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ کلیسا  
 عصمت کی صفت سے متصف بھی ہے؟ اس امر کی کیا شہادت ہے کہ کلیسا کے اغراض  
 و مقاصد کی حفاظت کسی کونسل میں منصفانہ اور واجبی طور پر کی گئی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اُن  
 حق قلت راے پر منحصر نہ ہو بلکہ کثرت راے پر مبنی ہو؟ کیا یہ بات اگر فراموش نہ کی جائے  
 آئی کہ ایک فرد واحد کی حقیقت شناسی صحیح راے کے قیام کا باعث ہوتی ہے اور باقی تمام  
 لوگوں نے اُسے جھوٹا سمجھ کر اور اُس کو اذیتیں پہنچا کر آخر کار مجبوراً اُسی کی راے کو تسلیم  
 تسلیم ہے اور کیا تمام بڑے بڑے اکتشافات کی تاریخ یہی نہیں ہے؟

سامنس کو ان حریفوں میں مصالحت کرنے سے کچھ سروکار نہیں اُس کی یہ کام نہیں ہو کہ اس امر کا فیصلہ  
 کرتا پھرے کہ اہل مذہب کو معیار حق اہل کی آیات میں ڈھونڈنا چاہیے یا مجالس عمومیہ مسیحیہ کے فیصلہ جات  
 میں یا باپا سے روم کے فرامین میں۔ وہ صرف اس حق کا مطالبہ کرتا ہے کہ جس طرح اُس نے دوسروں کو رہنا  
 معیار خود قیام کریں کی اجازت دے رکھی ہو اسی طرح اُسے بھی اپنا خاص معیار قیام کر لینے دیا جائے اگر وہ غیر  
 تاریخی روایات کو بہ نظر حقارت دیکھتا ہے یا اس ادعا پر کہ کثرت راے ذریعہ احقاق حق ہے  
 مطلق امتنا نہیں کرتا یا انسان کے دعوئے عصمت کی تنقید کو واقعات آتیہ کے سپرد  
 کر دیتا ہے تو خود اپنے ساتھ بھی اسی سرد مہری اور غیر جنبہ داری سے پیش آتا ہے۔ اگر

اُسے معلوم ہو جائے کہ مسئلہ کشش ثقل یا مسئلہ ارتعاش نذر واقعات سے تو افاق نہیں رکھتا تو وہ بلا تامل ان مسائل سے قطع تعلق کر لے اُس کا جبروتہ الہام کتاب فطرت ہے جس کے ادراک ہر وقت ہر شخص کے مطالعہ کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ یا ان نکتہ دان کے لیے اس کی صلاح عام ہے۔ اپنے اصول کی اشاعت کے لیے وہ نہ کسی انجمن کی حمایت کا محتاج ہے نہ کسی جماعت کی تصدیق خوانی کا رہین منت اُس کی وسعت غیر محدود اور اس کا مرد و پادشاہ ہے اور اسی لیے انسان کا استکبار و تعصب اس کے ساتھ ساز و باز نہیں کر سکا۔ زمین پر ہر شاندار اور خوبصورت چیز میں اس کا جلوہ دکھائی دیتا ہے اور آسمان پر اس کی داستان شمس و یازند و نجوم لامعہ کے لوزانی حروف میں لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔



# نوان باب

## نزل ع در بارہ انتظام عالم

انتظام عالم کے تصور کی دو حقیقتیں ہیں اول بذریعہ توفیق ربانی دوم بذریعہ قانون بشری اول کا تعلق پیشوایان مذہب سے۔ بشری ثانی کی ترویج کا مختصر بیان۔

پکڑ دہ قوانین دریافت کرتا ہے جو نظام شمسی پر مبنی ہیں۔ پاپا سے روم اس کی تفصیل کی تکمیل کرتا ہے۔ آدنی فلسفہ حرکات و عمل کی بنیاد لگاتا ہے۔

تکلیف عظیم ترکیب الاجرام کے اصول قوانین دریافت کرتا ہے۔ حیوٹ اجماع سادہ کی حرکات کو ان قوانین کے قیود و ضوابط میں لاکر ثابت کرتا ہے کہ نظام شمسی کی عنان نظم و نسق مہند سادہ جبر کے ماتحت مہین ہے۔ ہر شے ثابت کرتا ہے کہ کل کائنات اسی قانون کی تابع فرمان ہے۔ مسئلہ خفاہ الفجر تم اس پر مشاہدین کے اعتراضات۔

اس امر کا ثبوت کہ ترکیب ارضی و فطریہ سلسلہ نباتی و حیوانی تابع قانون ہے۔

نباتات و حیوانات کا ظہور بذریعہ پیدائش زمین ہوا بلکہ بذریعہ ارتقا۔

حکومت قانون کا ثبوت انسانی جماعتوں کے تاریخی حالات اور غیر افراد انسانی سے

بہم پہنچتا ہے۔

اصلاح یافتہ کلیات دین سے بعض اس خیال کو کسی قدر زہیم کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔

طریقہ نظم و نسق عالم کی دو تاویلین کی جا سکتی ہیں یا تو ہر واقعہ خدا کی دستِ اعجازی و مددِ خلت سے پیش آتا ہے اور یا غیر متبدل و غیر متغیر قانون کا عمل انتظام دنیا کا ذمہ دار ہے۔

قسیموں کا ہونے اور مذہب کے پیشواؤں کا رجحان ہمیشہ پہلی تادیل کی طرف ہونا سب سے  
 کہ ان کی دلی تمنا یہی ہے کہ عبادت گزار کی دعا اور لطیفہ غیبی کے درمیان ان کی حقیقت  
 حاجب یا شفیع کی سمجھی جائے۔ اس تادیل کی اہمیت کو لطیفہ غیبی کی نوعیت کی تعیین کا دعو  
 اور بھی بڑا دیتا ہے۔ چنانچہ مسیحیت سے پہلے رومانی بہت پرستوں کے مذہب میں کامیاب  
 کا فرض یہ ہوتا تھا کہ غیب دانی یا شگون شناسی کے ذریعہ سے یا جاثورون کے مردوں  
 کو دیکھ کر یا دیوتاؤں کی استقامت و رضا جوئی کے لیے جھٹ چڑھا کر دعا و تمنا آئندہ کی  
 نسبت حکم لگائیں۔ جب مسیحیت کا دور آیا تو رازداران شریعت کا پایہ قدرت اس سے بھی  
 اونچا ہو گیا یعنی پارہیوں نے یہ دعویٰ پیش کر دیا کہ ہم اپنی سفارش یا شفاعت کے ذریعہ  
 معاملات عالم کے انضباط و انقیاد میں حصہ لے سکتے ہیں۔ آفات و بلیات کو ٹال سکتے ہیں  
 نعمتات و دنیوی کا انعام دلا سکتے ہیں۔ معجزے اور کرامتیں دکھا سکتے ہیں بلکہ قانون قدرت  
 تک کو بدل سکتے ہیں۔

پس کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس مسئلہ کو کہ کائنات کا انتظام غیر متغیر قانون کے تابع ہے  
 بہ نظر استحسان دیکھیں۔ اس مسئلہ سے ان کی شان میں بڑھ لگتا تھا۔ ان کی وقعت میں فرق آیا  
 جاتا تھا۔ ایسا خدا ان کے نزدیک بہایت ہی سبب و مکر وہ محتاج پر انسان کی التجاؤں  
 اور منتوں کا مطلق افزہ ہو سکے جس کی سر دہری و بے اعتنائی اس سے بندہ کے حضور و  
 خضوع پر ملتفت نہ ہونے سے اور جو حیرت و تقدیر کی خوفناک بیہوشیوں میں جکڑا ہوا ہو۔

لیکن اجرام سماوی کی باقاعدہ حرکت ہر زمانہ میں از باب بعیرت کے دل پر ایک گہرا اثر  
 ڈالے بغیر نہ رہیں۔ آفتاب کا طلوع و غروب و دن کی روشنی کا بڑھنا اور گھٹنا۔ قمر کا کمال و  
 زوال موسموں کا اوقات مقررہ پر نمودار ہونا۔ سیاروں کی چچی نمی حرکت۔ یہ اور اسی قسم کے  
 ہزار ہا نشانات اگر قدرت کے باقاعدہ و غیر متغیر عمل کے کستے نہیں تو کیا ہیں۔ جو لوگ ابتداء  
 اس نتیجہ پر پہنچے ان کے دل میں شاید کسوت و غصہ کے مشاہدہ سے یہ سوچ کر خدشہ پیدا ہوا ہو

کہ قدرت کی روش مسترد میں یہ ناگہانی اور نامعلوم تغیر کیسا لیکن کسوف و خسوف کے  
مکرار اور اس تحقیقات نے کہ ان کے اوقات ظہور کی نسبت حکم مطلق لگایا جا سکتا ہے یہ شدہ  
مطلقاً منادیا ہوگا۔

فلکیات کی نسبت ہر قسم کی پیشین گوئیوں کا انحصار اس واقعہ کے اعتراف پر ہے کہ  
قوانین قدرت کے عمل میں آج تک نہ کوئی مداخلت یا تبدیلی ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔  
سائنس دان فلسفی کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی جو حالت کسی ساعت معینہ میں پائی جائے گی وہ  
حالت ساعت سابق کا بلا واسطہ نتیجہ اور حالت ساعت مابعد کی بلا واسطہ علت ہوگی۔ قانون  
اور بحث جبر اضطراری کے محض دو مختلف نام ہیں۔

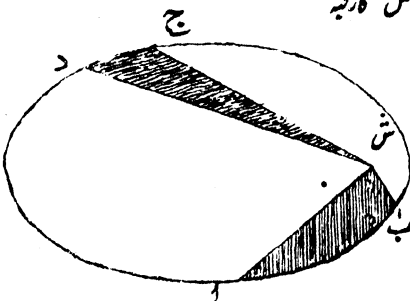
کوپرنیکس کی وفات کے کوئی پچاس سال بعد جان کپلر ساکن ورمبرگ نے سیاروں کو  
ابعاد و اوقات اور سرعت رفتار و اشکال ادوار کی تحقیقات شروع کی۔ کپلر اس مسئلہ کا  
قابل تھا کہ آفتاب مرکز عالم ہے اور اسکو یقین واثق تھا کہ آفتاب کے گرد جو سیارے  
گھومتے ہیں ان کی گردش کو آپس میں ربط و تعلق ہے اور اگر ان گردشوں کی صفحہ کے ساتھ  
جانچ کی جائے تو جن قوانین کی یہ حرکات تابع ہیں وہ معلوم ہو سکتے ہیں۔ کپلر نے اس مقصد  
کی تکمیل کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مانگو برہمی اور دوسرے ہیئت دانوں کے جو جوار فلکات  
و مشاہدات فلکی اُس کے ہاتھ آئے انہیں ان اندازوں کے ذریعہ سے جانچا جو مختلف  
قیاسات پر مبنی تھے اور اگر کوئی قیاسی اندازہ مشاہدات کے مطابق نہ ثابت ہوا تو اسے  
خارج کر دیا۔ کپلر کو جو محنت اس کام میں اٹھانی پڑی اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے چنانچہ وہ  
خود کہتا ہے کہ سوچتے سوچتے اور حساب لگاتے لگاتے میری یہ حالت ہو گئی کہ قریب تھا  
کہ میں دیوانہ ہو جاؤں۔ آخر اس محنت کا اُسے ثمرہ ملا اور قلم جزمین اُس نے اپنی کتاب  
”حرکات سیارہ مربع“ شائع کی جس کتاب میں حرکات مربع کو اس نے اس قیاس کے  
ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی تھی کیا اسے آفتاب کے گرد اس وضع میں گردش

کرتے ہیں کہ اُن کی حرکت سے ایک کامل دائرہ بن جاتا ہے جس کا مرکز آفتاب ہوتا ہے اور سیارہ دوار اس دائرہ کے محیط پر اپنے مرکز کو رکھ کر اپنے محور پر گھومتا ہوا آفتاب کے گرد دور د کرتا ہے۔ لیکن بعد میں کپلر کو معلوم ہوا کہ (۱) سیاروں کا مدار مستدیر نہیں ہے بلکہ اہلیجی الشکل ہے جس کا ایک مرکز آفتاب ہوتا ہے اور (۲) سیارہ سے بجانب آفتاب جو خط متحرک کہینچا جائے اُس کی جیبیت میں نقصان جو منقطع آتا ہے اُسے سیارہ کی زمانہ گردش سے برابر کی نسبت ہوتی ہے۔ یہ دونوں اصول اب کپلر کے پہلے اور دوسرے قانون

۱۔ اگر دسویوں کو ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ پر ایک دفتین میں گاؤں میں تارے گا ایک گروہ زہرہ حلقہ ڈالاجے اور پٹیل کی نوک سے تارے کو تار کر تیناؤں کے ساتھ ساتھ نوک کو حرکت دی جائے تو جو بیضی شکل پیدا ہوگی وہ شکل اہلیجی کہلائے گی۔ دونوں سوئیاں اس شکل کے دو مرکز ہوں گے۔ سوئوں میں جس قدر زیادہ فاصلہ ہوگا اُسی قدر اس شکل کی اہلیجیت زیادہ ہوگی۔ اور جس قدر کم فاصلہ ہوگا اُسی قدر یہ شکل دائرہ کو قریب ہوگی تا آنکہ اگر دونوں سوئوں کو ملا دیا جائے اور پھر دُوری تان کر پٹیل کی نوک سے حلقہ کہینچا جائے تو بجائے شکل اہلیجی کے کامل دائرہ پیدا ہو جائے گا۔ مترجم

۲۔ سر رابرٹ ہال نے اپنی کتاب "دی اسٹوری آف دی ہیوس" (داستان افلاک ہمیں اس قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "ہر سیارہ آفتاب کے گرد ہر نقطہ پر جس رفتار کے ساتھ گھومتا ہے اُس کی سرعت اس قدر ہوتی ہے کہ اگر اس نقطہ سے بجانب آفتاب ایک خط کہینچا جائے تو وہ خط مساوی رتبہ کو مساوی زمانوں میں طے کرے گا۔"

مثلاً اگر شکل ذیل میں اب ش اور ج و ش کا رتبہ



مساوی ہو تو جو سیارہ یہ شکل اہلیجی بناتا ہوا آفتاب کے گرد گھومے گا وہ اب کو باوجود کہ اُس کا فاصلہ ج و د سے زیادہ ہے ایک ہی وقت میں طے کرے گا اس کی وجہ یہ ہے

کے نام سے موسوم ہیں۔ آٹھ سال بعد کپلر نے تیسرا قانون دریافت کیا جس نے آفتاب اور سیاروں کے اوسط درمیانی فاصلہ اور اُنکے زمانہ گردش کے باہمی تعلقات کی تیسرین کردی۔ اس قانون کے الفاظ یہ ہیں: گردش کے زمانے کا مربع اوسط فاصلہ کے مکعب سے برابر کی نسبت رکھتا ہے۔ اس قانون کا اعلان کپلر نے اپنی کتاب ”مختصر نظام

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۱۷ء کہ اب کا موقع دے دے کے مقابلہ میں شش یعنی خمس سے زیادہ قریب ہے اور ازروے اصول حرکت سیارہ اس منظر میں پہنچتے ہی بوجہ قریب آفتاب زیادہ سریع السیر ہو جاتا ہے لیکن منطقہ ج و چونکہ آفتاب سے نسبت زیادہ دور ہے لہذا یہاں سیارہ کی رفتار اسی نسبت سے سست پڑ جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقت مرد و مساوی ہو جاتا ہے۔ مترجم

لے چونکہ سیاروں کی حرکت کامل الاستدار نہیں ہے بلکہ الیملی ہے لہذا گردش کی حالت میں ہر سیارہ کا فاصلہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے لیکن باوجود اس تبدیلی کے ہم اس فاصلہ کا تین اس کا اوسط نکال کر حرکت ہر جہ کی سب سے زیادہ آسان شکل یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ فاصلہ کو کم سے کم فاصلہ کے ساتھ جمع کر کے اُس کا نصف لے لیا جائے۔ یہ نصف مقدار اوسط فاصلہ کہلائے گی۔ کپلر اچھی طرح جانتا تھا کہ مختلف سیاروں کا زمانہ گردش مختلف ہوتا ہے اور اُسکو یہ بھی معلوم تھا کہ اوسط فاصلہ جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر زمانہ گردش بڑا ہوگا۔ اس علم کی بنا پر اُس نے دونوں کی باہمی نسبت دریافت کرنی چاہی۔ حساب لگانے سے اُسے معلوم ہوا کہ زمانہ گردش اوسط فاصلہ سے برابر کی نسبت نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے کہ اگر یہ نسبت صحیح سمجھی جائے تو جس سیارہ کا اوسط فاصلہ دوسرے سیارہ کے اوسط فاصلہ سے دگنا ہوگا اُس کا زمانہ گردش بھی دوسرے سیارہ کے زمانہ گردش سے دگنا ماننا چاہیے۔ حالانکہ مشاہدہ اس کی نفی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ بعید سیاروں کا زمانہ قریب سیاروں کے زمانہ کے مقابلہ میں دگنے سے زیادہ اور گنے کے قریب ہے۔ کپلر نے اپنی فوق العادت مہندسان قابلیت سے اُس محنت کے بعد جو کسی معمولی دماغ کے انسان کو دیوانہ بنا دیتی آخر میں صحیح نسبت دریافت کر لی جو اُس کے تیسرے قانون میں مضمر ہے۔

کو پرنیکس "مین جو مشاہدہ میں شائع ہوئی کیا تھا اور یہ بات ثابت کی تھی کہ آثار مشتری اسی تانہٹ کے تابع ہیں اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ جو قوانین نظام شمسی کے اعضاء ریس کی حرکات کبیرہ پر حاوی ہیں انہیں کا اطلاق اس کے حواشی کی حرکات صغیرہ پر بھی ہوتا ہے۔

کپلر کے اکتشافات سے قانون غیر متغیر کا جو لازمی تصور پیدا ہوتا ہے اور نظر باریکی مرکز کے مقابلہ میں نظریہ شمسی مرکز کا جو ثبوت ان سے ہم پہنچتا ہے وہ پیشہ ایمان کلیسا کو براہ راست کیے بغیر ردہ کا چنانچہ محکمہ ترتیب فہرست کتب عمرہ نے جب نظام کو پرنیکس کی تکثیر ان الفاظ میں کی کہ اس کی تعلیم کتاب مقدس کے خوا کی نقیض ہے تو کپلر کے "خلاصہ" کو بھی ممنوع الاشارہ قرار دیا۔ اسی موقع پر کپلر نے وہ عذر پیش کیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس مناقرہ اعتذار کے الفاظ یہ ہیں: "حرکت ارض و استقرار شمس کے متعلق کو پرنیکس کے مسائل اسی سال سے کسی قسم کی مخالفت باجماعت کے بغیر پر اشاعت ہیں اس لئے کہ مسائل طبعیہ پر بحث کرنا اور خدا کی صفت و حکمت کے چہرے سے پردہ اٹھانا جائز قرار دیا گیا تھا لیکن آج جبکہ مسائل کی حقیقت کی تائید میں وہ شہادت ہم پہنچی رہے ہو کلیسا کے ارباب علم و عقیدہ کو معلوم نہ تھی تو کائنات کے نظام ترکیبی کی معجزہ ہریت کی اشاعت کی مخالفت کی جاتی ہے!" کپلر کے حاصرین میں سے کسی کو بھی اس کے دوسرے قانون کی صحت کا یقین نہ تھا۔

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۱۸۔ سر رابرٹ بال اس قانون کی شرح اس طرح کرتے ہیں: "مثال کے طور پر ہم کو زمین اور سیارہ زہرہ کا مقابلہ کریں گے۔ اگر آفتاب سے زمین کا اوسط فاصلہ کافی فرض کیا جائے تو سیارہ زہرہ کا اوسط فاصلہ ۳۳ ۴۲ ۵۰ ہوگا۔ اگر کوئی اشاریہ کو پہلی کسر کے بعد حذت کر دیا جائے تو زمین کا زیادہ گردش ۳۶۵ ۵ ۳ دن اور زہرہ کا ۲۲۴ ۵ دن قرار پاتا ہے۔ کپلر کا قانون کہتا ہے کہ ۳۶۵ ۵ ۳ کا مربع ۲۲۴ ۵ سے وہی نسبت رکھتا جو ہوا یک کو ۳۳ ۴۲ ۵ کے مکعب سے۔ چوں اس نسبت کی تصدیق مزب کے عمل کے ذریعہ سے آسانی کی جا سکتی ہے۔"



اور نیوٹن کی کتاب "پرنسپیا" کے نتائج ہونے سے پہلے کسی نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانین کپلر کا فلسفیانہ مفہوم اُس زمانہ میں کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ خود اُن نتائج سے بے خبر تھا جو آگے چل کر لامحالہ ان سے نکلنے والے تھے۔ اُس کی غلطیاں تباہی ہین کہ یہ نتائج اُس کے ذہن سے کوسوں دور تھے مثلاً اُس کا خیال یہ تھا کہ ہر سیارہ ایک نفس ماطقہ کا جو درک کلیات و جزئیات سے غلط و مہبط ہے۔ اور پانچوں بڑے سیاروں کے ادوار کی مقدار علم ہندسہ کے محاسبات خمسہ کے ساتھ نسبت رکھتی ہین۔ ابتداء وہ یہ سمجھتا تھا کہ سیارہ مریخ کا دور بیضوی شکل ہے لیکن کہیں مدتوں کی دماغ سوزی کے بعد جا کر اُسے اس عظیم الشان حقیقت کا علم ہوا کہ یہ شکل الہیاجی ہے۔ اس خیال کی بنا پر کہ اجرام سماوی فساد و زوال سے مندرہ ہین ارسطو کا یہ عقیدہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ان کی حرکات کامل الاستدار ہین اور بجز حرکات مستدیر کے اجرام سماوی میں اور کسی قسم کی حرکت نہیں پائی جاتی۔ کپلر تلخی کے ساتھ شکایت کرتا ہے کہ یہ عقیدہ اس زمانہ کا چور ہے۔ اُس کی فلسفیانہ جبارت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس عقیدہ کا جو جبر لوگ صدیوں سے بلا چون و چرا تسلیم کرتے چلے آئے تھے اُس نے یک بیک پس پشت ڈال دیا۔

بعض اہم مسائل میں کپلر کی رائے نیوٹن پر سبقت لے گئی ہے اور کپلر الفضل للمقدم کا مصداق قرار پاتا ہے۔ مثلاً اصول کشش ثقل کے متعلق صحیح صحیح خیالات اول اُسی نے ظاہر کیے ہین اُس کا بیان ہے کہ مادہ کا ہر ذرہ اُس وقت تک حالت سکون میں رہتا ہے جب تک کوئی دوسرا ذرہ اس سکون میں خلل انداز نہ ہو۔ پتھر کی ایک سل اگر زمین کو اپنی طرف کھینچتی ہے تو زمین اُس سل کو اور بھی زیادہ قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اجسام ایک دوسرے کی طرف اپنے اپنے ثقل کی مناسبت سے حرکت کرتے ہین۔ زمین میں اور چاند میں جو فاصلہ ہے وہ چوٹن برابر حصوں میں تقسیم کیا جائے۔

تو زمین چاند کی طرف اگر اس میں سے بعد ایک حصہ کے بڑے گی وہ چاند باقی تری میں سے  
 طے کرے گا۔ کپلر یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ سمندر میں مد و جزر کشش قمر کی وجہ سے واقع ہوتا ہے  
 اور سیاروں کی وجہ سے مژدہ ہے کہ حرکات قمر کے تناسب میں ظل پیدا ہو۔

ہیئت کی ترقی کے تین دور قرار دئے جاسکتے ہیں۔ دور اول اجرام سماوی کی اعتباری  
 یعنی ظاہری حرکات کے مشاہدات اور تصاویر سے تعلق رکھتا ہے۔ دور ثانی میں ان کی  
 حقیقی حرکات خصوصاً سیاروں کی گردش کے قوانین کی حکشیف ہوتی ہے اس دور کو کوپرنیکس  
 اور کپلر کے کارناموں فرمایاں کر دیا۔ دور ثالث ان قوانین کے اسباب کی تحقیق کا زمانہ ہے  
 یہ زمانہ نیوٹن نے پایا۔

دور ثانی کا ترقی کر کے دور ثالث جو جابا علم تحریک اجسام کے ارتقا پر مبنی ہے جو  
 اسٹیمس یعنی مدرسا سکندریہ کی مستعدی کے زمانہ سے جا ملے گا۔

سچی یورپ میں لیونارڈ دو واونسی سے پہلے جو سٹارلیمین پیدا ہوا فلسفہ حرکات  
 و خیال کی طرف کسی نے توجہ نہ کی تھی۔ سائنس کے احیا کا سہرا لارڈ بیکن کے سر نہیں ہے  
 بلکہ واونسی کے سر ہے۔ لیکن نہ صرف ریاضیات سے بلکہ بہرہ تھا بلکہ مسائل طبیعیہ کی  
 تحقیقات میں ہندسہ و ریاضی کے استعمال کو غیر مفید خیال کرتا تھا۔ اس نے نظام کوپرنیکس  
 کے تسلیم کرنے سے ازراہ استحقار انکار کیا ہے اور اس پر لغو و مہمل اعتراضات کئے ہیں۔  
 ادھر تو گلیلیو اپنے ہمہ باشان دور بینی اکتشافات کی سرحد پر پہنچا ہوا تھا۔ ادھر لیکن یشکو  
 ظاہر کر رہا تھا کہ علمی تحقیقات میں آلات سے کام لینا سودمند نہیں ہو سکتا۔ طریقہ استقرائیہ  
 یعنی جزئیات سے کلیات کے استدلال کا طریقہ اس سے منسوب کرنا تاریخ کے سبق کو بھلا  
 دینا ہے۔ اس کا فلسفہ عملی اعتبار سے ذرا بھی مفید ثابت نہیں ہوا اور کسی شخص کے دل میں  
 ان تخیلات سے استفادہ کرنے کا خیال تک نہیں پیدا ہوا۔ مجر انگریزی ناظرین کے  
 لیکن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

ڈاؤنسی کے حالات سے ہم آگے چل کر زیادہ مفصل بحث کریں گے اس مقام پر ہم صرف اس قدر لکھنا کافی خیال کرتے ہیں کہ اُسکی جو تصانیف مسودہ کی شکل میں ابھی تک موجود ہیں ان میں سے دو تو میلان کے کتب خانہ میں موجود ہیں اور ایک پیرس میں ہے پیرس والا نسخہ پتو لیں اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ ڈاؤنسی کے ستر سال بعد ولندیزی مہندس میٹوینس پیدا ہوا جس کی کتاب اصول توازن و اعتدال پرست ۱۵۸۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے چھ سال بعد گلیلیو کا رسالہ علم الحركات شائع ہوا۔

اٹلی کے اس نامور شخص کی بدولت علم الحركات کے دو تین اصولی قوانین دریافت ہوئے جو قوانین حرکت کے نام سے موسوم ہیں۔ ان قوانین کی دریافت سے جو نتائج مترتب ہوئے وہ نہایت ہی اہم ہیں۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ حرکات مسلسل مثلاً حرکات اجرام سماوی قوت کے دوا می استعمال و آلات ہی سے قائم رہ سکتی ہیں لیکن گلیلیو کے قانون اول نے ظاہر کر دیا کہ ہر جسم حالت سکون یا حالت حرکت بظاہر غیر متحرک پر قائم رہتا ہے تا وقتیکہ کوئی خلل انداز قوت اُسے اس حالت کے بدلنے پر مجبور نہ کرے اس ابتدائی اصول کا صحیح طور سے سمجھ لینا طبعی ہیئت کے اصولی واقعات کو افہام کے لیے لازمی ہے۔ چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سطح زمین پر تمام حرکات جلد ختم ہو جاتی ہیں لہذا ہم یہ بادی النظری نتیجہ نکالتے ہیں کہ سکون اجسام کی فطری جمہلی حالت ہے۔ پس اگر ہم کو اطمینان ہو جائے کہ ہر جسم سکون و حرکت دونوں میں سے کسی کے ساتھ مساوات نہیں رکھتا بلکہ ہر حالت پر برابر قائم رہتا ہے تا وقتیکہ کوئی مخالفت قوت مخل نہ ہو تو اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم نے اپنی معلومات میں کس قدر ترقی کی ہے۔ اس قسم کی خلل انداز قوتیں جن سے عام حرکات بہاؤ پر چلتا ہے رگڑ اور اندفع ہوا ہیں۔ جب قوتیں موجود نہ ہوں گی تو حرکت استمراری ہوگی۔ پچھانچہ اجرام سماوی جو فضا سے بسیط میں حرکت کر رہے ہیں ایک حال پرستندہ متحرک ہیں۔

تو تون کی مقدار میں خواہ کیسا ہی اختلاف کیمن نہ ہو ان کا عمل بالاشتراك و بالاتفاق اس طور پر ہو گا کہ گویا ایک ہی قوت اپنا اثر دکھا رہی ہے دوسری غیر موجود ہے۔ مثلاً جب کسی توپ کے منہ سے گولہ زمین پر گر ادا جاتا ہے تو وہ بوجہ کشش ثقل کے اثر کے سطح زمین تک ایک خاص وقت میں پہنچتا ہے لیکن اگر اسی گولے کو توپ میں بارود سمجھ کر چھوڑا جائے تو اگرچہ اب یہ ایک ثانیہ میں کئی ہزار فٹ کا فاصلہ طے کر جائے گا لیکن کشش ثقل کا اثر اس پر اب بھی عبیدہ وہی ہو گا جو پہلے تھا۔ تو تون کی آمیزش سے کوئی غلطاطا یا کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ ہر طاقت نے اپنا اثر مخصوص دکھا دیا ہے۔

سترہویں صدی کے نصف آخر میں بویریلی - ہوگ - اور ہائینس کی تصانیف نے اس بات کو روز روشن کی طرح عیان کر دیا کہ حرکات مستدیر کی توجہ گلیلیو کے قوانین کی بنا پر کی جاسکتی ہے۔ بویریلی نے اتار مشتری کی حرکات پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایک مرکزی قوت کے عمل کیونکر حرکت مستدیر پیدا ہو سکتی ہے۔ ہوگ نے ظاہر کیا ہے کہ ایک خارجی مرکزی کشش حرکت مستقیم کو الودیع کر حرکت مستدیر بنا سکتی ہے۔

ششہم اودہ تاریخ ہے کہ نہ صرف یورپین سائنس طلبہ انسان کی دماغی ترقی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ یعنی اس سال نیوٹن کی بے مثل اور زندہ جادوید کتاب "پرنسپیا" شائع ہوئی۔

اس اصول کی بنا پر کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی مقدار کی نسبت مستقیم اور اپنے فاصلہ کے مربع کی نسبت معکوس سے کھینچتے ہیں نیوٹن نے ثابت کر دیا کہ اجرام سماوی کی

لے سطح زمین پرچہ اجسام اوپر سے نیچے کی طرف گرے ہیں ان کی سرعت رفتار سولفٹ فی ثانیہ ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر مرکز زمین سے چار ہزار میل کے فاصلہ پر ایک جسم سولفٹ فی ثانیہ کی سرعت رفتار سے اس کی طرف کھینچتا ہے۔ سطح زمین سے اگر یہ جسم چار ہزار میل لمبی مرکز زمین سے آٹھ ہزار میل کے فاصلہ پر چھو تو چونکہ مرکز زمین سے اس کا فاصلہ بمقابلہ سطح زمین دگنا ہے لہذا اس سے گولان کشش ثقل قوت کشش ثقل

نام حرکات کی معقول اور شافی وجہ بیان کی جاسکتی ہے اور کپلر کے قوانین یعنی حرکات الہیلیجی-  
فنا سے ملے ہوئے اور نسبت وقت و مسافت کے متعلق اسی اصول کو مد نظر رکھ کر پیش از پیش  
حکم لگایا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کیا ہے۔ نیوٹن کے معاصرین کو حرکات مستدیر  
کی وجہ معلوم ہو چکی تھی۔ یہ تو ایک صورت خاص تھی یعنی اس کا تعلق مشتری کے قریب کی حرکت  
سے تھا لیکن نیوٹن کی عقل و دقیقہ سنج نے اشکال حرکت کے عام مسئلہ کو حل کر دیا۔ جس میں  
حرکات مستدیر و الہیلیجی و قریب البیضوی و بید البیضوی گویا مخروطات کی کل حرکات کی خاص  
خاص صورتیں شامل تھیں۔

آسکندریہ کے مہندسوں نے بیان کیا تھا کہ اگر تے ہوئے اجسام کا رخ زمین کے مرکز کی  
طرف ہوتا ہے۔ نیوٹن نے ثابت کر دیا کہ ایسا ہونا لازمی ہے اس لیے کہ کسی کردہ کے کل اجزاء  
ترکیبی کی کشش کا عام اثر ایسا ہی ہے کہ گویا ان سب کا فقط اتصال اس کا مرکز ہے۔

اس مرکزی قوت کو جو اجسام کے ہبوط کی تعیین کرتی ہے کشش ثقل کا نام دیا گیا۔ اس  
وقت تک بجز کپلر کے اور کسی کو یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ اس قوت کی حد اثر کہاں تک ہے  
نیوٹن نے سوچا کہ ممکن ہے کہ اس قوت کا عمل چاند پر بھی ہوتا ہو اور یہی وہ قوت ہو جو چاند کو  
خط مستقیم سے منحرف ہو کر زمین کے گرد گردش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ قانون مربع معکوس  
کی بنا پر یہ اندازہ لگانا آسان تھا کہ آیا کشش زمین گردش قرص کے بدرجہی نتیجہ کی علت کا فی  
ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حسابت زمین کی پیمائش کے جو نتائج اُس وقت بہم پہنچ سکتے تھے  
ان کے ذریعہ سے نیوٹن کو یہ معلوم ہوا کہ انحراف جرم قمری تیرہ فٹ فی دقیقہ ہو حالانکہ  
اگر مسئلہ کشش ثقل صحیح ہو تو یہ انحراف پندرہ فٹ ہونا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا  
ہے پکار ڈالنے سے ۶۹ عین ایک درجہ ارضی کی پیمائش زیادہ صحت اور تدقیق کے ساتھ

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۲۴۔ فاصلہ کی نسبت معکوس سے گھٹ جیسے گی یعنی ایک چوتھائی رہ جائے گی۔  
بالفاظ دیگر ایک تالیف میں وہ جرم قمری بعد چاند کے گئے گا۔ مترجم۔

کی جس نے جسامت زمین اور اس لحاظ سے فاصلہ قمر کا اندازہ بدل دیا۔ <sup>۱۶۷۰ء</sup> میں جب بعض مسائل متعلقہ پر "رائیل سوسائٹی" میں مباحثہ ہوا تھا تو نیوٹن کی توجہ اس اندازہ کی طرف منطقت ہوئی۔ چنانچہ وہ پکارڈ کے عمل کی نقل کر کر گھرا یا اور اپنے برائے کاغذات نکال کر اسے نو حساب لگانے میں مشغول ہوا۔ جب وہ نتیجہ کے قریب پہنچا تو اُسے ایسی گہبراٹ ہوئی کہ نتیجہ کے استخراج کے لیے اُسے مجبوراً اپنے ایک دوست سے مدد لینا پڑی۔ یہ نتیجہ حسب امید برآمد ہوا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ چاند کا اپنے مدار پر قائم رہنا اور زمین کے گرد گھومنا کشش ثقل ارضی کی قوت کا نتیجہ ہے۔ غرض کپلر کے اس خیال کی جگہ کہ ہر اجرام سماوی عقول عالیہ کے مرکز ہیں ڈیکارٹ کے اس خیال نے لولی کہ فضا میں اثیر یعنی جو ہر لطیف کی لہریں اُٹھ رہی ہیں جن کے زور سے اجرام سماوی حرکت کرتے ہیں اور ڈیکارٹ کے خیال کے بجائے نیوٹن کا اصول قوت مرکزی قائم ہو گیا۔

اسی قوت کشش ثقل کی وجہ سے زمین اور باقی تمام سیارے آفتاب کے گرد شکل ایلیپی بنا تے ہوئے گردش کرتے ہیں اور ان میں جو اختلال واقع ہوتا ہے اُس کا باعث وہ عمل ہے جو ایک سیارہ کے جرم کا ثقل دوسرے سیارہ پر کرتا ہے۔ اگر ثقل اجرام کی مقدار اور اُن کا فاصلہ معلوم ہو تو اختلال کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ زمانہ مابعد کے مہندسوں نے اس کی شکل محکوس بھی دریافت کر لی۔ یعنی اگر کیفیت اختلال معلوم ہو تو جرم ذوالاختلال کا موقع اور ثقل معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سیارہ یورینس کا اپنے قیاسی موقع سے منحرف ہونا سیارہ نیپچون کے اکتشاف کا باعث ہوا۔

نیوٹن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے قوانین تحریک اجسام کو اجرام سماوی کی حرکات سے تطبیق دی اور اس بات پر زور دیا کہ سائنس کے قیاسات کی تصدیق و توثیق مشاہدہ و محاسبہ کی موافقت کے ذریعہ سے کرنی چاہیے۔

جب کپلر نے اپنے تین قوانین کا اعلان کیا تو پیشوا ایمان کلیسا نے انہیں مذموم قرار دیا

قرار دیا۔ نہ اس لیے کہ وہ غلط تھے بلکہ کچھ تو اس لیے کہ ان سے نظام کو پرنکیس کی تائید ہوتی تھی اور کچھ اس لیے کہ کسی غیر متنفذ قانون کو مشیت ایزدی و توفیق ربانی کا مزاحم سمجھنا خلاف مصلحت ہے۔ دنیا ایک نماشاگاہ مسجد لی گئی تھی جس میں خدا کی مرضی ہر روز اپنے کرشمے دکھائی رہتی تھی اور یہ امر خباب باری کی جلالت و جبروت کے منافی سمجھا گیا تھا کہ اسکی مشیت کسی قاعدے یا قانون کی پابند ہو۔ پادریوں کی طاقت کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ یہی دعویٰ تھا کہ وہ اپنے مسخ و اثر سے خدا کے عظیم علی الاطلاق کو نسخ کر سکتے ہیں۔ یعنی دھارٹا دون کی نحوست کا اثر کم کر سکتے ہیں۔ دھوپ نکلوا سکتے ہیں وینہ برسا سکتے ہیں۔ کسوف و خسوف کو روکا سکتے ہیں۔ یل قدرت کے بہاؤ کلخ بدل سکتے ہیں اور ہر طرح کے معجزے اور کرامتیں دکھا سکتے ہیں۔ اسی طریقہ سے گھڑی کی سوئی فری رحمت قہقری کر کے پیچھے کی طرف چلنا شروع کر دیا تھا اور آفتاب و ماہتاب چلتے چلتے آسمان کے وسط میں رک گئے تھے۔

نیوٹن کے زمانہ سے ایک سو سال پہلے ایک بہت بڑا مذہبی و سیاسی انقلاب ہو رہا تھا جو اصلاح کشیہ کے نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ اس انقلاب کی بدولت خیال انسانی کو کامل اتقادی و مہیسر نہیں ہونی تھی لیکن نفسیت کے قدیم پرزے بہت کچھ ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اصلاح یافتہ سماج میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نیوٹن کی تصانیف کا مذہبی پہلو سے تحفظ کرے اور پادری بھی نہ چاہتے تھے کہ اس معاملہ میں خواہ مخواہ دخل وین مداخل اول سٹینٹ فرڈ کی توجہ اپنے بہت بڑے دشمن یعنی کیتھولک فرقہ کی سازشوں کا ٹوڑ کرنے میں بیٹھ رہی اور جب اس طرف سے اطمینان ہوا اور اصلاح کے وہ شاخسانے جن کا پھوٹا لالہ تھا نکلنے شروع ہوئے تو برائٹسٹون کی توجہ حریت و رقیب کلیساؤں پر مبذول ہو گئی۔

”لو تھرن“ ”کیلونسٹ“ ”اسکوپیلین“ اور ”پریسیپیٹن“ فرقوں کو اپنے مذہبی مصلحت سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ نیوٹن کے مہند سائنہ اکتشافات پر اپنا وقت ضائع کرتے۔

غرض ان فرقوں کے باہمی فسادات قیوٹن کے مہتمم باشندان نظریہ کے لیے ذریعہ قوت بن گئے۔ لیکن غیر متخطیہ تو کجا کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور یہ نظریہ چپکے چپکے پوری قوت پکڑ گیا۔ اس کا فلسفیانہ مفہوم ان عقاید کے مقابلہ میں جو ان فرقوں کا مابہ انزعاع و نحو ہر جہاز یا دہ نتیجہ غیر تھا۔ اس نے نہ صرف آفتاب کو اپنے نظام کا مرکز تسلیم کر کے کپلر کے قوانین کی صحت کا اعتراف کیا بلکہ ثابت کر دکھایا کہ باور یون کی مخالفانہ دلائل خواہ کیسی ہی قوی کیوں نہ ہوں کچھ آفتاب مندر ہے کہ ہمارے نظام کا مرکز جو اور کپلر کے قوانین مہمند سائن لزوم یا جبر کا نتیجہ ہیں ناکمل ہے کہ یہ قوانین وہ نہ ہوں جو ہیں۔

اس کل سمیت سے بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ نظام شمسی کی حرکات میں بڑبائی مداخلت غلط انداز نہیں ہوتی بلکہ اس کے نظم و نسق کی عنان اُس غیر متبدل و غیر متغیر قانون کے ہاتھ میں ہے جو پچاسے خود مہمند سائن جبر کا نتیجہ ہے۔

ہرشل اول نے دور بین سے جو مشاہدات کیے اُن کی بنیاد پر اُسے یقین ہو گیا کہ مہند سائن فلکی میں سمیت سے دہرے ستارے بھی موجود ہیں۔ وہ ہرے سے مراد یہی نہیں کہ وہ اتفاقیہ طور پر ایک ہی خط لگادہ پر واقع ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ طبعاً ایک دوسرے کے ساتھ

ایک سروریش سے مراد ہے جو ایک مشہور و معروف ہندو دان تھا اور سنہ ۱۷۸۱ء میں بمبئی میں پیدا ہوا۔ سنہ ۱۷۹۵ء میں ہرشل انگلستان گیا اور وہیں بودو باش اختیار کر لی۔ مردودہ و زمین چو شکر سمیت، چھوٹی شہرین جن سے اُس کا شوق و مدد میں پورا مدد ملتا تھا لہذا اُس نے خود ایک بہت بڑی دور بین بنائی شروع کی جس میں اُسے کامیابی ہوئی اور اس کی مدد سے اُس نے نظام شمسی کا وہ سیارہ دریافت کیا جو پورینس کے نام سے مشہور ہے۔ شاہ جارج ثالث نے اُس کی ہدایت علمی نعمات کے صلہ میں اُس کا وظیفہ مقرر کیا اور خطاب سے بھی سرفراز کیا۔ اُس کا انتقال سنہ ۱۸۲۲ء میں ہوا۔



مربوط و منوط ہیں۔ اور ایک ستارہ دوسرے ستارے کے گرد گھومتا ہے۔ ہر شل ثانی نے ان مشاہدات کو جاری رکھا اور بہت کچھ وسعت دی۔ برج نبات النعاش کبریٰ کے دہرے ستارے ٹیچ کے ایلیمچی مارکی ماہیت سیوریسی نے دریافت کی تھی اور یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اس کو کمال دور کی رست سوا اٹھاون سال ہے۔ ایک اور دہرے ستارے کے حالات تہنڈ نے دریافت کیے تھے۔ اس کا نام کاردونا (اکلیل النور) ہے اور اس کے دور کا زمانہ سات سو چھتیس سال ہے۔ ان شمس جوڑائی کی حرکت دواہی کا ایلیمچی شکل ہونا صاف بتانا ہے کہ قانون کشش ثقل نظام شمسی کی حدود سے بھی بہت پرے نافذ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جہاں تک دور بین پہنچتی قانون کی عملداری نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر نے "انسائیکلو پیڈیا" (دائرۃ المعارف) کے دیباچہ میں لکھا ہے اور سچ لکھا ہے کہ کائنات محض ایک واقعہ واحد یا بالفاظ دیگر ایک حقیقت عظمیٰ ہے۔

پس ان تمام واقعات سے کیا ہکویہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ شمس و کواکب کو خدائے پیدا کیا اور اپنی مشیت علی الاطلاق سے ان کو ایسے قوانین کے تابع کر دیا جن کے تحت میں اُس مشیت کا اقتضا تھا کہ یہ اجرام حرکت کریں؟

یا اس امر کے بادر کرنی کی کوئی معقول وجہ موجود ہے کہ شمس باوجود کہ یہ نظام کسی حکم غیر سوجہ کی بنا پر معرض وجود میں نہیں آئے بلکہ قانون کا عمل ان کے وجود میں آنے کا باعث ہوا ہے؟

تیسریس کی تحقیقات کے بموجب نظام شمسی میں حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں نظام ۱۔ سردیو کا بیٹا سر جان لویڈرک ولیم ہرشل ایک نامور باپ کا نامور بیٹا ہے۔ مشہور میں پیدا ہوا۔ فن ہیئت میں نس کی دقت نظر اور مسلسل اداان محکمت نے بہت کچھ معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ باپ بیٹے ہر مشد کے نام سے پکڑے جاتے ہیں۔ ہر شل ثانی کا انتقال مشہور میں ہوا۔

سیارے اور ان کے اقمار جن اشکال البیلیجی میں حرکت کرتے ہیں ان کی البیلیجیت اس قدر کم ہے کہ ان پر تقریباً دائرہ کی تقریب صدق آتی ہے۔ تمام سیارے ایک ہی سمت میں اور تقریباً ایک ہی سطح پر گردش کرتے ہیں۔ اقمار اور سیاروں کی گردش کا رخ ایک ہی ہے۔ آفتاب سیاروں اور ان کے اقمار کی گردش محوری و گردش دوری کا رخ ایک ہی ہے اور اس گردش کی سطوح میں بہت کم تفاوت ہے۔

۱. ممکن نہیں کہ موافقت و مطابقت کی اتنی بہت سی صورتیں محض محبت و اتفاق کا نتیجہ ہوں۔ کیا یہ امر روز روشن کی طرح آشکارا نہیں ہے کہ ان تمام اجسام کی شیرازہ بنیاد یک قوت ہے اور ایک رشتہ بطور قند مشترک ان سب کو ربط دینے والا موجود ہے اور یہ ایک ایسے جرم عظیم نشان کے اجزاء ہیں جو نشتر تجلیل سے پہلے واحد و منفرد تھا؟

لیکن اگر ہم تسلیم کر لیں کہ جس مادہ سے نظام شمسی مرکب ہے وہ ایک فہشتگان ضابطہ النجوم یعنی بصورت غماز کو کبھی موجود تھا اور اپنے محور کے گرد گھومتا تھا تو تمام وہ خصوصیات جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اذرو سے اصول حرکات الاجسام لازمی نتائج کے طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ سیارگان و اقمار و نجومیہ ترکیب پذیر ہونے کی معقول توجیہ ہمارے ہاتھ آ جاتی ہے۔ ہر کو معلوم ہو جاتا ہے کہ بیرونی سیارے اور اقمار اندرونی سیاروں اور اقمار سے کیوں بڑے ہیں ہم بتا سکتے ہیں کہ بڑے سیارے کس لیے زیادہ تیزی سے گھومتے ہیں اور چھوٹے سیارے کی حرکت میں آہستگی پائی جاتی ہے اور بیرونی سیاروں کے اقمار اندرونی سیاروں کے اقمار کے مقابلہ میں کیوں زیادہ ہیں۔ ہم حکم لگا سکتے ہیں کہ سیارے اور اقمار اپنے اپنے دور کس زمانہ میں طے کرتے ہیں۔ ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اصل کے حلقے کس طور پر ہیں ہم سمجھ جاتے ہیں کہ آفتاب کی موجودہ طبعی حالت کی کیا وجہ ہے اور ارض و قمر جن کی طبعیات الہامی سرگزشت سے ہم واقف ہیں کیوں کہ مختلف مدارج تغیر طے کرتے ہوئے موجودہ حالت کو پہنچے۔

لیکن خصوصیات متذکرہ بالا میں دو مستثنیات بھی باقی گئی ہیں جو تو زمینیں اور چاند  
سے متعلق ہیں۔

اگر اس قسم کے مضامینہ النجوم کا وجہ تسلیم کر لیا جائے تو باقی تمام نتائج خود بخود نکلتے چلے آتے  
ہیں البتہ ایک بہت بڑی شکل سنگ راہ ہوتی ہے۔ یعنی جن دنیاؤں کو خدا نے بنایا ہے ان  
سے خدا سے قدیر خارج ہوا جاتا ہے۔

اول ہم کو یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ آیا ایسے مضامینہ النجوم کے وجود کا اعتراف کرنے کے  
لیے کوئی قوی شہادت بھی ہم پہنچ سکتی ہے یا نہیں۔

مسئلہ مضامینہ النجوم کا اصولی حصہ برشل اول کے اس دور میں انکشاف پر ہے کہ افلاک  
میں جابجا نواز کے زرد و درخشان بقعے پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے بعض اس قدر بڑے ہیں  
کہ مجرور گاہ کو بھی محسوس ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے اکثر بقعہ پر جب زبردست دور بینوں کے  
ذریعہ سے نظر ڈالی گئی تو معلوم ہوا کہ کوکب کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا ہے لیکن ایک  
آدھ بقعہ نور مثلاً برج جوزا کا مضامینہ اکبر ایسا بھی ہے جسے زبردست سے زبردست دور بینیں  
بھی کوکب میں تحلیل نہیں کر سکیں۔

جو لوگ مسئلہ مضامینہ النجوم کی حقیقت کا اعتراف نہ کرنا چاہتے تھے انھوں نے یہ اعتراض  
پیش کیا کہ عدم تحلیل کی وجہ دور بینوں کا نقص ہے۔ ان آلات مشاہدہ میں دو عدا گانہ قوتیں  
پائی جاتی ہیں۔ یعنی ان کی قوت اقتباس ان کے ”لنز“ (زجاجہ) کے دور پر اور قوت  
ایضاح صورت ان کی طوطی نظریہ کی غایت لطافت و زکات پر منحصر ہوتی ہے۔ بڑی دور بینوں

سے خدا سے قدیر شاید خارج ہو جائے مگر اس کا بنایا ہوا رابطہ یعنی وہ قانون جس کا مفہوم لن تجز  
لسنة الله تبدیلا میں مفسر ہے خارج نہیں ہو سکتا۔ لیکن بات ایک ہی ہے۔ ہم یقین  
کے قائل ہیں۔ آپ قانون کے ہم ذمت کا اعتراف کرتے ہیں آپ صفا کا۔ ہم خدا کو مانتے ہیں۔ آپ  
مادہ اہم حکمت کو۔ ع جلوں ہر چکا جیگمانہ تم عالی نہ ہم خالی۔ مترجم

میں وصف اول الذکر تو بوجہ اپنی جسامت کے بدرجہ تام موجود ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسری صفت شاذ و نادر ہی کمال الوجد بانی جاتی ہے جس کا باعث یہ ہے کہ یا تو اُن کی اصولی ترکیب ہی ناقص ہوتی ہے اور یا وزن کے باعث حمیدگی پیدا ہو جانے سے سطح نظر پر بگڑ جاتی ہے۔ لیکن بافتیکہ کسی دور میں میں یہ دونوں صفتیں پوری طرح سے موجود نہ ہوں۔ اُس سے غیر انجم کا انکساک بصورت نقاط منفصل نہیں ہو سکتا۔

• حسن اتفاق سے اس عقدے کے حل کرنے کا دوسرا سان بھی موجود ہے۔ ۱۸۶۶ء میں مصنف کتاب بذرائع اس حقیقت کا اکتشاف کیا کہ اجسام مستو قد یعنی جلتے ہوئے اجسام کے الوان منشور کا انعکاس مسلسل ہوتا ہے یعنی اس میں نہ سیاہ واریاں باقی جاتی ہیں نہ روشنی واریاں اس سے چشمہ قرآنہ فرسے یہ تکشہفت کی تہی کہ غار (گاس) مستو قد کے الوان منشور کا انعکاس غیر مسلسل ہوتا ہے۔ پس ان دونوں اکتشافات کو پیش نظر رکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کسی ضیاء بہ النجوم سے جو روشنی خارج ہوئی ہے اُس کا ماخذ ناز مستو قد ہے یا اجرام ذکوان وشمس مستو قد ہیں۔ اگر اس کے الوان منشور کا انعکاس غیر مسلسل ہو تو سمجھنا چاہیے کہ یہ ضیاء حقیقی یا غار مستو قد ہے اور اگر مسلسل ہو تو مجبوراً انجم سمجھنا چاہیے۔

۱۸۶۶ء میں مسٹر گنٹس نے ایک ضیاء کو جو برج ذریکوین واقع ہے اسی معیار میں جانچا تو معلوم ہوا کہ یہ ضیاء بہ حالت غازیہ میں ہے۔ اس کے بعد متعدد مشاہدات ہوئے اور سائنسدان ضیاء بہ النجوم کا امتحان کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے انیس کے الوان منشور کا انعکاس غیر مسلسل ہے اور باقی کا مسلسل۔

ایسی حالت میں ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آخر کار طبیعی و علمی ثبوت اس امر کا بہم پہنچ گیا ہے کہ مادہ کے عظیم الشان انبار غازیہ حالت میں موجود ہیں اور اُن کے التباب کے ہشتادو کی یہ کیفیت ہے کہ اُن کی روشنی کا رنگ بالکل سفید ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ لیمپس کا قیاس جہت موجودہ مشاہدات ناطق پر مبنی ہے۔ اس قسم کے کوکبی تودہ مستو قد کی تہرید۔

تجفر کے ذریعہ سے لازمی ہے اور انکا دگر دوش اس کے نتائج ناگزیر ہیں۔ مقرر ہے کہ اس تودہ میں سے جدا جدا طے نخل آتین جن کی سطح ایک ہی چوڑی سیارے اور قدر پیدا ہوں جو ایک ہی طرح گردش کرتے ہوں۔ اور وسط میں ایک آفتاب رہ جائے جسکے گرد یہ سیارے گھومتے ہوں۔ غرض ایک ہیولانی مادہ سے تو ایسے قدرت کے عمل کے باعث ایک مدون و مرتب نظام پیدا ہو جاتا ہے اور حرارت کے بتدریج کم ہونے سے مادہ دنیاؤں کی شکل قبول کر لیتا ہے۔

۱۔ انہیں خیالات کو ہم نے نظم کا لباس پہنایا ہے۔ یہ نظم جس کا انداز بیان فلسفیانہ عقل کے نقل کی ایک حتمی نمائی کرتا ہے۔ حضرات ناظرین کی مضافات طبع کے لیے جو خشک فلسفہ پڑھتے پڑھتے اکتا گئے ہوں گے تفننی بیان درج کی جاتی ہے۔

اول اول جب نہ تھا کچھ بھی بحر و آستانہ	ماسوا کا شکل و صورت سے تعلق تھا جدا
نقشے کے منفصل اجزائے اسند خدا	ساحت افلاک میں ذرات کا طوفان تھا بیا
سرکھٹ جاتا ہے داؤتی قدم میں جبکہ دم	کچھ نہیں پام خلا میں وہ سپر لاکسوا
اس جگہ اس مسئلہ پر ہم نہیں کرتے ہیں بحث	ابستہ کیون کر مہنی ہوگی کب اس کی انتہا
ہم فقط اتنا کہیں گے قرن گزرے و نشہ	اور تودہ مادہ پانے لگا غصہ و نا
پہلے جو کچھ منفصل تھا ہو گیا اب متصل	تودہ خیزاے فاسق کو کب دھڑی بنا
کھا کے مذون نے نصا و مہلے پیہم سو گرد	پہلے پیدا کی حرارت اور بعد اُس کے ضیا
کچھ تو سیارے بنے اور کچھ تو ابستہ بن گئے	کچھ ہوئے ماہ منیر اور کچھ شمس باد فہ
اس طرح عین نظام شمس قائم ہو گئے	جن کا پھیلا ہے خدا بنے کمان تک سلسلہ
اپنے محور پر جوئے سرگرم گردش آفتاب	اور لگا گردان کے سیاروں کا پھر زنجیر جگمگنا

جس مکان کے ہم کہیں ہیں یہ بھی اک سیارہ ہے

علمی قدرت کا اک چھوٹا سا آتش پارہ ہے

معروض ہستی میں جب آیا جدا آفتاب
 نور تھا اُس کی دوا اُس کی قبا تھا الہاب |

اگر نفاٹم شمس اور فواہت سیارہ کی دنیاؤں کی آفرینش کی حقیقت یہی ہو تو ہمیں قاضیوں کی  
عملداری کے متعلق اپنے دائرہ خیال کو مجبوراً وسیع کر کر اس امر کا اعتراض کرنا پڑتا ہے کہ

### بقیہ نوٹ صفحہ ۳۳۲

حرقۃ تنویر کا گویا کر ڈون میل میں      دوسے دریائے نفا پر تیرتا تھا اک حجاب  
چرم تھاب کی طبع اُس کا سراپا آتشین      کوہ کی بھی تھی وہی اُس کی جہت اُس کا شباب  
گرد و پیش اُس کے نہ تھی آناستہ انجم کی بزم      تھی محیط اُس کی خلا سے انتہا بے حساب  
یکوہ تنہا درایض تماخو کے معن میں      ایک بھی کوکب نہ تھا اُس وقت اُس کا ہر کلاب  
زمین اُس نے گزار میں عالم تجرید میں      اپنی تنہائی پہ صدیوں اُس نے کھایا پیچ و تاب  
جس طبع ہوتا ہے کوہ آتش افشان شتمل      جوش میں رہا کے آیا اُڑا کر دن آفتاب  
پہلے بھڑکی کے منہ سے جیسے نہ کوہِ تیسر پہل      کچھ ستارے ٹوٹ کر اُس سے گر خوش شباب  
آٹھیا سے یہی ہیں جوقائع اُس کے جن      ان میں اور اُس میں ہوا قائم تھاب کا حجاب  
دیکھ کر اپنی ولادت کے طریقے کو یہ نہی      کر لیے پیدا انہوں نے اپنے لہجے اشتاب

کتبہ میں جس کو نفاٹم شمس اندہ ہے یہی

وہ ہم میں کا عقل میں لاتا ہے چکر ہے یہی

جب زمین اگر ہوئی معنِ ظاہر میں جلوہ گر      خاصیت خورشید کی اُس میں عیان تھی ہر ہر  
نکل بھی گڑی تھی اُس کی اپنے صدر کی طبع      جرم بھی تھا شمس خورشید اُس کا اک سوج شر  
شتمل تجر سے لیکن ہر معنی زمان      رفتہ رفتہ ہر پہلا زایل حرارت کا اثر  
آتشین حالت مہل ہو گئی سوال سے      ہو گیا جس سے سراجِ ارض کو بگڑا گرم تر  
پھر تہذیبِ ریح انجاد اپنا عمل کرنے لگا      اور جو بالی تھا پہلے بن گیا وہ اب حجر  
سنگ خارا کی زمین نے ایک چادر اوٹلی      جس کے نیچے پڑا تھا دود آتش میں جھنڈ  
جا بجا لیکن بندی ادب سے چھ لگتی      مادہ از بسکہ اندر کا ہوا زیر و زبر

کائنات میں جو بے شمار اجرام پھیلے ہوئے ہیں نہ صرف ان کی تکوین بلکہ ان کی صفیات میں بھی قانون ہی کو دخل ہے۔

لیکن اس مقام پر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعہ کا اعتراض انتہائے بعید گئی پر دلالت نہیں کرتا؟ کیا ہم قادر مطلق خدا کو اس دنیا سے جسے اُس نے پیدا کیا جو بے دخل

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۳۳

محققین یہ نامہور اریان اس سطح سنگین پہ چہان  
بن گئے کہسار اور میدان بلندی تھی چہان  
آج یقیناً ہے انہیں کا نام ان ان مجرور  
اور جہان بستی تھی اُس میں کرایا دینے لگھر  
اک گھناؤنہ انجمن کا چھار ہاتھ ہر طرف  
جسے جل قتل کر دے پل بھر میں بن کر ابرتر

اتحاد مہر و ابرو رعد و باد و برق سے

موج آب شور پسکی تا مغرب شرق سے

ہو چکا جس رت کا لہر ہوا دما و طین  
وقت آہنچا کہ ہو سر سبز باغ روزگار  
اور ہوئی جب معتدل بن کر حرارت بھی زمین  
اور موالید نلکتے سے بھرے سہد زمین  
خامد ابداع صنایع ازل ہمار کرے  
پر وہ فطرت پر مخلوقات کے نقش و نگین  
رو گیا باقی تھا پڑنا اب نقطہ اک جان کا  
ڈھل چکا سا پنچے میں تھا دنیا کج ہنم نازنین  
زندگی اک راز ہے اور راز دار اک راز خود  
جس کا پردہ عقل ان فی اٹھا سکتی بہنیں  
ہیں معارف جس کے دانش کے کوئی یقین  
ہیں مغابر جس کے پرتش کے لیے میں انیس  
اُس چھپی قوت سے فہر اہل دنیا کو کیا  
صنعت باری کے خرم کر یہ سب بین خوشہ چین  
مروم و ماہی و مور و سبز و آب و حجر

اپنی حکمت سے بناے بے حساب اُس فرجہاں

اپنی قدرت کے دکھائے لا جواب اُس نشان

مترجم

نہیں کر رہے ہیں ؟

ہم نے صاف مطلع پر ابرگرہ تے ہوئے اکثر دیکھا ہے ۔ سیاہی کا ایک دہندہ لاسا نقطہ غبار کا ایک ننھا سا مرغولہ اول اول نمودار ہوتا ہے اور تدریج بڑھتے بڑھتے سیاہ وغلیظ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ آسمان کے ایک بہت بڑے حصہ پر کالی گھٹا چھا جاتی ہے ۔ یہ گھٹا انوکھی اور زالی خشکیں اختیار کرتی ہے ۔ آفتاب کا نور جب اس میں سے چھننا ہے تو ایک عجب و لغزیب سماں نظر آتے لگتا ہے ۔ لکھ ہاے ابر و دوش ہوا پر سوار ہو کر بڑے چلے جاتے ہیں گھٹا چھٹنے لگتی ہے اور جس طرح تدریج نمودار ہوئی تھی اسی طرح شاید آہستہ آہستہ کم ہوتی ہوئی ہوا میں غائب ہو جاتی ہے ۔ اور مطلع پھر صاف ہو جاتا ہے ۔

ہم کہتے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے اجزائے منفوطا جن سے یہ گھٹا مرکب تھی حرارت میں کمینف ہو جانے کے باعث اُن آبِ بخرون کے اتحاد سے پیدا ہوئی جو پہلے سے کرہ ہوا میں موجود تھے اور منجمد ہو کر اُنہوں نے سماجی شکل اختیار کر لی ۔ بادل کی تابانی یا غلٹ کی توجیہ ہم علم مناظر و مرایا کے اصول پر کرتے ہیں ۔ ہوا کے نور سے اس کی نقل و حرکت کا سبب بیان کرتے ہوئے ہم علم تحریک اجسام کے اصول پیش کرتے ہیں ۔ اس کے نمودار ہو کر غائب ہو جانے کی وجہ ہمارے نزدیک علم کیا کے اصول میں پائی جاتی ہے یہ ہمیں کبھی خیال نہیں آتا کہ اس شکل گریز یا کئی تکوین و ترکیب کے خلاف اسلئے مداخلت سے منسوب کریں ۔ اس کے کل واقعات متعلقہ کی توجیہ ہم طبعی قوانین کی بنا پر کرتے ہیں اور شاید ادب و احترام ماننے آئے کہ ہم بادل کی تخلیق کے لیے جناب بادی کے ہدایت کو بروئے کار آنے کی زحمت دین ۔

لیکن اگر چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے تو کائنات کی حقیقت بھی اس بادل سے زیادہ نہیں ۔ اُس کے اجزا بنجراتِ آبی تھے ۔ اس کے اجزا اسٹوس و عواہم ہیں ۔ پوری نظردن میں گو اس کی عظمت و نمکنت کی کوئی انتہاء نہ ہو لیکن عقل غیر محدود و لازوال کے نزدیک



اس کی ہستی ایک رمتی بدلی ہے۔ جس طرح آسمان پر کیوں بادل آتا ہے کیوں جاتا ہے اسی طرح یہ نظام ثواب و عین کا ثبات ہے شمار دوسری دنیاؤں کا قائم مقام ہے جو اس سے پہلے گزر چکی ہیں اور ان کے دنیاؤں کا پیش رو ہے جو جو زمین آنے والی ہیں۔ غرض انقلاب و تبدل علت و معلول اور سبب و مسبب کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔

اگر طبیعیات کے اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم کہہ کرے اور بادل کے اباب پر غور کر سکتے ہیں حالانکہ اس قسم کے مسائل علم حوادث الجو کے صغائر میں داخل ہیں تو کیا اسی اصول کی بنا پر دنیاؤں اور کائناتوں کی ابتدا و آخرت کے مسائل پر غور کرنے کی ہر اجازت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ آخریہ دنیا میں بھی بادل ہی ہیں اگرچہ ان کی وسعت مکان کا پیمانہ کسی قدر زیادہ ہے اور ان کی حقیقت کہہ کرے سے زیادہ نہیں اگرچہ اسکی وسعت زمان کا معیار کسی قدر کم ناچار ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک ایسی حد فاصل قائم کر سکے جسکے ایک طرف طبیعیات کا عمل ہو اور دوسری طرف مابعد الطبیعیات کا؟ کیا اشیاء کی مقدار اور مدت بقا کے متعلق ہمارے قیاسات محض اعتباری نہیں ہوتے؟ برج جوز امین جو منجانبہ النجوم نظر آتا ہے اگر ہم اس میں موجود ہون تو کیا شاندار نظارہ ہمیں دکھائی دے۔ اس کے مہم باشان انقلابات کا ظہور میں آتا اس کے آتشیں غبار کا منجد ہو کر دنیاؤں کی شکل اختیار کرنا ہمیں اس قابل معلوم کہ خدا بذات خود موجود ہو کر ان کی نگہانی کرے اس مقام بعید سے جہاں کروڑوں میل کی باریک نگاہوں کے سامنے کوئی ہستی نہیں اور شمس بازو فضا سے فلکی مین ہمیں چمکتے ہوئے درون کے برابر نظر آتے ہیں برج جوزا کا یہ منجانبہ النجوم دھندلی سے دھندلی بدلی سے بھی زیادہ سوہوم معلوم ہوتا ہے۔ گیلیلو نے برج جوزا کا ذکر کرتے وقت اسے اس درجہ بغیر و بیچ میرزہ سمجھا ہے

۱۔ اسی خیال کو شاعر نے کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

ہنگامہ گرم سبھی ناپا نہ ارکا۔ چشک ہے برق کی کہ جسم شرار کا۔

مترجم

کہ اس کا حوالہ تک نہیں دیا اور اگر کوئی شخص اس کی تکوین و تخلیق کو کسی علت تائید سے منسوب کرتا اور جو انقلابات اس میں ہو رہے ہیں اُن کے لیے خدا کی مطلق العنان دست اندازی کو ضروری نہ سمجھتا تو اُس زمانہ کے کٹر سے کٹر باوری بھی اُسے قابل الزام نہ خیال کرتے۔ پس جب اس غلابۂ النجوم کے متعلق ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں تو وہ نفس ناطقہ جو وہاں کی کسی دنیا میں موجود ہوگا ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرے گا؟ اس غلابۂ النجوم کی وسعت ہمارے نظام شمسی سے کروڑوں گنی زیادہ ہے۔ ہم وہاں سے مطلق نظر نہیں آتے اور اس لئے وہاں کی عقول کے لیے ہمارا عدم وجود برابر ہے۔ کیا وہ عقول ہماری آفرینش اور بقا کے لیے خدا کی فوری و بلا واسطہ مداخلت کو ضروری و لازمی تصور کریں گی؟

نظام شمسی سے قطع نظر کر کے اب ہم اس کے ایک جزو حقیر یعنی اپنے کرہ زمین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو ان زمانہ گزرتا گیا ہے اس میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ کیا یہ تبدیلیاں ربانی مداخلت کا نتیجہ ہیں یا غیر متغیر قانون کے مسلسل اور نہ ٹپنے والے عمل کا؟ قدرت کی شکل ہماری آنکھوں کے سامنے ہر لمحہ متغیر ہوتی رہتی ہے اور طبقات الارضی زبالوں میں یہ تغیر نہایت وسیع اور حیرت انگیز پایا نہ ہو رہا ہے۔ لیکن اُن قوانین میں جو ان تغیرات برعکس ہیں غیبت ہی تبدیل بھی نہیں ہوتی۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے لیکن وہ نہیں بدلتے۔ موجودہ نظام کو نذر و نساہ اُس عظیم الشان زنجیر کا محض ایک حلقہ ہے جس کا ایک سر ماضی کی غیر معین و ہر تراز احصاء سرحد کی طرف چلا گیا ہے اور دوسرا سر مستقبل کی غیر محدود و خارج از قیاس پہنائی کی جانب پھیلا ہوا ہے۔

اس امر کی طبقات الارضی اور ہستی شہادت موجود ہے کہ قرون ماضیہ میں زمین اور چاند کی حرارت بمقابلہ زمانہ موجودہ بہت زیادہ تھی۔ یہ حرارت بتدریج کم ہوتی گئی لیکن کمی کا عمل اس قدر بطی الاثر تھا کہ کسی مختصر مدت میں اُس کا محسوس ہونا ممکن نہ تھا۔ البتہ طویل زمانوں کے انقضا کے بعد یہ کمی نمایاں ہوتی گئی۔ جو حرارت بذریعہ متغیر زمین سے خارج ہوتی ہے

وہ نفاذ میں چلی گئی ہے۔

ادہ کے کسی نود کی تہذیبیہ خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا غیر مسلسل نہیں ہوتی یعنی اس کا عمل رک رک اور تمام غم کر نہیں رہتا۔ بلکہ ریاضی کے ایک مقررہ قانون کے تابع ہوتی ہے اگرچہ ان تغیرات غلبہ کے لیے جن سے زمین یہاں بجٹ ہے نہ تو زمین کا کلیہ کام یہ ہے نہ ڈیوالانگ کا اور نہ بیٹ کا۔ اس واقعہ سے ہمارے دوسرے مین کوئی فرق نہیں آسکتا کہ ایک زمانہ میں حرارت زمین کی رفتار زوال معمول سے کسی قدر کم ہو گئی۔ ایک زمانہ میں یہاں تک کم ہوئی کہ دور زہرہ پر یہ نمودار ہو گیا۔ پھر ایک زمانہ میں کچھ عرصہ کے لیے معمول سے زیادہ ہو گئی۔ یہ بجٹ ہی ہمارے دعوے پر کوئی اثر ڈال سکتی ہے کہ آیا یہ اختلافات سطح زمین کے بلند و پست ہونے کے باعث پیدا ہوئے یا حرارت آفتاب کے موت الا شداد ہونے کی وجہ سے حرارت آفتاب کا موت الا شداد ہونا حرارت کی تدریجی کمی میں محض ہمنزلہ ایک اختلال کے ہے۔ سیاروں کی حرکات کے اختلالات سے اس کشش ثقل کی تابعدار و توشیح ہوتی ہے نہ کہ تردید و تغلیط۔

حرارت کا یہ زوال ظاہر ہے کہ ہمارے کرہ کی طبیعی نوعیت میں بے شمار تبدیلیوں کا باعث ہوا ہوگا۔ سکرٹنے کی وجہ سے اس کا حجم بہت کچھ کم ہو گیا ہوگا۔ اس کے دن کا طول گھٹ گیا ہوگا۔ اس کی سطح شکستہ ہو گئی ہوگی اور جن جن طبقات کی قوت اندفاع سب سے زیادہ کم ہو گئی وہاں بڑے بڑے دراڑ اور غار پڑ گئے ہوں گے پسند کی کثافت بڑھ گئی ہوگی اس کے پانی کی مقدار گھٹ گئی ہوگی کرہ ہوا کے اجزائے ترکیبی حصہ صاف بخارات آبی اور کاربانک ایسڈ (موصوفۃ انہم) کی مقدار میں تغیر واقع ہو گیا ہوگا۔ ہوا کا دباؤ کم ہو گیا ہوگا۔

یہ انقلابات اگر بہت سے دوسرے تغیرات جو ان کے ساتھ لازم مضموم ہیں غیر مسلسل طور پر نہیں بلکہ نہایت ترتیب دافعالگی سے واقع ہوئے ہوں گے اس لئے کہ وہ علت کبرئے یعنی زوال حرارت جو ان تغیرات کے ظہور کا باعث تھی خود ایک ہندسی قانون کے تابع تھی۔ لیکن ان ان تبدیلیوں کا اثر کائنات غیر ذی حیات ہی پر نہیں بڑا کائنات ذی حیات

بھی ساتھ ساتھ برابر متاثر ہوتی گئی۔

ہر شکل ذوی الامنا خواہ وہ از قسم نباتات ہو یا از قسم حیوانات اسی وقت تک تبدیلی قبول نہیں کرتی جب تک کہ اس کے حوالی میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر حوالی بدل جائے تو وہ شکل یا تو متغیر ہو جائے گی اور یا بالکل معدوم ہو جائے گی۔

اگر تغیر حوالی نورسی دنا گہائی ہو تو انعام زیادہ قرن قیاس ہے لیکن اگر تغیر علی السطح ہو تو تبدیل یا تقلیب کا امکان زیادہ ہوگا۔

چونکہ اس واقعہ کے یقینی ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قدرت کے مفاہیر غیر ذی روح میں قربانہ قرن کے مرور سے وسیع و عظیم تغیرات واقع ہوئے ہیں۔ چونکہ کرۂ زمین کا بیرونی خول اور سمندر اور کرہ ہوا وہ نہیں ہیں جو کسی زمانہ میں تھے۔ چونکہ خشکی اور زری کی تقسیم اور دوسری طبیعی حالتیں بدل گئی ہیں۔ چونکہ مخلوقات ذی حیات کے حوالی میں اس قدر عظیم الشان تغیرات ہوئے ہیں لہذا صاف ظاہر ہے کہ ان مخلوقات کو بھی اسی طرح کے مبالغہ فساد و استحالة طے کرنے پڑے ہوں گے۔

اس قسم کے فساد و استعمار کے وقوع میں آنے کی ناطق اور قطعی شہادت اس کثرت سے موجود ہے کہ یقین کو مجبوراً اس کے آگے تسلیم ختم کرنا پڑتا ہے۔

اس موقع پر ہم مکرر اس امر کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ چونکہ وہ قوت جو ان تغیرات کا باعث تھی خود ایک ہندسی قانون کی پابندی کر رہی تھی لہذا اس کے یہ نتائج بھی اسی قانون کے تابع متصور ہونے چاہئیں۔

ان تمام مباحث سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ مخلوقات ذوی الاعضا کی ترقی قانون غیر ممکن التفسیر کے عمل کی تابع ہے خدا کی غیر مسلسل غیر مربوط اور سنت شکن مداخلت کا حاصل نہیں ہے۔ ان مباحث سے ہمارے اس خیال کو بھی تقویت ہوتی ہے کہ مجاز سے تخلیق کے اس فعل کے جو بے شمار صادر ہوا ہوا ایک جسم ذوی الامنا کی شکل کا مستحیل ہو کر دوسری شکل

اختیار کر لینا بہت زیادہ قرین عقل ہے۔ تخلیق یا پیدائش کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شے دفعتاً خود بخود نمودار ہو جائے اور استعمال سے مراد یہ ہے کہ ایک شکل جو پہلے سے موجود ہے تدریجاً تغیر ہوتی ہوئی دوسری صورت اختیار کر لے۔

اس طرح پہلا اور اک مسئلہ ارتقا کی حقیقت عظیمہ سے دوچار ہوتا ہے۔ ہر وجود ذوی الاعضاء حوادث کے سلسلہ سے مربوط و منوط ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس وجود کو دوسرے مفہام پر آفرینش سے کوئی لگاؤ نہیں اور یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے سلسلہ علت و معلول سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اسے واجب الوجود تصور کرنا چاہیے۔ اس کا تعلق اُس برتر از احصا سلسلہ حوادث سے ہے جو زمانہ ماضی میں علی سبیل تدریج پیدا ہو کر زمانہ موجودہ تک پہنچا ہے اور سلسلہ مقدرات آئندہ کی تیاری کا سامان کر رہا ہے۔ اس وسیع ذخیرہ کے حلقوں کا انقباض کچھ کچھ وقفہ پر تبدیل بحالت بسط ہو جاتا ہے۔ یعنی ارتقا کا اثر نمودار ہوتا ہے۔ لیکن ان تغیرات کے دوران میں وہ قوانین جن کی حدودی اس ذخیرہ کی تیاری کی ذمہ دار ہے مطلق نہیں بدلتے۔

اگر ہم حیوانات کی کسی جنس کے ٹھور پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کا وجود تغیر و استعمال کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ تخلیق کے ذریعہ سے مجدداً نمودار ہوا۔ اس کی ابتدا یہ شکل ناقص اُن دوسری اشکال کے درمیان ہوتی ہے جن کا دور حیات قریب الاختتام ہے اور جو معدوم ہونے کے قریب ہیں اس کی متعدد نوعیں یکے بعد دیگرے تدریجاً نمودار ہوتی ہیں اور ہر نوع پہلی نوع سے زیادہ کامل و مکمل ہوتی ہے یہاں تک کہ کئی قرون کے بعد وہ منتہا کی ملکیت پر پہنچ جاتی ہے۔ یہاں سے اسی تدریج اور آہستگی کے ساتھ زوال شروع ہوتا ہے تا آنکہ اپنی زندگی کی مدت ختم کر کے وہ بھی اپنے اسلاف کی طرح سراپرہہ عدم میں حل جاتی ہے۔

مثلاً اگرچہ حیوانات ذات اللہ ذی دور ثلثہ و دور ثلثہ مالاخریٰ سے مخصوص ہیں لیکن یہ جنس اپنی آمد کا اعلان کیے بغیر اسی دور میں دفعتاً و بغتہ ظاہر نہیں ہوتی۔ دور ثانیہ کو

کے قرون بعیدہ میں ہم اسے بشکل ناقص اس طور پر باقی رہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ زندہ رہنے کے لیے اچھ پائون مار رہی ہے۔ بالآخر یہ ترقی کرتے کرتے کامل شکل میں اسب الاعضا ہو گئی ہے۔

اسی طرح جنس ہوام الارض قرون ثانیہ کی حیاتی خصوصیات میں سے ہے۔ جس طرح ہم کسی بدلتے ہوئے طلسمی پردہ تصویر میں ایک منظر کی صورتوں کو دھندلا اور مدہم ہوتا ہوا اور ان و تبدیل صورتوں میں سے ایک نئی صورت کو نمودار ہوتا ہوا دیکھتے ہیں جو بتدریج واضح و نمایان ہو کر نہایت صاف نظر آنے لگتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ تحلیل ہو کر دوسرے مرتق کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے اسی طرح زمین پر رہنے والے حشرات الارض بشکل ناقص و موہوم نمودار ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ نسبتاً سے شباب کو پہنچ کر انحطاط کے رستہ پر پڑ لیتے ہیں۔ ان تیز رفت میں ایک بھی ایسا نہیں جو فوری و ناگہانی ہو بلکہ یہ درجہ بدرجہ ایک دوسرے میں غیر محسوس طور پر ختم ہوتے چلے جاتے ہیں

یہ نتائج وہ ہیں جو کسی طرح تل نہ سکتے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ گرم خون والے حیوان قرون اولی کی اس ہوا میں زندگی بسر کر سکیں جس میں جنسہ انجم عنصر اس درجہ غالب تھا۔ لیکن درختوں کے پتوں نے سورج کی شعاعوں کے ساتھ مل کر کیمیاوی طریقہ پر اس زہریلے عنصر کو ہوا سے خارج کر دیا۔ جو مٹی جو ہر کوئلہ کی شکل میں زیر زمین دفن ہو گیا۔ اسی جن کا عنصر اس سے علیحدہ ہو گیا اور اس طبع پر حیوانات زندہ رہنے کے قابل ہو گئے۔ کہہ ہوا میں جب یہ تبدیلی ہوئی تو سمندر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ جنسہ انجم کا جو جزو اعظم اس میں ملا ہوا تھا وہ اس سے جدا ہو گیا اور چونے کا پتھر جو اب تک بانی میں محلول تھا رسوب بن کر ٹھوس ہو گیا۔ جس قدر کوئلہ طبقات زمین میں پوند ہوا اسی قدر کلس معجم غیر مقررہ شکل حالت میں نہیں بلکہ اشکال ذوی الاعصاب بن کر علیحدہ ہو گیا۔ آفتاب کی شعاعیں روز بروز اپنا عمل کرتی رہیں لیکن اس کام کے ختم ہونے کے لیے سبب انتہا دنوں کی ضرورت تھی۔ کہہ ہوا کا زہریلے اجزا کی آمیزش

سے پاک و صاف ہونا قرہا قرن کے مدور کا محتاج تھا۔ علیٰ ہذا القیاس سرد خون والے حیوانات کے دور کا گرم خون والے حیوانات کے دور میں صہم ہونا مدت ہا سے دراز کے امتداد کا متقاضی تھا لیکن یہ طبعی تغیرات بجا بندی قانون عمل میں آتے رہے اور اجسام ذوی الاعضاء کی تبدیل شکل ناگہانی یا خدا کے کسی بے منابطہ نعل کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ ان تغیرات طبعی کا لازمی و لا بد نتیجہ ہونے کے لحاظ سے ان کی طرح قانون کا محصل تھی۔

اگر اس مضمون پر تفصیل سے نظر ڈالنی مقصود ہو تو ناظرین سیری کتاب "ٹریڈیشن آف ہیومن فزیا لوجی" (علم حیات انسانی) کی دوسری جلد کے پہلے دوسرے اور ساتویں ابواب یا خطہ فزیا لوجی پر کتاب "سائنس آف مین شاپ" ہونی چاہی۔

غالباً اس سوال کا جواب اب آسانی سے دیا جاسکے گا کہ آیا انتظام عالم بجا بند قانون ہے یا مداخلت ربانی کا تابع ہے جو سلسلہ علت و معلول کے سلسلہ کو توڑتی رہتی ہے۔ اس سوال کے ہر پہلو پر نظر غائر ڈالنے کے لیے ہم ایک ایسے نکتہ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو اگرچہ ایک لحاظ سے تو بے حقیقت محض ہے لیکن ایک اعتبار سے نہایت اہم اور معنی خیز بھی ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ آیا انسانی جماعتوں کی تاریخی زندگی تھنا و قدر کی نہ ٹھننے والی منزل میں ارتقا سے سابقہ تعیین کی علامات ظاہر کر رہی ہے۔ آیا کوئی شہادت اس واقعہ کی موجود ہے کہ اقوام کی زندگی قانون غیر متغیر کی تابع ہے اور آیا یہ خیال صحیح ہے کہ جماعت انسانی میں افراد انسانی کی طرح اجزاء عدم میں سے دفعۃً پیدا نہیں ہو جاتے بلکہ ان اجزاء کے تدریجی ارتقا سے پیدا ہوتے ہیں جو پہلے سے بشکل ناقص موجود تھے ؟

مسئلہ ارتقا کا مفہوم جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ کرہ زمین پر زندگی کے نمونہ ہونے کے وقت سے لے کر اس وقت تک اشکال ذوی الاعضاء کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے۔ جس کے اجزاء نے مابین نشو و نما منزل بمنزل طے کئے ہیں۔ اگر

کوئی شخص اس مسئلہ کو قابل اعتراض یا قابل تخریر خیال کرے تو اسے غور کرنا چاہیے کہ جن تبدیلیوں میں اُسے کلام ہے اُن کی مرحلہ بپائی وہ خود کر چکا ہے۔ نوہینے تک جب کہ وہ ان کے پیٹ میں تھامس کی زندگی کی نوعیت آبی تھی اور اس زمانہ میں اس نے درجہ بدرجہ بہت سی ستائز مگر متناسب شکلیں بدلیں۔ جب وہ پیدا ہوا تو اُس کی زندگی آبی سمجھائی ہو گئی وہ ہوا میں سانس لینے لگا۔ نئی قسم کی غذا اُسے دی جانے لگی۔ اُس کی پرورش کا طریقہ بدل گیا لیکن ابھی نہ وہ کچھ دیکھ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا نہ پہچان سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُسے ہوش و حواس کی نعمت عطا ہوئی۔ اُسے معلوم ہونے لگا کہ ایک بے دردنی و خارجی دنیا بھی موجود ہے۔ وقت مقررہ پر اُس کے اعضا تبدیل خدا کے نوکر ہو چلے۔ دانت نکل آئے اور خوراک بدل گئی۔ شیر خوارگی کے زمانہ کے بعد طفولیت کا دور آیا اور عہد طفولیت سہل بہ عالم شباب ہو گیا۔ اُس کا جسم نشوونما پاتا گیا اور ساتھ ساتھ قواسم عقلی بھی ترقی کرتے گئے جب اُس کی عمر اسل کے قریب پہنچی تو بوجہ اُس ترقی کے جو اُس کو جسم کے خاص خاص اعضائے کی تھی اس کی اخلاقی سیرت میں تغیر پیدا ہو گیا۔ نئے جذبے نئے خیالات اور نئی آہنگیں اس پر ایسا اثر ڈالنے لگیں۔ اس بات کا ثبوت کہ ان اعضا کا ارتقا ان جذبات کے ظہور کا باعث تھا فن شریک ابدان کی ہونگا فیون سے ہم پہنچتا ہے اور یہ ترقی یا تبدیلی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جسم کو منتہا سے بلوغ اور وراغ کو منتہا سے کمال پر پہنچنے کے لیے کئی سال کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخر کار رجحان بلوغ کی حد پہنچتی ہے اور اس کے بعد کھٹا ط کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ عین اس دور کے حسرت ناک نظارے یعنی قواسم جسمانی و ذہنی کے ضعف کی تصویر کشینی کی ضرورت نہیں شاید یہ قول مبالغے کی آمیزش سے پاک ہے کہ ہر انسان جو روے زمین پر موجود ہے ایک صدی سے بھی کم مدت میں ان تمام مسائل کو طے کر لیتا ہے بشرطیکہ اُس کا خاتمہ قبل از وقت نہ ہو چکا ہو۔

کیا زندگی کی ان تمام مسائل کے طے کر لے میں ہر شخص کو قدم قدم پر مداخلت ربانی



کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے یا بجائے اسکے یہ عقیدہ زیادہ تر قرین عقل ہوگا کہ وہ بے شمار نفوس انسانی جو روئے زمین پر آباد رہ چکے ہیں ایک غیر متغیر و ہمہ گیر قانون کے تابع ہیں۔ لیکن افراد اقوام کے اجزائے عنصری ہیں ان کا تعلق اقوام سے وہی ہے جو اجزاء جسمانی کو جسم کے ساتھ ہے۔ جسم کے اجزائے ترکیبی نظام جسمانی میں داخل ہو کر اپنا کار معوضہ انجام دیتے ہیں اور جب یہ کام ختم ہو چکنا ہے تو وہ فنا ہو جاتے ہیں۔ اور جسم سے خارج کر دیے جاتے ہیں۔

فرد کی طرح قوم بھی بغیر اپنے علم کے وجود میں آتی ہے اور اس کی موت میں بھی اس کی مرضی یا خواہش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ تومی و انفرادی زندگی میں بجز اس کے اور کوئی فرق نہیں ہے کہ قوم کی عمر بمقابلہ فرد کی عمر کے دراز زیادہ ہوتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم اپنی سماعت موقوف سے ایک لمحہ بھی زیادہ زندہ رہے۔ ہر قوم کی زندگی پر اگر نظر غائر ڈالی جائے گی تو معلوم ہوگا کہ اگر اس کو زندگی کے کل مدارج طے کرنے کا موقع ملا ہے تو بچپن۔ جوانی۔ بڑاپے سبھی منزلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

افراد و اقوام دونوں کی زندگی میں بشرطیکہ زندگی کی مختلف منازل طے کی گئی ہوں۔ خاص خصوصیات بطور قدر مشترک پائی جاتی ہیں۔ اور چونکہ افراد کی حالت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی زندگی حکومت قانون کی تابع ہے لہذا یہ استدلال غیر حق بجانب نہیں ہے کہ اقوام کی رفتار ترقی بلکہ کل بنی نوع انسان کا ارتقاء و اتفاق سے متاثر نہیں ہوتا اور فوق العادہ دست انداز یا تاریخی واقعات کے شیرازہ کو پراگندہ نہیں کرتین بلکہ ہر تاریخی واقعہ کسی واقعہ ماضی کا معلول ہے اور ان واقعات کے لئے جو ظہور میں آنے والے ہیں بمنزلہ علت ہے۔

لیکن نتیجہ مذہب جبر یہ یعنی اس یونانی فلسفہ کا اصل اصول ہے جس کی نسبت ہم ایک مقام پر بیان کر آئے ہیں کہ مصیبت کے وقت جب انسان کا بجز بیکسی کے اور کوئی بارو

مردگار نہیں ہوتا یہ فلسفہ اُسکے لیے سرمایہ تسلی و تسکین ثابت ہوا اور نہ صرف شاہیر یونان کا  
 ردۃ الکبریٰ کے جلیل القدر مدبروں سپہ سالاروں اور فرمان رواؤں کو مضبوط مستقیم پر چلنے  
 کی ہدایت کرتا رہا۔ اس فلسفہ نے بخت و اتفاق کے عنصر کو ہر شے سے خارج کر دیا تھا  
 اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ تمام واقعات کو جو جبر و قدر کے لزوم لاد کے تابع ہیں خیر کمال کی تسکین کا  
 ذریعہ قرار دینا چاہیے اس لحاظ سے یہ فلسفہ گویا صدق و خلوص - تساحت و نقشت - نیکی و  
 پاک بازی کی تعلیم دیتا تھا اور بنی نوع انسان کو یہ سکھاتا تھا کہ عقل و تیز سے کام لینا بیشک  
 کے اس قول سے شاید ہمیں یا اسے اختلاف نہ ہوگا کہ جبریتیں یعنی بیرون حکیم زینو کی تباہی  
 نسل انسانی کے حق میں ایک بہت بڑی آفت تھی اس لیے کہ یہی وہ لوگ تھے جن میں سے  
 اکابر و شاہیر پیدا ہوئے۔

لاطینی سیمیت اپنی پاپائی شکل میں اس اصول کی قطعی مخالفت ہے کہ اشتہام عالم بذریعہ قانون  
 چل رہا ہے۔ کلیسا عیسوی کی اس شاخ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معجزہ کن کرستون اور  
 فوق القدرت تصرفات کا ایک اچھا خاصہ نمونہ پیش نظر ہو جائے گا۔ اس روزنامہ کے  
 مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مقدس بزرگوں کی التجاؤں نے بسا اوقات نظام قدرت کو (بشرطیکہ  
 ایسا کوئی نظام حقیقت میں موجود ہو بھی) درہم و برہم کر دیا ہے۔ مورٹون اور تسمیرون نے  
 عجیب و غریب کرشمے دکھائے ہیں اور ہڈیاں بل اور دوسرے تیرکات کرستون کو ظہور  
 میں آنے کا باعث ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر اشیا کی حقیقت و صداقت کا معیار ان کی غیر  
 ممکن التزید تاریخی اصلیت نہیں ہے بلکہ ان کی معجزاتی اہل کرست آفرینی ہے۔ ایسی منطق  
 کے نرالے ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے جو ایک ادعا کا ثبوت کسی دوسرے واقعہ غیر  
 متعلقہ کی ناقابل فہم شہادت سے ہے؟

دور جاہلیت کے تاریک ترین زمانہ میں بھی حقیقت شناس اور معتدلیت پسند مسیحیوں کا  
 ان ربانی تصرفات اور کراماتی دست اندازیوں کے صحیح ہونے میں سزور شبہ ہوا ہوگا۔ نظام

قدرت کے باقاعدہ ارتقا میں عظمت و جبروت کی ایک ایسی شان نظر آتی ہے کہ ہم اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ہماری انفرادی زندگی کے واقعات میں اس بلا کا تسلسل پایا جاتا ہے کہ ہر دو سرورن کی زندگی میں خوارقِ عادات یعنی اس تسلسل کے انقطاع کا عمل میں آتا جیسا کہ اور نہیں آتا۔ ہر سمجھدار آدمی اچھی طرح جانتا ہے کہ قدرت نے اُسکی ذات کے لیے اپنی روش کبھی نہیں بدلی ہے۔ اُس کے لیے کبھی کوئی معجزہ ظہور میں نہیں آیا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر واقعہ کو کسی واقعہ سابق سے منوطاً مربوط پاتا ہے اور اسکو علت اور اسے معلول قرار دیتا ہے۔ جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اُسکے فلاں ہمجنس کی خاطر سنت اللہ تبدیل ہو گئی قانون قدرت بدل گیا اور فلاں فوق القدرت واقعہ معجزے کے طور پر ظاہر ہوا تو محالاً اُسے بھی سمجھنا پڑتا ہے کہ وہ ہمجنس یا تو خود فریب خوردہ ہے یا دوسرورن کو فریب دے رہا ہے۔

غرض جب اصلاح کینسہ کا زمانہ آیا تو نشاناتِ آسمانی کے بارے میں رو من کیتھولک عیسائیوں کے عقیدے کو سخت صدمہ پہنچا بعض بڑے بڑے متاہلین اور نیز پرائسٹنٹ کلیسا مسئلہ جبر و قدر کے قابل ہو گئے کیونکہ ان کا ہر صغیر ہو کر کتنا ہے کہ ہم ازل کے روز سے جبکہ ابھی

مصلحت کتب خاک میں مٹے کو آئے سوچ کر	مکڑے مکڑے تھا کلیجہ پارہ پارہ تھا جگر
کبھی نمی شانِ رسالت ہو دقتِ صبر و شکر	گرچہ متبادل کا تعاضد روئے جی کھول کر
نئے صحابہ بھی شریکِ غم نہیں بن کر ساقی	سب کے دل اس صدمہ جا بجا گاہ سے تھرپا تھر
اتفاقاً آفتاب اس دن گہن میں آگیا	ظلمتستان بن گیا جس سے دین سرسبز
اک محال نے کہا فطرتِ عقیقت سے کہ آج	سو گوار اس غم میں ہے سورج بھی ناخیز
جو جواب اس بات کا افس کو پیمبر نے دیا	آبِ زندہ سے منتقش ہے صفحہ تاریخِ زبر
کیا تعلق آدمی کے غم سے سورج کو بھنا	اک نشانِ قدرت حق ہے کون ایسا بفر

عالم کا نام و نشان بھی نہ تھا پابند قضاء و قدر کیسے گئے ہیں اس پابندی میں ہماری رضا مندی کو کوئی دخل نہیں بلکہ کار و ناسا سے قدر نے اپنے مقاصد کی تکمیل کو پیش نظر رکھ کر ہمیں حبس جلا بنا دیا کیلون کا یہ دعویٰ اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ جو اوقات گزرتے ہیں وہ ازل سے مقدر ہو چکے ہیں۔ اس طور پر کئی صدیوں کے گزرنے کے بعد دوسری صدی کے مسیحی فریون یعنی فرقه سیلیڈین و ولینٹائنوں کے خیالات پھر نمایاں ہونے لگے اور یہ وہی فرقتے تھے جن کے اوریت امیز عقاید نے مسیحیت کی شاخ میں مسئلہ تثلیث کا پیوند لگا دیا تھا۔ ان فریون کا یہ دعویٰ تھا کہ انسان سے تمام انحال برسیل اضطرار سرزد ہوتے ہیں یہاں تک کہ ایمان بھی ایک وہی نعمت ہے جس سے انسان کو مجبوراً مستفیض ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے انسان کی زندگی کا اخلاقی پہلو گو کیسا ہی قابل اعتراض کیونہ ہو لیکن اُس کی نجات کے لیے لازمی ہے کہ ایمان میں غلط نہ آنے پائے اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ خدا سے بزرگ و برتری تمام اشیا کا مصدر و مخرج ہے۔ اس طرح وہ خیالات رواج عام پانگے جن کو سینٹ اگسٹائن نے اپنی تصانیف میں بوضاحت صبح کیا ہیں یعنی خدا نے اپنی فوقی احوال و مشیت سے بعض شمس کی قسمت میں بلا لحاظ اُن کے ایمان یا اعمال صلح کے راحت ابدی لکھ دی ہے۔ اور اسی طرح بعض دوسرے اشخاص کو مبتلا سے عذاب نکل کر دیا ہے۔ پیروان مسئلہ تاخر تقدیر ہو یا نہ ہو عقیدہ تھا کہ یہبوط آدم مشیت ایزدی کے اقصائے تلج تھا یعنی حضرت آدم خدا کی اہلرت سے مبتلا سے معصیت ہوئے اور پیروان مسئلہ تقدم تقدیر ہو یا نہ ہوتا ہے مانتے تھے کہ یہبوط اپنے مہلک نتائج سمیت ازل سے مقدر ہو چکا تھا اور ہمارے آبا سے اولین شروع ہی سے کوئی اختیار نہ رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے اس جماعت کا عقیدہ سینٹ اگسٹائن کے اس قول کے خلاف تھا کہ۔

”یہ کہنا گناہ ہے کہ بحر حسنات کے خدا کسی اور امر کو بھی مقدرات میں داخل کرنا ہے۔“  
پس کیا خیال صحیح ہے کہ نجات ابدی خدا کے اُن مقدرات میں سے ہے جن کے ذریعہ سے

قبل ازاں کہ بنیاد عالم رکھی گئی اُس نے اپنی پوشیدہ مصلحت کو اس غرض کی تکمیل کے لیے  
و نہ نہ کر دیا کہ بنی نوع انسان کے ایک منتخب اور برگزیدہ طبقہ کو اعانت و عذاب مخلد سے نجات  
دلائی جائے ؟ کیا یہ سچ ہے کہ جماعت انسانی میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہیں قادیان  
نے بلا وجہ بے قصور غیر منتہی مصیبت اور غیر مختتم عذاب میں مبتلا کر دیا ہے ؟

۱۵۹۵ء میں عقاید عیسوی کی توضیح کے لیے جو تحریر بمقام لیتھ (واقع انگلستان) قلمبند  
کی گئی اُس میں یہ فقرہ درج ہے کہ "خدا نے بعض انسانوں کو ازل ہی سے سعید بنایا ہے اور بعض  
کو شقی قرار دیا ہے۔" ششہ عین اُس سچی کونسل نے جو بمقام ڈارٹ منعقد ہوئی تھی اس عقیدہ  
کی تائید کرتے ہوئے اسکے مخالفین کو ملعون قرار دیا اور ان کے ساتھ ایسی سختی کا برتاؤ کیا کہ بہت سے  
لوگوں کو ممالک غیر میں باکرپناہ لینا پڑی۔ کلیسا کے انگلستان نے بھی جیسا کہ اس کے  
دستور العمل عقاید کے سترہویں فقرہ سے پایا جاتا ہے اس عقیدہ کی حمایت کی۔

رومن کیتھولک عیسائیوں نے پراٹسٹنٹوں پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا ہے کہ انھوں  
نے انتظام عالم میں قانون کی مداخلت کو ایک حد تک قلیل کر دیا ہے۔ لیکن ان جملے پچھلوں  
کے پھوٹنے سے کیا نتیجہ نکل سکتا تھا۔ یورپ میں جہاں جہاں پراٹسٹنٹ مذہب نے رواج پایا  
معجزے اور کرامتیں صاف دیکھ لی گئیں۔ اس موقوفی سے اُس بہت بڑے ملی  
منافع کا بھی ناتہ ہو گیا جو کلیسا کو خائفانہ یون اور تبرکات کی مسیحاں سے حاصل ہوا کرتا تھا۔  
تذکرات النفران جو اصلاح کیندہ کے محرک تھے بکثرت بند ہو گئے اور ان پر دانون کی تجارت  
بے کام طلب بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ پادریوں کی خدمت میں ایک رقم ترہہ کو پیش کرنے پر خدا کی  
طرف سے کچھ بندوں کو گناہ کی اجازت مل جائے ماند پڑ گئی۔

اصلاح کرنے کا فلسفیانہ مفہوم اس رومن کیتھولک عقیدے کے ابطال پر متضمن  
تھا کہ خدا قیسی شفاعت کی تحریک پر معاملات انسانی میں مسلسل دست اندازی کرتا رہتا ہے  
لیکن اس ابطال میں سب کے سب اصلاح یافتہ کلیساؤں نے خاطر خواہ حصہ نہیں لیا۔

سائنس نے گزشتہ چند سال سے شہادت کا جو انبار اس مسئلہ کے متعلق جمع کرنا شروع کیا ہے  
 کہ انتظام کائنات تابع قانون ہے۔ اُسے ان میں سے اکثر کلیہ ماؤں نے مستنبط کیا بلکہ عدم  
 استحسان کی نظر سے دیکھا ہے لیکن شہادت کا وزن روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس لیے  
 ضرور ہے کہ اس تشکیک و نا پسندی کی کا ایک نہ ایک دن خاتمہ ہو جائے۔

جب حالت یہ ہے تو بجز اس کے چارہ نہیں کہ ہم کشتیوں کے بھٹے فیروزہ گر تیسرے  
 کے اس قول کو اپنا اصول مہضہ و قرار دین کہ ایک ابدی و غیر متغیر قانون تمام اشیاء اور تمام  
 زمانوں پر حاوی ہے۔



# دسوان باب

## لاطینی مسیحیت اور تمدن جدید کا تعلق

ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ تک لاطینی مسیحیت نے یورپ کے عقل واداک پر قبضہ کیے رکھا جس کے نتائج کی ذمہ داری اُس پر عائد ہوتی ہے۔

ان نتائج نے جو شکل اختیار کی وہ اصلاح کینسہ کے وقت شہرہ امکی حالت اور خانگی و عمرانی زندگی میں یورپ کی حالت سے ظاہر ہوتی ہے۔ اقوام یورپ کے کندھوں پر دہری حکومت کا جا رکھا ہوا تھا یعنی الیٹ انہیں حکام دنیوی کی متابعت کرنی پڑتی تھی دوسری طرف حکام دینی کی۔ اہل یورپ جہالت ادنام پرستی اور تکالیف مذہب میں مبتلا تھے۔ رومن کیتھولک مذہب کی ناکامیابی کی وجہ۔ پاپائیت کی سیاسی تاریخ۔ دینی دروہانی حکومت سے ترقی کر کے یہ مطلق العنان شخصی حکومت کی شکل میں بدل گئی۔ کر دینا لون کی انجمن اور کیریا کی کاروائی۔ پاپائی خزانہ کے لیے بیش قرار حاصل کی ضرورت بد اخلاقی کی محرک ہوتی ہے۔

جو فائدے یورپ کو کیتھولک عہد حکومت میں پہنچائے گئے ان میں حکومت کے منشا کو کچھ دخل نہ تھا بلکہ وہ محض اتفاقی یا مہمنی تھے۔

عام نتیجہ یہ ہے کہ پاپائیت کا سیاسی اثر موجودہ زمانہ کے تمدن کے حق میں مضر تھا۔

لاطینی مسیحیت جو تہمتی سے لے کر سولہویں صدی تک یورپ کی مادی اخلاقی اور عقلی حالت کی ذمہ دار ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس فرض سے یہ کس طرح عہد برآ ہوئی۔ موجودہ بحث کی اغراض کے لحاظ سے ہم جو کچھ لکھیں گے صرف یورپ ہی کے متعلق

لکھیں گے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پاپائیت کا یہ دعویٰ کہ اُسے الوہیت کے ساتھ ایک نسبت قریبہ ہے اور ساری دنیا کو اُسکی اطاعت کرنی چاہیئے اُسے کل بنی نوع انسان کی حالت کا جواب دہ ٹھہراتا ہے۔ جنوبی و مشرقی ایشیا کے عظیم الشان اور قدیم مذاہب کے مقابلہ میں اس کے اثر کا فقدان ایک اہم اور نکتہ خیز بحث پیدا کرتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا اثر وہیں تک پہنچا جہاں رومۃ الکبریٰ کا شہنشاہانہ اقتدار نافذ تھا لیکن اس سیاسی نتیجہ کو وہ ازراہ غایت استحقار رد کرتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاح کینہ کے آغاز پر ہر ایک لوگ ایسے تھے جو اس دلت کی تمدنی حالت کو زمانہ قدیم کی حالت سے مقابلہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے تھے کہ نہ تو یورپ کے اخلاق میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ نہ بلحاظ عقل و ادراک اُس نے کوئی ترقی کی ہے اور نہ ادگوں کی حالت میں کوئی اصلاح ہوئی ہے۔ خود رومۃ الکبریٰ کی عظمت و شوکت صفحہ تمدن سے محو ہو گئی تھی۔ سنگ مرمر کی وہ سڑکیں جن پر فیض آگسٹس کو ایک زمانہ میں ناز تھا نابود ہو چکی تھیں۔ اجرے ہوئے ہیکل۔ ٹوٹے ہوئے مینار کھنڈروں سے پٹے ہوئے کمپنا کی عظیم الشان ہنروں کی طویل مقف محرابیں حسرت ناک ویرانی کا مرقع نگاہ کے سامنے پیش کرتی تھیں کیپٹیل کا برج مشید جس پہاڑی پر واقع تھا اُس کا نام اب کوہ گو سفند ہو گیا تھا اس لڑکے یہاں بکریوں کے گلے رکھے جاتے تھے۔ جس مقام پر قورم کی وہ عالیشان عمارت قائم تھی جہاں روما کے آئین و قوانین وضع ہو کر دنیا میں نافذ ہوئے تھے اُسے اب احاطہ کاؤ کہتے تھے اس لیے کہ یہاں کا آئین بندہ ہی تھیں۔ قیصر کا پر تکلف محل مٹی کے ڈبیروں میں چھپ گیا تھا جن پر جہڑ جھنڈا لگا آئے تھے۔ کراکرا کے حمام اپنے جلو میں چمنوں اور محضون سمیت خزانہ آب کے برباد ہو جانے کے باعث جس سے انھیں پانی پہنچا کرتا تھا دلت کے ویران ہو چکے تھے۔ اس عظیم الشان عمارت کے کھنڈروں میں بلند محرابوں اور وسیع چوتروں پر پھولدار بیلین اور خوشبو دار مجاڑیان ہر طرف آگئی



ہوئی تھیں۔ روم الکبریٰ کی دیران عمارتوں میں سب سے زیادہ عظیم الشان عمارت عیسیٰ کا لائبریری کمرہ صرف ایک تہائی حصہ باقی رہ گیا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ اس میں نوے ہزار نمونہ شایون کی نشست کی گنجائش تھی لیکن انقلاب روزگار نے ازمندہ وسطیٰ میں اسے قلعہ بنادیا اور اس کے بعد روم کے ناخلف ذوالایق فرمانرواؤں نے اس کی دیواریں توڑ توڑ کر اپنے حلوں کے لیے پتھر کی سلون کا ذخیرہ فراہم کیا۔ پاپایان رومین سے بعض نے اس میں بزمینہ باقی اور شورہ سازی کے کارخانے قائم کیے اور بعض نے یہ جوہر کی کہ اس کے عالیشان چھتوں اور کمانچوں میں بیوپاریوں کی دکانیں لگائی جائیں۔ وہ لوہے کے قبضے جن سے اس کے پتھر جڑے ہوئے تھے پوری جاچکے تھے۔ دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور سلسلہ شکست درنیت جاری تھا۔ خود روہنات کی جو مختلف قسمیں اس عظیم الشان کھنڈر میں پیدا ہو گئی تھیں ان کی ماہیت پر متعدد کتابیں زمانہ حال میں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ ڈی فلو آف دی کالیریم (نہات کالیریم) میں چار سو بیس انواع کا حال موجود ہے۔ برانی پرنی وسیع درگشاہاتوں کے کھنڈروں میں ٹوٹے ہوئے ستون صنوبر اور عر اور بوسیدہ دستکاری کے ابھردین نقش دیواروں سے جدا ہو ہو کر گرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

لہ پر دنیس راڈرڈ ٹیلر نیل آف دی رائل سوسائٹی اپنی کتاب "انخراہ لوجی" (علم الانسان) کے صفحہ ۱۳۳ پر خرقی فی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج کل پتھر کی عمارت کے طریقہ تعمیر کے متعلق ہمارا عام خیال یہی ہے کہ پتھر کی سلون کو جوڑنے کے لیے ان کے درمیان چوڑے لکڑی کی ایک تہ بچھا دی جائے لیکن مصر اور یونان قدیم کی خوبصورت اور شاندار عمارتوں کو جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ان شک چنانی کا رواج تھا۔ سلین سٹیل پرچن دی جاتی تھیں اور ان کی پوستگی کے لیے جو نے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ مان جب پتھروں کو خاص طور سے جوڑنا منظور ہوتا تھا تو نہات کے قبضہ استعمال کیے جاتے تھے۔

عالم نبات بھی اس حسرت اندوز تعمیرین شریک تھا۔ رحسان جو ایک زمانہ میں آئوٹنٹا کے کنارے بہ کثرت پھولتا تھا تقریباً معدوم ہو گیا تھا۔ لارل (شجرۃ الغار) کی جگہ جس کے پتے کبھی تاجداروں کی پیشانی کو زینت بخشتے تھے۔ عشق بچان کی ہل آگ آئی تھی جو موت کی علامت ہے۔

لیکن شاید اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اس تمام ویرانی و بربادی کے ذمہ دار پاپائین روما نہیں قرار دئے جاسکتے۔ اور اس ادعا کی تائید میں بیان کیا جائے کہ ایک سو چالیس برس سے کم کے عرصہ میں روما کو الیرک۔ جنسرک۔ اریسمر۔ دیشیجز اور ٹائیلا نے یکے بعد دیگرے مسخر کیا اس کی بہت سی بڑی بڑی عارتین قلعوں اور برجوں کی شکل میں بدل دی گئیں۔ دیشیجز نے کپینا کو برباد کر کے نہروں کو ضائع کر دیا۔ ٹائیلا نے قیصر کے محلوں کو تاخت و تاراج کیا۔ پھر قوم لامبرڈ نے اس کے محاصرہ پر محاصرے کیے۔ اس کے بعد ابراہن گسکارڈ اور اُس کی نارمن فوج نے شہر کو آٹھ سو تین سو لکھ فلیمنین دروڑاں تک اور لیٹین سے لے کر کیٹیٹل تک جلا دیا۔ بعد ازاں کانسٹیبل بوبرون نے اسے لوٹا اور اُجاڑا۔ کئی دفعہ دریا سے ٹائبر کی طغیانی نے اسے غرقاب کیا اور بار بار اس کو زلزلہ کے صدمے پہنچے پڑے۔ یہ سب سچ ہے لیکن ہم کیا ولی کے الزام کو بھی نہیں فراموش کر سکتے جو اپنی تاریخ فلازش میں لکھتا ہے کہ اٹلی پر شمال کی وحشی اقوام نے جس قدر حملے

لے کر کوٹ کیا ولی پاپائے یوڈیم کا معاصر اور پندرہویں صدی کے مشاہیر اہل تدبر سے ہے لیکن اگرچہ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا فلسفی اور سب سے بڑا تدبر سمجھا گیا ہے پھر بھی اُس کی شہرت قابل رشک نہیں خیال کی جاتی۔ اس لیے کہ اُس نے فن تدبیر مملکت اور حکمت عملی کی بنیاد بے ایمانی چالائی۔ بدعہدی اور بے اصولی پر رکھی ہے۔ اسی لیے اُس کا نام غدارانہ چال بازی کا مردِ فاش ہو گیا ہے۔ لارڈ میکالے میکا ولی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لوگ اُس کے ال نام سے بدشاش اور اُس کے مسیحی نام سے شیطانِ مرداب لینے لگے۔

کیے سب پاپایان روما کی تحریک سے کیے۔ اس لیے کہ انہیں نے ان دشمنوں کو اٹلی پر چڑھائی کرنے کی دعوت دی تھی۔ روما کی تباہی و بربادی کا باعث گاتھ یا فنل یا تارمن یا عرب قوم کی حملہ آوری نہیں ہے۔ بلکہ خود پاپائون اور ان کے بہتجوں نے اس فوجی صورت شہر کو غارت کیا اپنی چونے کی جمیٹوں کے لیے انھوں نے اس کے کھنڈروں کو مصالحہ بہم پہنچایا۔ اپنے مغللوں کی تعمیر کے لیے انھوں نے قدیم عالیشان عمارت کے پتھر اکھڑوا اکھڑوا کر منگواے۔ پرانے مندروں اور ہیکلوں کی غارت گری سے گرجاؤں کی آرائش کا سامان لیا۔

اس دشمنانہ پن کا بھی کوئی ٹھکانا ہے کہ مندر توڑ کر گرجا بنائے جائیں!! اس الزام اور اسی طرح کے دوسرے الزامات کا وہ بہت پاپایان روما۔ ان کے دامن سے نہیں جھوٹ سکتا عالیشان کا رستمی وضع کے ستونوں کو خراب و چرہ پا کر ان بزرگواروں نے مسیحی اولیا کی صورتیں بنوا ڈالیں۔ شاندار مفسری پر کوئے بیزاروں کی پاپائی کنہوں کے استغاش سے بے حرمتی کی گئی۔ قیصر سچویرس کے عہد کی بے نظیر عمارت پیٹیر ویم کو اس غرض سے منہدم کیا گیا کہ اس کے امدت سے سینٹ پیٹر کا گرجا تعمیر کیا جاسے۔ چھتین کی کالسی کی جھٹ کلا کر وہ ستون ڈالے گئے جن سے سینٹ پیٹر کے روضہ کو آراستہ کیا گیا۔

کیپٹل کے برج میں ڈھکے ڈھکے اپنی ماتی گونج سے بہت سے پاپائون کی موت کا اعلان کر چکا تھا اور عمارت کی بے حرمتی اور لوگوں کی فاسد الاخلاق کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ غرض پاپائی روم کو تو ہم روما کا کچھ باس نہ تھا بلکہ اور اس سے انہی نفرت تھی جس کا ردہ کر اظہار ہوا۔ پاپایان روما اول اول فرمان روایان قسطنطنیہ کے ماتحت تھے۔ پھر تاجدارانِ فرانس کے مددگار ہو گئے اور اس کے بعد یورپ کی عثمان فرمان فرماؤں ان کی ماتحتیں آگئی۔ گویا ان کی حکومت نے بھی ہمسایہ اقوام کی حکومت کی طرح تغیر و انقلاب کو مختلف مراجع ملے کیے اور ان کے اغراض و مقاصد اور مطالبات اور عادی یک قلم

بدل گئے۔ پاپائیت کو تغیر نہیں ہوا تو صرف ایک بات میں نہیں ہوا یعنی اس کا تعصب دستور  
 قائم رہا۔ چونکہ مسیحیوں کی مذہبی زندگی کے مرکز ہونے کا دعویٰ تھا لہذا اس نے پاپائیت  
 سے خارج ہر مذہبی وجود کے تسلیم کرنے سے اصرار کے ساتھ انکار کیا حالانکہ اس میں  
 ذرا بھی کلام نہیں کہ سیاسی اور دینی ہر ایک اعتبار سے وہ از سر نیا بوسیدہ اور متعفن ہو رہی  
 تھی۔ آرمسن اور کوئٹھر نے حبسِ روم کی بے دینی اور دہریت پر نظر ڈالی تو ان کے اندام  
 اتفاقاً ارواح پر لرزہ طاری ہو ہو گیا۔

ان واقعات میں سے اکثر کی تفصیل کے لیے ہم نیچلی کی وقایع نویسی کے مہینت  
 بین میں نے اپنی تاریخ میں روم کے اخلاقی مفاسد و زایم کی تصویر کشی دی ہے انتخاب  
 کے وقت پاپائیان روم عموماً عمر رسیدہ و سالخورہ ہوتے تھے۔ اس لیے غنا و اقتدار ہمیشہ نئی

۱۵ یو پولڈوان ریگی زمانہ حال کا ایک بہت بڑا جرمن مورخ۔ ۱۹۵۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۸۷ء میں  
 وفات پائی۔ اُس کی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ واقعات کو بے رورایت بلا کم  
 کاست درج کرتا ہے اور ذاتی رائے یا رجحان کو وقایع نگاری میں مطلق دخل نہیں دیتا۔ اگر دوسرے  
 یورپین مورخین بھی اسی اصول پر چلتے تو تاریخ تدریس و تفسیر کے اُن عیوب سے پاک ہوتی  
 جو یورپ کے عارض تہذیب پر ملزوم ایک بدنامہ کے ہیں۔

تاریخ پاپائیان روم کی نسبت جس کا ڈیرس نے متن میں حوالہ دیا ہے لارڈبرکالے لکھتے ہیں کہ پروفیسر نیگی  
 کی تصنیف ان حلقوں میں جہاں جرمن لٹریچر کا رواج ہے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور یہ ایک  
 ایسے شخص کی مشقِ قلم کا نتیجہ ہے جو کنگڈومسکی و دیوینہ سنجی اور وسیع انظری کے اعتبار سے افراں وائل  
 میں سربرآوردہ ہے۔ کتاب کا طرزِ تحریر نہایت دلپسند و دل نشین ہے ممتاز و در ذات اس کے  
 حرفِ حق سے مترشح ہے۔ تعصب اور چھوڑا پن اس میں نام کو نہیں پایا جاتا اور ابتدا سے لیکر انتہا تک  
 رواداری کے ساتھ بلاور رعایت لکھی گئی ہے۔ اس تاریخ کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔ اور اس کے  
 انگریزی ترجمہ ہی کی تنقید کرتے ہوئے جولائی سال ۱۹۸۱ء کا کیا جواہر لارڈبرکالے نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ ترجمہ

باہتوں میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ ہر انتخاب امیدواروں اور متنازعوں کا انقلاب ہوتا تھا۔ جس جماعت کے تمام افراد کو کام ترقی پر پہنچنے کا موقع حاصل ہو اور ہر شخص کو اپنے واسن میں دولت اور طاقت کے گنج خاں گان کا سمیت ناممکن نظر آئے اس کا ہر فرد بھلا کیوں نہ ہو مسرور کے حقوق کی پابانی کی دھن میں لگا ہوا ہو۔ اگرچہ واقعہ اصلاح کینہ کے وقت ردائی اُبادی گھٹتے گھٹتے اسی نظر رہ گئی تھی پھر بھی عہدہ داروں کی تعداد بہت بڑی تھی اور ان عہدواروں کے امیدواروں کی تعداد اور بھی زیادہ تھی۔ کامیاب پانچ ہزاروں خدمتیں عطا کر سکتا تھا اور یہ خدمتیں ہوتی تھیں جن سے بہت سے قصور لازم نہایت بے دردی سے برطرف کر دیے جاتے تھے اور بہت سی جدید خدمتیں اس غرض سے قائم کی جاتی تھیں کہ امیدواران لازمیت کے ہاتھ فروخت کی جائیں جو کسی امیدوار کی دیانت یا قابلیت کو ہرگز پیش نظر نہ رکھا جاتا تھا بلکہ صرف ان امور پر لحاظ ہوتا تھا کہ وہ فرتی مقتدر کی کیا خدمت کر چکا ہے یا کر سکتا ہے اور ماموری کے معاوضہ میں کسی قدر غدا نہ پیش کرنے کی استطاعت رکھتا ہے ہمارے امریکن ناظرین ان حالات کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ امریکہ کے پرنیڈنٹ کے انتخاب کے موقع پر بھی اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں مجلس انتخاب پاپے دوا۔ جماعت نامزدگی پرنیڈنٹ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے چند ان سفایر نہیں ہے۔ قرعہ انتخاب جس کے نام پر پڑتا ہے اسے دونوں صورتوں میں بہت سے عہدواروں کے عطیہ کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

ولیم ساکن ماسبری کا بیان ہے کہ اس کے زمانہ میں اہل رومانے صداقت اور تقدس کا اچھا خاصہ بیوہ قائم کر رکھا تھا۔ کوئی پاک یا مقدس شے ایسی نہ تھی جس کا بھادوسو نے چاندنی میں مقرر نہ ہو۔ اس کے زمانہ کے بعد بھی کوئی اصلاح نہ ہوئی بلکہ کلیسا کی حالت اور بدتر ہو گئی اور کلیسا آلہ جلب منفعت بن گیا۔ اٹلی میں اس طہر پر ہمیش فرادہ رقیین جمع کی گئیں اور ملاک ملحقہ سے ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف بہ لطافت الحس بڑی بڑی رقیین وصول کی گئیں۔ روپیہ جمع کرنے کا سب سے زیادہ ناپاک چیلہ فروخت تذکرات الغفران تھا

جنہیں خرید کر مشتری من مانے گناہ کر سکتا تھا۔ غرض اطالوی مذہب بانگوں کو لٹٹے کا فن بن گیا تھا۔

ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک رومایا پاؤن کے زیر نگین رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس عرصہ میں اس پر بہت سی تباہیاں ایسی آئیں جن کے وہ جواب دہ نہیں ٹھہر سکتے لیکن یہ ذمہ داری یقیناً اُن پر عاید ہوتی ہے کہ اُن کی طرف سے کبھی کوئی پروردگار یا مستقل کوشش اس شہر کی مادی و اخلاقی اصلاح کے لیے عمل میں نہیں آئی۔ بجائے اسکے کہ اس مادے میں روم کوئی ایسی نظیر قائم کرنا جو دنیا کے لیے واجب القیاس ہو اُس نے ایک ایسی حالت کی مثال پیش کی جو ہر طرح سے قابل نفرت ہے۔ القصد دعا کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جب واقعہ اصلاح ظہور پذیر ہوا تو نویت یہاں تک سدھنچ گئی تھی کہ کوئی صاحب اتقا اجنبی یہاں آکر کارہ اور متفر ہو سکے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

پاپاں رومانے سائنس سے تو اس بنا پر قطع تعلق کر لیا تھا کہ یہ اُن کے دعاوی سے بالکل مغایر ہے۔ البتہ اخیر خیرین فنون لطیفہ کی سرپرستی شرف کی تھی۔ لیکن موسیقی و نقاشی کو بجائے خود سرمایہ لذت و آرائش حیات ہون بھر بھی اُن میں کوئی ایسی زندہ طاقت موجود نہیں ہے جو ایک کمزور قوم کو شہرور بنا دے یا جماعت انسانی کی مادی راحت و آسائش میں بالاشتغال اضافہ کر سکے۔ اسی لیے اصلاح کے وقت اس شخص کی نظردن میں جو روم کی حالت پر نظر غائر ڈال چکا تھا اس شہر کی تمام زندہ توانائی سلب ہو چکی تھی وہ اس قابل نہ رہا تھا کہ دنیا کی دنیوی یا دینی ترقی میں حصہ لے سکے۔ نظام جمہوری و شہنشاہی ترقی پذیر قواعد کے بجائے اُس نے پاپائیت کے جادو غیر متحرک اصول قائم کر لیے تھے اُس کی دینی حالت تو یہ تھی کہ اُس پر دہود اتقا کا ایک غیر حقیقی ملمع چڑھا ہوا تھا اور دنیوی ترقیات کی قسم سے اُس کے قبضہ میں فنون لطیفہ تھے۔ اس لحاظ سے

گو یا وہ کسی راہب کی اُس لاش کے مشابہ تھا جو سین ابھی تک کپوشیٹی طبقہ کے راہبوں کے دفن میں بھروسے رنگ کی کفن اور ہے اور ہاتھ میں دعاؤں کی کتاب یا کچھ مر جھا ہوئے پھول لیے نظر آتی ہے۔

”مینیٹا البقا“ (روما) کی تصویر کا یہ رُخ دکھانے کے بعد اور لاطینی مسیحیت نے اس کے ساتھ جو جو سلوک کیے اُن پر نظر ڈالنے کے بعد اب ہم کل براعظم یورپ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مذہب جو جماعت انسانی کے پیٹرو اور سنا ہونے کا مدعی تھا اپنے شاہج کے لحاظ سے کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔

ادوار کی حالت باعتبار اُن کے سود و بہبود کے نہایت صحیح طور پر اُن کی آبادی کی کمی و بیشی سے ظاہر ہوتی ہے۔ آبادی پر طرز حکومت (یعنی اُس کی جمہوریت یا شخصیت) کا اثر بہت کم پڑتا ہے۔ البتہ تدبیر مملکت و طریقہ نظم و نسق کا اثر اُس کے شمار و اعداد پر چھا جاتا ہے جن مصنفین نے اس ضمن پر غور کیا ہے اُنھوں نے قابل اطمینان طور پر ثابت کر دیا ہے کہ آبادی کا گھٹنا بڑھنا جماعت انسانی کی قوت تولید و قوت ممانعت حیات کے باہمی توازن پر منحصر ہے۔

قوت تولید سے مراد وہ مفاد و نیات و فطرت ہیں جو تہ نسل انسانی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں ایک خاص اس قوت کا وارد و خارج و ہوا پرست لیکن چونکہ یورپ کی آب و ہوا میں بخار و سردیوں صدیوں کے درمیان کوئی محسوس تغیر نہیں ہوا لہذا ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ براعظم یورپ میں یہ قوت زمانہ زیر بحث میں بحالت اصلی قائم رہی۔

قوت ممانعت حیات سے مراد وہ تمام اسباب ہیں جن سے بقائے افراد انسانی منحل ہو جائے۔ اس قسم کے اسباب میں غذا کا ناکافی ہونا لباس کا غیر مکتفی ہونا اور مسکن کا ناقص ہونا شامل ہیں۔

ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر قوت ممانعت گھٹ کر غیر محسوس ہو جائے تو قوت تولید

آبادی کو ۲۵ سال میں دگنا کر سکتی ہے۔

قوت مدافعت کے عمل میں آنے کے دو طریقے ہیں۔ جسمانی و دماغی۔ مدافعت کی جسمانی قوت اولاد کی تعداد کو کم کر دیتی ہے۔ اور زندگی کا اوسط گھٹا دیتی ہے۔ مدافعت کی دماغی قوت اُن لوگوں کو جن پر اخلاقی اور خصوصاً مذہب کا گہرا اثر ہو اس بات پر آمادہ کر دیتی ہے کہ تا وقتیکہ اُن میں بیوی بچوں کی خبر گیری و پرورش کی ذمہ داری سے عہدہ نہ آجائے کی قابلیت نہ پیدا ہو جائے شادی نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مدت معینہ میں جس قدر شادیاں ہوتی ہیں اُن کی تعداد کو خوراک کی قیمت کی شرح کے ساتھ ایک خاص نسبت ہوتی ہے خوراک میں جس نسبت سے اضافہ ہوتا ہے اُسی نسبت سے آبادی بھی بڑھ جاتی ہے اور قوت تولید اس درجہ طاقتور ہے کہ وہ ذرائع معاش سے تجاوز کر جاتی ہے اور ان پر مسلسل دباؤ ڈالے رکھتی ہے۔ ایسی حالت میں ضرور ہے کہ افلاس کی ایک خاص مقدار دنیا میں موجود ہو۔ یعنی جماعت انسانی کے ایک طبقہ کے لیے فاقہ کشی کا ضرور سامنا ہے۔

مختلف ممالک کی آبادی میں جو تغیرات واقع ہوئے ہیں اُن کا ثبوت مفصلہ ذیل مثالوں سے مل سکتا ہے جب چین کی فوج کشی نے آٹلی کی آبادی کو بے حد گھٹا دیا۔ شمالی افریقہ مذہبی جنگوں کی وجہ سے قریب قریب ویران ہو گیا لیکن جب یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو آبادی پھر ترقی کر گئی۔ طریقہ جاگیر داری کے رواج سے تمام یورپ کی آبادی بڑھ گئی اس لیے کہ جاگیر بن بمقابلہ اُن زمینوں کی تعداد کے جن کی قوت بسر کی وہ ذریعہ تھیں زیادہ تھی ہو گئیں۔ عرب صلیبیہ نے آبادی کو بہت کچھ گھٹا دیا اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ کرائیوں میں بہت سے آدمی مارے گئے اور کچھ یہ کہ بہت سے سندرت اور صحرانورد لوگوں کو متاہلانہ زندگی سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اسی طرح کے انقلابات براعظم افریقہ میں بھی ہوئے ہیں۔ میکسیکو کی آبادی ہسپانویوں کی اُس وحشیانہ سفاکی اور ناانسانیانہ



کی وجہ سے جس نے یہاں کے تہذیب یافتہ باشندوں کی عافیت تنگ کر دی اور انہیں زندگی کی طرف سے ناامید کر دیا۔ بقدر بیس لاکھ کے گھٹ گئی۔ یہی حال پیروکا بھی ہوا۔ انگلستان کی آبادی نارمن فتوحات کے وقت تقریباً بیس لاکھ تھی۔ پانچ سو سال میں یہ بمشکل دو گنی ہو سکی اس جہود کی و ممدار ایک حد تک غالباً وہ پانی مصلحت تھی جس نے پاریوں کو تہجد کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس مصلحت نے قانونی قوت تولید پر ضرور اثر ڈالا لیکن حقیقی قوت تولید پر اس سے خاک افروز پڑا اس مسئلہ پر جن لوگوں نے نظر غائر ڈالی ہے وہ مدت کے مطنین ہو چکے ہیں کہ علانیہ تجربہ حسیہ عیاشی کا مترادف ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام انگلستان چھ اٹھا کہ ملک میں ایک لاکھ عورتیں ایسی موجود ہیں جنہیں پادری خراب کر چکے ہیں اور اسی بنا پر عامہ خلافت اور نیز حکومت انگلستان نے اُن خانقاہوں کو جو رہبانیت کا مرکز تھیں بند کر دینے کا قصد کر لیا۔

ہم نے اپنی کتاب دتارنج خانہ جنگی امریکہ میں اسی مسئلہ پر بعض خیالات ظاہر کئے ہیں جن کا اقتباس اس مقام پر خالی از لطف نہ ہو گا۔ "آبادی کی اس چاب اور استقراری حالت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کو خواہ بصد وقت و زحمت حاصل ہو۔ تن ڈھکنے کو کافی کپڑا میسر نہ آئے۔ جسم غلامتوں سے آغوش ہو۔ رہنے کے لیے جموں پٹیان ایسی بنائی جائیں کہ موسم کی سختی سے بچاؤ نہ ہو سکے۔ سردی گرمی کے تباہ کن اثر کے سد باب کی کوئی صورت نہ ہو غلیظ اور دباؤی ابھرے پھیلے ہوئے ہوں۔ حفظان صحت کی تدابیر مفقود ہوں۔ اطباء و عالج نام کو دکھائی نہ دیں۔ گندے لتوڑے ٹہنے ٹٹکے کی چارہ گری بے سود ثابت ہو۔ معجزوں اور کرامتوں کی ادبچی دکان کا پکوان پھیکا اور سیٹھا نکلے غرض مصیبتوں تکلیفوں اور عاقبتوں کی اس طویل فہرست کا اگر خلاصہ کیا جائے تو آبادی کے حامد و غیر متحرک ہونے کا مفہوم یہ ہو گا کہ شرع اسوات کا اوسط غیر معمولی طور پر بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ مفہوم ابھی مزید تفصیل کی گنجائش رکھتا ہے۔ یعنی اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ شرع پیدائش کا اوسط معمول سے

گھٹا ہوا ہوا باغیاں گرنے کا دروازہ بند ہو گیا۔ مٹی کی گرم باریش - درپردہ نسق و فہر ہوتا ہو -  
اخلاق کا تو ام گز گیا ہو -

”ہاشمہ گان امریکہ کے لیے جو ایک سیٹہ ملک میں رہتے ہیں وہاں کل تین ایک سو  
اور ناقابل نفوذ جنگل چھایا ہوا تھا مگر وہاں آٹھ اسی آبادی کا حجم ہے جس پر کہیں مثال کے بعد مقررہ  
رفتار کے مطابق زندگی ہو رہی ہے حقیقی و اضافی زندگی کی ہر خوشی کے تعلق کو نہ ہوا تیار ہی جیتا  
واقف ہے وہ بتا سکتا ہے پھر دریافت کریں گے کہ آخر وہ کس قسم کا روزِ نسق و نسق تھا جس کا وہ  
تو یہ تھا کہ انسان کے معاش و معاویہ کی اصلاح و ترقی اس کا غلبہ کیوں ہے لیکن جب انسان  
نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو خوشیاں تیار ہی اور عیسیت انسان پر لگائی ہوئی ہیں  
میں جنگ و دباؤ اور خطا کی سہ گاہ بلاؤں کے متعلق اثر سے کہیں پائی ہوئی تھی اور سہل طریقہ کہ تو  
کو گمان تھا کہ اس طرز حکومت میں ان کی دنیوی بھلائی کا راز چھپا ہوا ہے - اس زمانہ کی حالت  
اور آج کل کی حالت کا اگر مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آنے لگا - انگلستان  
کی اسی جزیرہ فیانی سطح پر آج دس حصہ زیادہ لوگ آباد ہیں اور آبادی کے روز افزون اضافہ کی  
یہ حالت ہے کہ ہجرت کرنے والوں کے انہوہ کثیر دنیا کے مختلف حصوں میں جا جا کر آباد ہو رہے  
ہیں - جو شخص عہد گزشتہ کو ادب و احترام کی نظرت دیکھتا ہے اسے تو قیاس کر لینا چاہیے  
کہ اس قسم کے طرز نظم و نسق و تدبیر حکمت کی کیا قدر و منزلت ہو سکتی ہے ؟

یورپ کی آبادی کے ان تغیرات کے ساتھ ساتھ آبادی کی ترقی کی تیز رفتاری بھی ہے  
سلطنتِ رومین مسیحیت کے شائع ہونے کے بعد آبادی کا مرکز شمال کی طرف منتقل  
ہو گیا اور وہاں سے صنعت و تجارت کی ترقی کے باعث مغرب کی طرف چلا گیا -

اب کسی قدر زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ ان اضافہ و نقصان کی نوعیت پر  
نظر ڈالنے ہیں جنہوں نے یورپ کی آبادی کو ایک ہزار سال تک حالتِ تہ و دو سکون میں  
رکھا - براعظمِ یورپ کی سطح کا بہت بڑا حصہ فی ووق اور بے راہ بیگلوں سے گھرا ہوا تھا کہیں

کہیں راہبوں کی خانقاہیں اور بستیاں آباد تھیں۔ نشیبی مقامات اور دریاؤں کے دونوں جانب سینکڑوں میل لمبی دلدلیں پھیلی ہوئی تھیں جن میں سے عفونت انگیز بخارات نکل نکل کر دور دور تک وبا پھیلاتے تھے۔ پیرس اور لندن میں مکانات لکڑی کے تھے جن کی درزون پر گارا لسا ہوا تھا اور چھتیں پر ال یا سرکنڈون کی تھیں۔ ان مکانون میں روشن فان اور کھرکھان نہ ہوتی تھیں اور آہ کی کل کے زمانہ ایجاد تک بہت کم مکان ایسے تھے جن کا فرش چوبی ہو۔ درسی یا قالین ایک ایسا سامان آرایش تھا جسے کوئی جانتا تک نہ تھا۔ اس کا قایم مقام پرال تھا جسکی کچھ مقدار فرش پر بچھا دی جاتی تھی۔ گھروں میں دودکش بھی نہ ہوتے تھے۔ اُس چوبے کا دھواں جو کافی اندھن کے میسر نہ آنے سے بے رونق نظر آتا تھا چھت کے ایک سوراخ میں سے باہر نکل جاتا تھا ہرے کہ ایسے جمونہ پڑے موسم کی تسخیر کو کس طرح روک سکتے تھے۔ بدترین بالکل موجود نہ تھیں اور صفائی کا مطلق انتظام نہ تھا۔ شترے ہوئے فضلہ اور کوڑے کرکٹ کا دروازہ پر ڈمیر لگا رہتا تھا۔ مرد عورت اور بچے ایک ہی کوٹھری میں سوتے تھے اور اکثر گھر کے جانور بھی اسی حجرے میں ٹھونس دئے جاتے تھے۔ اس طوفان بد تنیزی میں ممکن نہ تھا کہ حیا اور اخلاق قایم رہ سکے۔ بستر بالعموم پرال کا ایک تھیلہ ہوتا تھا اور لکڑی کا ایک گول کندا تکیہ کا کام دیتا تھا۔ جسمانی صفائی سے لوگ مطلق نا آشنا تھے۔ بڑے بڑے اراکین دولت یہاں تک کہ کتہر برسی کے لاٹ پاوری کے تے جیل اللہ حکام اس درجہ گندے ہوتے تھے کہ اُن کے ع کپڑوں میں جو مین بنیہ کے ٹانگوں سے سوا تھیں۔

چنانچہ انگلستان کے ایک تاجدار کے حریت ٹامس بیٹ کی یہی حالت بیان کی گئی ہے۔ جسمانی عفونت کے چھپانے کے لیے عطریات کا بکثرت استعمال کیا جاتا تھا۔ عوام ان کے لباس چرمی ہوتا تھا جو ساہا سال تک کام دیتا تھا اور جس میں جسم کا میل برابر جمع ہوتا رہتا تھا۔ لہٰذا فزون متوسط کے عیسا یون کی اس گند کی اور گھٹا دے پن کی اگر تمحیل کی جائے تو اُس کا عنصر غالب وہ مجوزانہ تعصب ثابت ہوگا جو باریون کو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تھا چونکہ جسمانی طہارت

ہفتہ میں جس شخص کو کھانے کے لیے ایک دند گوشت مل جاتا تھا وہ فارغ البال اور آسودہ حال متصور ہوتا تھا۔ گلیوں میں کوئی بدرونہ ہوتی تھی۔ سرکین نہ تو کٹی ہوئی ہوتی تھیں نہ ان پر روشنی کا انتظام ہوتا تھا۔ رات کے وقت کوٹھڑیوں کے دروازے کھول دیے جاتے تھے اور کوڑا کچرا و ہون بلا تکلف باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ جو بیچارہ شامت کا مارا رہ کر تنگ و تارگی میں سے ہاتھ دھو کر منہ منڈاتی ہوئی لائین سیسے گزر رہا ہوتا تھا وہ اس آلائش کے سیلاب سے لپٹا ہوا اور شور بھر رہا جاتا تھا۔

اینٹیں سلویس نے جو آگے چل کر پائس نانی کے نام سے مسند پاپائی پر متمکن ہوا اور جس کی تحریک اس لحاظ سے نہایت قابلانہ و غیر متعصبانہ سمجھی جاسے گی۔ اپنی سیاحت جزائر برطانیہ کے مشرق حالات طلبند کیے ہیں۔ یہ سفر اس نے سنہ ۱۸۳۷ء کے قریب اختیار کیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ کسانوں کے مکانات خشک چٹائی کے پتھر بن کے تھے جن میں چونا نہیں لگایا گیا تھا۔ چھتیں گھاس بھوس کی ٹھیکیں اور بیل کی ایک اینٹھی ہوئی کھال دروازے کا کام دیتی تھی۔ خوراک کی قسم سے وہ ساگ پات موٹھ مشربیان تک درخون کی چھال تک کا استعمال کرتے تھے۔ بعض مقامات کے باشندے روٹی کے نام تک سے ناواقف تھے۔

گارسے سے لے کر کنڈون کی کوٹھڑیاں۔ بجدے اور بے ڈھنگی ٹھرون کے گھر۔ بے دودکش کی بے رونق دیوان دھارنگیٹھیاں۔ جوؤن کھٹھلون اور پسون سو

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۶۲۔ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ تھی لہذا ضرور تھا کہ پادری شست و شو سے قاطبہ الماکرین اور اپنے چیلون کو بھی ہی پڑائیں چونکہ مسلمان صاف ستھرے رہتے تھے ایسے لازم تھا کہ پادری گندے رہیں۔ عرض من تشبہ بقوم فلو منہم کے اصول پانہون نے اس حد تک عمل کیا تھا کہ مسلمان اگر دن کو دن کہتے تو پادری کہتے تھے کہ نہیں رات ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کئی صدیوں تک مسیحی دنیا غافلت اور بے متحرکی میں لقمی رہی۔

بھر سے ہوئے جسمانی اور اخلاقی غلامان کے جھٹ۔ سردی سے بچنے کے لیے اعفنا کر  
گرد پراں کے پلے ہوئے بیٹھے پنڈار سے سسکتے ہوئے کسان کے لے۔ عالموں اور  
سیانوں کی چارہ گری کے سوا اور کسی تدبیر کو نہ ہونا !! ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے  
کیونکر ممکن تھا کہ آبادی میں ترقی ہو سکے ؟

جب حالت یہ ہو رہی ہو تو کون سی تعجب کی بات ہو کہ مشلہ کے قحط میں انسان کا  
گوشت پکایا اور بیچا گیا۔ اور مشلہ کے قحط میں لندن کے ۱۵ ہزار باشندے بھوک میں مر گئے  
یاد باک بعض ملکوں میں لوگ اسے دسے کہ لاشوں کی تجنیز تکفین کرنے والا کوئی نظر نہ آتا  
تھا۔ مشلہ کی دبا میں مشرق سے آٹھی اور تھالی رستہ سے ہوتی ہوئی یورپ پر چا لگی  
فرانس کی ایک ٹالت آبادی ضلع ہو گئی۔

دیہات اور شہروں کے عوام ان اس کی ذیہ حالت تھی ہی لیکن امر کی حالت بھی کچھ  
بہتر نہ تھی۔ انگلستان قوم کی مد اطواریوں کا ذکر کرتے ہوئے ولیم ساکن ماس بری کہتا ہے کہ  
اس قوم کے امر پٹیا اور حیاض۔ تھے اور کبھی گرمی سے نہیں جاتے تھے۔ نماز فجر اور نماز  
قدس کے ادا کرنے کا انھوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ انکا پارسی جسکو ان کی تالیسی  
لے ان کی قلمروں سے گرا رکھا تھا ان کی خود کجاء میں جا کر بیدار ہونے سے قبل جلد جلد  
نماز کے الفاظ دہرائے کرتا اور ان کے کہنا میں ایک لفظ بھی نہ پڑتا تھا۔ عام لوگ  
حافظ اور امر اس کے بغیر غلام میں نہتے ہوئے تھے۔ ان کی جائداد میں چھین جاتی تھیں  
وہ دور و دراز ملکات میں جبر لکھتے تھے۔ ان کی لڑکیوں کو یا تو دارالافتاء  
میں بچا دیا جاتا تھا اور یا تو ان پر زانیہ کی زانیہ کی زانیہ کی زانیہ کے دو  
بیابے چلے رہتے تھے اور جو برائیاں بدستی کی رفیق ہیں وہ ظاہر ہو ہو کر مردوں کو نامرد  
بناتی جاتی تھیں۔ جاگیر وادوں کے قلعے گویا ڈاکوؤں کے گھر ہو رہے تھے۔ چنانچہ  
بھی مورخ جسکی تحریر سے ہم نے اوپر افہاس کیا ہے بیان کرتا ہے کہ مرد اور عورتیں

ان قلموں میں کچڑ لانی جاتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کے انگوٹھوں یا پاؤں میں رسی باندھ کر انھیں لٹکا دیا جاتا تھا۔ ان کے اعضا آگ سے جھلسے جاتے تھے۔ گرہ دار رسیوں کو ان کے سر کے گرد لپیٹ کر مڑا دیا جاتا تھا۔ غرض زردیہ وصول کرنے کے لیے طرح طرح کے عذاب اُنہیں پہنچا جاسکتے تھے۔

یورپ بھر میں پیش قرار شاہراہ اور ذمہ داری کی بڑی بڑی سیاسی خدمتوں پر پادری مامور تھے۔ ہر ملک میں دوسری حکومت تھی۔ ایک تو مقامی یعنی دیونی حکومت اور دوسری غیر ملکی حکومت جس کے اقتدارات کا مصدر و مرکز پاپا سے رونا تھا۔ روم کے اثر کا مقامی اثر پر غالب ہونا ایک لازمی امر تھا۔ اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے ایک شخص واحد کا شہنشاہانہ ارادہ پورے کی تمام اقوام کے مسترد و متفقہ ارادہ کے مقابلہ میں کامیابی کے ساتھ ظاہر ہوتا تھا اور بوجہ اپنی وحدت و اکتناز کے بے انتہا طاقتوں کا جامع تھا۔ علیٰ ہذا القیاس مقامی اثر کا ضعیف ہونا بھی لازمی تھا۔ کیونکہ اول تو خود ہمسایہ سلطنتوں کی باہمی رقابتیں اسے کمزور کر دیتی تھیں اور دوسری سہی طاقت کے سلب کرنے کے لیے رومانی رتیب کی حیلہ افزین تقرقہ پردازی ان کا فی ثقیں۔ ایک بھی ایسا موقع پیش نہیں آیا کہ مختلف دول یورپ نے اپنے مشترک حریف کو زک و سینے کے لیے آپس میں اتحاد قائم کیا ہو جب کبھی کسی بحث کے چمڑنے سے اتحاد کا حدشہ پیدا ہوتا تھا تو نہایت جلا لکی سے یہ جھگڑا عین حلیہ کچکا دیا جاتا تھا اور ہر حکومت کو بالعموم پاپا سے روم کے سامنے گردن انقیاد جھکانے ہی بنتی تھی۔ پاپائی مداخلت کا ظاہر دوسری نظری منصفہ تو مختلف اقوام کے اخلاقی و روحانی حقوق کی نگہداشت ہوتا تھا لیکن اصلی و حقیقی غایت یہ ہوتی تھی کہ ذرا بچہ آمدنی میں توفیر کا پہلو نکالا جائے اور پادریوں کے حجم و نفیر کی شکم پروری کی سبیل پیدا کی جائے۔ جو حاصل اس طور پر پاپائی خزانہ میں داخل ہوتے تھے وہ ہمارے اوقات مقامی حکومت کے مداخلت سے ہمارے جڑ سے پھٹے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً جب آئسٹن راج نے یہ مطالبہ کیا کہ کلیسا سے انگلستان تین سو مزید اطالوی

بادریون کا متکفل ہوا اور تسکن کے گرجا میں اُس کا ایک بھتیجا جو سن بلوغ کو بھی نہ پہنچا تھا ایک بڑی خدمت پر مامور کیا جاے تو معلوم ہوا کہ جو رقم پہلے ہی سے ہر سال غیر ملکی بادریون پر صرف ہوتی تھی وہ اُس رقم کے مقابلہ میں جو شاہی خزانہ میں داخل ہوتی تھی گنتی تھی۔ اعلیٰ طبقہ کے بادریون نے تو ہر ملکی خدمت پر جو کچھ بھی باعث منفعت تھی قبضہ کر ہی رکھا تھا اور ہر دیر کا صدرِ اہم کثیر التعداد غلاموں کے مالک ہونے کے لحاظ سے بڑے بڑے امیرون اور جاگیرداروں کا مقابلہ کرتا تھا چنانچہ بعض صدر راہبوں کے پاس بیس بیس ہزار غلام موجود تھے لیکن گدائی پیشہ راہبوں کے لیے بھی معاش کے وسیع ذرائع موجود تھے۔ ملک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں یہ نظر نہ آتے ہوں اور غربا کے قوت لایوت میں اپنا حصہ نہ بنالیتے ہوں۔ نکلے اور نکھٹو بادریون کا ایک انبوه کثیر جسکے ارادت میں ممالک غیر منسلک تھے ایسا تھا جس کی زندگی کاہلی اور بے کاری میں کٹتی تھی اور جو اپنا پیٹ محنت مزدوری کرنے والوں کے پسینے سے پالتا تھا۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن تھا کہ چھوٹے چھوٹے کھیت بڑی بڑی جاگیروں میں ضم نہ ہوتے چلے جائیں غریبا کا، فلاں روز بروز نہ بڑھتا جاے اور جماعت انسانی کی حالت رو بہ اصلاح ہونے کے بجائے پایہ اخلاق سے ساقط نہ ہوتی چلی جائے۔ دیرون صومعون اور خاقانوں سے ماہر تحصیل علم کی کوئی کوشش نہ کی جاتی تھی۔ اور کیوں کر کی جاتی؟ کلیسا کی منسلحت اسی میں تھی کہ لوگ جاہل رہیں۔ چنانچہ یہ اصول عام طور سے تسلیم کر لیا گیا تھا کہ جہالت زبرد قوت کی مان ہے۔

رودمانے جمہوریت اور شہنشاہیت کے زمانہ میں ہمیشہ اس اصول پر عمل کیا تھا کہ مستحکم بلوں اور پختہ سرکون کے ذریعہ مساپنے دور دست صوبوں کے ساتھ سرین السیر تعلقات قائم رکھے جائیں۔ بلوں اور سرکون کی تعمیر اور مرمت افواج رومۃ الکبریٰ کے اہم فرایض میں داخل تھی اس اصول پر کار بند ہونے سے اُس کا فوجی تفوق برقرار رہا۔

لیکن پاپائیت کے زمانہ میں چونکہ روم کی حکومت ایک بالکل جداگانہ اصول پر مبنی تھی اور اس کو اگلی سی ضرورتیں درپیش نہ تھیں لہذا اس فرض کی بجائے آوری کو اس نے دودل مقامی کی بے اعتنائی کے لیے چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ بھر میں کوئی سڑک ایسی نہ تھی جو سال کا اکثر حصہ بند نہ رہتی ہو۔ حمل و نقل کے عام ذرائع میلیون کے بے ڈھنگے چھکڑے ہوتے تھے جو گھنٹہ میں تین چار میل سے زیادہ نہ جا سکتے تھے۔ جہاں کشتیاں بہم نہ پہنچ سکتی تھیں مال تجارت کہ وہ بھی کیفیت و کم کے اعتبار سے چنداں قابل لحاظ نہ ہوتا تھا گھوڑوں اور خچروں پر لاد کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچایا جاتا تھا۔ جب فوج کے بڑے بڑے دستوں کو نقل و حرکت کی ضرورت پیش آتی تھی تو مشکلات اس قدر بڑھ جاتی تھیں کہ ان پر غالب آنا دشوار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حروب صلیبیہ کے مجاہدین اولیٰ کے کوچ کی کہانی ان مشکلات کا مرقع ہے۔ نقل و حرکت میں الممالک کی یہ دقتیں اور زمینی اس ماریکی اور جہالت کی ایک بڑی حد تک ذمہ دار تھیں جو عام طور سے پھیلی ہوئی تھی۔ اکیلا اکیلا مسافر جان جو کھوں میں ڈالے بغیر سفر نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ کوئی دلدل یا جنگل ایسا نہ تھا جہاں ڈاکو اور لٹیرے موجود نہ ہوں۔

جہالت اور لاعلمی ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے لوگ ادھام پرستی میں مبتلا تھے۔ یورپ میں شرمناک کرامتوں اور معجزوں کی بھرا بھری تھی۔ کوئی سڑک ایسی نہ تھی جس پر زائرین کے ٹھٹ کے ٹھٹ اولیاء کی ان خانقاہوں کی طرف ارادت کی باگین اٹھاسے نہ جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہوں جو اپنی مسیحائی اور شفا بخشی کی وجہ سے شہرہ آفاق تھیں کلیسا نے ہمیشہ اسی مساحت کو پیش نظر رکھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو طبیب یا اس کے پیشہ سے مانوس نہ ہونے دیا جائے۔ اس لیے کہ وہ خانقاہوں کو آہ جلب منفعت بننے سے بہت کچھ روکنے والے تھے۔ زمانہ اس منفعت رسان زور و تمبیس کی آخر قلعی کھول کر رہا۔ یورپ میں آج کتنی خانقاہیں ہیں جن کی دکانداری کا سلسلہ بدستور قائم ہے؟



جو مریض اس قدر ناتوان ہوتے تھے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ پہنچا سکتے تھے  
 اُن کا اندہی حافظہ تھا۔ بجز روحانی علاج یعنی اُن لاطینی دعاؤں کے جو اُس پر دم کردی جاتی تھیں  
 اُس کے لیے اور کوئی شکلِ دعا نہ تھی۔ امراض کے روکنے کے لیے گر جانوں میں دعائیں  
 لٹکا دی جاتی تھیں۔ لیکن حفظِ صحت کی کوئی تدبیر عمل میں نہ لائی جاتی تھی۔ ذہنیت یہاں تک  
 پہنچ گئی تھی کہ شہرِ فرطِ عفونت سے سٹراس بنا ہوا ہے اور دبا چارون طرٹ پھیلی ہوئی ہے  
 لیکن پادری صاحبِ اندہ و باکسا مان دعا سے کر رہے ہیں۔ مینڈ کی جھڑی کھینے بن نہیں  
 آتی یا اساک باران کی وجہ سے سقامت مہنگام کا اندیشہ ہے لیکن یہ بزرگوار اپنے چند  
 دعائیں بھلون کے زور سے میخہ کو اکوایا برساوینے کے معنی ہیں۔ سورج یا چاند کو گہن لگ گیا  
 ہے یا کوئی دمار ستارہ نمودار ہوا ہے لیکن یہ عقل کے پتلے ان قدرت کے کرشموں کو بگاڑ  
 آسمانی سمجھ کر ادویہ اتورہ سے ان کی نحوست ٹالنے کی فکر میں ہیں۔ جب ۱۴۵۵ء میں دو مدار  
 ستارہ جو پہلی کے نام سے موسوم ہے نمودار ہوا تو اسکی شکل ایسی خوفناک اور اس کا منظر ایسا  
 مہیب تھا کہ خود تقدس آب الوہیت افساب جناب کیلکسٹس خامس بابا سے روا کو اپنی روح  
 القدس قوت سے اس کی ممانعت پر ہونا پڑا۔ چنانچہ آپ نے ایک ایسا زبردست عمل پڑا  
 اور اتنی نعمتیں بجمعیں کہ مارے ڈر کے یہ خبیث ستارہ دم و بار کا فیتا کا پتہ جانوت مضامین میں  
 غائب ہو گیا اور کہیں پچہتر سال کے بعد اس کے ہوش و حواس اس حد تک بجا ہوئے کہ اس نے  
 رو بارہ نمودار ہونے کی جرات کی۔

اولیاء کے تصرفات روحانی اور دعاؤں کے ذریعہ سے مریضوں کو جو شفا ہوتی تھی اُس کا  
 طبیعی اندازہ اگر گمانا مقصود ہو تو اُس زمانہ کی اور آج کل کی شرحِ اموات کا مقابلہ کر لینا کافی  
 ہو گا اُن دنوں تیس میں ایک آدمی مر جاتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں جبکہ روحانیت کے بجا  
 چارون طرفِ مادیت کا عمل ہے بحسابِ اوسط چالیس میں ایک آدمی مر جاتا ہے۔

یورپ کی اخلاقی حالت اور روشن کی طرح اُس وقت اندہی اور ابلہ کو تلبیس کے ساتھی

جزائرِ غربِ الہند سے مرضِ بادِ فرنگ اپنے ساتھ لگاتے لائے۔ یہ بیماری ہیرت انگیز سرعت کے ساتھ یورپ میں پھیل گئی۔ ادنیٰ واسطے غریب و امیر سب کے سب اس شرِ مناک مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اور تو اور پاپائے مقدس حضرت یسوع بھی تو تاپال بیٹھے اور نیم کی ٹہنی ہلاتے ہوئے پاسے گئے۔ اکثر لوگ جو شامتِ اعمال سے یہ دکھ بھر رہے تھے یہ غدر پیش کرتے تھے کہ یہ ایک وبائی آلودہ ہے۔ جو سمیت اجزائے ہوا کی وجہ سے پھیل گیا ہے۔ لیکن اگرچہ پوچھا جاسے تو اس مادہ کی اشاعت کا باعث ہوا کی سمیت نہ تھی بلکہ فطرتِ انسانی کی ایک خاص کردہ تھی جسے وہ روحانیت بھی زایل نہ کر سکی تھی جو انسان کے لیے صدائے سال سے بمنزلہ چراغِ ہدایت تھی۔ خافیا ہون کے طبی کرشموں پر خاص خاص تبرکات کی موجودگاہ گسٹری مسٹر اوتھی۔ ان میں سے بعض تبرکات ایسے تھے جن کی نوعیت عقل کو محو حیرت کر دیتی تھی متعدد دیر اور خافیاہن ایسی تحقیق جن میں جنابِ مسیح کا کانٹون کا تاج موجود تھا۔ گیارہ دہائیوں میں وہ برچھا رکھا ہوا تھا۔ جس سے آپ کا پہلو چھیدا گیا تھا۔ اگر کوئی شخص ازراہِ جسارت یہ سوال کر بیٹھتا کہ ان سب کا اصل ہونا کیوں ممکن ہے تو وہ دہرہ اور مرد قرار دیا جاتا۔ حروبِ صلیبیہ کے دوران میں طبقہ ہیکلیٹین کے سوراؤن نے یوحنا کلیم سے مقدس دوشیزہ کے دودھ کی بوتلیں لالاکر صلیبی انواع کے سپاہیوں کے ہاتھ میں مانے اور منہ مانگے داموں بیچیں اور خوب ہی نفع کمایا۔ یہ بوتلیں

۱۵ جب بیت المقدس اور کل ارض مقدس کو مسلمانوں کے قبضہ میں دیکھ کر مسیحی دنیا کی غیر یسعی مقصد کا دریا جوش میں آیا اور حروبِ صلیبیہ کا خونریز سلسلہ شروع ہوا تو چند مسیحی برادریاں اس غرض سے قائم ہوئیں کہ جو مسیحی زائر ارض مقدس کا سفر اختیار کریں ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے یہ جماعتیں طبقہ ہیکلیٹین کے نام سے موسوم ہیں۔ بعد میں اس طبقہ کا مقصد دینِ مسیحی کی حمایت اور مسلمانوں کا استیصال ہو گیا۔ اس طبقہ کے جاننا ناما کین اگرچہ رہبانیت اور زہد و اتقا کا دم بھرتے تھے لیکن ان سے بسا اوقات ایسی برکتیں منور ہوتی تھیں جو بڑے سے بڑے فاسق و فاجر کو بھی حیرت انگیز تھا۔ انھیں میں ڈبو دینے کے لیے کافی ہوتی تھیں۔

ازراہ غایت ارادت و عقیدت بعض بڑے بڑے مذہبی اداکن میں مدتوں منایت اعتقاد کے ساتھ محفوظ رکھی رہیں۔ لیکن دیدہ دلیری اور اہلٹائی میں بیت المقدس کی اس خانقاہ کا درجہ شاید سب سے بڑا ہوا تھا جس کے تبرکات میں روح القدس کی ایک انجلی بھی داخل تھی۔ اس شرمناک بطلان پرستی کو زمانہ موجود نے عمارت آمیز غوغائی کے ساتھ رد کر دیا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ یہی تبرکات ہزار ہا خوش عقیدہ لوگوں کی کشت ارادت کو شپٹے روحانی چھینٹوں سے سیراب کرتے تھے لیکن آج وہ اس درجہ ناپاک اور ذلیل خیال کیے جاتے ہیں کہ کسی عجائب خانہ میں بھی انھیں جگہ نہیں ملتی۔

آخر اس حرمان کی کیا وجہ ہے جو یورپ کی امانت سے عہدہ برآمد ہونے کی شکل میں کیسا کونصیب ہوا؟ اگر رولنے یورپ کی روحانی و مادی ترقی کو حقیقت میں اپنا نصب العین قرار دیا ہوتا۔ اگر جانشین پطرس یعنی ساری دنیا کے گڈریے نے صدق دل سے واحد العزیز ہو کر اپنے گھد کی بہیزوں کی رکھوالی کی ہوتی اور ان کی دنیاوی آسائش اور دینی نجات کو اپنی غایت الغایات سمجھا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ کھسا کو اسل کا مٹی کا منہ دیکھنا پڑتا۔

یہ وجہ بڑی آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اور اگر اسے قلمبند کیا جائے گا تو حیا سوز معصیت کا ایک طومار تیار ہو جائے گا۔ فقرات ذیل میں ہم تو جیسا جو واقعات سپرد قلم کرتے ہیں وہ کیتھولک مصنفین کی تحریرات سے ماخوذ ہیں اور ہم کوشش کریں گے کہ بیان تک ممکن ہواں واقعات کا اعادہ مصنفین مذکور ہی کے الفاظ میں کیا جائے۔

جو داستان ہم اب بیان کرتے ہیں اس سے معلوم ہو گا کہ کیونکر ایک جماعت متحدہ نے ترقی کرنے کے لئے مطلق العنان حکومت شخصی کی شکل اختیار کر لی۔

قدیم ایام میں ہر گرجا اس توانق کی نفی کیے بغیر جو جملہ اصولی امور میں اسے کلیسے عمومی کے ساتھ ہونا تھا اپنا انتظام کامل آزادی کے ساتھ جداگانہ طور پر خود کرتا تھا۔ ادنیٰ روایات و تاویلات کو انفرادی حیثیت سے برقرار رکھ کر ان تمام مسائل کو جنہیں کلیسے عمومی

کے اعراض سے تعلق نہ ہوتا تھا۔ یا جن میں کوئی اصولی بحث منفرج ہوتی تھی خود مقامی طور پر فیصلہ کر دیتا تھا۔

نویں صدی کے آغاز تک یہی حالت قائم رہی اور کلیسا کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہونے پائی لیکن ششم کے قریب سینٹ اسی دور کے ساکن اشبیلیا کے مرتب کئے ہوئے فتاویٰ بہت کچھ قدرت و تدلیس کے بعد فرانس کے مغربی علاقوں میں شائع کیے گئے۔ جن میں پاپا یان زمانہ سابق کے تقریباً ایک سو و منی فرمان اور دوسرے حکام کلیسا کی بناوٹی تحریرات اور مسیحی کونسلوں کے فیصلہ جات شامل تھے ان ہمہ فتاویٰ کی اشاعت نے پاپائیت کے اقتدار کو بہت کچھ وسیع کر دیا۔ کلیسائی حکومت کے پرانے طریقہ کو بدل دیا اور اسے جمہوریت کے پیرایہ سے جاری کر کے مطلق العنان حکومت کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ سب کے سب اس وقت روم کے حلقہ گوبش ہو گئے اور اس وقت انگریز یعنی پاپا سے روم اکل یعنی دنیا کے پادشاہ کا حاکم اعلان کیا۔ ہڈییرنڈس پاپا سے گریگوری سلج نے بعد میں اسی بنا پر یہ بہتم با نشان کوشش کی کہ دول یورپ کو ایک بابائی الاصل قسیمی حکومت کی صورت میں بدل دیا جائے جس کا شہنشاہ پاپا سے روم ہو۔

گریگوری سلج جو اس بہتم با نشان منصوبہ کا بانی تھا جانتا تھا کہ اس کی تجویز کے کامیاب ہونے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ قسیمی مجالس کے ذریعہ سے کام لیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک فرمان اس مسنون کا جاری کیا کہ قسیمی مجالس کے انعقاد کا حق پاپاؤن اور ان کے نائبوں کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ مزید تقویت کی غرض سے اسلم ساکن لگانے کچھ تو قدیم اسیدوری مسنومات اور کچھ نو تراشیدہ فتاویٰ کی بنا پر قانون کلیسا کا ایک نیا مجموعہ تیار کیا۔ روم کی فوقیت اور برتری کے برقرار رکھنے کی غرض سے نہ صرف ایک جدید ضابطہ دیوانی و دینی کی تیاری ضروریات سے تھی۔ بلکہ ایک نئی تاریخ کا گہرہ لیا جانا بھی لازمی تھا۔ اس تاریخ میں بادشاہوں کے تحت حکومت سے انکار اور مسیحی بروری سے خارج کیے

جانے کے فرضی واقعات اس غرض سے درج کر دئے گئے کہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ ہمیشہ سے پاپایانِ روم کے مطیع و منقاد تھے۔ پاپاؤن کے زامین واجب العمل ہونے کے لحاظ سے کتب مقدسہ کی آیات کے ہر درجہ قرار دئے گئے۔ ان کو کششون کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ارض مغرب میں یہ عقیدہ عام طور سے پھیل گیا کہ مسیحیت کی ابتدا ہی سے پاپائانِ روم کلیسا سے عمومی کے واضعاً و قانوناً رہے ہیں، چونکہ مطلق العنان فرمانِ روم مجالسِ شوریہ کے روادار نہیں ہو سکتے لہذا پاپائیت نے بھی جب مطلق العنان ہونا چاہا تو قصد کر لیا کہ بعض قوی کلیساؤں کی مجالس جو زیادہ آزاد و رور اور سرچشمی ہیں تو رومی مابین اور حضرت انھیں مجالس کو قائم رہنے دیا جائے جو پاپا سے اعظم کی بلا واسطہ نگرانی میں ہیں۔ یہ چہا سے خود ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔

آٹھویں صدی میں ایک اور روایت رومین تراشی گئی جو بہت سے اہم نتائج کی ذمہ دار ہے۔ وہ روایت یہ تھی کہ چونکہ پاپا سے سلوٹر نے فیضِ فسطین کو مرضِ جذام سے اچھا کر دیا تھا اذرا صطبائغ بھی دیا تھا لہذا قیصر نے اس کے شکرانہ میں انہی اور مغربی صوبے تدارانہ کے طور پر پاپا سے مقدس کی خدمت میں پیش کیے۔ تھے اور نیز بطور اظہارِ اطاعت حضرت پاپا کی سائیس کی خدمت انجام دی تھی اور حضرت اقدس کی گڈڑ سے کئی باگ تمام کر کچھ دور چلا تھا اس مژبہ پر کا مقصد یہ تھا کہ تاجدارانِ فرانس اپنی اصلی قدر پہچان جائیں اور انھیں معلوم ہو جائے کہ جو علاقے وہ کلیسا کو دے رہے ہیں اس میں ان کا کچھ احسان نہیں ہے بلکہ محض سنی کو حقدار تک پہنچا رہے ہیں۔

ملکوتِ بابائی کے جدید نظام کا سب سے زیادہ زبردست حربہ فنا داسے گریشین تھا۔ یہ کتاب جبرائیل بن صدسی کے مسطین شائع ہوئی انفرانز ویر کا ایک بہت بڑا مجموعہ تھی۔ اس کی مدد سے کل عیسوی دنیا پر ماسٹریٹ پاپا سے روم اطالوی باورین کی ملکیت ہو گئی۔ اس سے پہلے مسیحیوں کی تمام کر دیا کہ انسان کو اصلاح سے پرہیز کرنا اور ماحدہ دزدانہ کو عذاب دینا

قتل کرنا اور اُن کی جائداد قرق کر لینا جائز و مستحسن ہے۔ جو شخص مسیحی برادر سی سے خارج کیا جا چکا ہو اُسے مار ڈالنا قتل اُن تکلم مزہ نہیں ہے۔ اور پاپا سے مقدس بلین ٹائسن غیر محدود برتری کے جو اُسے قانون پر حاصل ہے ابن الد کا ہمسایہ ہے۔

اجتماع قوت کی یہ نئی تحریک جن جن قرق پذیر ہوئی گئی اُن اصول کا جو زمانہ قدیم میں منافی مسیحیت سمجھے جاتے بے محابا اعلان ہوا گیا۔ مثلاً کمال بے باکی اور جرات سے یہ دعوے کیا جانے لگا کہ کل کلیسا پاپا سے مقدس کی جائداد ہے اور وہ اس سے جو کام چاہے کر سکتا ہے۔ یہ یونیٹڈ درسن کے حق میں گناہ ہے لیکن اُس کے حق میں گناہ نہیں ہے وہ قانون سے بالا اور برتر از اعتبار ہے۔ جو شخص اُسکی نافرمانی کرے وہ گردن زدنی ہے۔ ہر مصلحت یافتہ شخص اُس کی رعیت ہے اور خواہ وہ شخص چاہے یا نہ چاہے عمر بھر تک اُسکی رعیت رہے گا۔ بارہویں صدی کے ختم تک پاپا یان روم پطرس کے نائب تھے آئوٹ ٹھانٹ کے زمانہ کے بعد وہ نائب مسیح ہو گئے۔

لیکن ہر مطلق العنان فرمان روا کو خزانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس کھیت سے پاپا یان روم مستثنیٰ نہ تھے۔ نائبان پاپا کا عہدہ ہڈ پیر ہڈ کے زمانہ ہی میں قائم ہو چکا تھا۔ ان کا فرض بعض دفعہ تو یہ ہوتا تھا کہ کلیساؤں کا سائنڈ و منیج کریں اور بعض دفعہ کسی خاص خدمت پر مامور کیے جاتے تھے لیکن ہر صورت میں انھیں مالک آئوٹ ٹھانٹ سے روپیوں اور اسٹریٹوں کی ٹولیاں بانڈہ کر لانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ چونکہ پاپا سے مقدس قوانین وضع کرنے کے علاوہ اُن کے منسوخ و معطل کرنے پر بھی مقتدر تھا لہذا ایک قانون اس مضمون کا نافذ کیا گیا کہ جو شخص چاہے نذرانہ ادا کر کے پروانہ نقص قانون حاصل کر سکتا ہے۔ جو دیور روم کو خراج ادا کرتے تھے اُن کے اختیارات میں پاپا کی طرف سے دست اندازی نہ ہوتی تھی۔ عرض پاپا سے روم اس وقت عالم ہو گیا۔ ہر اہم شہر یہ (اس وقت کا مصلحت اختیار) پاپائی

نہ کلیسا کے عہدوں کی خرید و فروخت۔ مترجم

عدد دارضی میں داخل تھا اور پاپا بوجہ متصادف الاختیار ہونے کے ہر مقدمہ کی مثل اپنی عدالت میں طلب کر سکتا تھا۔ اس وقت کے ساتھ اُس کے تعلقات وہی تھے جو ایک مطلق العنان بادشاہ کے اپنے ارکان سلطنت کے ساتھ ہوتے ہیں کسی استغف کو اجازت تھی کہ بغیر اُس کی اجازت کے مستغنی ہو اور جو ابرشیدہ استغفی کی وجہ سے خالی ہوتا تھا اُس پر بدیدہ استغف کے تصور کا اختیار بجز اُس کے اور کسی کو حاصل نہ ہوتا تھا۔ اس فرض سے کہ اُسے پروانہ نقص قاذون کے اختیار اجرا کے استعمال کا موقع ملے عدالت ہاے ماتحت کے فیصلوں کی ناراضگی سے عدالت العالیہ پاپا نیہ میں اپیل دائر کرنے کی بات بات پر فریق متعلقہ کو ترغیب دی جاتی تھی ہزاروں ڈگریاں بغرض تعمیل جاری ہوتی تھیں۔ جن کی بدولت رومین ڈیورن بدیدہ کھنچا ہوا چلا آتا تھا۔ جب کسی ابرشیدہ کے لیے بہت سے اسیدوار ہوتے تھے تو پاپا اکثر ان سب کو ٹکسا جواب دیکر کسی اپنے پٹھو کو اس عہدہ پر مقرر کر دیتا تھا۔ پادریوں کو بسا اوقات رومین ساہا سال تک ملازمت کے لیے اسیدواری کرنی پڑتی تھی اور وہ یا تو اسیدواری کرتے کرتے دوسری دنیا کو سدبار جاتے تھے۔ اور یا بوریا بدہنا باندھ کر پاپا نیہ کی حساست وادشا کا داغ سینے پر لیے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے گھروں کو لوٹ جاتے تھے جرمی کو اس بارے میں بمقابلہ تمام دوسرے ممالک کے زیادہ رنج ناکامی برداشت کرنا پڑا اور یہی وجہ تھی کہ تحم اسلاح کی روئیدگی کے لیے یہاں کی زمین میں سب سے زیادہ قابلیت پیدا ہو گئی۔ تیرہویں اور چودھویں صدی میں پاپاؤن نے اپنے اقتدارات کو غیر معمولی طور پر بڑھا لیا۔ بجائے اسکے کہ پہلے کی طرح وہ کسی خالی سفدہ ابرشیدہ پر اپنے کسی منظور نظر کے مقرر کیے جانے کی سفارش کرتے اب وہ ایسے تقررات کے متعلق قطعی احکام جاری کرنے لگے۔ چونکہ ان کے اطالوی طرفداروں کی دہان دوزی ضرور تھی لہذا بجز اس کے اور کوئی علاج نہ تھا ممالک غیر میں ان کے لیے عہدے تجویز کیے جائیں۔ ایک ایک خدمت کے لیے رومین سینکڑوں پادری اسیدواری کرتے کرتے مر جاتے تھے۔ اور جب

حضرت عدرائیل کی توجہ سے اس طور پر جگہ خالی ہوتی تھی تو پاپا اس جگہ کا انتظام استحقاق خود کو کرتا تھا۔  
 اول اول یہ استحقاق رومانک محدود رہا۔ بالآخر یہ دعویٰ پیش کیا گیا کہ پاپا سے مقدس کو  
 بلا تفریق و امتیاز کل کلیسا کی خدمتوں کے انتظام کا حق حاصل ہے اور بروقت تفریق کا  
 یہ طعن اٹھانا کہ وہ پاپا کی اطاعت اور فرمانبرداری کرے گا قیسی اور سیاسی دونوں مفہوم  
 رکھتا ہے۔ جو مائیک شوی الحکومت تھے ان میں اس طور پر روحانی عنصر کی طاقت بدرجہ  
 غایت بڑھ گئی۔

پاپائی قوت کے اس اکتشاف و اجتماع کے لیے ہر قسم کے حقوق نہایت بیدار رہی سے  
 پاپا ل کیے گئے۔ کہ انی پیشہ راہبوں کے طبقوں سے پاپائیت کو اس مقصد کی تکمیل میں بہت  
 بڑی مدد ملی رہے گی پاپا اور یہ طبقے ایک طرف تھے اور اساقف اور ان کے اس تحت پادری دوسری  
 طرف۔ پاپا سے رومانک کے دربار نے تمام وہ حقوق غصب کر لیے جو مجالس عامہ مجالس مطرانہ  
 (کونسل متعلقہ دار السلطنت) اساقف اور قومی کلیساؤں کو حاصل تھے۔ چونکہ پاپا کے نائب  
 بات بات پر دست اندازی کرتے تھے لہذا اساقف نے اپنے ماتحتین کو ان کی بے عزتی پر  
 پروکھ نوک کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اور چونکہ گدا کی پیغمبر راہبوں کی مداخلت حد سے زیادہ بڑھ گئی  
 تھی اس لیے دیہاتی پادریوں کے اختیار بالکل سلب ہو گئے اور جو رہا سہا افر تھا اسے  
 ان راہبوں نے پاپائی تذکرات انفران اور پروا سمجھت نفی قانون بیچ کر زایل کر دیا۔  
 ان حرام کو حلال اور ناجائز کو جائز کر دینے والی مندوں کی فروخت سے جو روپیہ وصول ہوتا  
 تھا وہ سیدارو با بیع جاتا تھا۔

مالی ضرورتوں سے مجبور ہو کر بہت سے پاپا اس ذلیل حیلہ جوئی پر اترا آئے کہ جب کسی  
 فرمانروا یا اسقف یا رئیس سیکلین کا مقدمہ پاپائی عدالت میں پیش ہوتا تھا تو اس سے  
 کہا جاتا تھا کہ ایک جام طلائی جس میں دو کاٹ بھرے ہوئے ہوں بطور نذرانہ پیش کرے۔

لے ڈالنی روپیہ کا ایک سکہ جو تیس بن چلتا تھا۔ مترجم



اسی قسم کی ضرورتیں۔ جشن جوہلی کے انعقاد کی محرک ہوئیں۔ پاپائے سکٹس راج نے بہت سے جدید عہدے قائم کیے اور ہر عہدہ بوضو تین یا چار سو دو کات کے فروخت کر ڈالا۔ پاپائے انرست ٹامن نے اکیس پاپائی رہن رکھا۔ پاپائے لیوہم کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے تین پاپاؤن کی آمدنی اڑا ڈالی یعنی جو رقم اُس کا پیشرو خزانہ میں چھوڑا تھا اول تو

لے جب اقبال بنی اسرائیل کے ساتھ تھا اور حکومت اُن کے ہاتھ میں تھی تو ان کے سلاہین کا یہ دستور تھا کہ ہر چھ سو سال ایک بہت بڑا تیوار مناتے تھے اور اس موقع پر رہا گیا کے ساتھ طرح طرح کے سلوک اور اعلان کرتے تھے۔ تمام غلام آزاد کر دئے جاتے تھے۔ تمام قیدیوں کو رہائی دے دی جاتی تھی۔ تمام فرض معاف کر دئے جاتے تھے۔ تمام جائیدادیں حوصلی مالکوں کے ہاتھ میں گدشتہ نصف صدی میں نکل چلی تھیں۔ انھیں واپس دے دی جاتی تھیں۔ اسی تیوار کا نام جوہلی ہے جس کے عام معنی خوشی کے ہیں لفظ جوہلی ایک جمرانی لفظ ہے جس سے مشتق ہے جس کے معنی فیزی کے ہیں۔ چونکہ جشن جوہلی کا اعلان فیزی یا تری کی مدد سے کیا جاتا تھا اس لیے اس کا نام یوہل یا جوہلی پڑ گیا۔

یہودیوں کی دیکھا دیکھی کلیسا سے دس من کیتھولک نے بھی جشن جوہلی منانا شروع کیا چنانچہ پہلے جشن کے انعقاد کا اعلان پاپائے بائی فیس ٹامن نے ۱۳۹۹ء میں کیا۔ جشن اول پنجاد سالہ قرار پاسے پھر حضرت مسیح کی پورے اعداد کی مناسبت سے سی و سہ سالہ ہو گئے اور بالآخر بہت دینچ سالہ قرار دیے گئے اصل غایت اس جشن کے انعقاد کی جیسا کہ مصنف نے بیان کیا ہے یہ تھی کہ اس موقع پر عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے عیسائیوں سے پاپاؤن کو نذرانہ وصول کرنے کا میلہ ہاتھ آجائے۔ چنانچہ ان موقعوں پر پاپائی خزانہ میں کروڑوں ہی روپیہ داخل ہو جاتا تھا۔ جشن جوہلی کلیسائی خوشی بلکہ پاپائی طرف سے ہر شخص کو جو اعزاز سری کے بعد عشاے ربانی کی صحبت میں شریک ہوتا تھا خاص خاص گرجاؤں میں داخل ہونے کی شرط کے ساتھ ہوا نہ منفرد تھا کیا جاتا تھا۔

اُس پر ہاتھ صاف کیا اُس کے بعد اپنی دولت پر دست تہذیر دراز کیا اور حسب یہ بھی کافی نوبی تو اپنے جانشین کے مترقبہ داخل کو پہلے سے وصول کر کے لیکھا چکھا برابر کر دیا۔ اُس نے دو ہزار ایک سو پچاس جدیدہ خدمتین قائم کر کے فروخت کیں۔ مشترکون کے لیے روپیہ لگا۔ کی اس سے بہتر ترکیب نہ تھی۔ اس لیے کہ اصل سرمایہ پر بارہ فیصد سود کہیں گیا ہی نہ تھا۔ اس سود کے استحصا کے لیے وہ مالک موجود تھے جہاں کیتھولک مذہب رائج تھا یورپ بھر میں کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں سرمایہ اس قدر با منفعت طور پر لگایا جاسکتا ہو جسے رومین۔ انجلیک الرمن کے ذریعہ سے اور نیز عہدون کو نہ صرف ایک دفعہ بلکہ مکرر فروخت کر کے بڑی بڑی رقمیں وصول کرنی جاتی تھیں عہدہ دارن کا امنا ذاس فرض سے کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے عہدہ کو دوبارہ بیچ ڈالیں۔

اگرچہ سود خواری پاپائی اجتہاد کی رو سے ممنوع تھی لیکن پھر بھی پاپائی عدالت العالیہ کے متعلق ایک بہت بڑا بینک قائم ہو گیا تھا جو پادریوں کی ملازمت کے امیدواروں اور اہل مقدمہ کو نہایت سخت شرع سود پر روپیہ قرض دیتا تھا۔ پاپائی مہاجنون کے لیے تو گویا سود لینا مباح تھا اور باقی سود خوار مسطورہ و مردوستھے۔ پاپائی عدالت العالیہ کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ بھر کے پادری اگر اُس کے مقروض ہوں گے تو پاپائیت کی اغراض کو بہت کچھ نفع ہو گا اس لیے کہ عدالت اُن پر سن مانا دباؤ ڈال سکے گی اور اگر وہ دباؤ نہ مانیں گے تو عدم ادائے سود کی علت میں انھیں کلیسا کے حلقہ سے خارج کر سکے گی۔ ۱۷۱۳ء میں جب حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ نصف مسیحی دنیا طبقہ کلیسا سے خارج ہو چکی ہے۔ اس وقت کا اخراج اس لیے عمل میں آیا کہ وہ پاپا کے نائبوں کے مطالبات سے عہدہ برائے ہو سکے تھے اور عام شخص اس لیے خارج کئے گئے کہ وہ مجبور ہو کر تذکرات العفران یا اجازت نامجات نفی قانون خریدیں اور پاپائی کارندوں کو اُن کی منہ مانگی قیمت ادا کریں۔ تمام یورپ کے تیس سی مداخلتوں کی طرف کھینچے ہوئے چلے جاتے تھے جو ارتش۔ بکمونیت۔ سود خواری۔

بددیانتی اور استحصال بالجبر کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ۱۹۶۲ء سے جو تحریک اجتماع واکتفا رقت کی تاریخ آغاز ہے۔ پاپاؤن نے اپنے خاص گلے کی بھیڑن کی دیکھ بھال بالکل چھوڑ دی تھی یعنی روم کی آبادی کی روحانی غمزدہ پروا نہ تھی۔ ممالک غیر کے ہزاروں معاملات جن میں سے ہر ایک بگاڑے خود بہت بڑا ذریعہ آمدنی تھا انہیں ہر وقت مصروف رکھتے تھے۔ اس وقت آبرو ملاو کا بیان ہے کہ ”میں جب کبھی ایوان عدالت العالیہ پاپاؤن میں داخل ہوتا تھا تو ارکان عدالت یعنی پاپاؤن کے گمشدہ کو اسٹریٹ پر گتے ہوئے پاتا تھا جن کے ڈبیر کے ڈبیر ہر طرف لگے رہتے تھے“ پاپاؤن عدالت کی حدود ارضی کی توسیع کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا تھا۔ قانون سے مستثنیٰ کرنے کا ڈھنگ ایسا ڈال گیا تھا کہ جو شخص مستثنیٰ ہوتا تھا اسے ہر وقت ایک نیا استثناء حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اس وقت کو مجمع الاکلیروس کے مقابلہ میں خاص خاص رعایتیں حاصل تھیں۔ مجمع الاکلیروس بھی بمقابلہ اس وقت خاص رعایت سے مستفیض تھا۔ علیٰ ہذا القیاس اس وقت خانقاہیں اور عام اشخاص نابان پاپاؤن کے استحصال سے مستثنیٰ تھے۔ غرض استثناء کا یہ سلسلہ پاپاؤن مقدس کی خواہش جلب منفعت کی طرح کہیں ختم ہوتا ہی نہ تھا۔

پاپائیت کا مدار اب من دو قانون پر تھا ان میں سے ایک تو کرڈینالوں کی مجلس تھی اور ایک ”کیوریا“ یعنی عدالت العالیہ پاپائیت ۱۹۵۹ء میں پاپاؤن کا انتخاب کرڈینالوں کی کثرت سے ہونے لگا۔ اس سے پہلے یہ انتخاب کل رومن کلیتھولک پادریوں کی طرف سے مل میں آتا تھا اور روم کے مجسٹریٹوں اور سربراہان ہائے مذہب کا استصواب بھی لازمی ہوتا تھا۔ لیکن پاپاؤن کے نکلیس ثانی نے حق انتخاب کو مجلس کرڈینالوں کی آرا کو دہشت پر محدود کر کے نوٹیفکیشن کا حق شہنشاہ جرمنی کو عطا کر دیا۔ تقریباً دو سو سال تک کرڈینالوں کی حکومت مختصہ و مجتمہ اور پاپاؤن کی حکومت مطلقہ و منفردہ میں ایک

دوسرے پر غالب آنے کے لیے کشمکش ہوتی رہی اور آپس میں خوب خوب داؤن بیچ ہوئے۔ کریانل اس بات پر تو راضی تھے کہ پاپا کی حکومت خارجہ مطلق العنان ہو اور اُس کے اقتدارات کے اس شعبہ میں مطلق دست اندازی نہ کی جائے۔ لیکن بوقت انتخاب اُس کے موافق رائے دینے سے پہلے وہ اُس سے یہ اقرار لے لیتے تھے کہ حکومت میں اُن کو بھی ایک خاص حصہ دیا جائے گا۔ انتخاب کے بعد اور رسم تطہیر کے ادا ہونے سے پہلے وہ خاص خاص مراعات پر کاربند ہونے کی قسم کھاتھا مثلاً یہ کہ مدخل میں کریانل کو بھی شریک کر دیا جائے گا اور سال میں دو مرتبہ اس بحث کے لیے اُن کی مجلس کے منعقد ہونے کی اجازت دے گا کہ آیا وہ اپنے عہد پر قائم رہا ہے یا نہیں۔ لیکن پاپا اپنے عہد پر کبھی قائم نہ رہے اور متواتر پچاس سالوں کے متکرب ہوئے۔ کریانل جانتے تھے کہ کلیسائی حکومت اور آمدنی میں انہیں زیادہ حصہ ملے لیکن پاپا قوت اور دولت کی اس علیحدگی کے کسی طرح روادار نہ تھے۔ کریانل کی آرزو تھی کہ مشکوہ و مطمئن اور اسراف و تبذیر میں سربرآوردہ نظر آئیں اور اس کے لیے ظاہر ہے کہ رقم خیرہ درکار تھی۔ ان میں سے ایک کے اختیار میں ایک دفعہ پانچ سو عہدے تھے۔ ان کے اعضاء و اقربا اور ملازمین دستوسلین کا مکمل بھی لازمی تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مملکت فرانس کی پوری آمدنی بھی اُن کے اخراجات کے لیے کافی نہ ہوتی تھی۔ لیکن دفعہ اُن کی رفاقتوں کی وجہ سے سالہا سال تک کسی پاپا کا انتخاب نہ ہوا تھا۔ گویا اپنے اس طرز عمل سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ نائب مسیح کے بغیر بھی کلیسا کا کام آسانی سے چل سکتا ہے۔ گیارہویں صدی کے خاتمہ پر کلیسا سے روم دربار روم ہو گیا۔ بجائے اس کے کہ مسیحی بہترین مہیاتی ہوئی اپنے گڈریے کے پیچھے پیچھے روم کے مقدس باڑے میں بھرتی ہوئی نظر آئیں۔ محروم کارندوں، محصلوں اور دوشہ جات داود مستحق تصدیق کرنے والے عہدہ داروں کا ایک محکمہ قائم ہو گیا جس میں مراعات ناموں، تذکرات الغفران

اور استثنائوں کا لین دین ہوتا تھا اور اہل مقدمہ ہاتھوں میں غرضیان لیے بیضہ بیضہ پھرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ روما پر قوم و ملک کے امیدوارانِ ملازمت کا نقطہ اجتماع بن گیا تھا۔ دینی ڈگریوں یا پائی نوازش ناموں، عفو و غفران کے تذکرہ دار کتاب گناہ کے اجازت ناموں، فرائض اور فیصلوں کے طور پر اور ایشیا کے ہر حصہ کے لوگوں کے نام شب و روز جاری رہتا تھا گلیاے مقامی کے فرائض اور ذمہ داریوں کو پس پشت ال دیا سینکڑوں ایسے اشخاص اس خدمت کی بجا آوری پر مامور تھے جو حکومت ہی "کیوریا" میں رکھتے تھے ان کی زندگی کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ پاپائی خزانہ کی آمدنی کی کوئی فرسے سختی ترقی قرار پائیں تمام مسیحی دنیا "کیوریا" کی باج گزار ہو رہی تھی۔ مذہب کا یہاں نام و نشان تک باقی نہ تھا۔ "کیوریا" کے عہدہ داروں کو سیاسی مباحث فضل حضرات اجرا و تفصیل ڈگریات دینی سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ روحانی امور میں اپنا وقت ضائع کریں ہر کششِ قلم کی ایک خاص قیمت مقرر تھی۔ تذکرات الفرائض اجازت نامجات نقصانوں، سندات تجارتی بردارہجات، مکتوبات و مضموعات کی خرید و فروخت مال تجارت کی طرح ہوتی تھی اہل مقدمات کو چہرہ اسی سے لو کر پاپا تک سب کی مٹھی گرم کرنی پڑتی تھی۔ ورنہ مقدمہ جیتنا محال تھا۔ غیر مستطیع لوگوں کو نہ ترقی مل سکتی تھی اور نہ ملنے کی امید تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر باورسی یہ سمجھنے لگا کہ اُسے روما کی مثال کی تقلید کا حق حاصل ہے اور اپنے مقتدیوں کی روحانی تواضع اور عشاے بابائی کے ذریعے جائز و ناجائز طور پر جبکہ روپ پر بھی وصول ہو سکتا ہو وصول کرنا چاہیئے۔ جلب منفعت کا یہ استحقاق اُس نے روما میں دور رقم واکر کے خریدنا جو مہاجن سے قرض لی گئی تھی۔ اگر اس طور پر روپیہ نہ وصول کیا جاتا تو یہ قرض کیونکر ادا ہوتا۔ جب "کیوریا" کا مستقر روما سے ایوانِ شان میں منتقل ہوا اور اطالویوں نے فرانس کے جنوبی و مشرقی حصہ میں رہا سبے زمین کے بائین کن سے پروا تے ہے اور اُس ریاست کا آئین ہے جو لائق سے مائیل کو حاق ہے۔ مسیحی مہاجرین و مقاربہ اور امانک یہاں کثرت سے موجود ہیں اور ان کی شاندار ملازمین آدمیت کے اس مرکز کی مضمونیات سے ہیں۔ چنانچہ پاپا سے جان بست وہ ہم کا مقید و سولہ ہیں خدا

کی طاقت فرانسیسیوں کے پاس چلی گئی۔ تو پھر بھی قدیم حالت بدستور قائم رہی۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ اطالویوں کو بعد حسرت معلوم ہوا کہ سونے کی چڑیا ان کے ہاتھ سے اڑ کر فریسی اوٹے پر جا بیٹھی ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ پاپائیت ان کا مورد فی حق ہے اور جس طرح شریعت موسوی کے دور میں یہودی خدا کے خاص بندے تھے اسی طرح شریعت عیسوی کی رو سے خدا کا فیضان خاص انہیں پر مآزل ہوا ہے۔

تیرہویں صدی کے خاتمہ پر ایک جدید مملکت دریافت ہوئی جس میں بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہونے کی قابلیت موجود تھی اس مملکت کا نام مملکت غار عقل کے اندھوں اور گناہ کے پوروں کو یہ یقین دلایا گیا کہ حضرت پاپا اس سرزمین کی گناہ گار آبادی کو تذکرات انفرادی کے اجرا سے خالی فرما سکتے ہیں۔ اس کے لیے کسی دامن زور کا بچھایا جانا ضروری نہ تھا۔ دن دہاڑے لوگوں کی چشم اعتقاد میں خاک جوئی جاتی تھی۔ غرض اسقی طاقت کے ابتدائی جراثیم نے نشو و نما پا کر رفتہ رفتہ ایک بہت بڑی زبردست شخصی سلطنت کی شکل پکڑ لی۔

محکمہ احتساب عقاید نے پاپائی نوٹ کو ایسا زبردست بنا دیا کہ اس کی مزاحمت و دافعت محال ہو گئی۔ جو شخص مخالفت کرتا تھا آگ میں زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ کسی شخص کے دل میں مخالفت خیال کا ناشی ہونا عام اس سے کہ اس خیال کا اظہار کسی خارجی علامت سے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو جرم سمجھا جاتا تھا۔ چون جون زمانہ گزرتا گیا محکمہ احتساب عقاید کا طرز عمل زیادہ وحشیانہ ہوتا گیا محض شہ کی بنا پر ملزم کو کشت کنبہ کی سزا دی جاتی تھی۔ ملزم کو الزام لگانے والے کا نام تک نہ بتایا جاتا تھا۔ اسے کسی قانون دان شخص سے مشورہ لینے کی اجازت تک دی جاتی تھی۔ اس محکمہ کے فیصلہ کی نداد تھی نہ فریاد۔ افسران محکمہ یعنی اراکان احتساب کو حکم تھا کہ جرم و نسب کے

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۸۰۔ کے کن نمبر کی بہترین یادگار ہے۔ ستمبر ۱۸۰۹ء سے ستمبر ۱۸۱۰ء تک ادیان پاپائیت کا

سرد مقام ۱۔ ستمبر ۱۸۰۹ء میں بیان کی آبادی ۲۰۹۰۰۰۰ تھی ستمبر ۱۸۰۹ء میں ۲۰۹۰۰۰۰ ہو گئی۔ آج کل یہ شہر اپنی تجارت خصوصاً دیشی کپڑوں کے کارخانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔

مزجم

دل میں مطلق نہ آنے دیں۔ لازم کا عقاید منسوب سے توبہ کرنا بھی بے سود و لا حاصل تھا۔ لازم کے ناکردہ گناہ خاندان کا مال و اسباب ضبط کر لیا جاتا تھا۔ جس میں سے آدھا پاپا کے خزانہ میں چلا جاتا تھا اور آدھ سے ارکان اعتبار اپنے دوزخ کی تواضع کرتے تھے۔ پاپا سے اسٹٹا ثالث کا قول تھا کہ ملاحدہ کی اولاد کی صرف جان بخشی کرنی چاہیے اور وہ بھی محض بہ تقاضائے ترحم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کلوکس ثالث کے سے ڈاکو پاپاؤن نے اس مقدس عدالت کی لوٹ کے مال سے اپنے خاندان کو نہال اور مالال کر دیا۔ اور ارکان اعتبار کو تو ہر روز اس کی بدولت ترلے ملتے رہتے تھے۔

پاپائیت کے قبضہ کے لیے فرانسیسیوں اور اطالیوں میں جو جدوجہد ہوئی وہ جو دہویں صدی کے مشہور مذہبی تفرقہ کی ذمہ دار ہے۔ چالیس تک دور قریب پاپا ایک دوسرے پر شب و شتم کرتے رہے اور دو قریب پاپائی عدالتیں بہ تقاضائے جلب منفعت اقدام یورپ کو چونک بن کر چڑھی رہیں۔ بالآخر پاپاؤن کی تعداد دو سے بڑھ کر تین ہو گئی اور انتشار امر واد کے خراج ربانی کے لیے تین جداگانہ مرکز قائم ہو گئے۔ لوگوں کی ارادت و عقیدت ضغطہ میں پڑ گئی۔ وہ حیران تھے کہ کس پاپا کو اصلی اور سچا ناب خباب مسیح کا تصور کریں اور عشاے ربانی و سرالقدس جیسی پاک مذہبی رسمن کی تطہیر کے متعلق کس سے اور کیونکر استناد کریں۔ مسیحی انجمن میں جائز مجتہدانہ قیاس کی کرسی صدارت خالی تھی۔ ہر شخص مجبور تھا کہ اپنا مجتہد خود بنے لوگوں کو معلوم ہونے لگا کہ کلیسا کے پاپاؤن میں عدالت العالیہ پاپائی کی جو زنجیر پڑی ہوئی ہے اُس کا ٹوٹنا اور ایک مجلس عمومی کا قائم ہونا کلیسا کی سلامتی کے لیے ضروریات سے ہے چنانچہ مجلس عمومی کے قیام کی کوشش ابرار کی گئی۔ اس کوشش کی غایت یہ تھی کہ اس مجلس کو مسیحی دنیا کی پارلیمنٹ بنا دیا جائے جس کا اعلیٰ عہدہ دار انتظامی پاپا ہو۔ لیکن وہ ذاتی اغراض اور نفسانیتیں جو مدت ہائے مذہب کے زایم و منقاد کا نتیجہ تھیں کیونکر یک بیک علاج پذیر ہو سکتی۔ عدالت العالیہ پاپائیہ کا باز ابرہہ گرم ہو گیا اور پاپاؤن کا وہی اگلا استجاری لیں میں

پھر شروع ہو گیا۔ اہل جرمنی نے جنھیں عدالت العالمیہ باپائیہ کے اقتدار میں بھی حصہ نہ لانا تھا اصلاح کی ان کو کششوں میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن جب حالت بد سے بدتر ہوتی چلی تو ان کو بھی ماننا ہی پڑا کہ مجالس عمومی کے ذریعہ سے اصلاح کنیہ کی توقع رکھنا لا حاصل ہے۔ چنانچہ ارمس کی زبان سے بے اختیار یہ کلمات نکلے کہ اگر مسیح اپنے بندوں کو ان گونا گون قسیدہ منظم سے نجات نہ دلائیں گے۔ تو ترکوں کے ظلم کی سختی کم ہو جائے گی۔ غرض کلیسا کی حالت اس

طرح ارمس کا یہ فقرہ تعصب نفرت اور عداوت کے اُن سرگازہ جذبات کا پختہ ہے جن کا خزن پادریوں کی کچھن میں مسلمانوں اور خصوصاً ترکوں کو دیکھ کر رہ رہ کر اُترتا چلا آیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ قسطنطنیہ کے تخت پر سلطان سلیمان قانونی جیسا عادل و بیدار مغز فرمان روا حکم فرما تھا جسے یورپ بھی عالیشان کا لقب دے بغیر نہ رہ سکا۔ اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ سلطان سلیمان کا چہل دشمن سالہ عہد حکومت اُس حسن سلوک و مراعات کے لحاظ سے جو عیسائی رعایا کے ساتھ کی گئی، ٹوکی کی تاریخ میں اپنی تغیر آپ ہے تو ارمس کی حق ناشناسی پر ہمیں ضرب النشل والی اُس آنکھ کی بھیجی سو جہتی ہے جس کی شان میں یہ عیب نمایاں ترش در نظر نہ کہا گیا ہے۔ سربراہ دیگر کیسی اپنی تاریخ ٹوکی میں لکھتے ہیں کہ "سلیمان نے اپنے ہر دیسارے کے نام فرمان بھی کیا کہ قیام امن و امان کی فوری تدابیر اختیار کی جائیں۔ امیر و غریب مسلم و ذمی سب کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جائے اور عدل و انصاف سے سہو تجاؤ نہ کیا جائے۔ اُس کے اس فرمان کو ساری دنیا نے سراہا اور اس کی عام طور سے تمہیل کی گئی۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ان پر ایک زبردست اور سات ہی مہربان حکومت کا سایہ ہے۔ یہ تو یورپ کا خیال ہو اور ارمس صاحب ترکوں کو ظالم اور جاہل قرار دین۔ پھر یہ لوگ پادریانہ تعصب نہیں تو کیا ہے!!

لیکن مئی ۱۵۶۷ء و تاریخ ہے جس کا واقعہ کسی طرح واقعہ کر بلا سے کم نہیں اس لیے کہ اس دن مسلمانوں کو اندلس سے جہان اُغزون نے آٹھ سو سال تک بڑے کروفر اور آن بان کے ساتھ سلطنت کی تھی طرح طرح کے عذاب کے ساتھ نہایت عذرا نہ و سفاکانہ طور پر ذلیس نکالا دیا گیا۔ سلطان سلیمان صاحبقران کا زمانہ حکومت ۱۵۶۷ء سے لیکر ۱۵۶۷ء تک ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جس میں ترک آج کل کی



درجہ ابتر ہو گئی تھی کہ کردینا لون کا منصب علامہ فروخت ہونے لگا تھا اور پاپا سے اہم کے  
 بھدین تو برقیسی مذہبی خدمت نیلام ہوتی تھی۔ زندگی کا اصول معنوی ہو گیا تھا کہ اول دولت  
 بعدہ عزت مجیدہ دارون میں ایک بھی ایسا تھا جو انگلہ سے اوجھل ایماندار ہو یا گواہ لاسے بغیر  
 پاکبازی کا دوا کر سکے۔ کردینا لون کے ارغوانی رنگ کی محلی عبائیں اور سفید شجاب کے طیلان  
 دھو کے کی ٹٹی ہو رہے تھے جن کی آرزو میں کوئی عبادت نہ تھی جس کا یہ بزرگوار کتاب نہ کرتے

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۸۳۔ طرح دولیورپ کے چوگان کی گیند بنے ہوئے تھے بلکہ خود ان سے ہر نفرانی حکومت  
 کی کوریج تھی۔ اسپیس کے سبھی طرز عمل کو پیش نظر رکھ کر اگر مسلمان جس کی تشییر آبدار ہنگری کے جگرینہ پیر کی  
 تھی اپنی سلطنت سے مسیانیوں کو اسی طرح نکال دیتا یا بروستی مسلمان بنا لیتا جس طرح اُس کے معاصرین ڈونڈیا  
 و اسابیلا نے کیا تھا تو وہ ہر طرح سے حق بجانب ہوتا گو ارسس کی خاطر ہم اُسے کچھ دیر کے لیے غلام کہہ لیتے  
 لیکن اُس کی انسانیت اور شرافت نفس اس سے ظاہر ہے کہ جب اُس نے جزیرو روڈس کو عہدہ سینٹ جانا  
 کے ہیکلیکین سے فرج کیا جنہوں نے اُس کا مقابلہ دت تک جم کر نہایت بے جگری سے کیا تھا تو بجائے اس کے  
 کہ وہ اس کے رکی طرح غیظ و غضب میں اکران کو نیست و نابود کر دیتا یا فرمیں نڈ و اسابیلا کی طرح ان کے آثار اور  
 یادگاروں کو مٹا دیتا اُس نے روڈس کے سبھی باشندہ کو پوری مذہبی آزادی عطا کی اور حکم دیا کہ ان کے  
 گرجاؤں کی بے حسرتی نہ کی جائے بچے ان کے والدین سے نہ چھینے جائیں اور ان کے غام غم بھی امان اور  
 قومی علامات کو برقرار رہنے دیا جائے۔ چنانچہ بارش ملاٹ جس نے ۱۳۳۷ء میں روڈس کا سفر کیا۔ لکھتا  
 ہے کہ "تین سو پندرہ سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ عہدہ سینٹ جان کے طیلیل القدر ہیکلیکین کو دو سو بارہ سال  
 تک اس جزیرہ پر قابض رہا آخر اپنی سپردا لئی پڑی۔ ترکوں نے اپنے بہادر حریفوں کا یہاں تک ادب کیا  
 ہے کہ ہیکلیکین کا محلہ ابھی تک قائم ہے اور ہرگز کے دروازے پر ابھی تک اپنے سابق کین کا فخر ہے  
 اور سرکار ابھی تک غمت ہے۔ ہیکلیکین کی بنائی ہوئی عمارت بھی پستور موجود ہیں اگرچہ ان میں آج کل  
 کوئی نہ بنائیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ ان بھادروں کی روحیں یہاں مقیم ہیں۔"

ہوں اور کوئی گناہ نہ تھا جو ان حضرات سے صادر نہ ہوتا ہو۔

کلیسا کی وحدت (اور اس لحاظ سے اس کی طاقت) اس امر کی مقتضی تھی کہ لاطینی کا استعمال بطور زبان مقدس عام طور سے ہو۔ لاطینی ہی کے استعمال کے بدولت روم اور پوپ کا جزو لاینفک بنارہا اور تعلقات بین الاقوام کے قائم رکھنے میں کامیاب ہوا۔ لاطینی زبان کے بین الاقوامی استعمال نے روم کو جو قوت بخشی اُس کے مقابلہ میں امن اقتدارات کے اثر کی کوئی ہمتی نہیں جن کے سماوی الاصل ہونے کا باپائیت کو ادعا تھا اور اگرچہ اس کو اپنے کارناموں پر بہت بڑا تازہ ہے لیکن وہ اس الزام سے کسی طرح بچ نہیں سکتی کہ باوجود اتنی بڑی طاقت کے جو آئندہ اُس کے کسی جانشین کو حاصل نہ ہو سکے گی اُس نے کچھ اس سے بھی زیادہ کریں نہیں کر دکھایا۔ اگر باپا بیان روم اپنی ہوس راہیوں اور دنیا پرستیوں میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ اس بات پر قادر تھے کہ اُن کے ایک اشارہ پر تمام براعظم بالاتفاق ایسی رتی کرتا کہ دنیا دگر رہ جاتی۔ اُن کے آپ بے روک ٹوک ہر ملک میں جاسکتے تھے اور آئرلینڈ سے لیکر بوہیمیا اور آملی سے چلکر سکاٹ لینڈ تک بلا تکلف آپس میں بات چیت کر سکتے تھے۔ ایک زبان ہونے کی وجہ سے وہ بین الاقوامی امور کے نظم و نسق میں ذیل ہو گئے تھے اور ہر ملک میں اُنہیں ایسے ہوشیار اور سعلانہ حلیف ہاتھ آ گئے تھے جو ایک ہی زبان بولتے تھے اور مہات الاسور میں اُن کا ہاتھ بٹانے کے لیے تیار تھے۔

ایسی حالت میں یونانی زبان کے احیا اور ابرانی زبان کی ترویج پر روم نے جس نفرت و عداوت کا اظہار کیا وہ کچھ بے وجہ نہ تھا اور جو تشویش اُسے یہ دیکھ کر مانگیں مٹی کہ السنہ جدیدہ کی دیوار گنوار و بولیوں کی بنیاد پر چنی جا رہی ہے وہ بیجا نہ تھی۔ پیرس کے مدرسہ الہیات کے اس تروڈائیز استفار کو کہ اگر یونانی و ابرانی کے پڑھنے کی اجازت دی جائے گی تو مذہب کا کیا منہ ہوگا۔ اگرچہ کرڈینل زامینر کے عہد کے خیالات کی گونج سے تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن اس کی نہ میں ایک حقیقی خدشہ بھی معترف تھا۔ لاطینی کے

رواج عام پر روم کی طاقت کا انحصار تھا۔ اس کے انحطاط کے ساتھ اُس کا زوال وابستہ تھا۔ اس کے عدم استعمال کے یہ معنی تھے کہ روم کی حد اثر اٹلی کے ایک چھوٹے سے صوبہ تک محدود ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ پور وپین زبانوں کی ترقی روم کی بربادی کا باعث ہوئی ہے۔ یہ زبانیں گرائی پیشہ راہبوں اور ان بڑے عوام الناس کے درمیان تبادلۂ خیالات کا موثر ذریعہ بن گئیں اور ان میں سے ایک زبان بھی ایسی نہ تھی جس نے اپنی اولین تصانیف میں روم کو نشانہٴ خوارت و آماجگاہِ لامست نہ بنایا ہو۔

غرض یورپ کے مختلف الاسد لٹریچر کی ترقی یا پائی مسیحیت کے زوال کی ہمعصر ہے۔ پاپائی عہد حکومت میں نامکن تھا کہ یورپ کا لٹریچر وجود میں آسکے۔ ایسے کے مذہبی وحدت علمی وحدت کی متقاضی تھی جبکہ مفہوم یہ تھا کہ صرف ایک ہی علمی زبان ہر جگہ رائج ہو۔

اگرچہ ایک زبان واحد کے مانگ ہونے کی وجہ سے کلیسا کی قوت میں ایسا جرت انگیز اضافہ ہو گیا لیکن اُس کی طاقت کا اصلی راز اُس دسترس میں پوشیدہ تھا جو اُس نے نہایت چالاک سے لوگوں کی خانگی زندگی پر حاصل کر لی تھی۔ اس کے فقدان کے ساتھ اُس کا اثر بھی گہٹ گیا اور ساتھ ہی بین الاقوامی امور میں اُس کی سیاسی مداخلت بھی برائے نام نہ ہو سکتی تھی۔

مسیحیت سے پہلے جب تاجداران روم کانیر اقبال نصف النہار پر تھا تو سلطنت کے سربون میں جہان رومی افواج کی چھا و نیان قائم ہوتی تھیں وہ سب مقامات تہذیب و ثقافت کے مرکز بن جاتے تھے۔ صنعت و حرفت اور امن و امان کی جو حالت ان مقامات میں پائی جاتی تھی اُس کی مثال گرد و نواح کی وحشی اقوام پر جو برطانیہ فرانس اور جرمنی میں آج بھی پائی اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہی اور اگرچہ حکام روم کا یہ فرض نہیں تھا کہ اقوام مفتوحہ کی فلاح و بہبود میں نمایان دلچسپی ظاہر کریں بلکہ اُن کا فائدہ اسی میں تھا کہ ان اقوام کی حالت ذلیل رہے۔ کیونکہ بہت سی حالت حلقہٴ پوششی و اطاعت کی یعنی کی مدد و معاون ہوتی ہے لیکن پھر بھی عالم کی تمدنی و معاشرتی حالت میں منفرد و مجتمعاً برابر اصلاح ہوتی گئی۔

جب رومین پادریوں کا دور دورہ ہوا تو اسی قسم کے نتائج خود بخود ظہور میں آنے شروع ہوئے۔ سیر و نجات میں فوجی چھانیوں کی جگہ دیر تا بزم ہو گئے۔ گاؤں یا شہر میں گر جا رہے سنی اور تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اول الذکر کے سامان عیش و عشرت اور ثنائی الذکر کے مواظف و نفع ساج نے لوگوں پر ایک زبردست ڈالا۔

خاندانوں کے نظام معاشرت کی تنظیم حکومت ملکی کے ضابطہ کی تعیین اور دول یورپ کی ترکیب میں پادریوں کے طرز عمل نے جو حصہ لیا اس کے محاسن پر نظر ڈالتے وقت ہم اس امر کو فراموش نہیں کر سکتے کہ قیسی حکمت عملی کا خاص مقصد اصلاح تمدن نہ تھا بلکہ اعتلا کے کلیسا تھا۔ پس دنیا دار لوگوں کو جو فوائد پہنچ گئے وہ مقصود بالذات و معبود بالانہایت نہ تھے بلکہ ذیلی و اتفاقی تھے۔

اقوام کی مادی حالت کی اصلاح و ترقی کے لیے کوئی نتیجہ غیر مستقل بالذات تدبیر پادریوں کی طرف سے اختیار نہیں کی گئی۔ ان کے نشو و نما عقلی کے لیے کوئی طریقہ عمل میں نہیں لایا گیا اور انھیں ان بڑے بلکہ جاہل مطلق کہنے کی کوشش کی گئی۔ صدیوں پر صدیان گزرتی چلی گئیں لیکن کسانوں کی حالت کسیت کے چوپایوں سے بہتر نہ ہونے پائی۔ وسائل نقل و حرکت اور ذرائع ریل و رسائل کو جو وسیع خیالات کے مومعین ہوا کرتے ہیں حامد و غیر متحرک رہنے دیا گیا۔ آبادی کا اکثر حصہ ایسا تھا جسے ساری عمر اپنے گھر سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق نہ ہوا اس پر نصیب طبقہ کو نہ اصلاح حالت کی امید تھی نہ کسی ترقی کی توقع۔ اخلاص کے سد باب اور تحفظ کے انفع کے لیے بڑے بیانیہ پر کوئی تجویز نہ سوچی گئی۔ دبا کو اجازت تھی کہ کھلے بندوں جہان چاہے پھرے اور جس شہر پر چاہے چھا پڑے۔ بہت ہی روک ٹوک ہوئی تو کسی پادری نے دو چار لاطینی دسائیں بڑا بڑا دیں۔ بری خوراک ناقص لباس اور نا کافی مکان برابر اپنا اثر کیے چلے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہزار سال کے بعد یورپ کی آبادی دگنی بھی نہ ہوئے پائی۔ اگر کسی حکومت کا فن تدبیر مہاکات پیدا پیش کر دے اور اموات کا باعث ہونے کے اعتبار سے

سے قابلِ موزونہ جھڑکتا ہے تو پاپائیت پر کتنا بڑا موزا غلہ ہوتا ہے !  
 کینٹو ملک مذہب کے اس عام اثر کی تنقید کرتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے اپنی  
 آپ کو تو خیر جو کچھ نفع پہنچا یا وہ ظاہر ہے لیکن اس کے مقابلہ میں دوسروں کے ساتھ کیا بھلائی کی  
 راہب کی خانقاہ کی شاندار تصویر پر وہ تصور پر کھینچو۔ اس میں عیش و عشرت اور راحت و  
 آسائش کا ہر ایک سامان بہتین نظر آئے گا۔ تشریف ہوئی گھاس کے زمر دین تھتے چھوٹوں کے  
 چمن۔ میوہ دار درختوں کے حدیثی اچھلتے ہوئے فوارے ترم آفرین نرین سبھی کچھ پاؤ گے۔  
 لیکن ان نعمتوں کا تعلق جہاں سے دباؤ دہ کسان سے نہ ہوگا جو کسی دلدل کے کنارے ایک  
 ٹوٹے پھیر کے پیچھے یا رومدار سسکیاں بھرتا ہوا دم توڑ رہا ہوگا بلکہ ان کا تعلق خانقاہ  
 کے سجادہ صاحب سے ہوگا جن کے ناگن کی چھیل جن کی ترمیتوں۔ شکرون اور تازی  
 کتون کی حسد انگیزی جن کے نعمت خانہ اور خمنیہ کے اطمینان لایہ ودا شرفیہ کی حکایت سے تاریخ  
 کے ورق بھرے بڑے ہیں۔ یہ عیش پرست راہب اس مذہبی نظام کا ایک جزو لایہ تک ہے۔  
 جس کا مرکز اٹلی ہے۔ وہ روم کا باغیچہ اور مطلع و شقاو ہے اور اس کا کوئی فعل ایسا نہیں ہوتا  
 جس سے روم کے فریاد کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو۔ جب ہم اس زمانہ کے عالیشان گرجاؤں اور کلیساؤں  
 پر نظر دوڑاتے ہیں جن کا شمار فن تعمیر کی معجزانہ کے کرسٹون میں ہے اور جنہیں دیکھ دیکھ کر  
 یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ پاپائیت کے حقیقی معجزات یہی عمارتیں ہیں۔ اور جب ہم ان مہتمم  
 بالشان اور دل پر رب طاری کر سنے والے مذہبی مراسم کو جو ان گرجاؤں میں ادا کیے جاتے  
 تھے اس دھندلے نور کو جو رنگارنگ آئینوں والے دیوچون میں سے چھننا تھا۔ ان  
 سریشی آوازوں کو جن کے الپ کی سامنے فریہ ملائیک کے نغموں سے کسی طرح کو نہ تھی۔  
 ان پادریوں کو جو اپنے مقدس خدمت ہائے فائزہ زیب تن کیے ہوئے تھے اور جسے  
 فریاد وہ ان سرسجدہ عبادت گزاروں کو جو ایک اجنبی اور نامعلوم زبان میں دعائیں اور نمازیں  
 سن رہے ہوئے تھے۔ غرض جب ہم اس تمام عالیشان مذہبی نظارہ کو اپنے تصور میں

لاستے ہیں تو بے اختیار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ عبادت گزارین کی روحانی فلاح کی خاطر تھا یا روم کی زبردست اور ہمہ گیر طاقت کا پایہ حلال و عظمت اور بھی اونچا کرنے کی غرض سے؟

لیکن شاید کوئی شخص اس کے جواب میں یہ کہے کہ انسانی مساعی محدود ہیں۔ بعض امور ایسے ہیں جنہیں کوئی سیاسی نظام اور کوئی انسانی طاقت خواہ اُس کا ارادہ کیسا ہی نیک کیون نہ ہو انہیں نہ دے سکتی۔ انسان وحشیانہ حالت سے ترقی کر کے دفعۃً خلیستہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ایک وسیع براعظم ایک ہی دن میں مہذب نہیں ہو سکتا۔

یہ سب سچ ہے مگر باپائیت کے جانچنے کے لیے اس قسم کا معیار پہلے ہی مقرر نہیں کیا گیا۔ کیتھولک طاقت کی نسبت جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ وہ ازراہ غایت استحقار انسانی الاصل ہونے سے منکر ہوئی بلکہ اس وقت تک منکر ہے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اُس کا ماخذ بائی ہے اور اُس کو الوہیت کے ساتھ بااداسطہ نسبت ہے۔ پاپائے اعظم خلیفۃ السنی الارض ہے اُس کا اجتہاد و خطا سے پاک ہے اُس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو معجزے کے ذریعے سے ان ہونی بات کو ہونی کر دکھائے۔ ایک ہزار سال تک اُس نے یورپ کو عقل و ادراک پر جابرانہ اور قائم ہر حکومت قائم رکھی اور اگرچہ بعض اجدادوں نے سرکشی کی راہ سے کبھی کبھی اُس کی مخالفت کی لیکن مجموعی حیثیت سے یہ مخالفت ایسی بے حقیقت تھی کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یورپ کے حل و عقد و لبت و کشاد کا مدار علیہ پاپائے روم ہی تھا۔ جو ذاتیات اس فصل میں بیان کئے گئے ہیں ان پر بلاشبہ سوچدین صدی کے پراٹسٹنٹ علم برداران اصلاح کی نظر غائر پڑ چکی تھی۔ اور وہ نتیجہ نکال چکے تھے رومن کیتھولک مذہب اپنے فرائض مذہبی کی انجام دہی سے بالکل عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ بلکہ منکالت افراط و تفریط کا مجموعہ بن گیا ہے۔ پس سچی مسیحیت کے احیاء کی مرت یہی شکل ہے کہ نرون اولی کے عقاید و مراسم کو از سر نو تازہ کیا جائے۔ اس فیصلہ پر حامیان اصلاح و بغتہ نہیں پہنچے تھے۔

ایک مدت ممتد سے بہت سے پیشوایان مذہب اور روشن خیال علماء و فضلا کی یہی رائے تھی چنانچہ ازمنہ و مطلق میں ذوالسکین طبقہ کے متقی اور پرہیزگار راہب اس خیال کو صاف طور سے ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکے کہ روم کے ایک قیصر کی لٹرائینوں نے سچے مذہب کا خاتمہ کر دیا۔ غرض اصلاح کے لیے مواد ایک عرصہ سے تیار ہو رہا تھا۔ سبزنگ بچھائی جا چکی تھی۔ مرنے والے دکھانے کی دیر تھی تو سحر کی آواز کا بلند ہونا تھا کہ تمام شمالی یورپ نے فیصلہ کر لیا کہ مریم عذرا کی پرستش ادویا سے مراد طبی معجزہ سنائی دیرینوں کا کراماتی علاج۔ انتخاب گناہ کے لیے تذکرۃ العفوان کی خرید اور پاپا پرستوں کی مٹھی گرم کرنے والے باقی کے تمام اُن اعمال سیئہ کا جو حیثیت سے منسوب کر دئے گئے تھے لیکن اُس سے حقیقت میں تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ قلم خاتمہ کر دیا جائے۔ کیتھولک مذہب کو ایک ایسی طاقت ہونے کی حیثیت سے جس کی غایت علاج و ترقی انسان تھی اپنے اس دعوے میں کہ اُس کا طرز عمل معلل بہ تائید آسمانی ہے صاف ناکامی ہوئی اُس کے کارناموں اور اُس کے ادعاؤں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک ہزار سال تک اُسے انسان کی اصلاح حالت کا موقع دیا گیا۔ لیکن جب اُس کی کارگزاری کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ نبی نوز انسان کی جس جماعت کثیر کو اسکے حوالہ کیا گیا تھا اُسکی حالت جسمانی و عقلی ترقی کے اعتبار سے اُس حالت کے مقابلہ میں بہت ہی پست تھی جس میں یہ جماعت پائی تانی چاہتی تھی۔

# گیارہواں باب

## سائنس کا تعلق تمدن جدیدہ کے ساتھ

سائنس کے عام اثرات کی مثال تاریخ امریکہ سے۔

سائنس کا یورپ میں داخل ہونا۔ اسلامی مسیحین سے چلکر سائنس کا گورنٹالی آئی  
میں ہوا۔ جہاں بعد اس کے کہ پاپائیت کا مستقر آئیوینان میں منتقل ہو گیا تھا اس نے خاطر  
خواہ نشوونما پائی۔ چھاپہ، بحری اسفار اور اصلاح کینہ کا اثر۔ اطلاوی مجالس علمی تعلیم  
سائنس کا عقلی اثر اس نے یورپ میں اور اک کی طرز و روش بدل ڈالی۔ لندن کی  
راہل سوسائٹی اور دوسری علمی مجلہوں کے کارناموں سے اس کی تصدیق و توثیق۔

سائنس کا اقتصادی اثر اُن بینکار ایجادات متعلقہ فن جرنیل و فن طبیعیات سے ظاہر  
ہوتا ہے جو جوہرین صدی کے آغاز سے لگی ہیں۔ ان ایجادات کا اثر صحت بدلی  
اور خانگی زندگی اور نیز فنون رزم و ہزم پر۔

اس سوال کا جواب کہ سائنس نے بنی نوع انسان کو کیا نفع پہنچایا ہے۔۔۔

یورپ کی تاریخ ہزارہ اصلاح کینہ اُن اثرات کے نتائج پر روشنی ڈالتی ہے جو روٹائی  
مسیحیت نے اصلاح تمدن پر ڈالی۔ اگرچہ امریکہ کی تاریخ زمانہ حال پر اسی طرح کی نظر انعقاد  
ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ سائنس کے اثرات سے کیا کیا نتائج مترتب ہوئے ہیں۔

سترہویں صدی میں اہل یورپ کی ایک مختصر سی جماعت مجرا دیا نوس کے مغربی  
ساحل پر آباد ہو گئی تھی۔ جزیرہ آئیو فاؤنڈ لیسٹ (ارض جدید) میں چونکہ کاڈ مچھلی کا صنعت



شکاربہ کثرت تھا لہذا فرانسیسیوں نے ایک چھوٹی ٹیسی نوآبادی سینٹ لارنس کے شمال میں قائم کر لی تھی۔ قوم انگریز قوم ڈچ اور قوم سویڈ کے لوگ نیو انگلینڈ (انگلستان جدید) کے سوا حل اور ڈنل اسٹیٹس (ریاستہائے متوسطہ) میں آباد تھے اور فرانسیسی برائٹنٹون کی کچھ جہت کیرولائنا میں رہتی تھی۔ یہ افراد کہ فلاریڈا میں آب بھاگا ایک چشمہ ہے جس کا پانی پی کر انسان ہمیشہ جوان رہتا ہے چند سپانیولیوں کو یہاں لے آئی تھی۔ ان میں سیاحون نے جو گاؤں قائم کر لیے تھے ان کے پرلی طرف ایک وسیع و غیر معلوم سرزمین پھیلی ہوئی تھی جس میں خانہ بدوش و حشیون کے گروہ پھرتے تھے۔ ان وحشیون کی تعداد خلیج مکسیکو سے لے کر سینٹ لارنس تک ایک لاکھ اسی ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ ان کی زمینی پورپین نوادروں کو معلوم ہوا کہ اندرون ملک میں آب شیرین کے وسیع سمندر موجود ہیں اور ایک بہت بڑا دریا ہے جس کا نام مہیسی ہے اس دریا کے بارہ میں ان کے اقوال مختلف تھے۔ بعض کا یہ قول تھا کہ یہ دریا ورجینیا میں سے ہوتا ہوا بحر اوقیانوس میں جا گرتا ہے بعض کہتے تھے کہ ورجینیا میں سے نہیں بلکہ فلاریڈا میں سے گزرتا ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ دریا بحر الکاہل میں جا ملتا ہے اور بعض کا قیاس یہ تھا کہ اس کا دھانہ خلیج مکسیکو ہے۔ بحر اوقیانوس کی طوفان خیز مومیں جن کو عبور کرنے کے معنی یہ تھے کہ کئی مہینے کا سفر اختیار کیا جائے ان یورپین پریسیوں کو ان کے وطن سے جدا کر لی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ ایک ایسے کوئے میں پڑے ہوئے ہیں جہاں کسی کو ان کی خبر نہیں ہو سکتی۔

لیکن انیسویں صدی ابھی خمزنہ ہونے لگی تھی کہ ان بے سرد سامان اور بے یار و مددگار آوارگان و شہت غربت کی اولاد دنیا کی ایک زبردست اور طاقتور قوم ہو گئی۔ اس قوم نے ایک ایسی جمہوری سلطنت قائم کر لی جس کا علم بحر اوقیانوس سے لے کر تاباں بحر الکاہل پہنچتا تھا۔ دس لاکھ سپانیوں کے ایک لشکر جہاز کی مدد سے جس کا شمار صفیہ قرطاس ہی کی زینت

نہ تھا بلکہ جو میدان جنگ میں موجود تھا اس قوم نے ایک خانگی حریت کا تختہ سطوت و اقتدار الٹ ڈالا۔ اس کے جنگی بیڑے میں سات سو جہاز شامل تھے جن پر پانچ ہزار نو پین چڑھی ہوئی تھیں اور ان میں سے بعض توپیں ایسی بھاری تھیں کہ دنیا میں اس لحاظ سے اُن کا جواب نہ تھا۔ ان جہازوں کے سامان محمولہ کا مجموعی وزن پانچ لاکھ ٹن تھا۔ اپنے قومی حقوق کی حفاظت میں اس قوم نے پانچ سال سے کم کی مدت میں چار سو کروڑ ڈالر خرچ کیے تھے۔ اس کی مردم شماری سے جس کا انتظام وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا معلوم ہوا کہ اس کی آبادی پچیسویں سال وگنی جو رچی سرے جس سے یہ اُمید قائم کرنی بجا نہیں کہ اسی سوین صدی کے خاتمہ پر اس قوم کی آبادی تقریباً دس کروڑ ہو جائے گی۔

ایک ویران براعظم جو سنسان اور سونا پڑا ہوا تھا صنعت و حرفت کا اکھاڑا بن گیا جس میں کمون کے چلنے کے شور اور آدمیوں کی پیچمن حرکت نے ایک نئی روح بھونکائی۔ جہاں پہلے ایک گھنابے راہ جنگل چھایا ہوا تھا وہاں صد ہا شہر اور قصبے آباد ہو گئے۔ روٹی مٹا کو اور اناج جیسی بیش قیمت پیداوار کے کثیر المقدار انہاروں نے تجارت کی رونق بڑھا دی۔ کانون سے سونا، لوہا اور کوئلہ اس مقدار میں نکلتے لگا کہ عقل کو باور نہیں آتا تھا۔ بر تعداد کلیساؤں دارالعلوم اور مدرسوں نے ثابت کر دیا کہ اس مادی ترقی کے دوش بدوش عقلی و روحانی ارتقا کا عمل بھی جاری ہے۔ ذرا ہی نقل و حرکت کا انتظام بھی خاطر خواہ کر دیا گیا۔ ریل کی سرکین طول میں یورپ کی آہنی سرکوں کے مجموعی طول سے بڑھ گئیں۔ سترہ اعین یورپ میں سلسلہ ریل کا مجموعی طول ۶۳۳۶۰ میل تھا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں امریکہ کا سلسلہ ۷۰۵۰ میل لمبا تھا۔ اس سلسلہ کی ایک شلخ براعظم کے عرض میں پھیلی ہوئی تھی اور بحر اوقیانوس کو بحر الکاہل سے ملائی تھی۔

لیکن امریکہ کی ترقی میں یہ مادی نتائج ہی قابل لحاظ نہیں ہیں۔ اخلاقی اور تمدنی نتائج بھی ہماری توجہ کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتے ہیں مثلاً چالیس لاکھ حبشی غلام ایک فلم

آزاد کر دئے گئے۔ قانون میں اگر رعایت کا میلان پایا گیا تو بحق غرابا یا گیا۔ واصنعان قانون کا مقصد یہ تھا کہ افلاس کا انسداد کیا جائے اور غیر مستطیع طبقہ کے لوگوں کی حالت درست کی جائے۔ قابلیت کے لیے ترقی کی راہ کھول دی گئی اور سب رکاوٹیں دور کر دی گئیں۔ ترقی کا کوئی ایسا درجہ نہ تھا جس پر ذہین اور محنتی شخص فائز نہ ہو سکے۔ بعض بڑی بڑی سرکاری خدمتوں پر ایسے شخص مامور تھے جو ابستدائہ نہایت غربت اور کس پر سرسی کی حالت میں تھے لیکن بڑھتے بڑھتے ان جلیل القدر وادارچ پر پہنچ گئے۔ میل جول کی مساوات تو لوگوں میں خیر نہ پائی جاتی تھی اور دو نعمت مند اور آسودہ حال جماعتوں میں اس کا پایا جانا ممکن بھی نہیں لیکن دنیف کے حقوق سے ادنیٰ واسطے کیساں بہرہ اندوز تھے اور یہ مساوات نہایت تشدد کے ساتھ قائم رکھی گئی۔

شاید یہ کہا جائے کہ اس غیر معمولی ترقی کا باعث وہ مختص المقام و مختص الحیثیت خاتین تھیں جو کسی قوم کو اس سے پہلے پیش نہ آئی تھیں۔ ترقی کا ایک وسیع میدان کھلا پڑا تھا اور ایک پورا براعظم ہر اُس قوم کو جو اس کے ساحلوں تک آنے کی زحمت گوارا کرتی حق مقابضت و ملکیت عطا کرنے کے لیے تیار تھا۔ قدرت کو مسخر کرنے اور اُس کے خرمین فیضان سے خوشہ چین ہونے کے لیے بحر محنت اور جدوجہد کے اور کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔

لیکن ہم تو بھی سمجھیں گے کہ اُن مسافروں کے لیے جنہوں نے نئی دنیا کی عظیم الشان نوآبادی قائم کی ترقی کی راہ پر ایک بہت بڑے اصول نے میل و نرسنگ کا کام دیا۔ اسی اصول کی رہنمائی سے انہوں نے اُن خاموش مقامات کو جہاں ابدالاباد سے نشان چھایا ہوا تھا تمدن و تہذیب و تہذیب کی کام کرنا دیا۔ جنگوں وریاؤں پہلوڑوں اور بیابانوں سے ہراسان ہو کر بغیر دہرائی کو آبادی سے تبدیل کر دیا اور ایک صدی کے اندر اندر ایک پورے براعظم کو مسخر کر لیا۔ اس کے مقابلہ میں میکسیکو اور پیرو و پراہل اسپین کی اُس فوج کشی

کے ستارچ پر نظر ڈالنا خالی انداز متباعد نہ ہو گا جس نے ان ممالک کے ہجرت انگیز تمدن کو نیست و نابود کر دیا۔ یہ تمدن ہسپانوی تمدن پر گہنی ایک اعتبار سے فوقیت رکھتا تھا۔ اس تمدن نے نواد اور بارود کی مدد کے بغیر عروج حاصل کیا تھا۔ اس تمدن کا انحصار غلامت کے اور کاتانوں پر تھا جو نہ گھوڑوں کے محتاج تھے نہ بیلوں کے اور جنگو نہ ہل کی ضرورت تھی نہ جوئے کی۔ اہل اسپین کے لیے ترقی کی راہ صاف کھلی تھی۔ اون کے رستہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن انہوں نے کیا ترقی کیا کہ امریکہ کے اصلی باشندوں کی کی کرائی محنت کو غارت کر دیا۔ ان میں سے لاکھوں بد نصیب قسی القلب حملہ آوروں کی وحشیانہ خونخواری کا شکار ہوئے۔ وہ قوین جو صد سال سے فارغ البالی اور آسودہ حالی کی زندگی بسر کرتی چلی آتی تھیں اور ان رسوں اور رواجوں کی پابند تھیں جنہیں تاریخ نے اُنکے لیے سوزن ثابت کیا تھا ایک بیک غنہ و بد امنی کی بلا میں گرفتار ہو گئیں۔ ادھام پرستی کا مرض چاروں طرف پھیل گیا اور لوگوں کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کا بہت بڑا حصہ کلیسا سے روماکے قبضہ میں چلا گیا۔

ہم نے تذکرہ بالا مثال کو جس کا انتخاب تاریخ امریکہ سے کیا گیا ہے دوسری مثالوں پر جو تاریخ یورپ سے اخذ کی جاسکتی تھیں اس لیے ترجیح دی ہے کہ اس سے اس واقعہ کی شہادت بہم پہنچتی ہے کہ عمل ارتقا میں خارجی اثرات کا تصرف بہت ہی کم ہوا۔ یورپ کی سیاسی ترقی امریکہ کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کے طرز عمل اور ستارچ پر غور کرنے سے پہلے ہم مختصر بیان کریں گے کہ سائنس نے یورپ میں کس طرح رواج پایا۔

## یورپ میں سائنس کی ترویج

حروب صلیبیہ نہ صرف سالہا سال سے روماکے کلیسائی خزانہ کو ان بیش قرار رقموں سے باٹ رہی تھیں جن کا ماتہ ہر مسیحی قوم کا خوف یا اتقا تھا بلکہ ان کی وجہ سے باپائی حالت خطرناک طور پر بڑھ گئی تھی۔ اُس دو علی حکومت میں جو یورپ میں ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی دینی

حکومت کو پورا غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور دینیوی حکومت کی حیثیت اس کے خادم کی سی رہ گئی تھی۔ مسیحی دنیا کے اطراف و اکناف سے ہندوستانی رزمین رومین چلی آرہی تھیں۔ کوئی ایسا حیلہ نہ تھا جو لوگوں سے روپیہ وصول کرنے کے لیے نہ تراشا جاتا ہو۔ چاندی سونے کا ایک مینہ تھا کہ موسلا دارانی پر برس رہا تھا۔ دینیوی فرمانرواؤں کے خزانے خالی ہو چلے محاصل کی مقدار قلیل اور غیر یکتا رہ گئی۔ اندنی کی کمی کے باعث انتظام چلانا دشوار ہو گیا۔ فلپ الملطب (ہینری ڈیگوشو) شاہ فرانس (سترہویں) نے جب دیکھا کہ اسکی مملکت سے بغیر اسکی اجازت کے لکھو لکھا روپیہ یون باہر کھینچا جاتا ہے تو اس نے دل کڑا کر کہ نہ صرف اس مضمون کے اجتماعی احکام جاری کر دئے کہ اس کے فرمان کے بغیر چاندی اور سونا برآمد نہ کیا جائے بلکہ یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ نہ ہی جاگیروں اور قسیمی جائدادوں سے محصول شاہی وصول کیا جائے۔ اس فیصلہ کا صادر ہونا تھا کہ پاپائیت اور حکومت فرانس میں ایک مہلک جنگ چھڑ گئی۔ پاپائیت شاہ فرانس کو کیسا ستے خارج کر دیا۔ بادشاہ نے اس کا بدلہ یون لیا کہ پاپائے بانیفیس نامیوں پر دہریت کا الزام لگا کر یہ خواہش ظاہر کی کہ پاپا کا چالان مجلس عمومی کے اجلاس میں کیا جائے۔ اسی اثنا میں اس نے چند معتبر اشخاص کو اٹلی بھیجا جنھوں نے بانیفیس کے محل واقع آلمگنی میں داخل ہو کر اسے گرفتار کر لیا اور اس کے ساتھ ایسی سمجھتی کی کہ وہ چند دن ہیرا مر گیا۔ اس کا جانشین پاپائے سینڈکٹ یازدہم زہر دیکر مار ڈالا گیا۔

شاہ فرانس نے عزم پالجزم کر لیا تھا کہ پاپائیت کے ذایم و مفاسد کی کامل اصلاح کی جائے اور یہ عہدہ چیت اطالوی خاندانوں ہی کا درتہ نہ ہو جائے جو پانی چالاکی سے یورپ کی سرحد اعتقاد ہی کو سیم وز کی شکل میں بدل رہے تھے بلکہ فرانس کے رسوخ کا عنصر اس میں غالب ہو۔ چنانچہ کرومیاؤن کے ساتھ اس بارہ میں اس کا سمجھوتا ہو گیا۔ ایک فرانسیسی صمد مسافرت پاپائی مسند پر بٹھایا گیا۔ اور اس نے کلیمنٹ خامس کا لقب اختیار کیا۔ وہ بار پاپا فرانس کے شہر آدنیا میں اسٹھ آیا اور دوا جواب تک مسیحیت کا پایہ تخت

تھا اس شرف سے محروم ہو گیا۔

ستر سال گزرنے کے بعد پاپائیت کی تست نے پٹا کھایا یعنی ۱۷۷۴ء میں مدینۃ البقا (روما) کو پاپائے اعظم کے مستقر حکومت بننے کا شرف از سر نو حاصل ہوا۔ اس عرصہ میں بوجہ اس کہ پاپائیت کا رسوخ جزیرہ نماے اٹلی میں گھٹ گیا تھا شمالی اٹلی کے بڑے تجارتی شہروں میں وہ عقلی تحریک جلد جلد پھیل گئی جو تاریخ میں یادگار رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی بعض اور بھی مبارک و سازگار حالتیں نمودار ہو چلیں۔ حروب صلیبیہ کے انجام نے تمام مسیحی دنیا کے عقاید میں خلل ڈال دیا۔ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ فتح و شکست کو عام طور سے حق و باطل کا رباقی معیار سمجھا جاتا تھا ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی رغم ان فتنہ مسمیت ارض مقدس پر مسلمان قابض ہو گئے۔ وہ ہزار ہا مسیحی سربراہوں کو لٹا کر اپنے گھروں کو لوٹے۔ بائبل اسلام کا اعتراف کرتے ہوئے پاپائے گے کہ کلیسا نے ان کے حریفوں کی جوت کویر کھینچی تھی اس سے وہ بالکل مختلف تھے یعنی وہ بزدل و دشمنی اور ظالم نہیں تھے بلکہ شجاع خلیق اور عادل تھے۔ جنوبی فرانس کے خوش گزران شہروں میں عشق و عاشقی کے افلاؤن کا چرچا پھیلنا جاتا تھا۔ خانہ بدوش بھاٹ اور گویسے لوگوں کو اپنے ذوق تصنیف کی گیت اور اشعار سناتے پھرتے تھے۔ ان اشعار کے مضامین تغزل و تفصیل اور رزم و جزم کی داستانوں ہی تک محدود نہ ہوتے تھے بلکہ اکثر ان میں ان دنیائے مظالم مثلاً انگلیز کے واقعہ قتل عمام کا بھی ذکر ہوتا تھا جن کے ارکتاب کی ذمہ دار پاپائی حکومت تھی۔ علیٰ ہذا القیاس اردو نظمیں میں بادریوں کی سپہ کار یوں اور بد چلنیوں کے واقعات بھی مذکور ہوتے تھے۔ مسلمانانِ اندلس سے عیسائیوں نے "شور لے" کا

لے فرانس کا وہ خوش سواد صوبہ ہے جو ۱۷۵۶ء میں مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ اسلام میں اس کا الحاق فرانس کی عداوت کے ساتھ ہوا۔ مترجم

۱۷۵۶ء - نفاذ شوری: میں سپاہیانہ جاننازی۔ جنسی لطیف یعنی طبعہ نشوان کا ہمدرد غایت، ادب و احترام۔ جان جو کھوں میں ڈالنے کا شوق اور نام آدمی کی خواہش کے دو گونا گون مفہوم شریک ہیں جو فردن کھو

اولو العزمانہ وکرمیانہ خیال مستعار لیا اور اسی کے ساتھ خود داری و آب و پروری کا وہ شریفانہ سبق بھی حاصل کیا جس نے آگے چل کر یورپ کو شرافت نفس کے دستور العمل کے وضع کرنی میں مدد دی۔

پاپائیت اگرچہ اپنے مرکز اصلی پر واپس آگئی لیکن وہ اقتصادِ خارجہ پاپائون کو ستر سال پہلے جزیرہ نماے اٹلی میں حاصل تھا زندہ ہو سکا۔ روم سے گئے ہوئے اونہین دوسلوں سے زیادہ کا زمانہ ہو چکا تھا اور اگر وہ اپنی پوری شانِ جلال و جبروت کے ساتھ بھی واپس آتے تاہم اُس عقلی ترقی کا رد عمل نہ کر سکتے جو اُن کی غیبت میں بروئے کار آچکی تھی۔ لیکن پاپائیت کی جہتِ فرمان روائی کی غرض سے نہ مٹی بلکہ انقراض و انقسام کی غرض سے اور اُس اعتزالِ عظیم کا مقابلہ کرنے کے مقصد سے جس نے چودہویں صدی میں مسیحیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ ان اندرونی فسادات کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاپائون کی تعداد ایک سے دو اور دو سے تین ہو گئی جن میں سے ہر ایک مسیح کے نائبِ حقیقی ہونے کا مدعی تھا اور اپنے رقیب کو ملعون و کذاب قرار دیتا تھا۔ اس طوفانِ بے تیزی نے یورپ کی عقیدت و ارادت کو مبدل و نفرت و بھارت کر دیا اور اُس نے مصمم عزم کر لیا کہ اس خردناک تو توہینِ بین کا جلد خاتمہ ہو جانا چاہیے یہ اعتقاد کہ خدا کا ایک نائب زمین پر موجود ہے اور وہ پاپا ہے جس سے خطا کا سرزد ہونا ممکن نہیں اس تھا کا نفعی حقیقت کے مقابلہ میں بھلا کیوں کر صحیح ہو سکتا تھا؟ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے لائقِ پادریوں نے یہ تحریک کی کہ مجلسِ عمومی قائم کی جائے جو گویا یورپ کی دینی پارلیمنٹ ہو اور پاپا کو اس مجلس کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا جائے۔ یورپ کے لطیف اچھے ہوتے اگر یہ تحریک منظور ہو جاتی یہ جنگِ جو سائنس اور مذہب میں چھتری ہوئی ہے ہرگز برپا نہ ہوتی۔ اصلاحِ کنیسہ کا بھونچال ہرگز نہ آتا۔ پراٹسٹنٹ فرقوں کی مخالفت کا علم ہرگز بلند نہ ہوتا۔ لیکن کانسٹنس اسٹیشن کی کونسلینِ اطالوی جوے کو کندہ ہے سے ملتا تاریکین اور یہ

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۹۵-۳۹۶ میں شجاعت و شرافت کا لازمہ سمجھے جانے لگے۔ مترجم

دلپذیر نتیجہ ان سے مترتب نہ ہو سکا۔

اس طور پر کیتھولک مذہب کم درجہ پر ہوتا تھا۔ اس کا کاہن بوسی بوجہ عقل و ادراک کے سینہ سے جون جون کم ہوتا گیا روح کی شگفتگی بڑھتی گئی۔ اور عقل انسانی ترقی کرتی گئی۔ مسلمانوں نے پرانے سونی کپڑوں اور روٹی سے کاغذ بنانے کا فن ایجاد کیا تھا اور اہل ویش چھاپہ کا فن چین سے جا کر سیکھ آئے تھے۔ چھاپہ اور کاغذ کی ایجاد دین لازم و ملزوم تھیں۔ اب وہ وقت آگیا کہ بلا خوف مزاحمت تمام دنیا کے انسان آپس میں تبادلہ خیالات کرنے لگیں۔

چھاپہ کی ایجاد نے کیتھولک مذہب کے سینہ میں ایک زخم جانتان لگایا۔ کاتھولک و متحاب کے بین العمرانی حق پر اس سے پہلے پاپائیت نے بلا مشارکت احد سے قبضہ کر رکھا تھا۔ پاپائی مرکز سے مختلف المدارج پادریوں کی وساطت سے احکام و فرامین جاری ہوتے تھے اور منبر سے پڑھ کر سنا دئے جاتے تھے۔ مطبوعات نے اس حق خاص اور ان غیر معمولی اقتدارات کو جو اس کا لازمہ تھے یک قلم مٹا دیا۔ زمانہ حال میں منبر کا اثر بہت ہی کم رہ گیا ہے۔ خطیب کے قائم مقام آج کل اخبار نویس ہیں۔

پھر بھی پاپائیت اپنے پرانے حق سے جدوجہد کیے بغیر دست بردار نہ ہوئی۔ نئے فن کے ان نتائج پر جو نقصانے مہرم کی طرح مل نہ سکتے تھے جب اس کی نظر پڑی تو ایک نظارۃ المطبوعات قائم کر دیا گیا جس کی تخریج کی سختی سے مکتوبات و جرائد کے روکنے کی کوشش کی گئی۔ کتاب چھاپنے کے لیے قیسی نظارت سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ اور اجازت نامہ اس وقت ملتا تھا جب پادری صاحب کتاب کو بلا استیجاب دیکھ کر اس کی نسبت اخبار پسندیدگی فرماتے تھے۔ اور اس کے صحیح العقاید ہونے کی تصدیق کرتے تھے۔ شاہد عین پاپا سے الگ ریڈر سادس نے ایک فرمان جاری کیا جس کی مد سے وہ اہل مطابع کلیسا سے خارج قرار دئے گئے جو باطل عقاید شائع کریں۔



۱۵۸۰ء میں بیٹرن کونسل نے حکم دیا کہ جس کتاب کے جس کا تحریر بھی معائنہ ناظرین کلیہ سا کرے  
 ہوں اور کوئی کتاب شائع نہ کی جائے ورنہ شائع کرنے والے کو کلیہ سے خارج کیا جائیگا اور اس کے  
 جرمانہ کی سزا بھی دی جائے گی۔ نظارت مطبوعات کے عہدہ داروں کو حکم تھا کہ اس بات کی نجات  
 احتیاط رکھیں کہ کوئی تحریر ایسی نہ چھپنے پائے جو عقاید راسخہ و صحیحہ کے خلاف ہو اس تعقید کی  
 تہ میں یہ اندیشہ منہم تھا کہ ممکن ہے کہ مذہبی مناظر چھپ جائے اور سچی بات جواب تک چھپی ہوئی تھی  
 ظاہر ہو جائے۔

لیکن جہالت کی طاقتوں کی یہ مجنونانہ جدوجہد بیکار ثابت ہوئی۔ لوگوں میں دماغی و عقلی راہ  
 و رسم مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئی۔ اس راہ و رسم نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے زمانہ حال کے  
 اخبار کی صورت اختیار کر لی جو ہر روز دنیا کے ہر حصہ کی تازہ ترین خبریں شائع کرتا ہے۔ مطالعہ  
 ایک عام شغل ہو گیا اور یہ وہ نعمت تھی جس سے قدیم الایام میں بہت کم لوگ بہرہ ور تھے زمانہ  
 حال کے تمدن کی بعض نہایت ہی نمایان خصوصیات کا راز اسی شوق کتب بینی و مطالعہ  
 اخبارات میں پوشیدہ ہے۔

غرض کاغذ کی ساخت اور چھاپہ کے استعمال نے یورپ کے تمدن میں ایک بہت بڑا  
 انقلاب پیدا کر دیا۔ علیٰ ہذا القیاس آلات جہاز رانی میں کمپاس یعنی قطب نما کا اصناف بڑے بڑے  
 مادی و اخلاقی نتائج کا باعث ہوا۔ ہندوستانی تجارت نے اہل دہلیس اور اہل حجاز کو ایک دوسرے  
 کا رقیب بنا کر امریکہ کی تحقیقات کرائی۔ آسی کا سامنے افریقہ کا چکر کاٹنا اور سیکیلیں نے زمین کے  
 گرد اگر وہ جہاز رانی کی سفر موزر الذکر پر جو انسان کا سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامہ ہے نظر  
 ڈالتے تو ہتے زمین اس امر کی طرف سے خالی الذہن نہ ہونا چاہیے کہ کچھ لوگ مذہب نے  
 قطعی طور پر باگتجائش تردید یہ عقیدہ اختیار کر لیا تھا کہ زمین چٹی ہے۔ آسمان بہشت کا صحن  
 ہے امد و دوزخ دنیا سے ساغر میں ہے۔ بعض یادریوں نے جن کے اجتہاد میں بوجہ ان کی  
 جلالت قدر کے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی شکل زمین کی رویت کے ابطال میں فلسفیانہ

اور مذہبی دلائل پیش کی تھیں چنانچہ اس کا ذکر ہم پیش کر بھی چکے ہیں۔ اب یہ بحث دفعۃً ختم ہو گئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کلیسا غلطی پر تھا۔

جن تین بڑی سیاستوں کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے ان سے ایک فقط یہی اہم نتیجہ نہیں نکلا کہ انصاف شکل میں کدس مغربی غلطی میں کلیسا مبتلا تھا۔ اُس کی اصلاح ہو گئی۔ کوملبس ڈی کاہا اور سیگیلین کی روح مغربی یورپ کے تمام اولوالعزم اور باہست اشخاص میں سرایت کر گئی۔ لوگوں کے سادہ و معاش کی غایت الغایات اب تک عقیدہ تھا کہ بادشاہ کے ساتھ وفاداری برتی جاوے اور کلیسا کی متابعت کیجائے گویا لوگوں کی زندگی کا مقصد اس وقت تک استفادہ نہ تھا بلکہ افادہ تھا۔ اُن کی محنت کا ثمرہ اپنے لیے نہ تھا بلکہ دوسروں کے لیے تھا۔ اس عقیدہ کا سیاسی اثر ترقی پذیر ہو کر حردب صلیبیہ کی شکل میں نمودار ہوا۔ ہزاروں لاکھوں آدمی اُن لڑائیوں میں ہلاک ہو گئے جن سے انھیں خاک فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا اور جن کا نتیجہ بجز حسرت و ناکامی کے اور کچھ نہ نکلا تھا۔ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ان معرکہ آرائیوں کی وجہ سے نفع اگر کسی طبقہ کو ہوا تو پاپاؤن کر دینا لوں اور روم کے دوسرے پادریوں کو یا دینس کے مالکان جہاز کو لیکن جب اس حقیقت کے چہرہ دستے پردہ اٹھا کہ ملکیہ پیر اور ہندوستان کی دولت ہر اس شخص کے حصہ میں آسکتی ہے جو ہمت اور جرات رکھتا ہو تو وہ اغراض و مقاصد جموں نے یورپ کی بے چین انوار میں بیداری کی روح چھنک رکھی تھی ہوا کے طبع کی طراوت دفعۃً بدل گئی۔ گائیٹز اور پزارو کی داستان کو ہر شخص ذوق و شوق سے سننے لگا۔ یہی جوش کی جگہ بحری مہات نے لے لی۔

اگر ہم اُس اصول کو الگ سارے کے دیکھنا چاہیں جو اس زمانہ کے حیرت انگیز تمدنی انقلاب کی تین مضمراتوں میں سے پہچاننے میں ہمیں ذرا دقت نہ ہو گی۔ اب تک ہر شخص نے اپنی خدمات اپنے دینی یا دینی آقا کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ لیکن اب سے اُس نے قصد کر لیا کہ اپنی محنت کے ثمرہ سے خود متع حاصل کرے تشخص جس سے مراد انفرادی عصبیت ہے

غلبہ ہار رہا تھا اور ایتھارٹ کر خیال محض رو جلا تھا۔ اس تہید کے بعد ہم کو آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ کلیسا پر کیا بیت رہی تھی۔

شخص کا انحصار اس اصول پر ہے کہ ہر شخص اپنا آقا آپ ہے اور اس کو آزادی حاصل ہونی چاہیئے کہ جو اسے چاہے قائم کرے اور اپنے ارادہ کو جس وقت چاہے عمل میں لائے اس اصول کے لحاظ سے اسے ہر وقت اپنے انہائے جنس کے ساتھ سرگرم مسابقت رہنا پڑتا ہے گویا اس کی زندگی قوت علی کا ذریعہ اظہار ہے۔

یورپ کے صدیوں کے جمود کو حرکت میں لایا۔ اس جسم میں جواب تک غیر متحرک تھا ایک بیک بیداری کی روح پھونکنے اور اصول شخص کو اس کی غایت الغایات بنا دینا ان اخراجات و انتہا رات کی مخالفت فوژن کو اس کے مقابلہ میں لاکھڑا کرنا تھا جواب تک اسے پامال کر رہی تھیں۔ جو دوہون اور پندرہون صدیوں میں وہ اضطراب آئینہ کشش ہوا ہر جاری رہی جو آنے والے ستر کے عظیم کا پتہ دیتی تھی۔ سولہون صدی کے شروع (۱۵۱۷ء) میں یہ محرک شروع ہو گیا۔ اصول شخص ہمہ ہر جسمی کے ایک جنگ راہب کی صورت میں نمودار ہوا اور اس نے اس سے بغاوت کے محل اداء میں شمع بھانڈا شاید ضرور تھا کہ وہ اپنی حقوق طلبی دینی شکل میں کرے۔ پہلے تو تذکرہ الغفران اور بعض چھوٹے چھوٹے معاملات پر ایک آدھ بکڑ حریفوں میں جوئی لیکن لڑائی کا اصلی سبب بہت جلد ظاہر ہو گیا۔ یعنی مارٹن لوتھر نے اپنے تئسی بالا دستوں سے جو دامن بیٹھے۔ بیٹھے تمام تئسی دنیا کے عقاید کے اجاڑ دئے گئے تھے صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے اعتبار کا پابند نہیں ہوں۔ بائبل کی تاویل و تفسیر کے متعلق مجھے بھی آزادی اسے کا وہ حق حاصل ہے جس میں کوئی شخص دستہ اندازی نہیں کر سکتا۔

اول اول رومانے مارٹن لوتھر کو ایک بائبل تافریاں ہوا اور حیکل سلو پاوری سے نواہ نہ سمجھا اور اگر یہ انکو زایشن کا تافریاں چلتا تو اس کا کام چٹکی بجائے میں تمام کر دیا گیا ہوتا لیکن جنگ

جون جون طول کہنچستی گئی یہ معلوم ہوتا چلا کہ لو تھر اکیلا نہیں ہے بلکہ اُس کی پشت پر ہزار ہا صمیم العزم اشخاص موجود ہیں جو اُس کے ظلم کے حملوں کی تائید اپنی تلوار کی ضربوں سے کر رہے ہیں۔

لو تھر کو روانے جس جس طرح سے کو سا ہے اور اُس کے اعمال کی جس جس طرح سے تنقید کی گئی ہے وہ اس درجہ ترش و تلخ ہے کہ سن کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ مثلاً مقدس نکتہ چلیون نے ارشاد فرمایا ہے کہ نہ لو تھر کا باپ اُس کی ماں کا خاوند نہیں تھا بلکہ ایک خیمہ میں تھا جو اُس کی ماں کا اشتنا تھا۔ لو تھر دس سال تک ایمان بوکفر کی دو گونہ چوگان کی گیند بنا رہا اور آخر میں بوہڑ ہو گیا۔ وہ بقائے روح کا منکر تھا۔ شراب اس کی گھنٹی میں پڑی تھی اور اسی لیے اُس نے شراب خواری کی تعریف میں نظمیں تصنیف کیں وہ کتب مقدسہ کی توہین کرتا تھا۔ خصوصاً حضرت موسیٰ کی شان میں کلمات اہانت آمیز استعمال کرنے کا عادی تھا۔ جو غلط کرتا تھا اُس کے ایک لفظ کو بھی دل میں سچ نہ سمجھتا تھا۔ سینٹ جیمس کے خط کی نسبت اُس کا یہ قول تھا کہ اُس کی دیت پر کاہ سے زیادہ نہیں۔ واقعہ اصلاح کنیہ کو اُس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کے ظہور کا باعث شارون کی کھوست ہے۔ لیکن وہ سن کیتھولک پادریوں کی زبان پر باوجود اُس کو کبھی نجاست کے جو اصلاح کی ذمہ دار قرار دی گئی ہے یہ نا تراشیدہ اور ساقیانہ فقرہ چڑھا ہوا تھا کہ اگر تمہیں نے اصلاح کا اٹھا دیا اور لو تھر اسے سینے میں بند کیا۔

رومانے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ واقعہ اصلاح بعض شوریدہ سر پادریوں کا ایک عارضی جھوٹا تھا۔ اُس نے یہ نہ دیکھا کہ یہ انقلاب اُس اندر دینی تحریک کی انتہائی شکل تھا جو دو صدیوں سے یورپ میں ہو رہی تھی اور جس کی طاقت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اُس کو یہ نہ سوچا کہ اگر انقلاب کی اور کوئی وجہ تحریک نہ بھی ہوتی تاہم لوگوں کو ذاتی غور و فکر اور ذاتی اجتہاد پر مجبور کرنے کے لیے ایک اکیلا یہ واقعہ کیا کم تھا کہ تین پاپا ایک وقت میں موجود ہوں اور تینوں کی

لے کر کو کنیہ مت۔ لو تھر نے اس کو جو گالیان دی تھیں یہ اُس کا بدلہ ہے۔ مترجم

فرمان برداری کو گن پر واجب ہو۔ کانٹنس اور ریس کی مجالس نے ثابت کر دیا کہ ایک قوت ایسی بھی موجود ہے جسے پاپاؤن کی قوت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ اس کے بعد جو دیر پا اور خونریز ہنگامے واقع ہوئے ان کا خاتمہ خدا نارس و سٹیفلیا نے کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی آشکارا ہو گئی کہ دینی و شمالی یورپ نے روم کے عقلی جبر کا جو اپنے کندھے سے اتار بھیڑا ہے اسے اصول تشخص نے میدان مار لیا ہے اور ہر شخص کا یہ حق مسلم قرار پا چکا ہے کہ وہ اپنا مجتہد آپ ہے۔

لیکن ناممکن تھا کہ اجتہاد شخصی کے اس حق کو استقرار کا نتیجہ صرف اسی قدر نکل کر رہ جائے کہ لوگ کیتھولک مذہب کے منکر ہو جائیں۔ آغاز اصلاح کے وقت جب بعض ممتاز و سربراہان وہ اشخاص مثلاً آرمس نے جن کا شمار با بنیان اصلاح میں ہے اسے تنگ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اکثر پیشوایان اصلاح کو جس سے سخت نفرت ہے اسے اپنے ساتھ لے کر آئے۔ انہوں نے کامطلب یہ تھا کہ جہالت و تعصب کی گرم بازاری جو ایسی حالت میں ضرور تھا کہ پرائسٹ مذہب بھی تفرقہ و اعتزال کی اُکان تو جن کا نتیجہ مشق نہیں جو اس کے وجود میں آنے کی ایک ذوقین تعین اس کا مظاہرہ فرماؤں میں تقسیم ہو جانا ایک لازمی بات تھی۔ ان فرقوں کو جب اپنے مہیب اطالوی حریف کی طرف سے کھٹکنا نہ ہوا تو ان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی مختلف ممالک میں جب ایک پرائسٹ فرقہ برسر اقتدار ہوا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو خون میں بامال اپنے ہاتھ رنگ ڈالے۔ لیکن جب امتداد و روزگار نے ستم رسیدوں کو ستم گاروں پر غالب کر دیا اور انہوں نے اپنی مظلومیت کی تلافی کیلئے انتقام سے کی تو فریقین نے اپنی غیر اسی میں دیکھی کہ ایک فرقہ جو حقوق اپنے لیے طلب کرتا ہے اُن ہی حقوق سے دوسروں کو بھی نا روا اٹھانے لے۔ غرض ان خونریز جنگوں اور غرضخون سے وہ اصول عظیم قائم ہوا جو مسالمت یا رواداری کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن مسالمت بھی ایک درمیانی درجہ ہے جو نہ پرائسٹ مذہب کو عقلی استحکال و انفعال کا ہونا جائز لگے

یہ درمیانی درجہ ترقی پذیر ہو کر اُس مترقبہ حالت میں تبدیل ہوتا جائے گا جو دنیا میں ہمیشہ سے فلسفہ کا نصب العین رہی ہے یعنی وہ تمدنی حالت جس میں ہر شخص کو خیال کی کامل آزادی حاصل ہو بجز ان لوگوں کے جو اصول رسالت پر خوف یا دباؤ کی وجہ سے کاربند ہوں اس اصول کے پابند وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو دوسروں کی آراء و عقاید کو وقعت کی نظر سے دیکھنے اور تسلیم کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں پس ظاہر ہے کہ اس اصول کا ناخلف فلسفہ ہی ہو سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مذہب سے تعصب کو تقویت پہنچتی ہے۔ اور فلسفہ اس کا رد عمل یا امتیصال کرتا ہے۔

اصلاح کینسہ کا علانیہ مقصد یہ تھا کہ فسطحین اور اُس کے جانشینوں نے مسیحیت اور سلطنت رومہ الکبریٰ میں موافقت مصالحت پیدا کرنے کی نیت سے بت پرستی کے جن لے اس اصول کا خد مذہب بھی ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ اُس مذہب کی تعلیم یہ ہو کہ ”کم دینکم ولی دین“

”لا اکواہ فی الدین“۔ مترجم

۱۵ لیکن ایک مذہب ایسا بھی ہے جس کے پیٹول نے تعصب سے ان تاریخی الفاظ میں بیزاری ظاہر کی ہے۔ لیس منادہا لی عصبیۃ و لیس مناقلی عصبیۃ و لیس منامات علی عصبیۃ حبشۃ، استخی یعنی ولیم۔ لسان الہند مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی یادگار ناز مبدس میں حضور سرور کائنات صلعم کے اس ایشاد پاک کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

ڈرا یا تعصب سے اُن کو یہ کہہ کر کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر

ہوا وہ ہمارے ہی جماعت سے باہر وہ سانھی ہوا نہ ہم اُس کے یا اور

ہمیں حق سے کچھ اُس محبت کو بہرہ

کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرہ

تاریخ اسلام پر اگر نظر ڈالی جائے گی تو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں نے عام طور سے اپنے ادبی برحق کے خلاف مقدس کو اپنے سیاسی و عقلی دستور العمل کا اصل الاصول قرار دئے رکھا ہے۔

مترجم

خیالات و رسوم کو مسیحیت میں داخل کر دیا تھا۔ وہ اُس سے خارج کر دے جائیں۔ پرنسٹن  
جماعت یہ چاہتی تھی کہ مذہب عیسوی میں فردن اولیٰ کی پاکیزگی اور نراہت کی نشان اور  
پیدا کر دی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم عقاید کی بجالی کے ساتھ ساتھ انھوں نے وہ  
تمام زمین ترک کر دیں جن میں بت پرستی کا شائبہ بھی پایا جاتا مثلاً مریم عذرا کی پرستش  
موتوف ہو گئی۔ اولیائے مرادین مانگنے کا طریقہ جاتا رہا۔ انجیلیں یعنی اصلاح یافتہ کلیسا کو  
بیشواہمین یقین دلاتے ہیں کہ مریم عذرا نے زواجی زندگی کے فرائض اختیار کر لیے تھے  
اور اپنے منوہ کے ساتھ رہتی تھیں چنانچہ اُن کے بطن سے کئی ایک اولادیں بھی ہوئیں  
لیکن بت پرستی کی اشاعت کے ساتھ یہ خیال کہ آپ یوسف نجار کی بیوی تھیں دونوں سے  
محو ہو گیا اور آپ ملکہ آسمان اور خدا کی مان بگائیں۔

عربوں کے ادب کی طرح جس نے مسیحی دنیا پر جنوبی فرانس اور سسلی کی راہ سے پیش  
قدمی کی تھی اُن کا سانس بھی انہیں دونوں رستوں سے یورپ میں داخل ہوا۔ پاپاؤن کو  
تو دیس نکال لال ہی چکا تھا اور وہ بجائے روم کے اونیان میں مقیم تھے۔ اس کے علاوہ  
اعتزال عظیم یعنی پاپائیت کی تفریق کا واقعہ بھی برسرِ تائید تھا لہذا اسلامی سائنس کے قدم  
شمالی اٹلی میں مضبوطی سے جم گئے فلسفہ مشائیہ نے اُس خلدت سے آراستہ ہو کر جو ان  
نے اس کے لیے تیار کیا تھا بہت سے نغیہ اور علانیہ پیرو پیدا کر لیے ایسے لوگوں کی  
تعداد کم نہ تھی جو اس فلسفہ کا خیر مقدم نہایت تپاک سے کر لے اور اس کے مسائل کو نظیر  
استحسان دیکھنے کے لیے تیار تھے۔ لیونارڈو ڈاؤنسی کا شمار اسی جامعیت میں بت۔ روم  
اصول و منوہ کا بانی ہے کہ سانس میں استدلال بجز تجربہ اور مشاہدہ کے معتبر اور مفید یقین  
نہیں ہو سکتا۔ حقایق قدرت پر سمیع و شہنشاہی صرف تجربہ ہی ڈال سکتا ہے اور قوانین قدرت  
مکی دریافت کے لیے تجربہ کا ہونا لازمی ہے۔ ڈاؤنسی نے ثابت کیا کہ ایک نقلی پرورد  
عمودی تو توان کا عمل کسی مستطیل کے خط الزاویہ کے عمل کے مشابہ ہوتا ہے جس کے انقطاع

ان قوانین کو ظاہر کرتے ہیں اس اصول کے معلوم ہونے کے بعد غیر مستقیم قوانین کے مسئلہ کا حل ہونا بہت آسان ہو گیا۔ اس مسئلہ پر ایک صدی بعد آسٹینس نے از سر نو روشنی ڈالی اور قوتِ جاذبہ کی تشریح کے متعلق اس سے کام لیا۔ ڈاونسی نے بیہیم پر قوت کے بخفا غیر مستقیم اثرات کیسے جانے کے مسئلہ کی بخوبی توضیح کی۔ رگڑ کے قوانین جن کا عمل ثبوت آگے چلکر آئسٹن نے دیا اُسی کے دریافت کیے ہوئے ہیں۔ اصولِ حقیقتِ تجربہ رفتار کی مابیت سے وہ بخوبی واقف تھا۔ سطوحِ مائل اور قوسِ ماسے مدور پر اجسام کے غزروں کی شرائط پر اس نے مفصل بحث کی ہے۔ عکس تصویر کھینچنے کا کیمیا اُسی کی ایجاد سے ہے۔ علمِ ترکیبِ اجسام حیوانات و نباتات کے متعدد مسائل کی نسبت اس نے صحیح خیالات ظاہر کیے ہیں۔ طبقات الارض کے جدید علم کے بعض مہات مسائل مثلاً آثارِ متحولات کی نوعیت اور تبراہے اعظم کے ارتفاع کی نسبت احوال اس نے بیان کیے ہیں ان کی تجربہ نے آج تصدیق کر دی ہے اس نے اس مسئلہ کی تشریح کی ہے کہ چاند کی روشنی زمین کے نور کا عکس ہے۔ یہ جامع حیثیات شخص جس کی قابلیتوں میں حیرت انگیز تنوع کی شان ظہور آتی ہے۔ فون سنگ تراشی و صناعی و انجینیری میں بھی یدِ طولی رکھتا تھا اور اپنے زمانے کے فنِ میسٹ فنِ تشریحِ ابدان اور فنِ کیمیا میں بھی اُسے دستِ گاہِ نال نہ مل سکتی تھی۔

میں وہ میکائیل انجیب لو کاہ مقابل تھا۔ اور جب ایک دفعہ ان میں مسابقت ہوئی تو توفیق کا سہرا اسی کے سر پہ۔ سنٹامیر پاؤل گریزی کی ڈامینین خانقاہ کے نعمت خانہ کی دیوار پر اس کا جو مرقع موصوم ہے "عشائے اخیر" موجود ہے۔ اس نے بہت بڑی شہرت پائی ہے اور مصوروں نے اس کی جیبیوں نقلیں اتاری ہیں۔

شمالی اٹلی میں جب ایک دفعہ سائنس کے قدم مضبوطی سے جم گئے تو بہت جلد کل جزیرہ نمایاں اس کا اثر پھیل گیا اس کے پرستش کرنے والوں کی تعداد کم ہوتے ہوئے علمی مجلسوں سے چلتا ہے جو بہ کثرت قائم ہوتی جاتی ہیں اور جلد جلد ترقی کر رہی ہیں۔



یہ مجلسین اُن اسلامی مجالس کا چہرہ تھیں جو بزمِ سابقِ غرناطہ و قرطبہ میں موجود رہ چکی تھیں۔ اسلامی تمدن نے جس رستہ پر اپنے نقشِ قدم چھوڑے تھے اُس پر گویا مسافر کی لادوگاری قائم کرنے کی غرض سے ششہ ہومین ٹولوز کی اکادمی کی بنیاد ڈالی گئی۔ جو آج کے دن تک قائم ہے لیکن یہ اکادمی جنوبی فرانس کے دل خوش کن لٹریچر ہی کا مرکز تھی اور اس کا نام اسی مناسبت سے ”دی اکادمی آف فلورنس گینز“ (چینستان آف) رکھا گیا تھا۔ علمِ طبیعیات کو ترقی دینے کی غرض سے پہلی علمی مجلس کی بنیاد پاریس میں ہیڈیٹا پورٹانے ڈالی۔ تراشوشی کا بیان ہے کہ محکم کلیسا نے اس مجلس کو بند کر دیا۔ اس کے بعد پرنس فریڈرک سیسی نے رومین ایک مجلس بنام ”لنسن“ (نہدیہ) قائم کی۔ اس مجلس کا مقصد اس کے نشان ہی سے ظاہر تھا یعنی ایک سیاہ گوش آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اپنے پنجوں سے ایک تین سرواٹے ”سربس“ کو نوج رہا ہے۔ فلارنس کی اکادمی ششہ ہومین قائم ہوئی اس کے ارکان کا اجلاس فرما کر اسے فلارنس کے محل میں ہوا کرتا تھا دس سال تک یہ مجلس قائم رہی اس کے بعد پاپائی حکومت کے ایام سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور اس علمِ کثی کے معاونین فرما کر اسے فلارنس کا بھائی کر دینال بنا دیا گیا۔ بڑے بڑے شاعر مثلاً تارسیلی اور کیٹیلی اس مجلس کے رکن تھے۔ داخلہ کی شرط یہ تھی کہ ایمان و مذہب کو ترک کر دیا جائے اور تحقیق حق کا عزم کر لیا جائے۔ ان مجالس نے حاکمانِ علم کو اُس کچھ خلوت سے جس میں وہ اپنے آپ تک رہتے چلتے آئے تھے نکال کر آپس میں ملا دیا اور ان کو تبادلہ خیالات اور اتفاقِ باہمی کا موقع دیا۔ ترقی علوم و فنون میں بہت بڑا حصہ لیا۔

### سائنس کا عقلی اثر

تاہم یہی محسوس کہ سائنس بڑے عظیم پورسپ ہے۔ مین کیون کر داخل ہوا بیچ مین بٹو جہلہ لے یوتا فی علم الاصلہ مین اس کئی سرواٹے کئے کام ہے جو جہنم کی درباری کی خدمت پر بعد سائنس کے دیوتا پلوتو کی طرف سے مقرر ہے۔ مترجم۔

معتبرہ آگئی تھی۔ اب ہم اس ذیلی بحث کو چھوڑ کر اصل عنوان یعنی سائنس کے طرز عمل اور نتائج کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

تھمن جدید پر سائنس نے دو پہلوؤں سے اثر ڈالا ہے۔ (۱) علمی و (۲) اقتصادی۔ ان عنوانات کی ذیل میں اس اثر پر آسانی بحث کی جاسکتی ہے۔

سائنس کا عقلی اثر یہ ہوا کہ روایت کا اقتدار بالکل زایل ہو گیا۔ کسی استاد کے دعوے بلا دلیل کو خواہ اُس کا نام کیسا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور کیسی ہی تعظیم کے ساتھ کیوں نہ لایا جاتا ہو اس نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ فلائسن کی علمی مجلس نے اپنے ارکان کے لیے ناظم کی جو خیر ایشیا مقرر کی تھیں اور لندن کی شاہی سوسائٹی نے جو مقولہ اپنی علمی صلاحیت کے طور پر اختیار کیا اُس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ روایت کی سائنس کے نظروں میں کہاں تک وقعت ہے۔

طبعی مباحث میں سائنس نے فوق القدرت اور خارق عادت امور کو بطور شہادت تسلیم کرنے سے ابا کیا۔ شگون یا آسمانی نشان کے ثبوت کو جس کا قدیم الایام میں یہودیوں کے ہاں رواج تھا اس نے ترک کر دیا اور ایک واقعہ کے ثبوت کو دوسرے واقعہ غیر متعلقہ کا ثبوت مان لینے سے انکار کر دیا۔ اس طور پر وہ منطق جو صد ہا سال سے رائج چلی آتی تھی باطل ہو گئی۔

طبعی تحقیقات میں سائنس کا طرز عمل یہ تھا کہ کسی مفروضہ یا قیاس کی تنقید کی غرض سے اول کسی صورت خاص کو پیش نظر رکھ کر اس قیاس کی بنا پر اندازہ قائم کیا جاتا تھا اور اُس کے بعد تجربہ یا مشاہدہ کر کے تحقیق کر لیا جاتا تھا کہ اس تجربہ یا مشاہدہ کا نتیجہ اندازہ قائم مفروضہ کے نتیجہ سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں اگر مطابقت نہ پائی جاتی تھی تو وہ قیاس رد کر دیا جاتا تھا۔ اس طرز عمل کی ایک دو مثالیں ہم یہاں درج کرتے ہیں :-

نیوٹن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے کشش زمین یعنی کشش ثقل کی مدد سے

تک ہو اور یہی وہ وقت ہو جو اُسے زمین کے گرد گھومنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس قیاس کی بنا پر جب اُس نے حساب لگایا تو عجیب برنگا کہ جرم قمر اپنے مدار پر حرکت کرنے ہوئے خط الماس سے ایک دقیقہ میں بقدر تیرہ نصف کے منحرف ہوتا ہے۔ لیکن اُس مسافت کا اندازہ لگانے سے جو اجسام سطح زمین پر گرتے، وقت ایک دقیقہ میں طے کرتے ہیں اور اس مسافت کو مربع معکوس کی نسبت سے گنا ہوا فرض کرنے سے معلوم ہوا کہ، اس قدر پر جو کشش ہوگی وہ اجسام کو پندرہ منٹ سے بھی زیادہ کھینچے گی۔ غرض اُس وقت نیوٹن نے یہی سمجھا کہ اُس کا قیاس صحیح نہیں ہے۔ لیکن اضافہ سے کچھ مدت کے بعد ایک درجہ ارضی کی چوائش زیادہ صحت کے ساتھ کی گئی۔ اس چوائش نے زمین کے اندازہ جسامت اور فاصلہ قمر کو جو کہ اُس کے نصف قطر کی بنا پر ناپا گیا تھا متغیر کر دیا۔ نیوٹن نے اب اپنا تخمینہ از سر نو شروع کیا اور جدیدہ کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں یہ تخمینہ جب قریب بہ اتمام ہوا تو یہ دیکھ کر کہ مترقبہ رہا بقوت ظاہر ہوئے۔ کہ قریب ہے وہ ایسا گہرا کہ حسابی عمل ختم کرنے کے لیے اُسے مجبوراً اپنے ایک دوست سے فزائش کرنی پڑی۔ اب وہی قیاس بدلائل قاطع ثابت ہو گیا ایک اور مثال طریقہ زیر بحث کو کافی طور پر واضح کر دے گی۔ یہ مثال اُس مسئلہ کی یاد دہانی سے متعلق ہے جو فلو جیشن (جو بحر حرارت) کے نام سے موسوم ہے۔ اسمثال نے جو اس مسئلہ کا موجد تھا یہ دعویٰ کیا کہ قابلیت اضطراب یا سوزندگی کا ایک ایسا عنصر کائنات میں موجود ہے جس میں اجسام کے ساتھ اتصال پیدا کرنے کا خاصہ پایا جاتا ہے۔ اس عنصر کا نام اُس نے فلو جیشن رکھا تھا۔ اسمثال کا قول تھا کہ وہ فتنے جسے فلزانی اکسید کہا جاتا ہے جب اس عنصر کے ساتھ ملتی ہے تو فلز یعنی دہات پیدا ہوتی ہے لیکن اگر "فلو جیشن" نکال لی جائے تو دہات اپنی اصلی خاکی صورت یعنی اکسید ہی حالت میں رہ لیا جائے گی۔ اس اصول کی مدد سے گویا فلزات اجسام مرکب یعنی مٹیان ہیں جن میں فلو جیشن ملی ہوئی ہے۔

لیکن انصار یون صدی میں کیمیاء کی تحقیقات کے آلات پر کانٹے کا اصاد کیا گیا۔  
اب کیمیاء دان آسانی سے حکم لگانے کے قابل ہو گئے کہ فلو جیٹن والا اصول صحیح ہے  
یا نہیں اس لیے کہ اگر یہ اصول صحیح ہو تو دہات بمقابلہ اپنے اکسید کے بھاری ہونی چاہیے  
کیونکہ اول الذکر میں ایک جزو یعنی فلو جیٹن ایسا موجود ہے جو ثانی الذکر میں مشاں  
کیا گیا ہے۔ لیکن جب کسی دہات کا کوئی حصہ وزن کیا جاتا ہے اور وہ اکسید بھی تولی  
جاتی ہے جو اس سے نکلتی ہے تو اکسید بھاری ثابت ہوتی ہے۔ اور یہاں اگر مسئلہ  
فلو جیٹن غلط ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس تحقیقات کو جاری رکھا جائے تو ثابت  
کیا جاسکتا ہے کہ اکسید بالکل جو اس کا ابتدائی نام تھا ہوا کے ایک جزو کے مشمول  
کی وجہ سے اور بھی زیادہ بھاری ہو جاتی ہے۔

یہ تجربہ علی العموم لیوازیئر سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ واقعہ کہ فلزات کا وزن  
تھیس سے بڑھ جاتا ہے لیوازیئر کے زمانہ سے بہت پہلے بعض یورپین کیمیاء دانوں  
کے تجربہ سے پایہ تحقیق کو پہنچ چکا تھا بلکہ اس کی حقیقت مسلمان کیمیاء دانوں کو پہلے ہی سہی  
اچھی طرح معلوم تھی۔ البتہ لیوازیئر پہلا وہ شخص تھا جس نے اس مسئلہ کی اہمیت کا صحیح صحیح  
اندازہ کیا اور اس کے ہاتھوں اس نے علم کیمیاء میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

”فلو جیٹن“ والے تئیس کا ترک کیا جانا اس حقیقت کی ایک بین مشاں ہے کہ علمی  
مفروضات و قیاسات اگر واقعات سے مطابق نہ ہوں تو وہ کس آمادگی سے رد کر دیے  
جائے۔ یہ وہ کوچہ ہے جس میں سند و روایت کا گزر نہیں۔ یہاں ہر معاملہ میں استناد  
و استنباط قدرت سے کیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ علمی استفسار کا جو جواب قدرت  
دے گی وہ تیشہ صحیح ہوگا۔

اب اگر ان فلسفیانہ اصولوں کا جن پر سائنس کی ترقی منحصر تھی ان اصولوں کے ساتھ  
مقابلہ کیا جائے جن تپسیہیت کا دار و مدار تھا تو معلوم ہوگا کہ سائنس درایت کا دامن

گرفتہ تھا تو مذہب روایت کا سائنس نے اندازہ و مشاہدہ کے توافق یا عقل اور واقعہ کے تطابق پر زور دیا تو مذہب نے اسرار و ادبام پر سائنس نے اپنے قیاسات کو جب مطابق حقایق فطرت نہ پایا تو بلا تامل رد کر دیا۔ لیکن مذہب نے کورانہ تقلید سے کام لے کر ان عقاید کی رکاب تمام لی جو ناقابل فہم اور برتر از عقل تھے دونوں کا تفرق برابر بڑھتا چلا گیا۔ ایک طرف سے حقارت ظاہر ہونے لگی تو دوسری طرف سے نفرت۔ جن لوگوں نے چشم انصاف کھلی رکھ کر ان دونوں حریفوں کی زور آزمائی کا تماشا دیکھا انہیں معترف ہونا پڑا کہ سائنس جلد جلد قسیمیّت کی پہنچ کنی کر رہا ہے۔

اس طور پر فن ریاضی تحقیقات علمی کا بہت بڑا آلہ بن گیا بلکہ یون کہنا چاہیے کہ یہ فن علمی استدلال کا آلہ بن گیا۔ ایک اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے دماغ کے عمل کو حرکت اضطراری کی شکل میں بدل دیا اس لیے کہ اسکی علامات اکثر و بیشتر فکر و غور کی قائم مقام ہو گئیں۔ حکم و تدبیر استدلال کی عادت جس نے اس کے فیض سے نشو و نما پایا دوسرے علوم و فنون میں بھی داخل ہو گئی جس کی وجہ سے دنیا میں ایک عقلی انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب یہ ممکن نہ تھا کہ معجزات و کرامات کے ثبوت سے لوگوں کی تشفی ہو سکے یا وہ منطق ذریعہ تسکین ہو سکے جس پر لازمہ وسطیٰ میں عقل انسانی بھروسہ کرتی تھی۔ ریاضی نے نہ صرف طریقہ خیال بلکہ رجحان خیال میں بھی تبدیلی پیدا کر دی۔ چنانچہ ان معنایں کا جن پر مختلف علمی مجاہدین اور انجمنین اس زمانہ میں بحث کرنے لگے اگر لازمہ وسطیٰ کے مباحث سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

لیکن ریاضی کا فائدہ قیاسات و نظریات کی تصدیق و توثیق تک ہی محدود نہ تھا۔ جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے اس کے ذریعہ سے اُن حقائق کی نسبت پیشین گوئی بھی ہونے لگی۔ جو ابھی تک نامعلوم تھیں۔ اس لحاظ سے گویا اسے قسیمیّت کی پیشین گوئیوں کا جو اب سمجھنا چاہیے۔ فن ہیئت نے اسی طرح سے سیارہ بچوں کا انکشاف کیا اور فن

مناظرہ مرایا کے مسئلہ ارتعاش نور کے صغریٰ و کبریٰ سے وہ نتیجہ برآمد ہوا جو شعاع نور کے انعطافات مخروطی کے نام سے موسوم ہے۔

ادھر تو ریاضی کی بدولت علوم طبیعی میں یہ حیرت انگیز ترقی ہو رہی تھی۔ ادھر خود یہ فن مدارج ارتعاش کے کر رہا تھا۔ ہم ذیل میں اجمالی طور پر اس ارتقاء کی کیفیت قلم بند کرتے ہیں۔

فن الجبر کے ابتدائی جبرائیم اسکندریہ کے مہندس ڈیوفنٹس کی تصانیف میں نظر آتے ہیں۔ اس کا زمانہ دوسری صدی عیسوی بیان کیا جاتا ہے سابق میں اقلیدس نے دارالعلم اسکندریہ ہی میں علم ہندسہ کی عظیم الشان حقیقتیں منطقیانہ ترتیب کے ساتھ جمع کی تھیں۔ ساراکیزونین ارشمیدس نے علم ہندسہ کے اعلیٰ مسائل کو استقصا کے عمل کے ذریعہ سے حل کرنے کی کوشش کی تھی علمی رجحان کی یہ کیفیت تھی کہ اگر علوم و فنون کی سرپرستی جاری رہتی تو الجبر کبھی کا ایجاد ہو گیا ہوتا۔

سادہ فن الجبر کی معلومات کے لیے ہم عربوں کے رہن منت ہیں۔ ریاضی کی اس شاخ کا نام تک اُسہن کا رکھا ہوا ہے۔ دارالعلم اسکندریہ سے اس فن کے جو بچہ کچھ اجزا ان تک پہنچے تھے ان میں انہوں نے اُس معلومات کا اضافہ کیا جو ہندوستان سے حاصل کی گئی تھی اور شیخ و ترتیب کے بعد اس اصلاح یافتہ مجموعہ کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے مدون کیا۔ عربوں سے یہ فن تیرہویں صدی کے شروع میں اٹلی پہنچا۔ لیکن اس پر اس قدر کم توجہ کی گئی کہ تین سو سال تک یورپ میں کوئی کتاب اس فن پر نہ لکھی گئی۔ ۱۴۹۶ء میں پشیولی نے پہلی مرتبہ ایک کتاب بنام ”فن الجبر“ شائع کی۔ ۱۵۵۰ء میں کارڈن ساکن میلان نے مسادات کعبہ یعنی تیسرے درجے کی مساوات کے حل کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ ۱۵۵۰ء میں سیپونیرو اور اُس کے بعد ڈیٹلیا اور ویٹا نے مزید مفید اضافے کیے۔ اب علماء جرمنی نے اس فن پر اپنی ذمہ

مقبول کرنی شروع کی تھی وہ زمانہ تھا جب کہ علامات لڑیسی ناقص حالت میں تھی۔

۱۸۳۳ء میں ڈیوڈ کی تصنیف فن ہندسہ پر شائع ہوئی یہ کتاب جس میں اصول الجبر کا اطلاق خطوط مقوس کی تعریف و تحقیق پر کیا گیا ہے ریاضیات کی تاریخ میں ہنرلہ ایک نئے دور کی تہیہ کے ہے۔ اس سے دو سال قبل کوئلییری کا رسالہ مقادیر لایہ تجزیہ

پر شائع ہو چکا تھا اس طریقے کو تارسیلی اور بعض دوسرے ریاضی والوں نے ترقی دی۔ اب حساب مقادیر لامتناہی اور نیوٹن کے طریقہ فضلی اور لائبنٹس کے طریقہ حساب جزئیات و طریقہ حساب تمام کی ترقی کے لیے رستہ کھل گیا۔ اگرچہ اصول علم الفضل کے نکات کا سہارا نیوٹن کے پاس کئی سال سے جمع تھا لیکن اس نے اس موضوع پر شتہ تک کوئی تصنیف

شائع نہ کی۔ جن ناقص علامات کا استعمال نیوٹن کرتا تھا اس کی وجہ سے طریقہ فضلی کا عمل مونرو کا رگڑ ہوتا تھا۔ اس افتاء میں فن الجبر کو یورپ میں بہت ترقی ہوئی۔ برنولی کے تجربے اس کے بعض اعلیٰ مسائل کو نہایت خوبصورتی سے حل کر دیا جبکہ نتیجہ یہ ہوا کہ لائبنٹس کا طریقہ حساب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا جس میں بہت سے ریاضی والوں نے بہت کچھ اضافے

اور اصلاحیں کیں۔ یہ رشتہ ترقی غیر معمولی سرعت کے ساتھ اتحاد یورپین صدی میں برابر جاری رہی۔ شکل ذو عددین پر جس کا الکشاف نیوٹن سابق میں کر چکا تھا ٹیلر نے شائد میں اپنے مشہور طریقہ اضافات کا اضافہ کیا جو آج تک اس کے نام سے موسوم ہے۔ تو لرنے کے بعد اس میں حساب اختلافات جزیئہ کا طریقہ رائج کیا۔ ڈیلمبرٹ نے اس طریقہ کو اور زیادہ وسعت دی۔ اس کے بعد یوکر اور لگرنج نے طریقہ تعیرات کی بنا ڈالی اور

۱۸۳۷ء میں لگرنج نے طریقہ اعمال استخراجی ایجاد کیا۔

لیکن اٹلی، جرمنی، انگلستان اور فرانس ہی تک ریاضیات کی یہ عظیم الشان تحریک محدود نہ تھی۔ ریاضی کے سر پر جو عقلی تاج رکھا ہوا ہے اس میں اسکا ٹیمپٹ نے لوکارفم کی ایجاد سے ایک نیا ہیرو بڑ دیا۔ اس عظیم الشان ایجاد کے لحاظ سے

علمی دنیا نیپیر آف کریٹیشن کی منون احسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لیے مثل ایجاد کی علمی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے سے فہم قاصر ہے۔ طبیعیین و ہیت دان زمانہ موجودہ گریٹیم کلج کے استاد ریاضی پر و فیسر برگس کے اس قول پر سچے دل سے صا کر نیگے کہ آج تک اس درجہ دل پسند اور حیرت افزا کتاب میرے دیکھنے میں نہیں آئی یا کسی پر جس کا نام علمی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا کہتا ہے اور بجا کہتا ہے کہ ”علم کی جس شاخ نیپیر نے اپنی قابلیتوں کو صرف کیا اس کے لحاظ سے وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شخص ہے“ نیپیر کا انتقال ۱۶۱۷ء میں ہوا۔ اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ لو کارٹم کی ایجاد نے علم و ہیت کی محنت گھٹا کر ان کی عمر دگنی کر دی ہے۔

فلسفہ گنجائش مانع ہے کہ فن ریاضی کی ترقیات ہر زیادہ مبسوط و محف کیجائے۔ اس کے علاوہ ہم ریاضی کی تاریخ نہیں کہہ رہے ہیں۔ بلکہ اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ سائنس نے انسانی تمدن کی ترقی میں کیا حصہ دیا۔ اس مقام پر بے اختیار یہ سوال پھر تازہ ہوتا ہے کہ اس کی کیا معنی ہیں کہ کلیسا نے اپنے بارہ سو برس کے خود مختار و عہد حکومت میں ایک بھی ہندسہ نہیں پیدا کیا؟

ریاضی بسیط یا ریاضی مطلق کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تفصیل میں ان آلات کی ضرورت نہیں پڑتی جو اکثر لوگوں کو میسر نہ آسکیں۔ ہیت کے لیے رصد گاہ اور کیسے کے لیے محل کا ہونا ضرور ہے لیکن ریاضی دان کو صرف طبیعت کے انکاؤ اور چند کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس فن کا اکتساب نہ صرف کثیر کا متقاضی ہے نہ کمزور و دکار و خادم کی اعانت کا محتاج۔ ایسی حالت میں خیال ہوتا ہے کہ برہانیت کی خلوت گزین زندگی کے لیے بھی اس سے زیادہ دل پسند اور اس سے بڑھ کر روح کو بالیدگی بخشنے والا مشغلہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

اس استفسار کے جواب میں کیا ہم بھی خدا نخواستہ جناب پادری یو سی بیس صاحب



کے ہر مصنف ہو کر یہ کہیں کہ "یہ محنت لامحالہ حاصل چونکہ ہماری نظروں میں نہایت ہی ذلیل ہے اس لیے ہم اس کو قابل توجہ نہیں سمجھتے بلکہ اعلیٰ تر حقائق کے اکتساب کو زیادہ مفید خیال کرتے ہیں" اعلیٰ تر حقائق کی بھی ایک ہی کہی۔ یہ تو ارشاد ہو کہ وہ کونسی حقیقت ہے جو حق مطلق پر فضیلت رکھتی ہے؟ کیا جھوٹی روایتیں بے بنیاد کرامتیں اور باطل افتراء بر دانیان ہی وہ حقیقتیں ہیں جنہیں حقائق علیہ کے مقابلہ میں انضلیت کا ادعا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انہیں نے اتنی دلت تک سائنس کے رستہ میں رکاوٹیں ڈالے رکھیں۔

اس علمی حکم کی پہلی ہی جھپیٹ میں حکام کلیسا کو معلوم ہو گیا تھا جو اصول سائنس شائع کر رہا ہے وہ مروجہ مذہب کے عقاید سے مطلق لگا نہیں کھاتے۔ اسی لیے انہوں نے سائنس کی مخالفت میں ناخون تک کا زور لگایا اور جائز و ناجائز بھی طرح کی کوششیں سر کی تحزیب کے لیے کیں۔ علوم علی سے جن کا دار و مدار تجربہ اور مشاہدہ پر تھا۔ پادریوں کو اس قدر سخت عداوت تھی کہ جب فلاسف کی اکاڈمی بند ہوئی تو ان کے گھر میں لگی کے چراغ جلے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم نے بہت بڑا میدان مار لیا۔ اور یہ معاذ اللہ جذبات کچھ رومن کیجھو مذہب ہی کے سینہ میں جوش زن نہ تھے۔ پراٹسٹنٹ مذہب کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ چنانچہ جب لندن کی رائل سوسائٹی سر شاہی مجلس کی بنا ڈالی گئی تو پادریوں کی طرف سے اس پر ایسی سخت لے دے ہوئی کہ اگر شاہ چارلس ثانی اس کی علانیہ حمایت نہ کرتا تو اس کا اسی وقت خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ پادریوں نے اس سوسائٹی پر یہ الزام لگایا تھا کہ یہ جاہلی ہے کہ مذہب مروجہ کو مٹا دے۔ یونیورسٹیوں کو نقصان پہنچا دے اور علوم قدیمہ کا ستیاناس کر دے۔

اس علمی مجلس کی رودادوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انسان کی ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اس کا انعقاد ۱۶۶۲ء میں ہوا اور اُس وقت سے لیکر اب تک جو جو علمی تحریکات و کشفیات ہوئی ہیں۔ ان سب میں اس کی مستندی و تحریک

غالب رہی ہے اس نے نیوٹن کی تصنیف ”پرنسپیا“ اپنے اہتمام سے شائع کی۔ ہسپلی کا بحری سفر جو پہلی وہ مہم تھی جس کا اہتمام کسی حکومت کی طرف سے سرکاری طور پر ہوا ہوا اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا اس نے تشریب خون کے متعلق متعدد تجربے کیے اور آروسی کی تحقیقات دوران خون کو تسلیم کر لیا۔ چھبک کے مرض میں مریض کو ٹیکا لگانے کی ترغیب اسی نے دلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادی کیرولائن نے بادشاہ سے چھ ایسے مجرموں کی جان بخشی بغرض تجربہ کرائی جن کی نسبت سزائے موت کی تجویز ہو چکی تھی اور اس کے بعد شہزادی نے خود اپنے بچوں کے ٹیکا لگوا۔ اسی کی تائید سے بریڈلی نے اپنے عظیم الشان اکتشافات یعنی اختلافات منظر ذرات کو مکمل کیا اور استنزاف محور ارض کے دریافت کی۔ اور یہ وہ دو اکتشافات ہیں جن پر ڈالمر کے قول کے مطابق ہیئت جدیدہ کی تدقیق و حکیم منحصر ہے۔ اسی کی کوششوں سے مقیاس الحرارة میں جو میزان مدارج حرارت ہے اور تیرسین کی جیسی گھڑی میں جو میزان وقت ہے اصلاح ہوئی۔ اسی کی مساعی سے ۱۷۵۲ء میں تقویم گریگوری و سی باد جو شدید مذہبی مخالفت کے انگلستان میں رائج ہوئی۔ عوام و جہلا کا یہ خیال تھا کہ راک سوسائٹی نے اُن کی عمر کے گیارہ دن گھٹا دے دیں اسی لیے وہ ایسے برا فروخت ہوئے کہ سوسائٹی کے بعض ”فیلوز“ (اعضا) کو ان کے ہاتھوں جان کو لالے پڑ گئے اور ایک طیش آلودہ انبوه کے غضب سے انہوں نے بھاگ کر بمشکل اپنا بچھا چھڑا با پادری ویکسلی نے جو جیوئیٹ فرقہ کا ایک عالم تھا انقلاب تقویم کے مسئلہ میں بہت دلچسپی ظاہر کی تھی لہذا سوسائٹی کو مجبوراً اس کا نام مخفی رکھنا پڑا بریڈلی کا انتقال اتفاق سے اسی بل چل میں ہو گیا لہذا جہلا نے نہایت شدد کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ یہ مرگ مفاعبت خدا کا تہمت تھا جو اپنے گناہ کی پاداش میں نازل ہوا۔

اگر ہم اس عالی شان مجلس کی خدمات کا سوز و غم پر اعتراف کرنا چاہیں تو اس کے کارناموں کی تفصیل کے لئے کئی اوراق مطلوب ہوں گے۔ ڈائینڈ کی دور میں بے رنگ

راستوں کا باخبرہ انقسام جسکی ایجاد اول اول مشاہدات فلکی کی تصحیح و تحکیم کا باعث ہوئی۔  
 تیس اور دوسریں کی مساعی سے سطح زمین کے ایک درجہ کی پیمائش۔ سیارہ زہرہ کے مرور  
 کے ارتقا و کے لیے کپتان لگ کی سیاحت۔ زمین کے گرد اُس کا بحری سفر۔ اُس کا یہ ثبوت  
 کہ مرض احتراق خون کی بنا جس سے طویل بحری سفروں میں مسافر بچ نہیں سکتا میوہ اور ترکاری  
 کے استعمال سے دفع ہو سکتی ہے۔ قطب شمالی و قطب جنوبی کی مہات۔ مسکینڈن کے تجربوں  
 کے ذریعہ سے جو مقام شہالین علی میں لائے گئے اور نیز کیونڈش کے تجربوں کی وساطت  
 سے تحائف ارض کی شیعین۔ ہرشل کا اکتشاف سیارہ۔ یورینس۔ کیونڈش اور واٹ کی تحلیل  
 اجزائے آب لندن اور پیرس کے طول البلد کے فرق کی تعیین۔ بطاریہ کھرباسکی کی ایجاد۔  
 ہر اخلہ کی پیمائش فلکی۔ نیگ کا اصول مقدار شت کو ترقی دینا اور مسئلہ ارتعاش نور کو قوی  
 دلائل سے ثابت کرنا۔ جیلخانہ اور دوسری عمارت میں ہوا رسانی کا انتظام۔ شہر کی روشنی  
 کا انتظام بربیدہ غار۔ رقص نالازیہ کے طول کی تحقیق۔ اختلاف عرض البلد کے لحاظ سے  
 کشش ثقل کے اختلافات کا اندازہ۔ نفوس ارضی کی تحقیق کامل۔ راس کی مہم قطبی۔ ڈیوی  
 کی ایجاد فانوس سلامتی اور تحلیل حرضیات و ارضیات اور سٹڈ اور فیرڈے کے کھربائی  
 و مقناطیسی اکتشافات۔ بیچ کا باخبرہ تخمین۔ ہمبولٹ کی تحریک پر متعہ و مقناطیسی رصد  
 کے قیام کی تدابیر۔ سطح زمین پر ایک ہی وقت میں مختلف مقناطیسی اختلافات کے  
 حادث ہونے کی تحقیق و تصدیق بغرض کہان تک بیان کیا جاوے۔ "مائل سوسائٹی" کی علمی  
 کارناموں کی مکمل فہرست بھی ثبوت طوالت یہاں صحت کرنے سے ہم قاصر ہیں اس کے  
 قالب میں بھی وہی روح کار فرما تھی جو فلازنس کی علمی مجلس کی زندگی کا باعث ہوئی تھی  
 اور اسی لیے اس کا نشان امتیازی یہ فقرہ تھا۔ "تقلید جلد سے پرہیز"۔ اس نے ادب  
 و روایات کو اپنی حدود سے خارج کر دیا اور صرف محاسبہ مشاہدہ اور تجربہ کو جائز رکھا۔  
 یہ ہرگز نہ خیال کرتا جاسیے کہ ان غیر معمولی کوششوں اور نمایاں کامیابیوں کے لحاظ

سے رائل سوسائٹی یکہ دہن تھی۔ یورپ کے تمام دارالسلطنتوں میں مساوی الامتياز اور مساوی الفوز دارالعلم مجالس اور انجمنیں قائم تھیں جو معلومات انسانی اور تمدن جدید کے ارتقا میں برابر حصہ لے رہی تھیں۔

## سائنس کا اقتصادی اثر

علمی نظر سے اگر صحیفہ فطرت کی ورق گردانی کی جائے تو نہ صرف انسان کے عقلی تصورات کی رسائی معرفت اور حقیقت شناسی کے مقامات عالیہ تک ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی طبیعی و مادی حالت کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ انسان کے دل میں ہمیشہ یہ خواہش پیدا ہوتی رہتی ہے کہ واقعات معقہ کے اقتصادی استعمال کی کوئی ایسی شکل نکالے جس سے وہ اس کے معاش کی اغراض کی تکمیل کر سکیں۔

اصول علمی کی تحقیقات کے بعد بہت جلد ایجادات علمی کا ظہور ہوتا ہے۔ علم و عمل کا یہ باہمی تعلق ہمارے زمانہ کی خصوصیت مختصہ ہے۔ اس نے دنیا کے تمدن میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

زمانہ سابق میں جنگ استر قافا ہوا کرتی تھی۔ فاتح غلاموں کے کھپ کے کھپ اپنے ساتھ لے آتا تھا اور ان سے جبراً محنت لیتا تھا اس لیے کہ انسانی محنت میں انسانی محنت ہی کے ذریعہ سے تخفیف ہونی ممکن تھی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ قدرت کی طبیعی اور جبرئیلی قوتوں سے کام لینے میں بدرجہا زیادہ فائدہ ہے تو اقوام کی حکمت علمی میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جب اس حقیقت کا علم ہوا کہ کسی نئے علمی اصول کا استعمال یا کسی نئی کل کی ایجاد ایک جدید غلام کے حصول کی بہ نسبت زیادہ نفع رسان ہے تو صلح کو جنگ پر ترجیح حاصل ہو گئی۔ ان جدید اکتشافات کا اثر یہاں تک ہوا کہ اہل امریکا و روس کی طرح ان قوموں نے جن کی آبادی کا بڑا حصہ غلاموں سے مرکب تھا یہ دیکھ کر ہمدردی

انسانی اور اغراض شخصی اب ایک دوسرے کی مغائر نہیں ہیں۔ اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا۔

عرض ہم ایک ایسے زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس کی ایک نمایان خصوصیت یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی نمٹ کا تعلیم مقام کلون کو بنایا جائے۔ اس زمانہ کی جراثیمی ایجادات نے تمدن اور معاشرت میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ہم اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے قدرتی طاقتوں سے مدد مانگتے ہیں۔ فوق القدرت طاقتوں سے چاہہ ہوئی نہیں کرتے۔ کیتھولک مذہب اسی جدید تمدن سے جو اس طور پر پیدا ہوا ہے۔ اب اکرتا ہے۔ پاپائیت بہ مانگ دہل اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ اسکو موجودہ حالت سے ہرگز کوئی سروکار نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس امر کی متقاضی ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کو دور جاہلیت کی طرف رجعت فقہری کی جائے۔

یہ حقیقت انسان کو حضرت مسیح سے چھ سو برس پیشتر معلوم تھی کہ اگر گہرے ایک کھدے کو گرا دیا جائے تو اس میں جذبہ دفع کی قوت پیدا ہو جائے گی۔ ظہور مسیح سے سولہ سو سال بعد تک یہ حقیقت محض بچوں کا کھیل بنی رہی اور اس سے کسی نے فائدہ نہ اٹھایا۔ لیکن جب اس پر علمی طریقہ سے بحث کی گئی اور مہندسانہ مناظرہ اور تجربہ کی کوئی پراسر اس کے نتائج کو علمی طور پر کام میں لایا گیا تو اسی اوتیسی حقیقت کی بدولت انسان اس قابل ہو گیا کہ خشکی اور تری کے علیل ہونے کے باوجود ہزار میل کے فاصلہ پر بیٹھا ہوا ایک دوسرے سے طرفہ العین میں بات چیت کر سکے۔ اس حقیقت نے دنیا کی قوموں کو ایک دیکر پر لا کر جمع کر دیا ہے۔ فرمانِ رواے وقت کو بال لحاظ زمان و مکان اجراءے احکام و فرامین پر قدرت عطا کرنے سے اس نے تدبیر میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور سیاسی قوت کے سابقہ تکمیل کو تکلیف سے بدل دیا ہے۔

عباب فاذا اسکندریہ میں ایک کل غنی جسے بیردریاضی دان نے حضرت مسیح سے

کوئی ایک سو سال قبل ایجاد کیا تھا۔ یہ کل دخانی قوت سے چلتی تھی اور اس کی شکل ایسی ہی تھی جیسی آج کل باخترۃ استرجامیہ یعنی رد عمل کرنے والے انجن کی ہوتی ہے۔ یہ انجن جو دنیا کی ایک نہایت عظیم الشان ایجاد کا ہیولی تھا سترہ سو سال تک محض ایک اجمو یہ سمجھا جاتا رہا۔

زمانہ حال کے دخانی انجن کی ایجاد کو بخت و اتفاق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ اسے غور فکر اور تجربہ کا عقلی ماحصل سمجھا جا رہے سترہویں صدی کے وسط میں بعض مہندسوں نے جو علم الحركات و المخیل کے ماہر تھے دخانی قوت سے فائدہ اٹھانے کی کوششیں شروع کیں۔ ان کوششوں کو واٹ نے اٹھارہویں کے وسط میں مکمل کر دیا۔

دخانی انجن بہت جلد تھان کا مزدور بن گیا۔ اس نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ان اشخاص کو جن کی عمر بڑھ گیا دھوئے دھوئے کٹ جاتی زیادہ مفید مشغولوں کا موقع دیا۔ جو لوگ پہلے حال تھے اب حکیم بننے کے قابل ہو گئے۔

اقل اول اس سے بندیہ نل پانی کھینچنے اور اسی قسم کا دوسرا کام لیا گیا جس میں محض طاقت صرف ہوتی تھی لیکن زیادہ مدت نہ گزرے پانی بھی کہ سوت کا تنے اور کپڑا بننے کی لطیف صنعت میں حصہ لیکر اُسے ثابت کر دیا کہ اس میں با ایک اور نازک کام کرنے کی قابلیت بھی موجود ہے۔ اس نے صنعت چریت کے عظیم الشان کارخانے قائم کر دیے اور دنیا کا بڑا بڑا اسی کے طفیل چلتے لگا۔ عرض اقوام عالم کے صنعت و حرفت کی اس نے صورت ہی بدل دی۔

پہلے دریادوں اور اُسکے بعد مسندروں میں جب دخانی انجن سے جہاز اتنی کے متعلق کام لیا گیا تو اُس نے کشتیوں اور جہازوں کی سرعت رفتار کو گنا چگنا بچگنا کر دیا۔ امریکہ سے انگلستان پہنچنے میں پہلے چالیس دن صرف ہوئے تھے اب آٹھ ہی دن میں یہ سفر طے ہونے لگا۔ لیکن خشکی کے سفر میں دخانی انجن کی طاقت حیرت انگیز طور پر ظاہر ہوئی جو فاصلہ انسان پہلے ایک دن میں بھی طے نہ کر سکتا تھا۔ اب ایک گھنٹے سے

بھی کم میں طے ہونے لگا۔

دخانہ ایجن سے نہ صرف انسانی مستعدی و کارگزاری کے میدان کو وسیع کر دیا ہے بلکہ فاصلہ کے اعتبارات کو گھٹا دینے سے انسانی زندگی کی قابلیتوں کو بڑھا دیا ہے۔ کافائنات کے تیار شدہ مال اور زراعتی پیداوار کے سرچلے میرل و نقل سے اس نے انسانی صنعت و حرفت کی تحریک میں ایک بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

گھڑی کی ایجاد نے دخانی جہاز رانی کے فن کو درجہ کمال پر پہنچانے میں ایک بڑی حد تک تحریک کی اس لیے کہ اس ایجاد کی بدولت نہایت صحت کے ساتھ یہ معلوم ہونے لگ گیا کہ سمندر میں جہاز کس وقت کس موقع پر ہے۔ عجائب خانہ اسکندریہ میں سائنس کی ترقی اس وجہ سے ایک بڑی حد تک رکی ہوئی تھی کہ کوئی ایسا آلہ نہ تھا جس سے وقت یا حرارت کا اندازہ کیا جاسکے یعنی اُس زمانہ میں گھڑی موجود تھی نہ مقیاس الحرارت کا وجود تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایجادیں لازم و ملزوم ہیں اس میں شک نہیں کہ عجائب خانہ اسکندریہ میں آبی گھڑیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن اُن کی ساعت ثنائی صحیح اور قابل اعتماد نہ تھی۔ ان میں سے ایک گھڑی کو جو منطقۃ البروج کی علامات سے مزین تھی قرون اولیٰ کے بعض جابلو عیسائیوں نے ضائع کر دیا۔ اور ایک مقدس عالم آئینت پالیکارپ نے اس کی نسبت نہایت نہایت معنی خیز لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ "ان تمام خبیث دیوؤں کی شکل میں ایک ایسے سفلی علم کی صورت نظر آتی ہے جو دشمن ایمان ہے" کہیں مشعلہ میں جا کر گھڑی درجہ صحت کو پہنچی۔ ہو کر نئے جوئیوں کا سامنا تھا اس میں دو لابل تبدیل اور چکر دار کمائی دو پرزے بنائے۔ اس کے اور مختلف پرزے مثلاً لنگر۔ کلاہ۔ مٹنی اور منتشر یکے بعد دیگرے اٹھانے کیے گئے ورجات حرارت کے تغیرات کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی اور اس کے لیے مزید تریسات کی گئیں یہاں تک کہ تیسریں اور آٹھونے گھڑی کو وقت کا ایک نہایت ہی صحیح چارہ بنا دیا۔ گھڑی کی ایجاد پر گاڈ فری کا مزدور ان کا سی مینی سدس دائرہ کی شکل کا دوا آہ مستند ہوا جسکی وجہ سے چلتے جہاز

میں مشاہدات فکلی کا ارتقا ممکن ہو گیا۔

فن جہاز رانی میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں ان سے انقسام اقوام پر ایک قوی اثر پڑ رہا ہے۔ مستعمرات یعنی نوآبادیان بڑھ رہی ہیں اور انکی نوعیت تغیر پذیر ہو رہی ہے۔

لیکن ان بڑے بڑے اکتشافات و ایجادات ہی نے جو تحقیقات علمی کا حاصل ہیں انسان کی حالت کو انہیں بدلا ہویت سی جھوٹی جھوٹی ایجادات نے جو بجائے خود چندان قابل لحاظ انہیں مجموعی حیثیت سے تمدن پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جو دو ہین صدی میں سائنس نے قوت ایجاد کو ایک حیرت انگیز محرک پہنچائی اور اس قوت نے ان پر آپ کہ ان علمی نتائج کے استخراج پر وقت کو بوجھ سود مند کی پہلو لیے ہوئے تھے۔ قانون نے موجدوں کو اپنی ایجاد سے معقول نفع حاصل کرنے کا استحقاق بذریعہ سند ایجاد عطا کیا جس سے لوگوں کو نئی نئی ایجاد دین کرنے کی انگ پید ہوئی۔ اس قسم کی ایجادات کا ذکر ہم اس مقام پر پہلے تذکرہ سرسری طور پر کریں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان سے تمدن کس قدر متاثر ہوا ہے۔ آدھ کشی کی کل کے جاری ہونے سے مکانات کے فرش چوبی ہو گئے اور سیٹ چو نے پتھر کے فرش خواب و خیال ہو گئے بشیغہ سازی کے کارخانوں کے قائم ہونے سے آئینہ دار کھڑکیوں کا مکانات میں اضافہ ہو گیا اور کمرے گرم رہنے لگے لیکن آئینہ بندی کا فن سولہویں صدی سے پہلے کمال کو نہ پہنچا۔ سولہویں صدی میں خفیہ سمیرے سے ترشا جانے لگا۔ دو دکشوں کے امناؤں سے مکانات کی ہوا صاف ہو گئی پہلے وہ دشتیوں کے جھونپڑوں کی طرح دھوئیں سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے اندر کی دیواریں کالک سے لسی ہوئی ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں دو دکشوں کی وجہ سے مطلقاً بارہ کے مکانات میں وہ سامان راحت مہیا ہو گیا۔ جسے آتش دان سے تعبیر کرتے ہیں اب تک آگ پہنے اور مکان کو گرم رکھنے کا ذریعہ صرف یہ تھا کہ دھواں نکلنے کے لیے چھت میں ایک سداغ کھرا کر دیا جاتا تھا لہذا جلانے کے فرش کے بیچوں بیچ ایک گڑا کھودا جاتا تھا اور جب بھی



گل کرنے کی سرکاری گھنٹی بجتی تھی یا رات ہو جاتی تھی تو ایک سرپوش سے اس گرہے کو ڈھک دیا جاتا تھا۔

اگرچہ پادریوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی لیکن لوگوں کے ان خیالات کی کسی طرح روک تھام نہ ہو سکی کہ دباؤن کو خدا کا قہر نہ سمجھنا چاہیے جو بندوں پر ان کی بد اعمالیوں کی پاداش میں نازل ہوتا ہے بلکہ غلاط اور تہاہ حالی کا مادی نتیجہ تصور کرنا چاہیے اور ان سے بچنے کا مناسب طریقہ یہ ہیں جسے کہ پیروں اور اولیاءوں سے دعائیں مانگی جائیں۔ بلکہ یہ ہے کہ شہروں میں صفائی کا انتظام کیا جائے اور ہر شخص خود بھی جسمانی صفائی کا خیال رکھے۔ بارہویں صدی میں پیرس کی گلیاں مارے غلاط اور عفونت کے سڑا اس بنی ہوئی تھیں حکومت نے مجبور ہو کر سڑکین صاف کرائیں اور ان پر کنکر کٹوا سے۔ گندگی کا دور ہونا تھا کہ بچپن اور بانی بخار فوڑا جاتا رہا۔ اس طور پر تدریج شہر کی صفائی کی قریب قریب وہی حالت ہو گئی جہاں کے اسلامی شہروں میں نظراتی تھی یہاں سڑکیں صدیوں سے پختہ آتی تھیں۔ غرض پیرس میں جسکا حسن اب روز بروز بڑھتا چلا سوروں کے رکھنے کی ممانعت کر دی گئی لیکن اس حکم پر سینٹ انتونی کے وزیر کے راہب بہت بگڑے اور متقاضی ہوئے کہ اس خانقاہ کے سوروں کو بے روک ٹوک ہر جگہ پھرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ کلیسا کے عتاب کی تاب کوئی نصرانی حکومت اس زمانہ میں نہ لاسکتی تھی۔ اس لیے مجبوراً فرانسیسی حکومت کو اپنے حکم میں کتر جوت کرنی پڑی اور معاملہ اس طرح رفع دفع ہوا کہ اس خانقاہ کے سوروں کے گھلے میں گندیاں لٹکا دی جائیں۔ شاہ لوئی الملعب، فریب کا بیٹا شاہ فلپ ایک دن گھوڑے پر سوار ہوا تھا کہ ایک سورتی سامنے آگئی گھوڑے نے ٹکڑ کر کھائی اور بادشاہ کو لیسکر گرا۔ جس کا گرتے ہی دم نکل گیا۔ بالاخانوں اور کھڑکیوں میں سے دھوون باہر پھیلنے کی لوگوں کو عام نادم تھی جس کی وجہ سے آئندہ روئند لٹ پٹ ہو جاتا کرتے تھے حکومت کی طرف سے اس کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ ششہ اع میں پاپائی حکومت کے انتہاء کر

وقت جب صنعت کتاب ہذا کو روم کی سیر کا اتفاق ہوا تو گلیوں میں گھومنے کے ڈھیروں گندے پانی کے ڈبروں کی یہ کیفیت تھی کہ کپڑوں کو نجاست کی آلودگی سے بچانے کے لیے ضرور تھا کہ گزرنے والے کی آنکھیں کبھی کبھی آسمان کی طرف اٹھ جانے کے بجائے زمین کی سطح و مستقل در بانی کیا کریں۔ سترہویں صدی کے شروع میں برلن کی گلیوں کی یہ حالت تھی کہ ان کو کبھی صاف نہیں کیا جاتا تھا۔ اس شہر کا قانون یہ تھا کہ جو دیہاتی سودا سلف خریدنے کی غرض سے اپنا چمکڑا لیکر بازار میں آئے وہ واپسی کے وقت چمکڑے میں کوڑا کرکٹ بھر لے جایا کرتے۔ سڑکوں کی کثافت کے بعد نالیوں اور بدرووں کی تیاری کی کوشش کی گئی لیکن اول اول یہ کوشش ناقص اور ادھوری رہی۔ جو لوگ سوچ سمجھ کر کتے تھے ان کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوا کہ شہر بن اور نیز ان مکانوں میں جو الگ تھلک واقع ہیں جب تک نالیوں اور بدروں کا انتظام نہ کیا جائے گا صحت و تندرستی کے لیے اس کے بعد عام گزرگاہوں کی روشنی کا انتظام ہوا۔ جن لوگوں کے گھر ب راہ واقع تھے اول تو ان پر اس قاعدے کی باندھی لازم کی گئی کہ موم بتیان یا چراغ اپنی کمرلیوں میں روشن رکھیں تاکہ ان کی روشنی سڑک پر بھی پڑتی ہے اس کے بعد قریبہ دغراٹھ کے اسلامی طریقہ کو پیش نظر رکھ کر سرکاری طور پر روشنی کا انتظام کیا گیا لیکن یہ انتظام اٹھارہویں صدی سے پہلے جبکہ گاس کی روشنی ایجاد کی گئی تکمیل کو نہ پہنچا۔ سرکاری لائٹوں کے نصب کیے جانے کے ساتھ ساتھ رات کے پہرے اور پولیس کا انتظام بھی کیا گیا۔

سولہویں صدی کے آغاز پر کلون کی ایجاد اور دست کاریوں کی اصلاح نے لندن اور معاشرہ پر نمایاں اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ دیواروں پر صورت دیکھنے کے آئینے آویزان نظر آنے لگے۔ عاتقوں پر وقت دیکھنے کی گھڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ آتش دانوں پر کائین بن گئیں۔ اگرچہ اکثر مقامات کے باورچی خانوں میں گھاس بھونس اور کلڑی ابھی تک ایندھن کا کام دیتی تھی لیکن کوئلہ کا استعمال عام ہو چلا کھانا کھانے

کے کمردن میں نیز ہوا ان نعمت کے لئے غوان لئے ہوئے نظر آنے لگے۔ تجارت کا ہاتھ ملاک  
 غیر کی نعمتیں اس پر چٹے لگا۔ شمالی ممالک کی بد مزہ اور غیر مصفا شرابوں کی جگہ جنوب کی لطیف اور پھل  
 خربہ لئے لی۔ برت خالصے تعمیر ہو گئے۔ ہوا کی چکیدن میں آنے کی چھتے سے روئی زیادہ سفید اور  
 زیادہ نفیس تیار ہوئے گی۔ مکی۔ آتو۔ قیل مرغ کا گوشت اور تمباکو وہ نعمتیں تھیں جو پہلے بوجہ نادر اور کم باب  
 ہونے کے خاص خاص لوگوں کو میسر آتی تھیں۔ اب ان کا ذائقہ کام و زبان کے لئے عام ہو گیا۔ پہلے لوگ  
 ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے۔ کاسنے نے چوہلی میں ایک باد ہوا اس گھناؤنے طریقہ کی اصلاح کر دی۔  
 غرض مہذب و شائستہ قوموں کے دسترخوان کی صورت بھی بدل گئی۔ چار پین سے قبوہ عرب سے اور  
 شکر مند وستان سے آنے لگی جن کا استعمال ایک بڑی مذمت مسکرات و منشیات کا قائم مقام  
 ہو گیا۔ پرانی کے فرش کی جگہ دیون اور تالینوں لئے لی۔ خواہنگا ہون میں صاف ستھرے پلانک  
 اور ابلے پچھو لئے موجود ہو گئے۔ توشہ خاڑن میں صاف اور نفیس پوشاک کے متعدد جوڑے  
 مہیا ہو گئے۔ بہت سے شہزادوں میں یکائے اس خیمہ آب کے جہان سے ہر شخص بقدر اپنی ضرورت کے  
 پانی بھر کر لے جاتا تھا یا پانی کے اس نل کے جھگی میں نصب ہوتا تھا گھر گھر پانی کا نل جاری ہو گیا۔ دھچتین  
 جو زمانہ سابق میل اور کلوئس سے غلیظ ہو جاتی تھیں اب میل بولے اور نقش و نگار سے مزین ہو گئیں۔  
 حمام کا استعمال عام ہو چلا۔ جسم کی بد بو کا رد عمل کرنے کے لئے عطریات کے استعمال کی ضرورت کم گئی  
 حدیقہ آرائی و دین بندی کے دل پر یہ طاق کو روز بروز ترقی ہوتی چلی اور ممالک غیر سے بہت سے نئے نئے  
 ہتھوڑوں کے پودے لاکر گشتوں میں لگائے گئے مثلاً گل شبو۔ کرن پھول۔ گل اکیل۔ گل زرگس۔  
 گل شقیق نغانی۔ گل صبر برگ۔ سواری کی ستم سے اول پالکیاں اور تام جہام رائج ہوئے اس کے بعد  
 بند کانیان استعمال ہونے لگیں اور آخر میں کرایہ کی گاڑیاں رائج ہو گئیں۔

مکون کا گھر گھر چاہا ہو چلا۔ گنوار و جہانوں تک بھی ان کی رسائی ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ ہل جوتے۔  
 سچ بولنے گھاس کاٹنے۔ فصل کی لاؤنی کرانے اور دوائیں جلاسنے کے آلات مکمل ہوئے گئے۔

باد جو دان پادہوں کے مواعظ و فصاح کے جو سبیک کا ٹھیکرا لئے ہوئے یورپ کے ہر شہر میں

دوبد پھرنے سے لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہو چکا کہ فلاکت ام الجرائم اور حجاب العلم ہے۔ اور تجارت کے ذریعہ سے دولت کماتا بمقابلہ اس جاہ و مکت کے جو ذریعہ جنگ حاصل ہو براتب افضل ہے۔ مانیسیکو کا قول ہے کہ تجارت قوموں کو قومی ہے مگر افراد کو لڑائی اور بنس اخلاقی کا یو پار کرتی ہے۔ یہ قول اگرچہ سچ ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تجارت ہی کی بدولت دنیا میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ تجارت کا نصب العین یہی ہے کہ عالم میں امن و صلح کا علم پھراتا ہوا نظر آئے۔

جب سے سائنس اپنا فیض رسان اثر دنیا پر ڈالنے لگا ہے اور قوت ایجاد و صنعت و فنت کا ہاتھ بٹانے لگی ہے انسان کے تمدن اور معاشرت کی حالت میں غیر معمولی اصلاح اور ترقی ہو گئی ہے۔ ان اصلاحات و ترقیات کی تفصیل کے لئے بجائے کئی ضخیم جلدوں کے ان چند اوراق پر اکتفا کرنا اگرچہ مضمون کو تشتمل چھوڑتا ہے اور قلت گنجائش میں مزید ایضاح کی اجازت بھی نہیں دیتی لیکن بعض امور پھر بھی ایسے ہیں جنہیں غموشی کے ساتھ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بار ملونا کی بندرگاہ غلافائے اندلس کی عظیم الشان بحری تجارت کا مرکز تھی۔ یہاں سے سینکڑوں جہاز قیمتی مال تجارت سے لدے ہوئے اطراف و اکناف عالم میں جاتے تھے۔ مسلمانوں نے یہودی تاجروں کی اعانت سے فن تجارت میں بہت سے جدید اصول اختیار کیا یا ایجاد کئے تھے اور یہ اصول علم کے نظری مسائل کے ساتھ ان کی فیض رسانی کی بدولت یورپ کی تجارتی جماعتوں تک پہنچ گئے تھے۔ اس طو پر حساب نویسی کا طریقہ و نو انداجیں یہ حساب مروج رائج ہو گیا جس میں آمدنی اور خرچ کا روزانہ حساب و وجدگانہ خانوں میں بالمقابل لکھا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا تہیہ ہر ایک کی مختلف قسمیں بھی رائج ہو گئیں اگرچہ پادری کو کڑا آتے اور بڑبڑاتے ہی رہے۔ یہیہ آتشزدگی و بیمہ بحری کی مخالفت پادریوں کی طرف سے نہایت سختی کے ساتھ اس بنا پر ہوئی کہ یہ ایک فتنہ ہے جو گویا قضا و قدر کا امتحان لیتا ہے۔ زندگی کے بیمہ کے عدم جواز کے متعلق یہ فتویٰ صادر ہوا کہ اس فعل سے گویا خدا تعالیٰ کی مشیت کے نتائج میں دخل دہی مقصود ہے۔ سود یا کفالت پر روپیہ قرض دینے کی جو کوشیاں یعنی بینک اور بند ملک کے ساتھ کاری قائم تھے۔ ان کی سخت

مخالفت کی گئی۔ خصوصاً زیادتی شرح سود کو رہا خواری کے ذیل نام کی آئین قابل نفرت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور یہ وہ خیال ہے ابھی تک بعض نا ترقی یافتہ جماعتوں میں پایا جاتا ہے۔ موجودہ شکل کی ہندیاں جن میں وہی اصطلاحات مستعمل تھیں جو آج کل زیر استعمال میں رائج ہیں انسر تصدیق قبائل جات کا عہد و قائم ہو گیا اور ہندوؤں کے سکارے سے پہلو تہی کرنے والے یہ گرفت ہوئے گی۔ غرض بلا سائل کہا جاسکتا ہے کہ تجارت کی کل آج جن پرزدوں کے زور سے چل رہی ہے وہ اُس زمانہ میں تمام و کمال رائج ہو چکے تھے۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اور یہ کی دریافت نے یورپ میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اٹلی کے بہت سے دولت مند تاجر اور باہمت یہودی ائینڈ انگلستان اور فرانس میں جا کر آباد ہو گئے اور ان مالک میں ان کی وجہ سے تجارت مختلف تجارتی گروہوں میں گھٹنے پائوں نے طے سے زیادہ سود کھانے والوں کو مردود و ملعون قرار دیا تھا۔ یہودی زمینیں ان مومن کی کچھ پروانہ تھی بھاری سود پر پریدہ قرض دے دے کر خوب مالدار ہو گئے تھے۔ پاپائی پائس ثانی نے یہ دیکھ کر کہ اس سے مسیحائیوں ہی کا نقصان ہے کٹھن لغت واپس لے لیا۔ بالآخر قیود ہم کی اجازت سے بندھک کے سامہو کاری قائم ہو گئی اور پاپائی طرف سے اس مضمون کا ایک تبدیلی آمیز فرمان جاری ہوا کہ جو شخص ان کو ٹھیکوں کے جواز کے خلاف قلم اٹھائے گا وہ کلیسا سے خارج کر دیا جائے گا۔ پرائسٹوں نے محض مند کی وجہ سے ان مہاجنی کارخانوں کی مخالفت شروع کی۔ بھلا کیونکر ممکن تھا کہ جس جیسے کو رو ما جائز بنائے اُس پر پرائسٹ ناجائز سمجھیں۔ جب اس دینی عقیدے کو کہ زلزلہ کی طرح دیا بھی خدا کا قہر ہے جو انسان پر اُس کے اعمال سے کی پاداش میں نازل ہوتا ہے لوگ شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے تو دبا کے و فیہ کی کوشش قسطنطین کے قیام سے عمل میں لائی جانے لگی نتیجہ یقینی انسانی جھک کے ٹیکے کا طریقہ مسلمانوں کا دریافت کیا ہوا تھا۔ مسئلہ مین ٹیڈی میری و درملی بائیکاٹ جب قسطنطین سے اُس طریقہ کو اپنے مہراں لائین تو پادریوں نے اس کی ترویج کی جسے خستہ مخالفت کی کہ اگر انگلستان کا شاہی خاندان ایضاً شامل سے اس کے استعمال

کی ترغیب دلاتا تو اس کا رواج پذیر ہونا محال تھا۔ علیٰ ہذا القیاس جب اس طریقہ میں اصلاح کر کے  
 کھینچ البتہ یعنی گائے کی چپک کے ٹیکے کا طریقہ رائج کیا گیا تو اس وقت بھی پادریوں نے مخالفت  
 کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا حالانکہ ایک صدی پیشتر خال خال ہی کوئی چہرہ ایسا نظر آتا تھا جو چپک  
 کے دواخون سے مسخ نہ ہو گیا ہو اور آج کل ایسا چہرہ شاذ و نادر دکھائی دیتا ہے جس پر چپک کے داغ  
 ہوں۔ اسی طرح جب امریکہ میں ادویہ بے ہوشی کی اسہم دیا نفع ہوئی ادویہ ادویہ زچگی کی حالتوں  
 میں استعمال کی جانے لگیں لیکن تو پادریوں نے حسب معمول اس استعمال کی مخالفت کی نہ اس لئے  
 کہ از روئے اصول علم الابدان یہ استعمال قابل گرفت تھا بلکہ اس بنا پر کہ کتاب پیدائش کے  
 تیسرے باب کی سولہویں آیت نے جو لعنت کا طوق عورت ذات کے گلے میں ڈال دیا ہے  
 وہ اس عملہ کو شش سے اتراجاتا ہے۔

ایجاد ابداع نے غترحات مفید رہی تک اپنے آپ کو محدود نہیں کیا بلکہ سامان تفسیر  
 طبعی بھی ہم پہچانا شروع کر دیا۔ اٹلی میں سائنس نے قدم رکھا ہی تھا کہ عجوبہ پسند لوگوں کے مکافون  
 میں طرح طرح کے متحرک و میل نواز جنہیں جادو کا کھیل کہا جاتا تھا نظر آنے لگے۔ ان میں جادو  
 کی لائین کا سب سے بڑا حصہ ہوتا تھا۔ پادریوں کو اگر حکمت علمی اور تجزیہ آئندہ فلسفہ سے نفرت تھی  
 تو وہ بلاوجہ نہ تھی اس فلسفہ سے ایک نہایت اسہم نتیجہ پیدا ہوا یعنی بھان متی کا تاثر کرنے والے  
 اُن بزرگوں اور ان کی مسابقت کا کامیابی کے ساتھ دم سہرنے لگے جو صاحب اعجاز و کرامت سمجھے  
 جاتے تھے۔ وہ جعلی خوارق عادت اور جھوٹی کرامتیں جو گر جادو ان میں پیش کی جاتی تھیں بازار میں  
 حاشا کرنے والے پادریوں کے کرتبوں کے سامنے پھینکی پڑ گئیں۔ جو بات مقدس پیشوایان کلیسا  
 سے نہ ہو سکتی تھی وہ ہمارے لئے کر کے دکھا دی۔ یعنی وہ سحر میں سے آگ کے شعلے نکالنے لگا۔  
 دھبے انگاروں پر ننگے پاؤں چلنے لگا دانتوں میں سرخ جلتے ہوئے لوہے کی سلاح پکڑنے لگا۔  
 سحر میں سے کوڑیوں انڈے نکالنے لگا اور کٹ پتلیوں کے ذریعہ سے معجزے دکھانے لگا۔  
 بائیں ہاتھ معجزات کا قدیم خیال بڑی شکل سے ٹٹھنے میں آیا۔ ایک گھوڑے پر جسے اُس کو مانا جاتا

بہت سے عجیب عجیب کرتب سکھار کئے تھے۔ سولہ عین بمقام لڑ بن مقدمہ چلایا گیا اور اس جرم کی علت میں کہ اس پر بھوت سوار ہے پچار سے بے زبان جانور کو آگ میں جلا دیا گیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک سینکڑوں عورتیں اس الزام میں زندہ جلائی جاتی رہیں کہ وہ چڑھلیں ہیں۔

اکثات اور ایجاد کا سلسلہ جب ایک دفعہ قائم ہو چکا تو اس کی ترقی نہایت سرعت کے ساتھ علی التسلل ہونے لگی۔ دو وزن کا ایک دوسرے پر برابر عمل اور دو عمل ہوتا رہا اور ان کی وجہ سے خرق عادت کی جڑ کھوکھلی ہوتی گئی۔ توں قزح کی تشریح ڈی ڈائمنس نے شروع اور نیوٹن نے ختم کی۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ توں قزح منظر قہر خدا نہیں ہے جس سے وہ اپنے بندوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے بلکہ پانی کے قطروں میں نور کی شاعون۔ کے عمل کا کرشمہ ہے۔ ڈی ڈائمنس کو صدر استغ کے عہدے اور گرد نیال کے منصب کی امید پر ہکا بھٹا کر دیا گیا۔ جب وہ یہاں پہنچا تو اسے ایک عالیشان محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد اس الزام کی بنا پر کہ وہ روماء انگلستان میں اتحاد و مرافات کا محرک ہے وہ سینٹ انجیلو میں قید کر دیا گیا جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا تابوت ایک خمیسی عدالت کے سامنے لایا گیا اور زندہ و اتحاد کے جرم کی علت میں محمدانہ کتابوں کی ایک ڈھیر کے ساتھ آگ کے ایک بہت بڑے الاد میں جھونک دیا گیا۔

فریٹکن نے اس بات کا طوط دے کر کہ یہ بھی اور برقی قوت و اصل ایک ہین جرمیٹر کو اس کے موافق سے محروم کر دیا۔ ادہام ہاملہ کے کرشموں کی جگہ حقایق کے عجائبات نے لی لی۔ دو دین عکس انگن اور عد بین بے رنگ نے جو اٹھارہویں صدی کی ایجادات ہیں انسان کو اس قبل بنادیا کہ وہ کائنات کی غیر محدود عظمت و شان کے چہرے سے پردہ اٹھا سکے۔ اور مکان لا متناہی و زمان بے پایان کا اس حد تک جو انسان کے لئے ممکن ہے اندازہ کر سکے۔ کچھ مدت بعد خرد بین بے رنگ نے عالم غبار کی بے انتہا دقیق موجودات کو انسان کے پیش نظر کر دیا۔ غبار وہ اسے ہادوں سے بھی اوپر لے گیا اور آگ و غریب کے ذریعہ سے وہ سمندر کی

تینک پہنچ گیا۔ مقیاس الحارث اور مقیاس الہوائے اُسے مدارج حرارت کی تعیین اور ہوا کے  
 دباؤ کے اندازہ کی قابلیت عطا کی۔ کانٹے کے رواج سے فن کیمیا کی دقیقہ بینی بڑھ گئی اور یہ ثابت  
 ہو گیا کہ مادہ غیر ممکن النفا ہے۔ اکیسجن ہائڈروجن اور بہت سی دوسری غاذون کی دریافت اکیسجن  
 کلکس اور دوسری فلزات کے تجرؤ سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ خاک و باد و آب عناصر نہیں ہیں  
 اُس علمی غریبت و مستعدی سے کام لے کر جس کی تعریف کے لئے ہمارے پاس کافی الفاظ  
 موجود نہیں ہیں واقعہ روزمرہ سے فائدہ اٹھایا گیا اور مختلف حصص ارض میں علمی مہات بھیج کر زمین  
 اور سورج کا درمیانی فاصلہ دریافت کیا گیا۔ مسئلہ سے لے کر مسئلہ تک یورپ نے جو عقل  
 ترقی کی اُس کا اندازہ پستی کے مدار تارے سے ہوتا ہے۔ سال اول الذکر میں جب یہ تارہ نمودار  
 ہوا تو اُسے خدا کے تہر و غضب کی اسمانی علامت سے تعبیر کیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ اس کا ظہور خاک  
 و باد و گوناگون بلاؤں کا پیش خیمہ ہے۔ پانچ سو سال کے حکم سے یورپ بھر کے گرجاؤں میں  
 گھٹنے پائے گئے تاکہ اُن کی ٹن ٹن سے تارہ دم و بارک بھاگ جائے۔ وین و اور و فرس و تیدہ  
 نصرانیوں کو ایسا ہوا کہ وہ اندازہ نماز پر ایک جدید نماز کا اضافہ کریں۔ اس قسم کی نمازیں اور دعائیں پہلے  
 بھی کسوف و خسوف اور خشک سالی و بارش کے موقع پر کارگر ثابت ہوئی تھیں چنانچہ اس  
 موقع پر بھی جب تارہ غائب ہو گیا تو یہ اعلان کیا گیا کہ عالیجناب تقدس باب حضرت پاپائی انکم کو  
 خدا۔ نے و مدار تارے پر فتح عطا فرمائی ہے۔ لیکن اس اثنا میں پستی کو کپکپا کر اکیسجن کے اکتشافات کی  
 مدد سے یہ معلوم ہوا کہ اس و مدار تارے کی حرکات پر بھی دینا کے عجز و الحاح اور منت و زاری کو  
 قابو نہیں ہے بلکہ مقدرات نے ایک ایسی شکل مدار کا چمکراس کے بلاؤں میں ڈال رکھا ہے۔  
 وہ جانتا تھا کہ مقتضیات قدرت سے وہ اس بے باکانہ پیشین گوئی کو اپنی آنکھوں پر اسوتا نہ دیکھ سکا  
 لہذا اُس نے آئندہ نسل کے حیئت دانوں کو نصرت کی کہ مسئلہ زمین اس کی واپسی کا انتظار  
 کریں۔ اس پیش گوئی کا حیت حرفت پورا ہوا اور اسی سال میں تارہ مکرر نمودار ہوا۔

اگر کوئی شخص بیجا طرفہ ادبی سے پاک ہو کر اس مسئلہ پر غور کرے گا کہ زمین کچھ لوک نصرانیہ



اپنی طولِ طویل مدتِ حکومت میں یورپ کی عقلی اور مادی ترقی میں کس قدر حصہ لیا۔ اور اس کے مقابلہ میں سامتس نے اپنے مختصر عہد میں کیا کر دکھایا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ بجز اس کے اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچے گا کہ اس تقابل میں شانِ تغنا و نظر آ رہی ہے۔ حالانکہ واقعات و حقائق کی جو فہرست ہم نے گذشتہ اوراق کے ذریعہ سے پیش کی ہے وہ نہایت ہی غیر مکمل اور ناقص ہے۔ ہم نے فنونِ نوشت و خواندگی کی ترویج کی بدولت مدارس عامہ کے ذریعہ سے تعلیم کی اشاعت اور کتب بینِ جماعت کے روز افزون اضافہ۔ اخباروں اور فقیدی رسالوں کے ذریعہ سے عام رائے کی تولید و اخبار نویسی کی بڑھتی طاقت ڈاکخانہ اور سستے محصول ڈاک کے ذریعہ سے خانگی اور عام خبروں کی اشاعت اور اخباری اشتہاروں کے شخصی اور عمرانی فوائد کا ذکر تک نہیں کیا۔ ہم نے یہ نہیں بتایا کہ پیرس کے ہسپتال کے بعد جو پہلا شفا خانہ تھا عام شفا خانے قائم ہو گئے۔ قید خانوں میں اصلاح کی گئی۔ مجرموں کے لئے دارالاصلاح اور غیر متعلقہ لوگوں کے لئے علاج خانے کھولے گئے۔ بہترین تعمیر کی گئیں۔ حفظانِ صحت کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ مردم شماری کا انتظام کیا گیا۔ ہم نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ انطباعِ حروفِ مسبوکہ یعنی سب سے پہلے حروف کو جاکر چھاپنے کی ایجاد کیونکر ہوئی۔ طور آئن سے کپڑا سفید کرنے کی ترکیب کب معلوم ہوئی۔ روئی سے جنولے جدا کرنے کی کل اور پارچہ بانی کے پتلی گھردن کی وہ حیرت انگیز ایجادات جنہوں نے کپڑے کا نرخ بے حد سستا کر کے انسان کی جسمانی صفائی و آسائش اور صحت پر اضافہ کر دیا ہے۔ کس طرح عمل میں آئیں۔ ہم نے طب و جراحی کی عظیم الشان ترقیات علمِ ابدان کی جدید معلومات۔ فنونِ لطیفہ کی تحریک۔ فلاحت اور اقتصادیات دیہی کی ترقی۔ کیمیاوی کھادوں اور ذراعتی کھون کے رواج۔ لوہے کی ساخت اور اس کو وسیع کارخانوں اور نیز انواع و اقسام کے ریشمی ادنیٰ اور سوئی پٹروں کے کارخانوں کے قیام۔ عجائبِ فائنات متعلقہ علمِ حیوانات و نباتات قدیمہ میں نوازد و عجائبات کی فراہمی پر ایک سطر تک نہیں لکھی۔ ہم نے اس اہم مضمون کو بالکل ہی قلم انداز کر دیا ہے کہ کلین کیونکر خود بخود تیار

ہوسنے لیکن اور غیر اوپر چڑھانے اور زندہ پھیرنے کے اُن آلات متحرک اور نیز دوسرے آلات کا مطلق حال نہیں لکھا جن کے ذریعہ سے انجنون کی تیار سی مہند سائنس کے ساتھ عمل میں آئے۔ ہم نے کافی طور پر نیل سے بحث کی ہے نہ تار برقی سے نہ علم حساب سے نہ تپھر کے چھاپہ سے نہ ہوا کشی کے نل سے نہ برقی بطری سے نہ سیارہ یوٹریس یا چنچون کے اکتشاف سے۔

نہ سوسے بھی اوپر چنچون کی تحقیقات سے۔ نہ شہابہ مٹوالیہ اور مدار تارون کے باہمی تعلقات سے۔ ہم اُن علمی مہمت کی توضیح کے حق سے عہدہ برا نہیں ہو سکے جو مختلف حکومتوں کی طرف سے براہ خشکی و تری ہیئت و جغرافیہ کے مختلف اہم مسائل کے حل کرنے کے لئے واجباً بھیجی گئیں اور نہ اُن پیش ہا و کامل ایوارڈ بھرون کی مشرق کیفیت ہی ہم نے قلبہ کی جو ان حکومتوں کے ایسا سے طبیات کے اصولی نکات کی تفہیم کے لئے عمل میں لائے گئے۔ ہم نے انیسویں صدی تک کی بعض عظیم الشان علمی فتوحات کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ علم الموجودات کے متعلق اس صدی کے محققین کے مہم با الشان تقصیرات۔ مقناطیسی اور کھر پائی حقایق کی دریافت فن فوڈوگرافی (عکاسی) کی دلکش ایجاد۔ فلکیات کے متعلق تجزیہ ایوان نور معکوس کا استعمال فن کیمیا کو ایوڈوڈو بائل و میریٹ اور چارلس کے قوانین تلمذ کے تابع کرنے کی کوشش۔

غیر ذوی الامضاء مادہ سے مصنوعی طور پر اجسام ذوی الامضاء کی تولید جس کے فلسفیانہ نتائج کی اہمیت میں کلام نہیں۔ علم ترکیب حیوانات و نباتات کی بنا فن کیمیا پر رکھنے سے اس علم کا استنباب۔ جغرافیائی سیالشی اور سطح زمین کی ہیئت کذائی کے صمیم نقشہ جات کی ترتیب۔ لوبی التقویہ بند و قون اور آسن پوشش جہازون کی تیاری۔ فن حرب کے انقلابات و عولن کے حق میں اُس آپہ خیر و برکت یعنی سینے کی کل کی ایجاد۔ صنائع و بدائع کی کرشمہ ریزی۔ دنیا کے مہم گیر میلون کی رونق اور صنعت و دستکاری کی نمائشون کا انعقاد۔ یہ وہ امور ہیں جن پر ہم نے حکم تک نہیں اُٹھایا۔

ایکادات و اکتشافات علیہ کی جو فہرست ہم نے اوپر درج کی ہے اگرچہ وہ باوی وانظر

میں طویل نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس طوالت پر بھی نہایت ہی عاجز و مجمل بلکہ ناقص و غیر مکمل ہے۔ اس فہرست کو پیش نظر رکھنے سے ہماری نگاہ سرسری طور سے اُس عقلی بلِ میل پر جا پڑتی ہے جس کی شور و شل میں روز افزون ہٹاؤ ہو رہا ہے۔ گویا ایک فانوس نیالی ہے جس کے مثالی نقشِ نظر کے سامنے گزرتے جاتے ہیں۔ اس علمی و ادبی سرگرمی کا مقابلہ جب ازمنہ وسطیٰ کو سکون و جمود سے کیا جاتا ہے تو زمین آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے۔

اس ان تھک سرگرمی کے چاروں طرف جو عقلی نور پھیلا ہوا ہے اُس نے بنی نوعِ انسان پر بے شمار برکتیں اور رحمتیں نازل کی ہیں روس میں اس کی وجہ سے کاشتکار بلجہ کے وہ لاکھوں نفوس آزاد ہو گئے جو مالکانِ اراضی کے پشتینی غلام تھے۔ امریکہ میں اس کی بدولت چالیس لاکھ حبشی غلام آزاد ہو گئے۔ بجائے اُس غبی تلخی خیرات کے جو خالقِ یار کے پھانگ پر چند بد نصیبِ فلاکت زدہ لوگوں کو مل جایا کرتی تھی اس نے خیراتِ خاصے محتاجِ خالص اور بیتِ العیون ایک وسیع میدان پر قائم کر دئے اور محتاجین و غرباء کے لئے قانون بنا دیا۔ اس نے طب کو سید سے رستہ پر لگا دیا یعنی مرض کے ازالہ سے ہر جا بہتر اُس کا دغیر ہے۔ فنِ تدبیرِ ملکیت میں اُس نے صحیح علمی اصول قائم کر دئے اور بجائے اُس قانون کے جس میں عطایانہ بے تربیتی کی شان نظر آتی تھی ایسے قوانین وضع کیے جن میں یہ اصول مضمر تھا کہ قانونی چارہ جوئی سے پہلے تمدنی واقعات پر تنقوس کے ساتھ تحقیق کی نظر ڈالی جائے۔ انسان کے ارتقاء عقلی میں جو حصہ اس نے لیا ہے وہ اس درجہ نمایان اور نکٹھا سوز ہے کہ ایشیا کی دیرینہ سال القوام بھی اس اہمیتِ عقلی سے مستفیض ہونے کی آرزو مند ہیں۔ زمین یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ مغرب کا جو اصل مشرق ہو گا جو اس کا روعِ عمل مغرب پر ہو نا لازمی ہے۔ رومان میں جب مختلف دیار و اعداد کے دیوتا ایک جگہ لا کر جمع کئے گئے تھے تو ان کے باہمی مقابلہ کی وجہ سے بت پرستی سست گئی تھی۔ اسی طرح آج وسائلِ نقل و حرکت کی آسانیوں نے متضاد و معارض مذاہب کو ایک و محمل میں لا آتا۔ اسہے اور مسلمان بدہ برہمن ایک دوسرے کے مواجہ میں صفِ آرا

نظر آئے ہیں پس ضرور ہے کہ ان مختلف مذاہب میں ترقیات اور تبدیلیاں ہو جائیں۔ اس پہلی  
نظام کے اثر سے مامون و معنون صرف سائنس ہی رہے گا اس کے ذریعہ سے کائنات اور  
آفرینندہ کا کون و مکان کا جو تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہوا ہے وہ زیادہ تر عظمت و جبروت اور  
زیادہ تر ہیبت و رعب کی شان لئے ہوئے ہے۔

جس اصول نے اس تحریک کو زندہ کیا ہے اور جو ان علمی اکتشافات و ایجادات کی روح  
وروان ہے وہ تشخص کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اصول بعض دنوں میں آرزوئے دولت  
بن کر ظاہر ہوتا ہے اور بعض دنوں میں جن کی طینت شرافت سے عمر کی گئی ہے تنہائے عزت  
کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پس مقام تعجب نہیں ہے کہ یہ اصول سیاسی قوت بن کر اٹھا رہوین  
صدی میں دو موقوفوں پر ان عظیم الشان تمدنی زلزلوں کا محرک ہو جو تاج مین انقلاب امریکہ و  
انقلاب فرانس کے نام سے مشہور ہیں۔ انقلاب اول الذکر کا نتیجہ ہوا کہ ایک پورا ابراہیم  
وقت تشخص ہو گیا اور کوئی دن جاتا ہے کہ وہاں بہ اتباع اصول جمہوریت دس کروڑ انسان  
ہر اس قید سے آزاد ہو کر جو محض فلاح امن عامہ ہو کامل حریت کی زندگی بسر کرتے ہوئے نظر آئیں گے  
انقلاب ثانی الذکر نے اگرچہ یورپ بھر کی سیاسی بساط الٹ دی ہے اور اگرچہ حیرت انگیز جنگی فتنوں  
اس کے ہمرکاب ہی ہیں پھر بھی اپنے مقاصد کو کامل و مکمل نہیں کیا۔ بلکہ فرانس پر اس کی وجہ  
سے وہ رہ کر تباہی اور بربادی آئی ہے۔ فرانس کی دو عملی حکومت نے جو دنیوی و دینی دونوں  
کی اطاعت و ارادات کو ابھو اس کے گندہ پر رکھے ہوئے ہے اسے اگر موجودہ ترقیات کا  
ایک پہلو سے حلیف بنایا ہے تو دوسرے پہلو سے حریف کر دکھایا ہے۔ ایک ہاتھ سے  
اس نے عقل کے سر پر تاج رکھا دوسرے ہاتھ سے اس نے سنبھال لینے ہوئے پاپا کوئے  
سر سے سنبھالا۔ اس تناقض کا خاتمہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی  
تمام اولاد وطن بیان تک کہ ادنیٰ گزار کو بھی سچی تعلیم نہ دے۔

انقلاب فرانس نے موجودہ آراء پر جو عقلی حملہ کیا اس میں سائنس کی طاقت صرف نہیں

کی گئی تھی بلکہ ادب کی۔ اس میں انتقاد و مبادات کی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن سائنس پر ابادی  
 انہم کی تعریف کبھی صادق نہیں آئی۔ اُس نے ہمیشہ مافغان پہلو اختیار کیا ہے اور حریف کو بروک  
 ٹوک حملہ کرنے کا بکمال فراخ حوصلگی موقع دیا ہے۔ کچھ بھی ادب کا حملہ اس قدر خطرناک نہیں  
 ہے جس قدر سائنس کا۔ اس لئے کہ انشا پرہیزی ایک عقلمانی شے ہے اور سائنس عالمگیر  
 و ہمہ گیر ہے۔

اب اگر ہم یہ سوال کریں کہ سائنس کی ذات سے تمدن جدید کو کیا فائدہ پہنچا ہے اور  
 اُس نے بنی نوع انسان کی راحت و آسائش اور فلاح و بہبود میں کس قدر حصہ لیا ہے تو اس کا  
 جواب ہمیں اُسی طرح ملے گا جس طرح اس سوال کا جواب ملتا تھا کہ لاطینی نصرانیت نے انسان  
 اور اُس کے موجودہ تمدن کو کیا نفع پہنچایا ہے جن نظریں نے اوراقِ گد شمع پر نظرِ آسمان ڈالی  
 ہے وہ اس نتیجہ پر لا کالہ پہنچے ہوں گے کہ ضرور ہے کہ ہمارے انبا نے جنس کی حالت میں  
 اصلاح واقع ہوئی ہو لیکن جب ہم اس نتیجہ کو شمار و اعداد کے معیار سے جاسچنے میں تو اس میں  
 شانِ تعین و تحکیم پیدا ہو جاتی ہے۔ فلسفہ کے سانک اور مذاہب کی اشکال کا اثر اگر بنی نوع  
 انسان پر دیکھنا مطلوب ہو تو فرد و مشہوری کی رہنمون کی ورق گردانی کرنی چاہئے۔ لاطینی نصرانیت  
 ہزار سال میں یورپ کی آبادی دگنی نہ کر سکی۔ اور انفرادی زندگی میں بھی کوئی نمایاں اضافہ اس کو  
 عہد میں نہ ہو سکا۔ لیکن ڈاکٹر جاردوس کی رپورٹ سے جہاں اُس نے سیمپلشس کی مجلسِ حفظِ صحت  
 کے ملاحظہ میں پیش کی معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ اصلاحِ کینسر کے وقت جنوا میں انڈو کی عمر کا  
 اوسط ۲۱ سال تھا۔ ۱۸۳۷ء اور ۱۸۳۸ء کے درمیان ۴۰،۲۶۸ ہو گیا۔ تین سو سال پہلے جنوا  
 آدمی پالیس برس زندہ رہتے تھے اتنے آج کل ستر برس کی عمر کو پہنچنے میں ۱۸۹۹ء میں  
 گورنمنٹ انگریزی کو یہ فرض لینے کی ضرورت پڑی۔ یہ ضرورت اس طرح پوری گئی کہ اوسط  
 مدتِ عمر کے حساب سے ہر شخص کے بے وظیفہ سالانہ مدام الحیات متعز کیا گیا اور یہ وظائف  
 سینئر خزانگی سے لے کر اوسط سن عمر تک کے اشخاص کے ہاتھ بعض ایک خاص رقم کے

بیچ ڈالے گئے۔ اس انتظام میں فائدہ گورنمنٹ ہی کو رہا۔ ستاونے سال بعد وظائف کا ایک جدید سلسلہ گزشتہ صدی کے اوسط معیار حیات کی توقع پر جاری کیا گیا۔ لیکن وظیفہ خواران دور ثنائی نے اپنے پیش روؤں کے مقابل میں اتنی زیادہ عمر پائی کہ گورنمنٹ کو لینے کے دینے پڑ گئے اور یہ قرضہ بہت ہی گراں قیمت ہوا۔ حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ وظیفہ خواران قرضہ اول میں سے ذکور و اناث دونوں جنوں کے دس ہزار اشخاص اٹھائیس سال کو پہنچنے سے پہلے مر گئے لیکن ایک صدی بعد جب وہ سرے قرضہ کے وظائف جاری کئے گئے تو اسی عمر کے صرف پانچ ہزار سات سو ہتر و دون اور چھ ہزار چار سو سولہ عورتوں نے وفات پائی۔

ہم روحانیات کا جہانیاں کے ساتھ اور فنیاسات کا واقعات کے ساتھ مقابلہ کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ اقوال جن کا اتباع قرون اولیٰ و آخری میں کیا گیا رنگ لائے بغیر نہ رہے۔ زمانہ سابق میں جو مقولہ واجب الاتباع سمجھا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ ”جہالت زہد و الفالک مان ہے۔“ دور آخر میں جس مقولہ پر عمل ہوا اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ”علم اور طاقت مترادف ہیں۔“

# بارہواں باب

## خطرہ کی آمد آمد

نہجے کے مسئلے خطرہ ہونے کی قریب الوقوع علامات۔ کلیڈائے روم جو نصرانیت کا رکن رکین ہے ان علامات کو پہچان کر آنے والے خطرہ سے مقابلہ کرنے کی تیاری کرتا ہے۔ پاپائیوں یا کسٹس تاسع مجلس عریبیہ بھیہ مفقود کرتا ہے۔ مختلف و دل یورپ کے تعلقات پاپائیت کے ساتھ۔ کلیڈائے تعلقات سائنس کے ساتھ حسب تصریح سندھ بہ مکتوب عمومی و تلخیص پاپائیت۔

دیکھیں کونسل کے نوے مہمت پاپا کے متعلق اور نیز دربارہ سائنس۔ کونسل کے فیصلہ کا خلاصہ۔ حکومت پر دشمنیا اور پاپائیت کی مٹ۔ بھیڑ۔ یہ مقابلہ تفوق اور غلبہ کے حصول کے لئے دراصل سلطنت اور کلیسا کا مقابلہ ہے۔ یورپ میں دو مملکتوں کا اثر۔ دیکھیں کونسل کا اعلان اس امر کے متعلق کہ پاپائیت سائنس کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ روس کی ترقیوں کا مذہب کی تحکمانہ ساخت۔ خدا اہم ایمان اور عقل کے متعلق اس کی تعریفیات۔ اس کا سبب دشمن۔ تمدن جدید۔ اس کی کسوت جو امت اتحاد انجیلیہ فرقہ پرانہ سنت اور اس کے فیصلہ جات۔

سابق الذکر فیصلہ جات و فتاویٰ پر ایک عام نظر۔ مسئلہ زیر بحث کی موجودہ و آئندہ صورت۔

جو شخص مسیحی دنیا کے موجودہ درجہ ان خیال سے آگاہ ہے وہ اس واقعہ کے اخفا پر قادر نہیں ہو سکتا کہ نصرانیت ایک عقلی و نہرہمی بحران میں مبتلا ہوا چاہتی ہے۔

ہر طرے سے تیرہ دہائیوں کا تجربہ ہے۔ بلوفان کی آمد آمد کا شور کا نون میں بڑھ رہا ہے۔ جرمنی میں توئی بہت عقائد مادیہ اور الجوال (یعنی پاپائی مذہب) کی مخالفت پر مکرر بانہ ہے کھڑی ہے۔ فرانس

میں ترقی یافتہ ملتوں کے ساتھ دوست و گریبان دکھائی دیتا ہے اور اس کشمکش میں اس دولت عظیم الشان کی سیاسی قومیت بے اثر بلکہ ذلیل ہو چکی ہے۔ اٹلی میں روم پر ایک ایسا فرمان روا قابض ہے جو کلیسا سے خارج کیا جا چکا ہے۔ پاپائی مقدس اس حیلہ کی آڑ ڈھونڈ کر کہ آپ قید میں ہیں اپنے قصر دیشکین سے حریت پر ملاعن و مطاعن کی چھانڈ کر رہے ہیں اور باوجود کے کہ آپ کی غلطیاں اور خطائیں برائیل قاطع و براہین ساطع ثابت ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی براہیہ بڑ لگائے جاتے ہیں کہ آپ معصوم عن الخطا ہیں۔ ایک رومن کیتھولک استغفہج کہتا ہے کہ اہل یورپ ملائیم طہر پرنصرانیت سے قطع تعلق کر رہے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں اہل مذہب نہایت مدح و اسی کے ساتھ یہ دیکھ رہے ہیں کہ زمانہ میں آج کل کچھ ایسی ہوا چل رہی ہے کہ مذہب کی عقلی بنیاد منہدم ہوئی جاتی ہے۔ آنے والی تباہی کا وہ جس طرح بن پڑے مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ایک قوم پر وہ وقت بڑی آزمائش اور امتحان کا ہوتا ہے جب وہ مذہبی یا مذہبیوں کی کینہی جسم سے اتارتی ہے۔ یونان اور روم کی تاریخ زمین بتاتی ہے کہ یہ وقت کیسا سحر کا ہوتا ہے اور اس میں کیسے کیسے خطرات عظیم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب سدا ایک حالت پر زمین رہتے۔ ان میں انسان کے عقلی نشو و نما کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا میں ایسے کتنے ملک ہیں جن کا مذہب وہی ہے جو مسیح کی ولادت کے وقت تھا؟

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ یورپ کی کل آبادی تیس کروڑ دس لاکھ کے قریب ہے۔ ان میں سے اٹھارہ کروڑ پچاس لاکھ رومن کیتھولک ہیں اور تین کروڑ تیس لاکھ یونانی کیتھولک۔ پراشٹنٹ سات کروڑ دس لاکھ ہیں جو بہت سے فرقوں میں منقسم ہیں۔ یہودیوں کی آبادی پچاس لاکھ ہے اور مسلمانوں کی ستر لاکھ۔

امریکہ کی مذہبی تقسیم کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ عام جنوبی امریکہ کی سیسی؟ آبادی کا مذہب رومن کیتھولک ہے۔ وسطی امریکہ۔ میکسیکو۔ اسپین اور فرانس کے عرب الہندی مقبوضات کی نسبت بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ اور کینیڈا میں پراشٹنٹ آبادی کی اکثریت ہے۔



آسٹریلیا پر بھی یہی قول صادق آتا ہے۔ ہندوستان کے میں کروڑ مسلمانوں اور دوسری مشرقی تہذیبوں کے مقابلہ میں مسیحی آبادی تعداد کے لحاظ سے بے حقیقت محض ہے۔ غرض کلیسائے رومن کچھوں ملک زمانہ حال کی تمام مذہبی جماعتوں کی بہ نسبت زیادہ زبردست زیادہ ترتیب یافتہ اور زیادہ وسیع الاثر ہے۔ بلکہ اسے مذہبی جماعت کہنا ہی غلطی ہے۔ اسے ایک پولیٹیکل جیتھا سمجھنا چاہئے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ کل طاقت پادریوں کے ہاتھ میں آئے ہو یا داروں کو صرف عبودیت و متابعت کا حق حاصل ہے۔ مسیحیت کے قرن اولین میں کلیساؤں کی شکل جمہوری تھی۔ یہ جمہوریت بتدریج ایک متحد النظام اور مطلق العنان حکومت کی شکل میں بدل گئی ہے اور ایک انسان نائب خدا ہونے کی حیثیت سے اس پر مسلط ہو گیا کو اس امر کا ادعا ہے کہ اس کی مانگوں من الہی کا اطلاق دینی ذبیحی دونوں حکومتوں پر یکساں ہوتا ہے اسے یہ حق حاصل ہے کہ حکومت ملکی کو اپنی اغراض کا تکمیل کا آلہ بنائے لیکن حکومت ملکی کو اس کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور ان ممالک میں بھی جہاں پر انٹرنٹ مذہب جاری ہے۔ اس کو حق حکمرانی علی سبیل المساوات ہی نہیں بلکہ پورا شاہی اقتدار بلا مسابقت احدی و مشارکت غیرے حاصل ہے۔ کلیسائے مذکور کو اس دعوے کی حقیقت پر بھی اصرار ہے کہ حکومت ملکی کو اس کے حدود و اراضی کے اندر کسی شے پر کس طرح کا حق حاصل نہیں اور چونکہ پر انٹرنٹ مذہب سب غائباً بصفت کی مراد مذہب و مذہب مسلمان پیارے تو سات ہی کروہین یا شاہد عظیم ہیں جب کہ یہ کتاب اول اول مشایخ جوئی ہندوستان کی مردم شماری کا مواد اس درجہ ناقص ہو کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد میں کروڑ بھی جاتی جو۔ مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ مسئلہء میں گورنمنٹ ہندوستان کی طرف سے جو رپورٹ مردم شماری شایع ہوئی تھی اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل آبادی ہندوستان کی اس نسبت ۱۹۱۱ء میں ۲۴۰ ملین تھی ۱۹۲۱ء میں ۲۸۰ ملین تھی ۱۹۳۱ء میں ۳۲۰ ملین تھی ۱۹۴۱ء میں ۳۶۰ ملین تھی ۱۹۵۱ء میں ۴۰۰ ملین تھی ۱۹۶۱ء میں ۴۴۰ ملین تھی ۱۹۷۱ء میں ۴۸۰ ملین تھی ۱۹۸۱ء میں ۵۲۰ ملین تھی ۱۹۹۱ء میں ۵۶۰ ملین تھی ۲۰۰۱ء میں ۶۰۰ ملین تھی ۲۰۱۱ء میں ۶۴۰ ملین تھی ۲۰۲۱ء میں ۶۸۰ ملین تھی ۲۰۳۱ء میں ۷۲۰ ملین تھی ۲۰۴۱ء میں ۷۶۰ ملین تھی ۲۰۵۱ء میں ۸۰۰ ملین تھی ۲۰۶۱ء میں ۸۴۰ ملین تھی ۲۰۷۱ء میں ۸۸۰ ملین تھی ۲۰۸۱ء میں ۹۲۰ ملین تھی ۲۰۹۱ء میں ۹۶۰ ملین تھی ۲۱۰۱ء میں ۱۰۰۰ ملین تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان ہندوستان کی تعداد کے متعلق جو حکم تھا۔

کی حیثیت محض باغیانہ ہے لہذا اُس کو کوئی حق حاصل ہو ہی نہیں سکتا بلکہ پراسٹنٹ جماعتوں کا جائزہ حقیقی روحانی پیشوا کیتھولک اسقف ہی ہو سکتا ہے۔

پس ظاہر ہے کہ نصرانیت کے پیروں کا جزو غالب کیتھولک ہے۔ اور پاپائیت کا یہ مطالبہ کہ اُسے مسیحی دنیا کی اعلیٰ ترین طاقت تسلیم کیا جائے تحکمانہ امر ایسی شان لئے ہوئے ہے کہ مسیحی دنیا کی موجودہ غریبی حالت پر نظر اتقا و ڈالتے وقت اس کے فیصلجات و فتاویٰ کو پیش نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔ پاپائیت کی طرز عمل میں اعلیٰ درجہ کی دانشمندی اور تدبیر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ کیتھولک فرقہ ایک شخص کے احکام کی تعمیل کرتا ہے لہذا اس کو وہ اتنا اقتدار حاصل ہے پراسٹنٹ جماعتوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں۔ اس کے علاوہ روم کا بڑا نام اپنی شان و آبرو دار بادگاروں کے ساتھ اس کا پشتیبان ہے۔

پاپائیت نے تامل و تذبذب سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر اُس عقلی خطرہ کے ہر پہلو پر غور کیا ہے جو کوئی دم میں ظاہر ہوا چاہتا ہے۔ اور جو فیصلہ اُس نے اس بارہ میں صادر کیا ہے۔ اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو بدنام خود اپنے حریف پر اُپر غلبہ حاصل ہے۔ یہ فیصلہ گذشتہ وینٹیکن کونسل کے اجلاس کی رویداد کے معائنہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ پاپا پالس ناسع نے بذریعہ فرمان مورخہ ۲۹ جون ۱۸۷۰ء میں ایک مجلس عمومی انعقاد کی تحریک کی۔ اس مجلس کا اجلاس ۸ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شروع ہوا کہ جولائی ۱۸۷۰ء میں منعقد ہوا۔ منجملہ دوسرے مسائل کے جو اس مجلس میں درج ہوئے۔ دو امور نہایت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ پاپا سے روم معصوم ہے دوسرا یہ کہ مذہب کا تعلق سائنس کے ساتھ کیا ہونا چاہیے۔

لیکن اس مجلس کا انعقاد عام رعنا مندی کے ساتھ نہ ہونے پایا۔ مشرقی کلیساؤں کی رائے زیادہ تر اس کے خلاف تھی۔ اُن کی طرف سے یہ عزیز پیش ہوا کہ معلوم ایسا معلوم ہوا کہ پاپا نے روم نصرانیت کی پیشوائی کا منصب اپنے لئے مختص کرنا چاہتا ہے حالانکہ اُن کی رائے میں حضرت یسوع مسیح ہی کیسا کے سردار ہیں۔ اُنھوں نے یہ خیال بھی غلام کیا کہ مجلس کے

انفقا کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہو گا کہ نئے فساد اور نئی خرابیاں اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ ان محترم کلیساؤں کے خیالات کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب ۱۶۶۷ء میں کلدانی بطریق نے منطوری بطریق سائین کو رو من کیتھولک اتحاد میں شامل ہونے کی دعوت دی تو اُس نے یہ جواب دیا "آپ چاہتے ہیں کہ میں اسقف روم کی پاپوش کو بعد عجز بوسہ دون لیکن یہ تو فرمائیے کہ کیا وہ بھی آپ ہی کی طرح ایک انسان نہیں ہے۔ کیا وہ عزت و آبرو میں آپ سے بڑھ کر ہے؟ ہم اس بات کو کبھی جائز نہ رکھیں گے کہ ہمارے مقدس معابد میں مور تون اور مجسموں کی پرستش ہو اس لئے کہ ان کی پرستش ناپاک اور ذلیل بت پرستی کی ہم منی ہے۔ کیا آپ لوگوں کی طرح ہم بھی اس عقیدہ کے پیرو ہو جائیں کہ خدائے قدیر انسان کی طرح مان کے بطن سے پیدا ہوا ہے حضرت یہ کفر آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہمیں تو اس سے معاف رکھا جائے۔" اس جواب نے ثابت کر دیا مشرق اور مغرب کا اتحاد محال ہے۔

بالآخر اہل اکنات عالم سے جو بطریق صدر اسقف اور اسقف آکر اس مجلس عمومیہ میں شریک ہوئے اُن کی مجموعی تعداد سات سو چار تھی۔

روما کو اپنی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ سائنس نہ صرف پاپائی عقاید کی جلد جلد جڑ کاٹ رہا ہے بلکہ باسی قوت بھی فراہم کر رہا ہے۔ یہ واقعہ اُس سے چھپا ہوا نہ تھا کہ یورپ بھر میں تعلیم یافتہ اشخاص مذہب سے قطع تعلق کر رہے ہیں اور اس اعتراض کا مرکز اصل جرمی کا شمالی علاقہ ہی ایس جب جرمی اور آسٹریا میں جنگ چھڑ گئی تو اُس نے اس جنگ سے نہایت دلچسپی ظاہر کی اور بقدر امکان آسٹریا کا حوصہ بڑھایا۔ لیکن معرکہ ساؤووا کے نتیجے نے اُس کی امید کو مہل بدل دیا۔

اس کے بعد جب فرانس اور جرمنی میں لڑائی ہوئی تو پاپائیت کو پھر تھوڑا سا اطمینان قلب نصیب ہوا۔ اُس کو ذرا شک نہ تھا کہ نئے فرانس کو حاصل ہوگی جس کے یہ منی ہوں گے کہ تمویخ خود اُس کی فتح ہوئی۔ لیکن جنگ سیدان نے دوبارہ اُس کی امیدوں کا خون کر دیا۔

اب چونکہ کئی سال کے لئے اُس کی امید دن کے احیا کی کوئی صورت نہ تھی لہذا اُس نے تہیتہ کر لیا کہ جرمنی میں بغاوت کر دی جائے۔ چنانچہ آج کل اس سلطنت میں جو کل کھل رہے ہیں وہ حضرت پاپائی وہ ماہری کی چین آرائی کے کرشمے ہیں۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر آئندہ یا فرانس کو کامیابی نصیب ہوئی تو پروشیا کے شاہ پر اسٹنٹ مذہب کا بھی خاتمہ ہو گیا ہوگا۔

اس جنگی کشاکش کے ساتھ ساتھ ایک اور منصوبہ بھی بروئے کار لایا گیا جس کا تعلق ذہنیات کے ساتھ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اذمنہ وسطی کے سالخورہ و فرسودہ عقاید و مراسم کے احیا کی تدبیر کی جائے اور انہیں افراط کی حد تک پہنچایا جائے خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو چنانچہ نہ صرف اس اوٹا کا علم بلند کیا گیا کہ پاینت کو تمام ممالک کی دنیوی حکومتوں میں علی السوئے شریک ہونے کا بانی حق حاصل ہے بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ رومانی برتری اور نوعیت واجب الاعتراف ہے اور مسائل بابہ النزاع میں دنیوی حکومت کو اُس کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ چونکہ پاینت کے خطرہ میں پڑنے کے باعث سامنس کی ترقی ہوئی تھی لہذا اُس نے کمال شوخ چٹھی دے باکی کی راہ سے سامنس کی حد بندی کر دی اور اُس کے اقتدارات کی حدود مقرر کر دیں۔ اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ تمدن جدید کو بھی مردود و مفلوج قرار دینے کی خدمت اپنے ذمہ لی۔

جب پاپائی مقدس شہداء میں گینا سے مراجعت فرمایا ہوئے تو ان منصوبوں پر

۱۰ جنوبی اٹلی کا ایک شہر ہے چولہ ساحل روم سے ۶۰ میل جاب جنوب و مشرق اور نیپلز سے پینتالیس میل جاب شمال و مغرب واقع ہے۔ یہ شہر نہایت قدیم ہے اور رومن سلطنت کے زمانہ سے لے کر آج تک اس نے بہت سے تاریخی انقلاب دیکھے ہیں۔ مسلمانوں نے نوین صدی میں اس کا محاصرہ کیا تھا لیکن ۱۰۰۰ میں اس پر اسپین کا قبضہ ہوا۔ اُن سے ۱۰۰۰ء میں فرانسویوں نے چھینا۔ پاپائی پاپس تاسع جن کا ذکر متن میں ہوتا ہے محول دے گئے تھے اور گینا میں انہوں نے پناہ لی تھی ۱۰۰۰ء میں فرانسویوں کی مدد سے

غور شروع ہوا اور جیسوٹ فرقہ کے مشورہ پر انہیں عمل میں لانے کا ڈھنگ ڈالا گیا۔ یہ فرقہ اس خیال خام میں مبتلا تھا کہ خدا نامکون کو ممکن کر دے گا اور پاپائیت کی بڑھی ہوئی باتوں میں جو ان کی کاکس بل پیدا کیا جاسکے گا۔ غرض پاپائی گزٹ میں یہ اعلان کیا گیا کہ کلیسا بمقابلہ حکومت آزاد و خود مختار مطلق ہے۔ اس وقت پاپا کے مطیع ہیں۔ اس وقت کی فرمان برداری ان کے باعقین پر واجب ہے۔ پراٹسٹنٹ عیسویوں کا فرض ہے کہ جادو ارتداد و دہریت سے محروم ہو کر اس گھر میں شریک ہو جائیں جس سے جدا ہو کر وہ بے شکستہ رہتی ہیں۔ مسالمت و رواداری کی گنجائش میں کسی طرح جائز نہیں۔ ماہ دسمبر ۱۸۵۲ء اس وقت کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں پاپا نے عقیدہ جبل بلانز کا اعلان کیا۔ اس کو دس سال بعد وہ فراہین پاپا کی طرف سے جاری ہوئے جو مکتب عمومی اور مخصوص کے نام سے مشہور ہیں۔

مکتب عمومی کی تاریخ اجراء۔ ۱۸۵۲ء میں پراٹسٹنٹ نے اس کا مسودہ بڑے بڑے عالم پادریوں نے مرتب کیا تھا اور ہونی آفریقا، وسط مقدس، کی مجلس انتظامی نے اس پر کچھ بحث کی تھی۔ اس کے بعد یہ اس وقت کے پاس پہنچا گیا تھا اور سب سے آخر میں پاپا نے کر دینا ان کے ساتھ مل کر اس پر نظر ثانی کی تھی۔

تعمدات جدید پر اس مکتب میں جو لے دیے گئے تھے اس سے بعض پادریوں نے اختلاف کیا۔ اور بعض کو دینا ل بھی اس کے ساتھ رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جھپکنے کی قیوت کا اخباروں نے اس کی اشاعت کی تو سہی لیکن یہ تاسف دہر گیا۔ پراٹسٹنٹ حکمرانوں نے اگرچہ اس کی مزاحمت کی لیکن کی قیوت لک حکومتوں کو اس نے غلط دیکھا۔ اس کے مندرجہ میں ڈال دیا۔ فرانس نے اس کے صرف اس حصہ کی اشاعت کو روک دیا۔ نتیجہ ۱۸۵۳ء میں انہوں نے اپنا کمپوزیشن پر عمل کیا اور مراحمہ۔ فرانسے روک دیا۔

جو جوبلی کے اعلان سے متعلق تھا۔ آسٹریا اور اٹلی نے اسے شائع ہو جانے دیا لیکن سرکاری طور پر منظور نہ کیا۔ کچھ ملک ممالک کے اخبارات و رسالجات اور مجالس وضع آئین و قوانین کی طرف سے اس پر نکتہ چینی ہوئی۔ اکثر لوگوں نے بہ تاسف یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کی وجہ سے کلیسا اور موجودہ تمدن کا اختلاف بہت بڑھ جائے گا۔ اور تو اور اسپین ملک میں بعض اخبارات ایسے تھے جنہوں نے ان الفاظ میں اپنا افسوس ظاہر کیا کہ ”ہر بار پاپا سے رومانے تمدن جدید کو بدنام کرنے اور اُس پر نفرتیں بھینچنے میں نہایت ہمت دہری اور کورسوادنی کا ثبوت دیا ہے۔“

اس مکتوب نے آزادی ضمیر و آزادی ایمان پر ان الفاظ میں نکتہ چینی کی ہے :-  
 یہ عقیدہ نہایت ہی خطرناک بلکہ مجبوزمانہ ہے کہ آزادی ضمیر و آزادی پرستش کا حق ہر شخص کو حاصل ہے اور ہر شائیہ سلطنت میں اس حق کے اعلان اور نگہداشت کا ذمہ دار قانون کو ہونا چاہیے اور نیز یہ کہ حامد غلامان کا ارادہ ہو اُس طریقہ سے جسے عام راستے کہا جاتا ہے یا دوسرے ذرائع سے ظاہر ہو ایک اعلیٰ قانون سے جو تمام ربانی یا انسانی حقوق کی قیاس سے آزاد ہے۔ والدین کے اس حق کی بھی اس مکتوب میں نفی کی گئی ہے کہ وہ کلیسا کے رومن کیتھولک کی حدود سے خارج ہو کر اپنی اولاد کو تعلیم دے سکتی ہیں۔ اُن گستاخ و بیہ ادب لوگوں پر اس مکتوب میں نفرتیں کی گئی ہیں جو ازراہ جبروت کلیسا اور پاپائی منصب کے اُن پیشوایانہ اقتدارات کو ”دنیوی حکومت“ کے تابع کرنا چاہتے ہیں جو خداوندی حق مسیح کا عطیہ ہیں اور تقدس اب دباب پاپا نے مکتوب عمومی کے مکتوب الیہم یعنی اپنے محترم برادران دینی کو ہر وقت عبادت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اور حسب ذیل تائیدی الفاظ سے اس تاکید پر مزید اعانہ فرمایا ہے۔ ”اس غرض سے کہ خدا کے تعالیٰ زیادہ آسانی سے ہماری اور آپ کی دعاؤں کو قبول فرمائے ہمیں چاہیے کہ کمال سچائی اور خلوص کے ساتھ خدا کی مان مریم عذرا سے دعا لگیں جو ہم سے اور اُس کو درمیان بمسرتہ ایک وسیلہ

کے ہیں۔ اور جو اپنے اکلوتے بیٹے ہذا دنیووع مسیح کے دہنے ہاتھ پر زین رو اور ہے اور مختلف زہرات پہننے ہوئے بطور ملکہ کے جلوہ فرما ہیں۔ اس لیے کہ کوئی مراد ایسی نہیں جو آسمان کی ملکہ کے توسل سے پوری نہ ہو سکے۔“

صاف ظاہر ہے کہ باپا کی طرف سے جس اصول کا اب اعلان ہوا اُس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جن حکومتوں کے تعلقات باپائیت کے ساتھ اب تک مرافقانہ و مصالحانہ تھے وہ بھی اس کے مخالف ہو جائیں۔ روس میں بہت بڑی ناراضی پھیل گئی اور جو واقعات اس کے بعد پیش آئے اُن کے لحاظ سے جناب تقدس آب نے ایک تہدید آمیز فرمان نومبر ۱۸۶۷ء میں صادر فرمایا جس کا جواب گورنمنٹ روس نے یہ دیا کہ اُس معاہدہ کو جو ۱۸۶۷ء میں دربار روما اور دولت روس کے درمیان قرار پایا تھا فسخ و کالعدم کر دیا۔

جنگ ساڈوا (جولائی ۱۸۷۰ء) کے نتیجہ کی طرف سے بالکل خالی الذہن جوکر باوجودیکہ یہ ظاہر تھا کہ تمام یورپ کا سیاسی نقشہ بدل گیا ہے خصوصاً وہ تعلقات جو باپائیت کو دول یورپ کے ساتھ تھے اپنے حال پر قائم نہیں ہیں۔ باپا نے بتاریخ ۲۷ جون ۱۸۷۰ء ایک فرمان جاری کیا جو مکتوب عمومی اور تخلص کا مصدق و موثق تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ایک مجلس عمومی کے انعقاد کا بھی قصد ظاہر کیا جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ چنانچہ دوسرے سال یعنی بتاریخ ۲۹ جون ۱۸۷۰ء انقادی مجلس کا اعلان نامہ جاری کیا گیا۔ لیکن اب آسٹریا کے ساتھ جھگڑش ہو پڑی۔ آسٹریا کی پارلیمنٹ نے جو قوانین جاری کیے تھے اُن کی رو سے سلطنت کے تمام باشندوں کا درجہ ملکی حقوق کے لحاظ سے مساوی قرار دیا گیا تھا اور مکیس کے اقتدارات محدود کر دئے گئے تھے اس پر باپا کی گورنمنٹ کی طرف سے اعتراض ہوا اور آسٹریا کو بھی روس کی طرح مجبوراً وہ معاہدہ جو ۱۸۵۵ء میں حکومت آسٹریا و دربارہ کے مابین قرار پایا تھا منسوخ کرنا پڑا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے فرانس میں سالم تمنعین کی اشاعت کی اجازت نہیں

دی گئی۔ لیکن پرورشیا چونکہ پاپائیت سے الجھنا نہیں چاہتا تھا لہذا اس کا مزاحم نہ ہوا۔ پاپائیت تو اہل من مزید کے مرض میں مبتلا تھی ہی۔ اس عدم مزاحمت نے مرض کو اور بڑا دیا۔ یعنی علامت یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ اہل ایمان اپنے مال و جان بلکہ اپنے عقلی عقاید تک کلیسا کی نذر کر دیں۔ پرائسٹنٹون اور یونانیوں کو بھی کلیسا سے رو دین کی تعمیل کی حلقہ بگوشی کی دعوت دی گئی۔

تاریخ مقررہ پر مجلس عمومیہ کا افتتاح ہوا۔ اس کے مقاصد یہ تھے کہ تخلص کو قوت سے نفل میں لایا جائے۔ عصمت پاپا کے عقیدہ کی ترخیص کیجائے اور مذہب اور سائنس کے تعلقات صاف صاف بتا دیے جائیں۔ اس بات کی ہر طرح سے تیاری کر لی گئی تھی کہ جو مقدس ذہن میں پیشتر سے قائم ہیں ان کی تعمیل و تکمیل ہو کر رہے۔ اسقفوں کو پیش از پیش مطلع کر دیا گیا تھا کہ وہ روم میں بحث کرنے کے لیے نہیں آ رہے ہیں بلکہ ان فیصلوں پر صاف کرنے کی غرض سے بلائے جا رہے ہیں۔ جو ایک معصوم و غیر خاطی پاپا صا در کر چکا ہے۔ آزادانہ بحث کا خیال تک بھی پیش نظر نہ تھا۔ مجلس کے کسی اجلاس کی روئاد کے معائنہ کی کسی کج اجازت نہ تھی۔ ان اساتف کو جن کا تعلق محض ایک رسمی ضابطہ کی تکمیل کے لیے فریق امتلاٹ سے تھا بات کرنے کا موقع تک نہ دیا گیا۔ تاریخ ۲۲۔ جنوری ۱۸۷۸ء اس معنوں کی درخواست مجلس میں بغرض تصفیہ پیش ہوئی کہ عصمت پاپا کی تعریف کیجائے۔ اس کے مقابلہ میں جماعت اقلین کی اختلافی درخواست پیش ہوئی۔ اس پر اقلین کو مباحثہ کی ممانعت کر دی گئی اور ان کی آراء کی اشاعت کے متعلق بھی حکم امتناعی جاری کیا گیا۔ اگرچہ یہ انتظام کر لیا گیا تھا کہ جماعت اکثرین فریقین مباحثہ کا اس حد تک جزو غالب ہو کہ جماعت اقلین پر پوری طرح سے چھا جائے لیکن پھر بھی مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ ایک حکم اس معنوں کا جاری کیا جائے کہ کسی تحریک کی منظوری کے لیے یہ ضروری نہیں کہ غلبہ آما اتفاق کامل کے قریب قریب پہنچا ہو بلکہ محض کثرت مائے کافی ہوگی۔ جماعت اقلین کی آراء سے مخالفت کی مطلق پروا نہ کی گئی۔



مجلس نے اپنے مقاصد کی تکمیل پر جب اس قدر دور دیا تو دول خارجیہ کے حکام کو اس کی اس غیر آال اندیشہ کارروائی نے مایم و سر اسیمہ کر دیا۔ دنا پناہ تحت آسٹریا کے صدر اسقف نے پاپا کی خدمت میں ایک محضر روانہ کیا جس پر بیت سے کر دیا گیا اور صدر اسقفون کے دستخط ثبت تھے۔ اس میں جناب تقدس آب سے التماس کی گئی تھی کہ مسئلہ عصمت کو معرض بحث میں نہ لائیں۔ اس لیے کہ کلیسا آج کل ایسی کشمکش میں مبتلا ہے جس کا گذشتہ زمانے میں وجود نہ تھا اور اسکو ایسے حریفون سے ہالا پڑا ہے جو سرے سے مذہب ہی کے دشمن ہیں اور آسے فطرت انسانی کے لیے سم مائل سمجھتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں جب کہ کیتھولک اقوام کی بیت اعدا اور معاندین کی منصوبہ سازوں سے ڈانوا ڈول ہو رہی ہو ان کو ایسے عقاید کے تسلیم کرنے پر مجبور کرنا جو ملت کی کونسل کے مسئلہ عقاید پر مستند اور ان قرن مصداق نہ ہو گا۔ اس محضر میں یہ عبارت بھی درج تھی کہ مسئلہ عصمت پاپا عن الخطا کی تعریف جن الفاظ میں کرائی جاتی ہے وہ دشمنان مذہب کے ہاتھ میں ایک اور ذریعہ حربہ ہے۔ جس کا اثر ہو گا کہ وہ لوگ بھی جو بلحاظ عقاید افضل الناس ہیں کلیسا کی رسوم کیتھولک کو ان متولیون کے انھما سے برا سمجھنے لگیں گے۔ وزیر اعظم آسٹریا نے ایک امتیاز تحریر کے ذریعہ سے دربار پاپا کو اچھی طرح آگاہ کر دیا کہ ہر ایسی کارروائی کا خمیازہ دربار موصوف کو پہنچنا پڑے گا جو آسٹریا کے حقوق میں تصرف و تدازی کا موجب ہوگی۔ فرانسیسی گورنمنٹ نے بھی ایک یادداشت پاپا کی خدمت میں بھیجی جس میں یہ تحریر کی گئی تھی کہ ایک فرانسیسی اسقف کو مجلس کے اجلاس میں فرانس کے حالات پر بحث اور اس کے حقوق کی حمایت کرنے کی اجازت دی جائے لیکن اس کا جواب پاپا کی گورنمنٹ نے یہ دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسا اسقف سفارت کی خدمات بھی انجام دے اور مجلس کی رکنیت کے مقدس فرائض سے بھی سبکدوش ہو سکے۔ اس پر فرانسیسی گورنمنٹ نے ایک مودبانہ عرضیہ کے ذریعہ

سے گزارش کی کہ امید ہے کہ حضرات اس وقت کسروانکسار کے اصول کو پیش نظر رکھ کر اور جناب پاپا سے مقدس احتیاط دعا بقت شناسی کو کام فرما کر غلو آمیز شخصی آراء کو مذہبی عقاید کی فہرست میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ توقع بھی ظاہر کر دی کہ دینی حکومت کی بیجا مداخلت اور دست اندازی سے اس کے مدنی و سیاسی قوانین کو کیتھولک فرانسیسیوں کی عقل سلیم اور حب وطن محفوظ رکھے گی۔ اس مخالفت میں شمالی جرمنی کی "کانفیڈریشن" (راہجن) اتحاد ابھی شریک ہو گئی اور ہر طرف سے پاپا کی گورنٹ پر دباؤ ڈالا گیا۔

۲۴ اپریل کو دان آرنم سفیر پروشیا نے دار و سفیر فرانس کے ساتھ ملکر پاپا کی صمت میں یہ تحریک پیش کی کہ قرون وسطیٰ کے خیالات کا احیاء بعید از مصالحت ہے۔ اس وقت اقلین نے یہ سنہ پا کر مطالبہ کیا کہ مسئلہ عصمت پاپا کے تصفیہ سے پہلے دینی اور دینی حکومتوں کے تعلقات کا تعین کر دیا جائے۔ اور اس مسئلہ کا بھی تصفیہ کر دیا جائے کہ آیا مسیح نے سینٹ پیٹر اور اس کے جانشینوں کو باوجود شاہوں اور شہنشاہوں پر اقتدار عطا فرمایا ہے یا نہیں۔

لیکن اس تحریک پر مطلق التفات نہ کی گئی یہاں تک کہ بحث کے لیے سہلہت تک نہ دی گئی۔ فرقہ جیسوئٹ کے اراکین جو اس تمام تحریک کے بانی سبانی تھے اپنی ہر ایک تجویز بجز بھروسہ لیتے تھے۔ عام مکتہ چینی سے بچنے کا کوئی ایسا حیلہ نہ تھا جو مجلس نے اختیار نہ کیا ہو۔ تمام کارروائی بائیں رکھی گئی۔ جو لوگ اس کارروائی میں شریک تھے ان سے حلف لے لیا گیا تھا کہ خاموش رہیں گے۔

۱۳ جولائی کو وہ رائے لی گئیں۔ ۶۰۱ آراء میں چار سو کاؤن موافق تھیں کثرت آراء کے قاعدے کے مطابق تحریک منظور شدہ قرار پائی اور پانچویں دن پاپا نے اس عقیدہ کا اعلان کر دیا کہ وہ معصوم عن الخطا ہے۔ اکثر کہا گیا ہے کہ یہ وہ دن تھا جبکہ فرانس

نے پردہ مشیاء کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اس کے آٹھ دن بعد فرانسیسی فوج روما سے ہلائی گئی۔ شاید مدبر اور فلسفی دونوں کو اس کا اعتراف ہو گا کہ اگر عقل سلیم پاپا کو غرضاتی تسلیم کرتی تو اسکی عصمت اتحاد و اتفاق کا بہت بڑا عنصر ہو سکتی ہے مگر عقل کو یہ بات باور آئے تو کیونکر آئے۔

اس کے بعد شاہ اٹلی نے اپنی قلم سے ایک خط پاپا کو لکھا جس میں نہایت مودبانہ طور پر ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ امر ضروری ہے کہ شاہی فوجیں بڑھ کر ان مقامات پر قبضہ کر لیں جن کا جناب تقدس باب کی سلامتی اور ملک کو حریفوں کی دست برد سے بچانے کے لئے شاہی قوت کی حمایت میں آجنا مصلح سیاسیہ کے مقتضیات سے ہے۔ اس خط میں یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ کیتھولک مذہب کا تقدس انتساب پیشوا اسس ضرورت کو تسلیم کرنے سے نہ صرف فوجی تمناؤں کو پورا کر گیا بلکہ باشندگان اٹلی کی ارادت و عقیدت کا مرکز بن کر دریائے ڈانوب کے کنارے اگر چاہے تو ایک ایسی شاندار حکومت قائم رکھ سکے گا۔ جو انسانی حکومت کی اطاعت سے مطلقاً آزاد ہوگی۔

اس کا جواب جناب تقدس باب نے ایک مختصر سے جملے کئے خط میں یوں دیا۔  
 "میں خدا کا شکر کرتا ہوں جس نے حضور کو میری زندگی کے پیا لہ کی تلچھٹ میں تمنی کے لانے کی توفیق عطا کی ہے باقی رہے آپکے بعض مطالبات سو میں ان کے منظور کرنے سے قاصر ہوں اور ان اصول کی پابندی بھی میرے حیطہ امکان سے خارج ہے جو آپ کے خط میں درج ہیں میں پھر خدا سے استعانت چاہتا ہوں اور اپنا کام اس کے ہاتھ میں چھوڑتا ہوں کہ وہ خود اسی کا کام ہے۔ میری خدا سے دعا ہے کہ وہ حضور پر اپنی بہت سی برکتیں نازل کرے اور آپ کو خطرات سے بچائے اور آپ پر وہ رحم فرمائے جس کی آپ کو بہت ہی ضرورت ہے۔"

شاہی فوج کو بہت کم مزاحمت پیش آئی۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۷۰ء کو اس نے روما پر قبضہ

کر لیا۔ اب ایک عام اعلان جاری کیا گیا کہ مسئلہ اتحاد دولت اٹلی کے متعلق کل باشندگان اٹلی کی رائے بذریعہ قرعہ اندازی لی جائے اس عام قرعہ اندازی کے نتیجے نے ثابت کر دیا کہ اٹلی میں لوگوں کا دماغ دینیات کی قیود سے کامل طور پر آزاد ہو چکا ہے اُن صوبوں میں جو روما سے متعلق تھے آراء قابل اندراج کی تعداد ۱۶۷۵۴۸ تھی ان میں سے بہ قدر ۱۳۵۲۹۱ آزاد کے قرعہ اندازی ہوئی۔ الحاق صوبہ جات کی تائید میں ۱۳۳۶۸۱ آراء برآمد ہوئے آراء مخالف کی تعداد ۱۵۰۷۰ تھی اور ۱۰۳ رائیں ایسی تھیں جو منوع کر دی گئیں اٹلی کی پارلیمنٹ نے باشندگان روما کی اس متحدہ رائے کو کہ روما کی صوبہ جات کا دولت اٹلی کے ساتھ الحاق کر لیا جائے بغلیہ آراء تسلیم کر لیا۔ ۲۳۹۹ رائیں اس اعتراف کی موید تھیں اور بیس مخالف غرض ایک شاہی فرمان کے ذریعہ سے اس امر کا اعلان کر دیا گیا کہ پاپائی ریاستیں دولت اٹلی کے ساتھ ملحق کر دی گئیں اور ایک استعمار اس الحاق کی جزایات کے متعلق جاری کیا گیا۔ اس استعمار میں بتایا گیا تھا کہ ”ان رعایات سے گورنمنٹ اٹلی یورپ پر یہ بات ثابت کرنا چاہتی ہے کہ باجماع اس اصول کے کہ ایک خود مختار حکومت میں گھلیسا کو خود مختار ہونا چاہیے۔ اٹلی پاپائی فرمان روائی کو تسلیم کرتی ہے جب پروشیا اور آسٹریا کی جنگ ہوئی تو پاپائیت کو یہ امید تھی کہ سلطنت جرمنی پر آسٹریا کی نگرانی قائم ہو جائے گی۔ اور اہل جرمنی کا مذہب کیتھولک ہو جائے گا۔ جب جرمنی اور فرانس میں لڑائی ہوئی تو فرانس میں کواہمیت کو امید تھی کہ جرمنی میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں گے جنہیں رومن کیتھولک مذہب کے ساتھ ہمدردی ہوگی۔ اسی لیے کیتھولکوں کو بہائیتوں کے خلاف بھڑکانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ کوئی ایسی گالی نہ تھی جو اُن کو نہ دے گئی ہو کبھی اُنہیں دہر یہ کہا گیا کبھی اُن کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ اُن میں ایمانداروں اور دیانت کی صفت ہو ہی نہیں سکتی۔ کبھی ان کے فرقوں کی نسبت یہ ظاہر کیا گیا کہ اُن کا اعتراف رو بہ زوال ہے کبھی اُن پر یہ آوازہ کسا گیا کہ پیروان کو تھرر

زیادہ فاسق و فاجر تو کم پورپ بھر میں کوئی نہیں۔ خود جناب پاپا نے شاید یہ سمجھ کر کہ دنیا کو تاریخ نسیمیا منسیا ہو گئی ہے بلاتامل یہ ارشاد فرمایا کہ ”اہل جرمنی کو سمجھ جانا چاہیے کہ مجھ کلیسا سے روم کے اور کوئی کلیسا آزادی اور ترقی کا سرچشمہ نہیں ہو سکتا۔“

اس اثنا میں جرمنی کے پادریوں نے ایک جماعت اس غرض سے قائم کی کہ پاپا کی غاصبانہ دست برد کے خلاف اپنی آواز بلند کرے بلکہ علی طور پر اس کی مزاحمت کرے۔ اس جماعت نے صاف کہہ دیا کہ ہم ہرگز اس امر کے روادار نہیں ہو سکتے کہ انسان خدا کے تحت پر بٹھا دیا جائے بلکہ ہم کسی شکل میں بھی کسی کو نائب خدا بنا ہوا دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے علمی عقاید کو قیسمیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا سکتے ہیں۔ بعض تو یہاں تک بے دھڑک نکلے کہ انہوں نے خود پاپا ہی پر زندہ والحاد کا الزام لگادیا۔ ان متماد اور سرکش اشخاص کو خارج ار کلیسا کیے جانے کی دہکیاں دی گئیں اور بالآخر یہ مطالبہ کیا گیا کہ بعض پروفیسروں اور معلموں کو خدمت سے سبکدش کر کے بجائے ان کے ایسے اساتذہ مقرر کیے جائیں جو عصمت پاپا کے قابل ہوں۔ اس مطالبہ کی تعمیل سے گورنمنٹ جرمنی نے انکار کر دیا۔

گورنمنٹ جرمنی کی دلی تمنا تھی کہ پاپائیت کے ساتھ صلح صفائی کے تعلقات قائم رکھے وہ مذہبی جھگڑوں میں ہرگز نہ پڑنا چاہتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہو کر باکار مابہ الجفت مذہبی نہ تھا بلکہ پولیٹیکل یعنی حکومت کی طاقت آیا حکومت ہی کے خلاف مروت کیجائے یا نہیں۔ ایک دفعہ ایک استاد جو کسی مدرسہ میں ویرش کی تعلیم دینے پر مامور تھا کلیسا سے خارج کیا گیا۔ اور جب کلیسا کی طرف سے اس کی بڑائی کی تحریک ہوئی تو گورنمنٹ نے اس تحریک کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ حکام کلیسا نے اس انکار کو کلیسا کے حقوق کی پامالی پر محمول کر کے ظاہر کیا کہ گورنمنٹ نے مذہب پر حملہ کیا ہے۔ شہنشاہ جرمنی نے اپنے وزیر کی اس کارروائی کو جو کلیسا کے مقابلہ میں کی گئی

تھی بنظر استحسان دیکھ کر اس کی حمایت کی۔ اس پر پاپائی اخبار دن نے شہنشاہ کو ہر ایماندار کیتھولک کی مخالفت کی دہلی دی کر بتایا کہ پاپا کے ساتھ مقابلہ کرنا کچھ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس میں حکومتیں تہ دبلا ہو سکتی ہیں اور ہو کر رہیں گی۔ ہر شخص جو ذرا بھی سمجھ رکھتا تھا اچھی طرح جان گیا کہ امر ماہ النزاع نے اب اس سوال کی شکل اختیار کر لی ہے کہ سلطنت کا اسمعیلی مالک کون ہو گورنمنٹ یا کلیسا۔ روماء؟ دو بادشاہ در اتالیعہ نہ گنبد۔ والی مثل ثابت ہو رہی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ لوگ دو حکومتوں کے ماتحت رہ سکیں جن میں سے دونوں ایک دوسرے کا خطیہ کرتی ہوں۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر گورنمنٹ کلیسا سے روماء کے احکام کی متابعت کرنے سے پہلو تہی کرے گی تو دونوں گویا ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ اس طور پر روماء نے جرمنی کو لڑائی پر مجبور کیا اور یہ وہ لڑائی تھی جس میں روماء کی بوجہ تمدن جدید کے حریف بنے۔ ہونے کے صاف زیادتی پائی جاتی ہے۔

گورنمنٹ جرمنی اب اپنے حریف کو پہچان کر یہ مدافعانہ چال چلی کہ محکمہ وزارت عبادات عامہ کے کیتھولک صیغہ کو ایک قلم تخفیف کر دیا۔ یہ واقعہ شائع ہونے کے بعد جرمن پریس میں شہنشاہ پارلیمنٹ میں ایک قانون اس مضمون کا نافذ کیا کہ جو پارسی اپنے عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر موجب نقص امن ہوں گے وہ مستوجب منزع البیعہ فوجداری ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس اصول کو پیش نظر رکھ کر کہ کامیاب دہی جماعت ہوگی جس کے ہاتھ میں مدارس ہوں گے ایک منصوبہ وسیع بیان پر اس غرض سے قائم کیا گیا کہ مدارس کو کلیسا سے علیحدہ کر لیا جائے۔

”جیسوٹ“ فرقہ تمام جرمنی میں اس سازش کا جال پھیلا رہا تھا کہ ایسے مذہبی قانون کی تعمیل رعایا پر فرض نہیں ہے جو حکومت کا بنایا ہوا ہو۔ یہ گویا کھلم کھلا بغارت تھی گورنمنٹ اگر ان باغیوں کی دہلی میں آجاتی تو اس کی خیر نہ تھی۔ ارملان کے اس وقت نے صاف کہہ دیا کہ حکومت کے ان قوانین کی وہ ہرگز متابعت نہ کرے گا۔ جو سوخو کلیسا ہوں گے۔ اس پر گورنمنٹ نے اُس کی تنخواہ روک دی اور یہ دیکھ کر جب تک جیسوٹ فرقہ کا ملک میں قدم ہے گا۔ امن قائم

ہو سکے گا ان کے اخراج کا قصد کر لیا اور جتنے جیوٹ تھے سب ملک پر کر دئے گئے۔  
 ۱۸۷۸ء کے خاتمہ پر جناب تقدس تاب نے ایک خطبہ شائع کیا جس میں اس واقعہ کی طرف  
 اشارہ کرنے کے بعد کہ سلطنت جرمنی میں کلیسا جو رجحان کا تحتہ مشق بنا ہوا ہے۔ آپنے یہ دعویٰ  
 کیا کہ کلیسا اور حکومت کی حدود اور منی کے معین کرنے کا حق صرف کلیسا ہی کو حاصل ہے۔ یہ  
 اصول جس درجہ خطرناک اور ناقابل تسلیم ہے ظاہر ہے اسلئے کہ لفظ اخلاق کلیسا کی اصلاح میں  
 انسان کے جملہ تعلقات باہمی پر حاوی ہے۔ اور کلیسا نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ ہر وہ قوت  
 جو اس کی معین نہیں ہے اس پر جبر کرتی ہے۔ اس خطبہ کی اشاعت کے چند روز بعد یعنی  
 ۴ جنوری ۱۸۷۸ء کو گورنمنٹ نے چار قوانین نافذ کیے:-

(۱) اون وسائل کے انضباط و تعین کے متعلق جن کو اختیار کر کے انسان اپنا تعلق کلیسا سے  
 منقطع کر سکے۔ (۲) کلیسا کے اقتدارات تعزیری کی تفسید و تحدید کے متعلق۔ (۳) قانون تنہیت  
 و تاویبات مذہبی دربارہ ممانعت سزا سے جسمانی و انضباط سزا سے جرمانہ و جلا سے وطن و  
 عطا سے حق پائل بہ ناراضی فیصلہ عدالتہا سے ماتحت بعدالت العالیہ امور مذہبی جبکہ فیصلہ قطعی  
 اور ناطق متصور ہوگا۔ (۴) قانون تعلیم ابتدائی و تقرر پادریان۔ اس چوتھے قانون کو  
 روسے لازمی قرار دیا گیا کہ پادریوں نے غلط خواہ تعلیم پائی ہو اور سرکاری امتحان پاس کیا ہو  
 ورنہ فلسفہ و تاریخ و جرمن علم ادب میں مہارت رکھتے ہوں یہ بھی قرار پایا کہ جو مذہبی مدارس  
 سلطنت کی نگرانی میں قائم رہنے سے انکار کریں وہ بند کر دئے جائیں۔

یہ قوانین حکومت جرمنی کے اس مصمم قصد کو ثابت کرتے ہیں کہ وہ ہرگز اس بات کی  
 روادار نہ ہوگی کہ اٹلی کے چند اوپنچے گھرانے جرمنی میں من مانی کارروایاں کریں اور اسے  
 کٹ پتلی کی طرح تار پر سچائیں۔ بلکہ وہ اپنے گھر کا انتظام اب خود اپنے ہاتھ سے کرنا چاہتی  
 ہے۔ اس مقابلہ کو وہ مذہب اور ایمان کا معاملہ نہیں سمجھتی بلکہ قانون سلطنت اور قانون  
 کلیسا کی فرمانروایانہ مولتوں کا تصادم تصور کرتی ہے۔ باغض دیگر وہ باپائیت کو مذہبی نہیں

بلکہ پولیٹیکل طاقت سمجھتی ہے۔ اور اُس نے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ جرمنی کی دستور سی حکومت کا یہ اعلان لفظاً و معناً علماً و عملاً برقرار رہے گا کہ نہ یہی آزادی کو ہرگز ان فرائض میں مغل نہ ہو چاہیے جو ہر فرد رعایا کے ذمہ دوسرے افراد رعایا اور حکومت کی طرف سے واجب ہیں۔

یہ قول بالکل درست ہے کہ باپائی حکومت میں شان عہدیت نظر نہیں آتی یعنی وہ ایک ہمہ گیر کلیسا نہیں ہے جسکی برکات سے کل مسیحی دنیا مستفیض ہوتی ہو بلکہ اسکا مقصد محض چند اطالوی خاندانوں کو نفع پہنچانا ہے۔ اس کی ہئیت ترکیبی پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باپا کر دینال اسقف اور کر دینال شماس سب کے سب اطالوی ہیں۔ کر دینال تخصیص تقریباً سب کے سب اطالوی ہیں۔ روما کی مجلس مقدسہ کے اعضاء و اعلیٰ سب کے سب اطالوی ہیں مقرون متوسطہ سے لے کر آج تک فرائض کا ایک بھی باپا نہیں ہوا۔ یہی حال آسٹریا پرتگال اور اسپین کا ہے۔ باوجود اُن کوششوں کے جو اس اختصاص کے خلاف وقتاً فوقتاً عمل میں لائی گئی ہیں اور باوجودیکہ سبھی طرح کے جتن کیے گئے ہیں کہ کلیسا کے مناسب جلیلہ کا دروازہ تمام کیتھولک دنیا کے لیے بلا امتیاز کھول دیا جائے لیکن ممکن نہیں کہ کوئی غیر ملکی کرسی مقدس تک پہنچ سکے۔ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کلیسا ایک سلطنت ہے جو خدا نے مخصوص طور سے اٹلی ہی کے امرا کو عطا فرمائی ہے۔ موجودہ مجلس کر دینالان کے پچھن ارکان میں سے جالیس اطالوی ہیں حالانکہ اعضاء اُن کی تعداد آٹھ سے زیادہ ہونی چاہیے تھی۔

ترقی یورپ کی چلتی گاڑی کی راہ میں حکومت کی دو عملی نے روڑا اٹھا رکھا ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ ہر قوم کے دوا و شامہوں ایک دینی یعنی داخلیہ اور ایک دینی یعنی خارجیہ جبکہ مختلف ممالک جدا جدا فرمان رواؤں کے ماتحت ہوں اور ان سب کا ایک فرمان روا باپا سے روما ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ تالیخ میں ہکو بجز ان متخالف و متعارض



طاقون کی رقیبہ جدوجہد کی داستان کے اور کوئی سبق آموز حقیقت نظر آئے؟ جو شخص ان دانتات کا بغیر غور مطالعہ کرے گا اُسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ تو مین جھون نے فنونیست کے عنصر کو اپنی حکومت سے خارج کر دیا ہے سب سے زیادہ ترقی یافتہ مین اُس پر فاضل کی حقیقت منکشف ہو جائے گی جس نے فرانس کو عضو معطل بنا رکھا ہے۔

ایک طرف تو فرانس یورپ کا مقتدا و پیشوا بننا چاہتا ہے۔ اور دوسری طرف عہد ماضی کی اس لاش سے ہم آغوش ہے۔ جس کی ہڈیاں بھی گل کر چو نہ ہو گئی ہیں یعنی طبقہ جہلا و عوام کے خوش رکھنے کی غرض سے وہ طرز عمل اختیار کرتا ہے جس کی وقت اُس کی عقل سلیم کی نظروں میں خاک بنیں ہو سکتی۔ جن دو حکومتوں کا فرانس مین دور دورہ ہے وہ یہاں تک مادی القوت ہیں کہ کبھی ایک کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ کبھی دوسرے کو اور بار بار ایسا بھی اتفاق پیش آتا ہے کہ ایک قوت دوسری قوت کو اپنے اغراض کی تکمیل کا آلہ بنا لیتی ہے لیکن اس دو عملی کے خاتمہ کا وقت اب قریب آتا جاتا ہے۔ شمالی اقوام کو جو تحیلات

بارہ و توہمات باطلہ میں اس درجہ مبتلا نہ تھیں یہ فنونیت مدت سے ناقابل برداشت ہو گئی تھی اور اوہنوں نے علی رغم الف روم اس کا جواب اپنے کندھے سے اتار پھینکا تھا جس کی قسمت دوسری قوموں سے اچھی تھی۔ کبھی بھی کسی غیر قوت کا روحانی حلقہ بگوش نہ بنا۔ وہ دیکھ کلیسا سے یونان کی رسموں ہی کو اپنا سرمایہ نجات تصور کرتا تھا۔ اور پاپائیت کو لفرانسیست قرن اولی میں مفیدانہ رختہ اندازی سے تعبیر کرتا تھا۔ اہرکے مین امور دنیا و دین بالکل الگ الگ کر دئے گئے ہیں۔ مذہب کو حکومت مین دست اندازی کرنے کی مطلق اجازت نہیں اگرچہ باقی ہر اعتبار سے اُسے پرمی آزادی حاصل ہے نئی دنیا کی حالت دیکھ کر ہمیں یطینا

لے دو سال ہوئے کہ فرانس بھی اس دو عملی حکومت کی قید سے آزاد ہو گیا۔ مذہب حکومت سے بالکل بے دخل کر دیا گیا اور اب فرانسیسی گورنمنٹ کا شاہی مذہب نام کو لفرانسیست لیکن فی الحقیقت مذہب ہے۔ مترجم

بھی ہوتا ہے کہ ضرورت کے دونوں فرقوں یعنی کیتھولک اور پریسٹنٹ کی قوت بایلیگی و انفرع سلب ہو چکی ہے۔ ان کی جو حدود ایک عرصہ سے معین ہو چکی ہیں ان سے یہ دونوں متجاوز ہونے کے قابل نہیں رہے۔ کیتھولک اقوام کیتھولک ہیں اور پریسٹنٹ پریسٹنٹ۔ پریسٹنٹوں کے دل سے فرقہ بندی کا خیال دور ہو رہا ہے۔ ان کے اخلافاً سنئے جاتے ہیں۔ مختلف فرقوں کے افراد کا میل جول بڑھتا جاتا ہے۔ ان کی آراء و عقائد مروجہ کا ماخذ کلیسا نہیں ہے بلکہ اخبارات و رسائل ہیں +

جس جدوجہد کا ذکر ہم نے کیا ہے اس کے لحاظ سے پاپائے پائس تاسع کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ اول یہ کہ پاپائیت کی قوتیں ایک مرکز پر لا کر جمع کر دی جائیں اور یہ مرکز ایک مطلق العنان روحانی مقتدا ہو جسے ربانی اقتدار حاصل ہوں۔ دوسرے یہ کہ جو اقوام سچی المذہب ہیں ان کے عقلی نشوونما کی ہاگ پاپا کے ہاتھ میں آجائے مقصد اول الذکر کا کوئی اور نتیجہ بجز سیاسی مداخلت کے ہو ہی نہیں سکتا۔ پاپائے موصوف کو اصرار تھا کہ دنیوی طاقت ہر حال میں دینی طاقت کے تابع ہو اور ہر دفع قانون جو کلیسا کی اغراض کا حامی نہ ہو منسوخ کر دیا جائے۔ اس لئے کہ ایسا قانون اہل ایمان کے لئے واجب الاتباع نہیں ہے۔ گزشتہ اوراق میں ہم محل طور پر محض ان پیچیدگیوں کا ذکر کر آئے ہیں جو اس اصول کو برقرار رکھنے کی کوشش کے باعث واقع ہو چکی ہیں +

اب ہم اس طریقہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو پاپائیت نے اپنی عقلی حکومت کے قیام کے لئے تجویز کیا ہے۔ یعنی ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس نے اپنے اور اپنے حریف سائنس کے باہمی تعلقات کی تعریف و تعین کن الفاظ میں کی ہے۔ ازمنہ وسطی کی حالت کے احیاء کی کوشش میں اس نے تنہا جدید کی کیوں کر مخالفت کی ہے اور بنائے حال کو کس کس طرح سے کو سا ہے

مکتوب عمومی و تلخیص میں جو اصول مندرج ہیں انہیں وٹیکن کونسل قوت سے فعل

میں لانے کی آرزو مند تھی۔ تیغیوں میں ان لوگوں کی تکفیر کی گئی ہے جو عقیدہ ہمہ دوست کے قائل ہوں یا پجری ہوں یا مطلقاً استدلالی و معقولی ہوں۔ اور اس قسم کے عقائد کو مورد نفرت قرار دیا گیا ہے کہ خدا کائنات ہے۔ خدا اور قوت متراوقات ہیں۔ امور دین پر بھی اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہئے جس حیثیت سے مسائل فلسفہ پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ وہ طریقے اور اصول جنہیں متکلمین زمانہ قدیم نے دینیات کی حمایت کے لئے اختیار کیا تھا مقتضیات زمانہ حال و ترقی سائنس کے لحاظ سے سوزوں و مناسب نہیں رہے۔ ہر شخص آزاد ہے کہ جس مذہب کو ازروئے عقل سچا سمجھے قبول کر لے۔ کلیسا کے اقتدارات کی تعین و تحدید کا حق حکومت کو حاصل ہے۔ کلیسا کو جبر یا بالواسطہ و بلاواسطہ قوت سے کام لینے کا حق حاصل نہیں۔ کلیسا کو حکومت اور حکومت کو کلیسا سے الگ کر دینا چاہئے۔ اب یہ امر قرین مصلحت نہیں رہا کہ حکومت کا مذہب عبادت کے باقی تمام طریقوں کی نفی کر کے کیتھولک مذہب ہی قائم رہنے دیا جائے۔ جو لوگ کیتھولک مالک میں اگر سکونت پذیر ہوں انہیں اپنا طریقہ عبادت علانیہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ پاپائے روما کو تمدن جدید کی ترقی کے ساتھ اتفاق و موافق ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے بھی تیغیوں میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ کلیسا کو مدارس عامہ کی نگرانی کا کامل اختیار حاصل ہے۔ اور حکومت کو ایسا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ نخل اور طلاق کے معاملات بھی کلیسا کے حیز اقتدار میں داخل ہیں +

ان میں سے وہ اصول جنہیں کونسل نے بالفعل شکل ضابطہ مرتب کرنا قرین مصلحت سمجھا ایک رسالہ میں جس کا نام ”کیتھولک مذہب کا دستور عقائد“ ہے درج کر دیئے گئے ہیں اب ان عقائد کے مہات الامور خصوصاً مذہب اور سائنس کے تعلقات باہمی پر غور کرنا ہے۔ تیغی نہ رہے کہ سطور ذیل اس رسالہ کا مکمل اقتباس پیش نہیں کرتیں بلکہ ان کے فریضہ سے صرف ان اجزاء کا خلاصہ درج کیا گیا ہے جو ضروری الاظہار ہیں +

رسالہ کی تہد ایک مناظرانہ تقریر پیش کرتا ہے جس میں واقعہ اصلاح کینڈہ کے اصول و نتائج پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے :-

”اُس ربانی اقتدار کی نفی کرنے کے باعث جو کلیسا کو دین برحق کے حقائق کی تعلیم کے متعلق حاصل ہے اور جہلہ امور متعلقہ مذہب کو برہنہ کے اجتہاد ذاتی کے حوالے کرتا کی بدولت متعدد فرقے پیدا ہو گئے ہیں اور ان فرقوں کے باہمی اختلاف و نزاع سے نہ صرف بہت سے لوگوں کے دل سے یسوع مسیح کا ایمان زائل ہو گیا بلکہ کتب مقدسہ کا شمار افسانوں اور فرضی روایتوں میں ہونے لگا۔ لوگ مسیحیت کے منکر ہو گئے اور اس کے بجائے محض عقل بقول خود نیچر کی تعلیم کی پیروی کرنے لگے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے جو ہمہ اوست مادیت اور دہریت کے قریب جا کر رہے ہیں۔ اور فطرت انسانی کے استدلالی پہلو کو نظر انداز کر کے اور نیکی و بدی کے ہر قاعدہ کو پس پشت ڈال کر جماعت انسانی کا اخلاقی شیرازہ بکھرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ ان معتقدات فاسدہ و بدعات سیئہ کی چونکہ ہر جگہ اشاعت ہو رہی ہے لہذا بہت سے کیتھولک بھی ان کے دام مزدوری میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے سائنس کو جس کا ماخذ انسان ہے مذہب کے ساتھ جو ربانی الاصل ہے ملا کر خلط بھٹ کر دیا ہے۔ لیکن کلیسا جو ابوالا ائم اور سید الاقوام ہے کمزوروں کی قوت اور ناتوانوں کا سہارا ہے جو راہ گم کردہ اُس کے آغوش عاطفت میں آکر عافیت گزین ہونا چاہیں انہیں پناہ و پناہ کے لئے تیار ہے اور جس رستہ سے وہ بھٹک گئے تھے اُس پر انہیں نئے سرے سے ڈالنے کے لئے آمادہ ہے۔ اسی لئے کل دنیا کے اساتذہ اس مجلس عمومیہ میں اکٹرا کر جمع ہوئے ہیں اور چونکہ روح القدس بھی اس جلسہ میں نزول اجلال فرما کر ہمارے اجتماعات میں شریک ہے لہذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پطرس کی کرسی سے مسیحی نجات کے عقیدہ کا اعلان کریں اور اُن بدعات کو جو اس عقیدہ کی مخالف ہیں سر زمین اعتقاد

سے قاطبۂ خاج کر دیں +

”خدا کی حقیقت جو آخریندہ کون و مکاں ہے :- مقدس رومن کیتھولک کلیسا جو <sup>سلیمن</sup> مسیح کی یادگار ہے یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ خدا نے جی و برحق ایک ہے جو آسمان و زمین کا خالق و مالک - قادر مطلق - ازل و ابدی - لا تعد و لا تحصر - برتر از فہم و قیاس - غیر متناہی العقل الارادہ اور من کل الوجہ کامل ہے - و کائنات سے جدا اور متمازن ہے وہ اپنی مشیت مطلقہ کی تحریک پر دو مخلوق ہستیوں کو عدم سے وجود میں لایا جن میں سے ایک روحانی ہے دوسری جسمانی ایک لہو ہوتی ہے دوسری ناسوتی - اس کے بعد اُس نے فطرت انسانی کو بنایا جو ان دونوں سے مرکب ہے - اس کے علاوہ خدا اپنی تائید سے تمام چیزوں کی حفاظت اور انتظام کرتا ہے اور اُس کا جلال و جبروت اقصائے کائنات پر محیط ہے اُس کے نظم و نسق میں موزونی و ترتیب پائی جاتی ہے - و ہمہ دان و ہمہ میں ہے - اور و بابتیں بھی اُس سے پوشیدہ نہیں ہیں جو اُس کی مخلوقات کے آزادانہ افعال کے وقوع میں آتی ہیں +

”الہام کی حقیقت :- کلیسا نے مقدس کا عقیدہ ہے کہ اگرچہ خدا کی ذات عقل انسانی کے قدرتی نور کی روشنی میں صاف صاف نظر آ سکتی ہے لیکن اُس کی یہ بھی مرضی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے مقدرات کو فوق العادت طور پر ظاہر کرے - یہ فوق العادت الہام ٹرنٹ کی مقدس کونسل کے اجتہاد کے مطابق عموماً متیق وجہ دید کے اُن نسخوں میں مندرج ہے جن کی توحیح کونسل نے کی ہے اور نیز کتب مقدسہ کے لاطینی نسخوں میں موجود ہے - یہ کتابیں اس وجہ سے مقدس ہیں کہ اُن کے املا میں روح القدس کا تصرف شامل تھا - ان کا مصنف خدا ہے اور ربانی تصانیف ہونے کی حیثیت سے وہ کلیسا کے حوالے کی گئی ہیں +

”اس عرض سے کہ یحییٰ اور یحییٰ طبیعت کے لوگ آیات آسمانی کی غلط تفسیر و

تاویل نہ کرنے پائیں بہ تجدید اجتہاد مجلس رٹٹ یہ فرمان صادر کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کتب مقدسہ کے معانی اُن معانی سے مختلف نہ بیان کرے جو کلیسا نے مقدس نے بیان کئے ہیں کہ اُسی کو اس قسم کی مفسری سزاوار ہے \*۔

”ایمان کی حقیقت یہ ہے چونکہ انسان بندہ ہے اور خدا اُس کا آقا ہے اور چونکہ عقل حادث حقیقت ازلی کی کمال طور پر طبع و منقاد ہے لہذا انسان کا فرض ہے کہ جب کوئی الہام منجانب اللہ صادر ہو تو اُس پر ایمان لائے۔ ایمان ایک سعادت ہے جو بزر و بازو نہیں حاصل ہوتی بلکہ یہ ایک جوہر باوراء العادوت ہے جسے خدا کی دین سمجھنا چاہیئے جو شخص آیات آسمانی کو برحق سمجھتا ہے نہ اس لئے کہ اُن میں وہ فطری حقائق پوشیدہ ہیں جن کے سمجھنے پر عقل انسانی قادر ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ان آیات کی تنزیل کا ماضی جناب باری ہے اُس کے لئے ایمان ذریعہ نجات ہے پھر بھی اس خیال سے کہ عقل اور ایمان میں توافق قائم ہو سکے خدا نے الہام پر معجزوں اور پیشین گوئیوں کا اضافہ فرما دیا جو اُس کی قدرت کاملہ و حکمت بالغہ کے مظاہر ہونے کے لحاظ سے ایسی جہتیں ہیں جن کو عوام و خواص یکساں سمجھ سکتے ہیں۔ ان جہتوں کا اظہار حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیاء کے ذریعہ سے عموماً اور جناب مسیح کے ذریعہ سے خصوصاً ہوا \*۔

”کوئی شخص ایمان لائے بغیر اپنی فطرت کے حق سے عمدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کوئی شخص تا وقتیکہ مرتے دم تک اُس کا ایمان سلامت نہ رہا ہو ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کے ذریعہ سے کلیسا کو اپنی الہامی آیات کا محافظ و معلم قرار دیا۔ کیونکہ صرف کلیسا نے کیتھولک ہی اُن نشانات آسمانی کا مورد و مبط ہے جن سے دین مسیحی کا مفید یقین ہونا ظاہر ہو سکتا ہے۔ اور یہی نہیں خود کلیسا اپنی حیرت انگیز تبلیغ، اپنے فیف الشان تقدس، اپنی بے پایاں خیر و برکت اپنے ہمہ گیر اتحاد اور اپنی غیر متزلزل استقامت سے اس دعویٰ کی تائید کر رہا ہے کہ

وہ ایمان وایقان کا حقیقی واصلی مرکز ہے اور بلا خوف و تردید اس بات کا ثبوت دے گا ہے کہ اُس کی ماموریت مغائب اللہ ہے۔ اس طور پر کلیسا اپنے بچوں کو بتاتا ہے کہ اُن کا ایمان ایک نہایت مستحکم بنیاد پر قائم ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن لوگوں کی حالت میں جنہوں نے ایمان کی تائید آسمانی کی بدولت کیتھولک مذہب قبول کر لیا ہے اور اُن لوگوں کی حالت میں جنہوں نے عقل انسانی کو اپنا پیشوا قرار دے کر ایک جھوٹا مذہب اختیار کر لیا زمین آسمان کا فرق ہے۔

”عقل اور ایمان کی حقیقت :- اس کے علاوہ کلیسا کیتھولک کا ہمیشہ سے عقیدہ ہے اور اب بھی ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں اور ہر قسم باعتبار اپنی اصل اور غایت کے ایک دوسری سے مختلف ہے۔ اختلاف اصلی تو اس لحاظ سے ہے کہ ایک بذریعہ عقل فطری معلوم ہوتا ہے دوسرا بذریعہ ایمان۔ اور اختلاف غایت اس اعتبار سے ہے کہ علاوہ اُن حقیقتوں کے جن کا انکشاف عقل فطری کی وسعت سے ہو سکتا ہے ہمارے ایمان کے سامنے اُن اسرار و غوامض کو پیش نظر کیا جاتا ہے جن کا راز سرمد خدا ہی کو معلوم ہے اور تا وقتیکہ وہی اُن کو بذریعہ ایمان ظاہر نہ کرے اُن کی حقیقت کا علم ہم کو نہیں ہو سکتا۔“

”اُس میں شک نہیں کہ اگر عقل ایمان کی روشنی سے منور ہو اور اپنی تلاش و جستجو میں استقامت و رزانت سے کام لے تو وہ خدا کی عنایت سے توسط اُن اشیاء کے تشل کے جو قدرتی طور پر معلوم ہیں اور توسل اس تعلق کے جو اسرار و غوامض متذکرہ کو ایک دوسرے کے ساتھ اور انسان کی عاقبت کے ساتھ ہے ان اسرار و غوامض کی کنہ تک ایک محدود مگر بدرجہ غایت مفید پیرایہ میں پہنچ سکتی ہے۔ لیکن محال ہے کہ عقل کبھی بھی ان اسرار و غوامض کو کمال طور پر اُن حقائق کی طرح سمجھ سکے جو اس کا ضیوع اصلی میں اس لئے کہ خدا کے بھید اپنی نوعیت کے اعتبار سے عقل حادث و مخلوق کی

رسائی سے اس قدر دور ہیں کہ الہام کی تلقین اور ایمان کی تصدیق کے بعد بھی ان پر ایمان ہی کی نقاب پڑی رہتی ہے جو اُس وقت تک نہیں اٹھتی جب تک کہ مرغِ نوح قفسِ عنصری سے آزاد نہیں ہو لیتا۔

”لیکن اگرچہ ایمان برتر از عقل ہے تاہم ان دونوں میں حقیقی تناقض کبھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جو خدا کشفِ اسرار اور سرچشمہ ایمان ہے وہی روحِ انسانی کو عقل کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ خدا اپنی ترویذ آپ نہیں کر سکتا اور ایک حقیقت دوسری حقیقت کی ضد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر عقل و ایمان میں ظاہر بینوں کو تناقض نظر آئے تو اس کی مثال بالکل سراسر کی سی ہے جو فریبِ نظر کا کرشمہ ہے۔ ایسے تناقض کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یا تو ایمان کی حقیقت اُس طور پر نہیں سمجھی اور سمجھائی گئی جس طرح کلیسا دراصل اُسے سمجھتا ہے اور یا بعض لوگوں کے یہود و راہبوں اور جیلوں کو غلطی سے مقتضیاتِ عقل کا مترادف خیال کر لیا جاتا ہے۔ پس ہم ہر اُس ادعا کی نسبت باطل ہونے کا فتویٰ صادر کرتے ہیں جو ایمان کی روشن حقیقت کی ضد ہے مزید برآں کلیسا کو جو تبلیغ کے رسولی منصب کے علاوہ ایمان کی حفاظت و حیانت کی خدمت پر بھی مامور ہے یہ اقتدار بھی مستجابِ اللہ حاصل ہے بلکہ یہ بات منجملہ اُس کے ربانی فرائض کے ہے کہ علمِ باطل کو حرام قرار دیا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ فلسفہ اور تزویر کے دام میں گرفتار ہو جائیں۔ اسی لئے تمام ایمان والے مسیحیوں کو یہ تقید فرائض کی جاتی ہے کہ نہ صرف اُن آراء کی حمایت سے مطلقاً باز کریں جو سامٹن کے جائز مسلمات سمجھے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں مغائرِ لایان ہیں اور کلیسائے خصوصیت کے ساتھ انہیں عقائدِ فاسدہ کی فہرست میں داخل کر دیا ہے بلکہ اُن کا یہ فرض ہے کہ ایسی آرا کو منجملہ اُن غلطیوں کے تصور کریں جنہوں نے مسیحائی کی فریب و ٹٹل اختیار کر رکھی ہے۔

”نہ صرف یہ بات ناممکن ہے کہ عقل اور ایمان میں تخالف واقع ہو بلکہ وہ اور



اٹنا ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں یعنی ادھر تو عقل سلیم ایمان کی بنیاد قائم کرتی ہے اور ایمان کی مشعل ہاتھ میں لے کر حقائق آسمانی پر روشنی ڈالتی ہے۔ اور اُدھر ایمان عقل کو غلطیوں میں مبتلا ہونے سے بچاتا ہے اور انواع و اقسام کے معارف و حقائق سے اس کے سرمایہ اور اک میں اضافہ کرتا ہے پس کلیسا انسانی علوم و فنون کا مخالف نہیں ہے بلکہ اُن کا حامی و مؤید ہے۔ وہ اُن فوائد سے بے خبر نہیں ہے جو علوم و فنون کی بدولت انسان کو حاصل ہیں اور نہ اُن فوائد کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بخلاف اس کے اُس کو اس امر کا اعتراف ہے کہ چونکہ ان علوم و فنون کا ماخذ خدا ہے جو الٰہک علم ہے لہذا اگر ان سے صحیح صحیح طور پر فائدہ اُٹھایا جائے تو ان کا اکتساب تائیدِ ایزدی سے موجبِ بزرگوں شناسی ہو گا۔ کلیسا اس بات کی بھی مانعت نہیں کرتا کہ یہ علوم اپنے اصول اور طریقوں سے اپنی اپنی جائز حدود کے اندر کام نہ لیں لیکن اس وجہی آزادی کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی کلیسا اس احتیاط کو بھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا کہ کہیں یہ علوم تعلیم ربانی کی نفی کرنے سے غلطیوں میں نہ پڑ جائیں اور اپنی جائز حدود سے متجاوز ہو کر ایمان کا شیرازہ نہ بکھیر دیں +

”ایمان کی مہم من الہی کسی فلسفیانہ اکتشاف کی طرح انسانی عقل کے ذریعہ سے نہ کیا کہ کو پونچھنے کی محتاج نہیں ہے بلکہ ایمان کو کامل و مکمل شکل میں ودیعت سے یعنی کلیسا کے حوالے کر دیا گیا ہے تاکہ جان سپاری کے ساتھ اُس کی حفاظت کی جائے اور پاک اور بے لوث صورت میں اُس کی اشاعت کی جائے۔ اسی لئے دین مقدس کے کل مسائل کے معانی کلیسا کے مفہوم کے لحاظ سے بیان کئے جانے چاہئیں اور یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ مفہوم نہ وضاحت کے بہانہ سے ان معانی میں کوئی ترمیم یا تفسیر روا رکھا جائے پس صدیوں کی رہنمائی کے اُلٹنے اور انسان کی متواتر نسلوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ عقل و فہم اور علم و دانش کی سرریح الہیہ ترقی اشخاص کے لئے

منقرض اور کلیسا کے لئے مجتمعاً جائز قرار دی جاتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ ترقی بہ اعتبار قسم اپنی حد سے متجاوز نہ ہو یعنی مسائل ایمان کے مفہوم و معانی و عقیدہ میں کسی قسم کی خارجی آمیزش نہ ہونے پائے۔

منجملہ دیگر ادا مرد و فداہی کے حسب ذیل امور بھی منہیات میں داخل کئے گئے۔  
”لعنت ہو اُس پر۔“

”جس کا یہ ایمان نہیں ہے کہ خدا نے برحق ایک ہے جو تمام دیکھی اور ان دیکھی چیزوں کا خالق اور مالک ہے۔“

”جو شیخ چشتی کی راہ سے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یحزماں کے اور کسی شے کا وجود نہیں ہے۔“  
”جو یہ کہتا ہے کہ ذات باری اور باقی نام اشیا بلحاظ جوہر ترکیبی واحد لخص و مشترک الاصل میں۔“  
”جو یہ کہتا ہے کہ موجودات جسمانی و روحانی جن کی ہستی محدود ہے یا کم از کم موجودات روحانی کا منجھ جوہر ذات باری ہے یا یہ کہ جوہر ربانی اپنے ہی مظاہر یا اپنی ہی ترقی یافتہ شکل کے ذریعہ سے کائنات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔“  
”جس کو اس حقیقت کا اعتراف نہیں ہے کہ خدا نے کون و مکان کو نیست سے ہست کیا۔“

”جس کا یہ قول ہے کہ انسان اپنی ذاتی کوششوں سے بذریعہ ارتقاء جاری بالآخر حق و خیر کو دریافت کر سکتا ہے اور اُسے ایسا کرنا چاہئے۔“  
”جو کتب مقدسہ کو مرث کی مقدس کونسل کی توضیح کے مطابق کلاً یا جزاً مقدس اور مدار حجت شرعیہ ماننے سے انکار کرتا ہے یا اُن کے الہامی ہونے سے منکر ہے۔“  
”جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ عقل انسانی اس درجہ آزاد و مطلق العنان ہے کہ خدا اُس سے پابندی ایمان کا خواہاں نہیں ہو سکتا۔“

”جس کا یہ قول ہے کہ الہام ربانی خارجی شہادتوں کی بنا پر قرین اعتبار و مفید

یقین نہیں ہو سکتا +

”جو یہ کہتا ہے کہ معجزہ نہیں ظاہر کئے جاسکتے یا یقین کے ساتھ ان کا کبھی علم نہیں ہو سکتا اور مسیحیت کا سادہ الاصل ہونا ان کے ذریعہ سے کبھی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔“  
”جو یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ الہام ربانی منحصر اسرار سے عاری ہے اور جملہ معتقدات تربیت یافتہ عقل کی مدد سے سمجھ میں آسکتے اور ثابت کئے جاسکتے ہیں +“  
”جس کا یہ اعتقاد ہے کہ علوم انسانی کی تحصیل میں اس درجہ آزادی سے کام لینا چاہئے کہ ہر شخص ان کے ادعا کو صحیح باور کرنے کا مجاز ہو خواہ ایسے ادعا الہامی تعلیم کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو +“

”جو اس بات کا قائل ہے کہ ممکن ہے کہ ترقی سائنس کے دور میں ایک زمانہ ایسا آئے جبکہ کلیسا کے معتقدات کا مفہوم اس مفہوم سے بالکل ہی بدل جائے جس کے لحاظ سے کلیسا نے آج تک ان معتقدات کی تاویل کی ہے +“

یہ فیصلجات و فتاویٰ جن عجیب و غریب بلکہ جن بے باکانہ و شوخ چٹانہ و عادی پر متضمن ہیں انہیں تعلیم یافتہ اور روشن خیال کیتھولک جماعت استخوان و اطمینان کی نظر سے نہ دیکھ سکی۔ جرمن یونیورسٹیوں کی طرف سے تو ان دعاوی کی دل کھول کر مخالفت کی گئی اور جب ختم سال پڑ وٹیکن کونسل کے احکام عام طور پر تسلیم کر لئے گئے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ احکام مبنی بر صحت و صداقت ہیں بلکہ محض موڈ بانہ متابعت کے اقتضا سے بہت سے متقی و پرہیزگار کیتھولک علما کو اس تمام کارروائی اور اس کے نتائج پر کمال رنج و افسوس ہوا چنانچہ ایک فرانسیسی پادری ہیماںتھ اپنے طبقہ کے مقتدا کو ایک خط ان الفاظ میں لکھتا ہے: ”کلیسا کا جو ہمارا مبداء ایمان ہے افسوس صدی کے تمدن سے جس کی ہم دینیوی اولاد ہیں اور جس کے بہت سے فرائض و حقوق ہمارے ذمہ واجب الادا ہیں اس طور پر بجا کر دیا جانا ایک ایسا فعل ہے جس میں معصیت اور

حماقت کی مسادی آمیزش پائی جاتی ہے اور میں اس افتراق کو بہت ہی قابل ملامت سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اگر لاطینی قوم میں عموماً اور فرانس کی آبادی میں خصوصاً تمدنی اخلاقی اور مذہبی بنیاد کی آگ بھڑک اٹھی تو اس کی وجہ کیتھولک مذہب نہ ہوگا بلکہ کیتھولک مذہب کا طریقہ تاویل و طرز عمل ہوگا جس نے ایک مدت سے اس دین کی صورت مسخ کر رکھی ہے ۴

بادجو دیک جناب پاپائے مقدس کو معصوم ہونے کا ادا دعا تھا جس کے بالفاظ دیگر یہ معنی تھے کہ آپ ہر داں و علام الغیوب ہیں پھر بھی آپ کی روح القدسی بصیرت بنگ فرانس و جرمنی کے نتیجے کے متعلق پیش بینی نہ کر سکی۔ اگر آپ کو ملکہ نبوت عطا ہوا ہوتا تو عجب شناسی کی قابلیت آپ کے حصہ میں آئی ہوتی تو آپ پر اپنی کونسل کے اجتہادات کی غیر موزونی و موقع ناشناسی کی حقیقت کھل گئی ہوتی لیکن کہاں کی عصمت اور کہاں کی نبوت۔ یہاں تو مطلب سعدی کچھ اور ہی تھا۔ پاپا کی اس درخواست کو کہ اس کے دنیوی اقتدار کے برقرار رکھنے کے لئے کچھ فوج بطور کمک بھیجی جائے شاہ جرمنی نے رو کر دیا۔ خاج الکلیسا شاہ اٹلی نے روم پر قبضہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ پاپا نے جھنجھلا کر یکم نومبر ۱۸۷۰ء کو ایک مکتوب عمومی صادر کیا جس کی تلخی اور ششی تاج کل کی بین الاقوامی مراسلت کے مذہب اور شائستہ لہجہ کے ساتھ نسبت تفصلاً درکھتی ہے۔ اس مکتوب میں جناب تقدس تاب نے دربار پیڈمانٹ کی کارروائی کو ہدف سهام مظاہرین و ملاحظین بناتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کارروائی کے بانی مبانی اس فریق کے مشورہ پر کاربند ہوئے ہیں جس کے لئے خسران آخری مقدہ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد یہ ارشاد

۱۱۱۹۸ اٹلی کا شالی صوبہ جس کے ٹال کی طرف سوئٹزرلینڈ اور مغرب کی طرف فرانس واقع ہے رقبہ ۱۱۱۹۸

مربع میل اور آبادی ۱۱۱۹۸ میں ۳۲۶۳۳۱۱ نفوس تھی +

ہوا ہے کہ مابہ دولت حالت قید میں ہیں اور گروہ اشرار و شیطین کے ساتھ کسی باب میں اتفاق نہیں کر سکتے۔ پھر اپنی مخالفین پر اخراج اکبر یعنی عدم شرکت کینسد کی حد اخیر جاری کرتے ہوئے سب و شتم اور تاوان و سزا کا انتہائی فتویٰ بھی صادر کیا ہے اور دو شیخہ مریم مادر خدا اور مرسلین مقدس پطرس و پولوس کی شفاعت کے خواستگار ہوئے ہیں +

مختلف پرنسٹن فرقوں میں سے بعض نے مجلس اتحاد انجمنی کے نام سے ایک انجمن بغرض صلاح و مشورہ قائم کر لی تھی۔ اس مجلس کا آخری اجلاس ۱۸۷۳ء کے موسم خزاں میں بمقام نیویارک ہوا۔ اگرچہ اس موقع پر یورپ اور امریکہ کے پرنسٹن کلیساؤں کے بہت سے زاہد و متقی و کلاہ جمع ہوئے تھے لیکن وقعت و سطوت کے اعتبار سے اس مجلس کو اس عظیم الشان مجلس سے کوئی نسبت نہ تھی جس کا اجلاس کلیسا نے سینٹ پیٹر واقع روم میں اس سے کچھ ہی دن پہلے منعقد ہو چکا تھا۔ مجلس اتحاد انجمنی اپنے ہزار سالہ شجرہ نسب کے مقدس تسلسل کا حوالہ نہ دے سکتی تھی اور اس حیثیت سے اپنے دعاوی نہ پیش کر سکتی تھی کہ گویا دو تاجداروں اور تخت نشینوں کی سیم و عدیل بلکہ ان سے بھی بالا و برتر ہے۔ وینیکن کونسل کی کارروائی کے ہر پہلو میں دانشمندانہ تدبیر اور دنیوی حکمت عملی کی شان نظر آتی تھی لیکن مجلس اتحاد انجمنی کے پیش نظر جو مقاصد تھے وہ وضاحت اور یقین سے معرا تھے اور کوئی خاص غایت اس کے انعقاد کا نصب العین نہ تھی۔ اگرچہ اس مجلس کی خواہش یہ تھی کہ مختلف پرنسٹن کلیساؤں کا اتحاد زیادہ کامل و مکمل ہو جائے لیکن اسے قوی اُمید نہ تھی کہ یہ دل پذیر خواہش پوری ہو سکے گی پرنسٹن کلیساؤں کے وجود میں آنے کا باعث نا اتفاقی اور ان کے قیام کا مدار افتراق پر تھا۔ اس مجلس نے اسی اصول کو عملی طور پر ثابت کر کے دکھا دیا +

پھر بھی مجلس اتحاد انجمنی کی کارروائی میں بعض نکتہ آموز و معنی خیز واقعات شامل ہیں یعنی اس نے اپنے اس دیرینہ حریف کو جس نے ابھی حال ہی میں واقعہ اصلاح کو مورد

سطاعن نارودا و ملاعن ناسنر بنایا تھا نظر انداز کر کے وٹیکن کونسل کی طرح اپنی نگاہ سائنس پر جمادی۔ سائنس کے مہبت ناک نام کی آڑ میں اس کے سامنے گویا ایک ایسا جھوٹا پھنٹا دیو کھڑا تھا جو ہر ساعت بڑھ رہا تھا اور جس کی شکل نہایت ہی ڈراؤنی تھی۔ اس عظیم الجثہ و قوی تیہکل دیو سے خطاب کرتے وقت مجلس اتحاد دینی نے بعض دفعہ تو ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے تلق و روا داری کی ہوتی تھی اور بعض دفعہ ایسا الجھا اختیار کیا جو سراپا تعریض و تشنیع تھا۔

مجلس اتحاد کو یہ نظر نہ آیا کہ موجودہ سائنس اور اصلاح کینہہ حقیقی ہی نہیں بلکہ تو احم بہنیں ہیں۔ بطن ارتقا میں ان کا ٹھکانہ ایک ہی وقت میں ہوا اور ان کی پیدائش کی عت ہی ایک ہی ہے۔ مجلس اتحاد نے یہ نہ دیکھا کہ اگرچہ متعارض و متخالف فرقوں کا متحد ہونا محال ہے لیکن سائنس ایک ایسا نقطہ اتصال ہے جہاں یہ سب جمع ہو سکتے ہیں اور ان کا اصلی و حقیقی خاتم اسی میں ہے کہ سائنس کو بے اعتباری کی نظر سے نہ دیکھیں بلکہ اس کے ساتھ مخلصانہ اتحاد قائم کریں۔

اب ہم کیتھولک مسیحیت کے دستور العقاید پر جس حیثیت سے کہ وٹیکن کونسل نے ان عقاید کی تعریف و توثیق کی ہے کچھ خیالات ظاہر کرتے ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک شے مختلف اشخاص کو ایک ہی حیثیت سے دکھائی دے تو ضرور ہے کہ اس پر ایک ہی پہلو سے نظر ڈالی جائے۔ جو مثال اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اہل مذہب اور اہل سائنس کے مقامات مشابہ بالکل الگ الگ ہیں۔ ایسی حالت میں دونوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ فریق ثانی سے یہ خواہش ظاہر کرے کہ واقعات کی جو قطاریں صف بستہ اسے نظر آرہی ہیں دوسرے فریق بھی ان کو ویسا ہی تسلیم کرے۔

دستور العقاید کو اس اصول موضوعہ کے اعتراف پر اصرار ہے کہ کلیسا نے رومائے

من انٹر ہے اور ماورین الکی کا یہ خلعت بلا سہمت و مشارکت اصدے خاص طور پر اسی کو عطا ہوا ہے۔ اس ربانی اقتدار کی بنا پر اس کی یہ خواہش ہے کہ تمام لوگ محققات میں اس کی متابعت اختیار کریں اور تمام اقوام اپنی ملکی حکومت کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دیں +

لیکن ایسے زبردست اور پرشکوہ دعوے کے لئے دلیل بھی ایسی ہی زبردست اور پرشکوہ ہونی چاہئے اور ثبوت ایسا ہونا چاہئے جس کے مافذ کی صحت پر کسی کو اعتراض کی مجال نہ ہو سکے اور یہ ثبوت ضمنی و بالواسطہ وغیر متعلق نہ ہو بلکہ صریحی و موجہ قاطع ہو غرض یہ ثبوت ایسا ہو جس کی تردید ناممکن ہو اور جس کا توڑ نہ ہو سکے +

لیکن کلیسا کا قول ہے کہ اس بات کو جائز نہیں رکھ سکتا کہ اس کا دعویٰ عقل انسانی کی کمزوری پر پرکھا جائے بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ دعوے بلا عین و چرا و بے حیلہ و حجت فوراً بطور اصول ایمان تسلیم کر لیا جائے +

اگر یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے تو اس کے باقی کے مطالبات بھی خواہ وہ کیسے ہی بے اندازہ کیوں نہ ہوں لامحالہ ماننے پڑیں گے +

دستور العقاید نے عقل کا تخیل اور منقصت کرنے میں عجب خود فراموشی سے کام لیا ہے یعنی اول قویہ دعویٰ کیا ہے کہ عقل امور مابہ البحث کا تصفیہ کرنے سے قاصر ہے اور اس کے بعد خود ہی ان امور کی تائید میں براہین و دلائل پیش کر کے عقل سے فیصلہ طلب کیا ہے۔ غرض دستور العقاید کیا ہے۔ ایک التجانامہ ہے جس میں عقل سے نہ جہت یہ تمنا کی گئی ہے کہ اپنی تعلیل و تحقیق کر کے کسی طبع رومانی نصرانیت کو سچا ثابت کر دے +

جب مذہب اور سامنس کے اختلافی پہلو اس درجہ تباہ و متغایر ہیں تو ناممکن ہے کہ دونوں میں حقیقت اشیا کے اظہار کے متعلق تطابق و توافقی پیدا ہو سکے۔ اور نہ اس

ہم کوئی مشترک نتیجہ مترتب ہو سکتا ہے جب تک کہ ان دونوں کا حکم عقل کو نہ قرار دیا جائے اور اس کا قول فیصل نہ سمجھا جائے +

دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں جن میں سے بعض رومانی نصرا نیت سے زیادہ قدیم ہیں اور بعض کے پیروؤں کی تعداد اس کے پیروؤں کی یہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں بجز اس کے کہ عقل سے استصواب کیا جائے ان میں سے ایک کو دوسرے پر کسی طرح ترجیح دی جاسکتی ہے۔ پس ضرور ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں اپنا اپنا دعوے عقل کے دربار میں پیش کریں اور جو کچھ عقل فیصلہ کرے اسے صحیح تسلیم کریں + لیکن پاپائی کو نسل کو اس سے سخت اختلاف ہے۔ وہ ایمان بالغیب کو عقل پر ترجیح دیتی ہے اور کہتی ہے کہ عقل و ایمان علم کی دو علیحدہ علیحدہ شاخیں ہیں ایمان کا شمع اسرار و غوامض میں اور عقل کا واقعات و حقائق۔ اس کا دعوے ہے کہ ایمان کو عقل پر فضیلت حاصل ہے اور جو طبیعتیں متذبذب و مشکلی ہیں ان کی تسکین و معجزوں کا درمیان میں گوئیوں کے ذریعہ سے کرنا چاہتی ہے +

بمخلاف اس کے سائنس ناقابل فہم امور سے روگردانی کر کے دکلف کے اس قول پر تکیہ کرتا ہے کہ خدا انسان کو ان باتوں پر ایمان لانے کے لئے مجبور نہیں کرتا جن میں وہ سمجھ نہ سکے + اور چونکہ اس کا حریف کوئی قابل اطمینان صداقت نامہ جس سے اس کا اعتبار قائم ہو سکے نہیں پیش کر سکا لہذا سائنس یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آیا پاپائیت کی تاریخ یا پاپاؤں کے حالات زندگی سے کوئی ایسی کیفیت تشریح ہوتی ہے جس سے عقل منقول طور پر اس امر کی تصدیق ہو سکے کہ پاپا مامورین اللہ ہیں یا معصوم ہیں یا انکھیں بند کر کے ان کے لئے پر اس حیثیت سے عمل کرنا واجب ہے کہ وہ ناب ضاہیں + دستور العقائد میں ایک نہایت ہی نمایاں لیکن ساتھ ہی متناقض خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ اس نے عقل انسانی کے آگے طوعاً و کرہاً تسلیم ختم کیا ہے۔ اس میں



کیتھولک مذہب پر جہاں من حیث اللفظ نظر ڈال کر اس کا مبنی بر عقل ہونا ظاہر کیا گیا ہے وہاں عام متبذل مذہب کی مکروہ شکل پر پردہ بھی ڈال دیا گیا ہے۔ اس میں آفرینندہ کون و مکان جناب باری کی صفات ان الفاظ میں بیان کی گئی ہیں جن سے خدا کی شان جلالی و جمالی موزوں طور پر آشکارا ہوتی ہے لیکن اس قول کے اعادے سے احتراز کیا گیا ہے کہ یہ خدائے قہار و قیوم جس کا رعب کائنات پر چھایا ہوا ہے ایک مادر خالی کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو ایک یہودی بخار کی بیابستانی بی بی تھی اور اس کے بعد آسمان کی مالکہ ہو گئی جس خدا کی تصویر اس میں کھینچی گئی ہے وہ قرون متوسطہ کا خدا نہیں ہے جو لاکھوں کے ایک گروہ سے گھرا ہوا اپنے سونے کے تخت پر جلوہ گستر ہے بلکہ فلسفہ کا خدا ہے۔ دستور العقاید میں نہ اتنا نیم ملٹہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ نہ مریم عذرا کے اس استحقاق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسے سجدہ ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے بلکہ ضنناؤ کنائیا اس استحقاق کی سختی سے نفی کی گئی ہے۔ نہ عشاء نے ربانی یعنی پادری کے کیسی می عمل سے شراب اور روٹی کو خدا کے خون اور گوشت کی شکل میں بدلنے کا حوالہ دیا گیا ہے اور نہ اولیاءوں سے مراد ہیں مانگنے کے وجوب و حقیقت پر زور دیا گیا ہے۔ غرض اس کے ماتھے پر زمانہ موجودہ کے تخیل کی تقلید اور عقل انسانی کی ترقی کے آثار کا ٹیکا لگا ہوا ہے۔

ذات و صفات، باری کی اس تشریح کے بعد دستور العقاید نے اس مسئلہ کی تلقین کی ہے کہ انتظام کائنات کیونکر عمل رہا ہے۔ کلیسا کا دعویٰ ہے کہ اسے تمام مادی و اخلاقی حوادث پر مآوراہ الطبعی و سترس حاصل ہے۔ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے پادری یا تو اس قیسی قوت کے زور سے جو ان کی جبلت میں ودیعت کی گئی ہے اور یا آسمانی طاقتوں کو دعائوں کے ذریعہ سے اپنا مددگار بنا کر واقعات آئندہ کو اپنی خواہش اور ارادہ کے

سلاہ یعنی قرآن مجید کا خدا ہے۔ مترجم

سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ پاپائے اعظم کا ارادہ مصدر رست و کشادہ ہے۔ اور اُسے حل و عقد کی پوری قدرت حاصل ہے۔ اس کا فیصلہ ناطق اور اس کا فرمان قضا تو اماں ہے۔ اس فیصلہ کی ناراضی سے کسی مجلس عمومیہ میں لہیل وائر کرنا اور اس طور پر گویا یہ ظاہر کرنا کہ کوئی دنیوی طاقت پاپائے بھی اعلیٰ و ارفع ہو سکتی ہے باطل ناجائز ہے۔ اس قسم کے اقتدار پر ایک مطلق العنان اور غیر تہی حکومت میں تو شاید اعتراض نہ ہو لیکن جس حکومت کا نظم و شق قانون غیر متغیر پر مبنی ہو اُس میں ان کو مطلق دخل نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ دستورالقصا نہایت زور سے یہ دعویٰ پیش کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے نظم عالم میں مسلسل دست اندازیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کو ہرگز اس حقیقت کا اعتراف نہیں ہے کہ واقعات قدرت میں ایک غیر ممکن الاندفع توازن اور معاملات انسانی میں ایک ناقابل تغیر تسلسل پایا جاتا ہے۔ لیکن ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا دنیا کے ہر حصہ میں نظام تمدن کی ترتیب یکساں نہیں پائی جاتی رہی؟ کیا انسانی جماعتوں کا نشو و نما افراد کے نشو و نما کے مشابہ نہیں ہے؟ کیا وہ دونوں کو شباب بلوغ اور انحطاط کے مدارج نہیں طے کرنے پڑتے؟ کیا وہ شخص جس نے دنیا کے مختلف ممالک کی آبادیوں کی رفتار تمدن پر غور کیا ہے اور ان ایک سہی حالتوں کو مشاہدہ کیا ہے جو اس تمدن کی ترقی کا باعث ہوتی ہیں صاف نہیں معلوم کر سکتا کہ یہ ارتقاء پابند قانون ہے؟ پیرد کی قوم اٹکا اور فرماں روایان مکسیکو کے مذہبی خیالات اور ان فرماں رواؤں کے آداب و مراسم دربار وہی تھے جو ایک زمانہ میں یورپ میں پائے گئے۔ وہی تھے جو ایشیا میں پائے گئے یعنی ان سب کا رجحان خیال ایک ہی طرف تھا۔ اور ان سب کی ترقی کے دارے کا رخ ایک ہی جانب تھا۔ شہد کی کھیلوں کے ایک ابنوہ کو اگر ان کے وطن سے کسی دور دراز سرزمین میں منتقل کیا جائے تو ان کے چھتے کی ساخت اور ان کا طرز معاشرت اُسی ایک طریقے کا پابند ہو گا جس کو کھیلوں کے دور نامعلوم ابنوہ اختیار کریں گے۔ یہی حال بے تعلق اور دور افتادہ انسانی جماعتوں کا ہے۔

خیال اور فعل کا یہ تعلق و توازن اس درجہ غیر متغیر ہے کہ بعض فلاسفہ تاریخ ایشیا کی مثالوں کو یورپ پر منطبق کر کے بلاتامل یہ دعویٰ پیش کرنے کو تیار ہوں گے کہ اگر اسقف روم اور چند صدیاں ہوں تو ایک غیر خاطمی پاپا خود بخود پیدا ہو جائے گا اور اگر ایک غیر خاطمی پاپا پر کچھ اور مدت مستزاد کی جائے تو لامائیت نمودار ہوگی و لامائیت جسے ایشیا کبھی کا حاصل کر چکا ہے +

موجودات روحانی و جسمانی کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے دستور العقائد نے اپنے اقوال کو ان لوگوں پر تبر کر کے سے شان تاکید و تائیس عطا کی ہے جو مسئلہ انفصال کے قائل ہوں یعنی یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ مظاہر قدرت محض ذات باری کے مظاہر ہیں۔ دستور العقائد کا مسون مرتب کرنے والوں نے ان عقاید کی تکفیر کرنے کو تو کر دی لیکن جو مشکل اس مرحلہ میں انہیں درپیش تھی و ایسی نہ تھی جس کا آسانی مقابلہ کیا جاسکے۔ کیوں کہ ممکن تھا کہ ان پرانے یا نئے زبردست خیالات کی صفیں ان کے مقابل معرکہ آرا نہ ہوتیں جو سرجوں زمانہ میں ارباب فکر و دانش پر اپنا قوی اثر ڈال رہے ہیں۔ اصول بقا و تناسب قوت کا منطقی نتیجہ مشرق کے فرسوں و پیش پا افتادہ مسئلہ انفصال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور مسئلہ ارتقا و مسئلہ نشو و نما علی سبیل التدریج اس عقیدے کی بیخ کنی کر رہے ہیں کہ موالید کی پیدائش وقتاً فوقتاً عمل میں آئی۔ مسئلہ اول الذکر اس اصولی نکتہ پر مبنی ہے کہ کائنات میں قوت کی مقدار غیر متغیر ہے۔ اگرچہ یہ مقدار گھٹ بڑھ نہیں سکتی لیکن ان اشکال کا جن کے ذریعہ سے یہ قوت اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے ایک دوسری میں استحالة ہو سکتا ہے۔ ابھی تک اس نظریہ کو سائنس نے کمال اور بدیہی طور پر ثابت نہیں کیا لیکن جو دلائل اس کی تائید میں پیش کی گئی ہیں وہ کثیر التعداد ہونے کے علاوہ اس درجہ قوی ہیں کہ اس کے مستحکم و مستند ہونے کا خواہی مخواہی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اب اگر ایشیائی مسئلہ انفصال و انجذاب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو اس مہتمم بالشان

نظریہ کے ساتھ توافق ہے۔ اس مسئلہ کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ جب انسانی ہستی صلب کے بدن میں متقل ہوتی ہے تو خدا ایک نئی روح کو عدم سے وجود میں لا کر اس میں چھونک دیتا ہے بلکہ ان اس بات کے متقید ہیں کہ عقل ربانی یا عقل کل پہلے سے موجود ہے اس کا ایک حصہ انسان کے جسم میں ڈال دیا جاتا ہے اور جب اس کی زندگی کے دن پورے ہو جاتے ہیں تو یہ حصہ اسی سرچشمہ حیات میں واپس جا کر مل جاتا ہے جس سے نکلا تھا۔ دستور العقاید کے مصنفین کے نزدیک یہ عقاید فاسد ہیں اور ان کی پیروی کی یہ کہہ کر ممانعت کرتے ہیں کہ ایسے عقائد رکھنے والا شخص مبتلائے عذاب ابدی ہوگا۔

علیٰ بن ابی القاسم انہوں نے ارتقا اور نشو و نما کے جاری کے مسائل کی بہ یک کشش قلم یہ کہہ کر تردید کر دی ہے کہ کلیسا کا عقیدہ یہ ہے کہ موالید کی پیدائش وقتاً فوقتاً ہوتی ہے مسئلہ کہ ہر جاندار شکل کسی شکل سابقہ کا ماحصل ہے سائنس کی رو سے قوت والے مسئلہ کی نسبت زیادہ مل دہر بہن ہے اور جو اضافے حال میں اس پر ہوئے ہیں ان کا خواہ کچھ ہی بشر کیوں نہ ہو لیکن غالباً اصولی طور پر اس کی صحت اور درستی میں کوئی کلام نہیں ہے۔

واقعہ اصلاح پر سب و شتم کی بوجھاڑ کرنے سے کلیسا نے اپنے ان خیالات کو گویا علیٰ لباس پہنا دیا ہے کہ عقل تابع ایمان ہے۔ اس کی نظروں میں اصلاح ایک لمحدانہ بدعت ہے جس نے لوگوں کے لئے ہمہ اوست دہریت اور مادیت کا دام خسراں بچھا رکھا ہے اور جو اس بنیاد ہی کو ڈھا رہی ہے جس پر تمدن کا دار و مدار ہے۔ اسی لئے اس نے ”ان شیخ اور بے چین طبیعت کے لوگوں کی بے راہ روئی کا سد باب کرنا چاہا جنہوں نے بہ تعلیق و تہریر رائے قائم کی ہے کہ ہر شخص کو کتب مقدسہ کی تفسیر و تاویل کا ذاتی حق حاصل ہے“ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ پرائسٹنوں کو کیتھولکوں کے برابر پولیٹیکل حقوق نہ ملنے چاہئیں اور جو شخص اس مساوات کا ادعا کرتا ہے وہ خبیث اور گمراہ ہے۔ اس کا یہ قول ہے کہ پرائسٹنوں سے بہ جبر و تشدد ہمیشہ آنا اور ان کا استیصال کرنا ایک مقدس فرض

ہے اور انہیں مدارس قائم کرنے کی اجازت دینا ایک قابل مفسرین فعل ہے۔ ہاپسے  
گرگوری شانزودہم نے آزادی ایمان کو ایک مجنونانہ حماقت سے تعبیر کیا اور اخبارات کی  
آزادی کے متعلق یہ رائے ظاہر کی کہ اس سے بڑھ کر نابھار اور ناشدنی حرکت اور کوئی  
نہیں ہو سکتی +

لیکن دریائے ٹائبر کے کنارے جو تقدس تاب بزرگوار غیب دانی کی کرسی پر جلوہ  
افروز ہیں ان کی مہم من اللہی و عصمت عن الخطا کا قایل و شخص ہو تو کیوں کر جو جس کو معلوم  
ہے کہ پاپاؤں نے ہمیشہ ایک دوسرے کی تغلیط و تکذیب کی ہے اور پاپا اگر مجاس  
عمومیہ کے منہ آئے ہیں تو مجاس عمومیہ نے پاپاؤں کی خبر لی ہے اور جس سے یہ بات  
پچھی ہوئی نہیں ہے کہ پاپاے سکسٹس خاص کی بائبل میں اتنی سلسلہ غلطیاں تھیں کوئی  
دو ہزار کے قریب ہوں گی، کہ اس نسخہ کے مرتب کرنے والوں کو اس کی اشاعت خود  
روک دینی پڑی؟ کس طرح ممکن ہے کہ ارباب کلیسا ان حقائق کو قریب و غلطیاں اقرار  
دیں کہ زمین گردی اشکل ہے نظام شمسی کا ایک رکن ہے اپنے محور پر گھومتی ہے اور  
آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے؟ و ان اس واقعہ سے کیوں کراہنا کر سکتے ہیں کہ زمین کے  
حصہ متقابل پر بھی انسان آباد ہیں اور ہماری دنیا کے علاوہ اور بھی دنیا میں موجود ہیں؟  
ان دعاوی کو کن دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں کہ دنیا حد مہ سے وجود میں لائی گئی اور  
ایک ہفتہ کی مدت میں اس مکمل شکل میں جو ہمارے پیش نظر ہے بنائی گئی اور اس میں  
کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اس کے اجزاء ایسے ناقص العمل ہیں کہ خدا کو ان نقائص کی تلافی  
و اصلاح کے لئے مسلسل دست اندازی و مداخلت کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے +  
جب پادری سائنس کو حکم دیتے ہیں کہ اپنے عقلی معتقدات کی سپر بھیجک دے  
تو کیا سائنس کو ان سے ان الفاظ میں مخاطب ہونے کا حق نہیں ہے کہ ذرا اپنے  
تاریخی گریبان میں حافظہ کا منہ ڈال کر تو دیکھیں؟ جب زمین کی فیکل اور بہشت و دوزخ

کے موقع کی بحث چھڑی تو پادریوں ہی کو بچا دیکھتا ہوا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ زمین ایک سطح میدان ہے اور آسمان بہشت کا صحن ہے جس کی راہ سے انسان بہشت میں داخل ہوتا ہوئے بکرات و مرآت دیکھے گئے ہیں لیکن یہ دعویٰ غلط اور باطل ثابت ہوا۔ زمین کا کردی شکل ہونا علم ہیئت کے واقعات اور سیکلین کے جہاز کے سفر سے بہ دلائل قاطع ثابت ہو گیا۔ اس کے بعد پادریوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے جو تمام اجرام سماوی اس کے تابع ہیں اور یہ خدا کی عنایات و انصاف کی عموماً خاص ہے جب اس خیال کی بھی قلعی کھل گئی تو انہوں نے اس ادھاک آڑ میں جانپانا لی کہ زمین غیر متحرک ہے اور آفتاب و ثوابت جو بظاہر اس کے گرد حوکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں حقیقت میں بھی گردش کرتے ہیں۔ لیکن جب دور بین کی ایجاد کرنے اس بوسیدہ طلسم کو بھی توڑ دیا تو پادریوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ نظام شمسی کی حرکات کا مدار مدار مداخلت ربانی پر ہے۔ اس قول کو نیوٹن کی کتاب پر پسپا کرنے یہ ثبوت دے کر جھٹلایا کہ نظام شمسی کے ارکان کی حرکتیں قانون غیر ممکن التیغیر کی تابع ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے یہ دعویٰ پیش کیا کہ زمین اور تمام اجرام سماوی آج سے کوئی چھ ہزار سال پہلے پیدا کئے گئے اور چھ دن میں نظام قدرت مرتب کر دیا گیا اور نباتات و حیوانات اور ان کی مختلف نوعیں روئے زمین پر آباد کر دی گئیں۔ جب شہادت مخالف کی گٹھڑی کا وزن اس قدر بڑھ گیا کہ پادریوں کی منطق کی کمرہ ہری ہو گئی تو انہوں نے بدرجہ مجبوری تاویل کا پہلو اختیار کیا اور وزن کو قرون میں تحویل کر دیا لیکن یہ جیل بھی کارگر نہ ہوا۔ چھ قرون اور چھ خاص پیدائشوں کا خیال اس اکتشاف کے سامنے نہ ٹھہر سکا کہ حیوانات کی نوعین بتدریج ایک دور میں نمودار ہو کر دوسرے دور میں منتہا نے بلوغ کو پہنچیں اور تیسرے دور میں رفتہ رفتہ فنا ہو گئیں۔ اس انطباق قرون و اددار کا توازن نہ صرف پیدائش بلکہ پیدائش کمر کا استغاضی ہے۔

پادریوں کو اس قول پر اصرار تھا کہ دنیا میں ایک ہمہ گیر طوفان آیا تھا جس کی موجیں اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چھا گئی تھیں اور یہ پانی ایک تندہوا کے چلنے سے خشک ہوا تھا۔ جب کہ ہوا اور سمندر کے عمق کے صحیح حالات معلوم ہوئے اور غل تجخیر کا بھی ٹھیک اندازہ ہو گیا تو طوفان دالابیان بھی ڈھکوسلا ثابت ہوا۔ نسل انسانی کے اولین سررٹوں کے متعلق پادریوں کا یہ بیان تھا کہ خدا نے انہیں جسمانی دوامی ہر اعتبار سے کامل بنایا لیکن بعد میں وہ اس ذریعہ کمال سے بچے گر پڑے۔ اس بیان کا بھی وہی حشر ہوا جو دوسرے بیانات کا ہوا تھا چنانچہ پادریوں کو یہ فکر پڑی ہوئی ہے کہ زمانہ قبل تاریخ کے انسان کی وحشیانہ حالت کے ثبوت میں شہادت کا جو روز افزوں انبار جمع ہو رہا ہے اُس سے عمدہ برا ہونے کی کیا سبیل اختیار کی جائے ؟

جب حالت یہ ہو تو اس میں کونسی تعجب کی بات ہے کہ اُن لوگوں کی تعداد جو کلیسا کے معتقدات کو ہزلیات و شیطیات سمجھنے لگے ہیں روز بروز بڑھتی جائے ؟ کیوں کر ممکن ہے کہ اُس مذہب کو جو دیکھی اور بوجھی ہوئی چیزوں کے متعلق ایفاشی غلطیوں میں مبتلا ہے ان دیکھی اور ان بوجھی حقیقتوں کا نکتہ آموز تسلیم کر لیا جائے ؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ مذہب جو جسمانیات میں ناکامیاب ہوا ہے اخلاقیات و روحانیات میں کامیابی کے ساتھ مقتدا و پیشوا ہو سکے ؟ کلیسا نے سائنس اور مذہب کے ان اختلافات کا تخیلہ ازراہ استحقار یہ کہہ کر کرنا چاہا ہے کہ "انہیں فریب نظر سمجھنا چاہئے" یہ بیہودہ جیلہ میں "یہ جہل علم نام کے مصنوعی کرشمے ہیں" یہ غلطیاں ہیں جنہوں نے اپنے چہرے پر حقیقت کا نظر فریب غاذول رکھا ہے۔ لیکن میں اس قسم کے جھکے فقرات سے بھی کام چلا ہے۔ سائنس کے حقائق و نڈر اور غاذول گواہ ہیں جو تیسیت کے دعوائے عصمت کا بلا خوف تردید ابطال کر رہے ہیں اور پادریوں کی آنکھوں کے سامنے اُن کی جہالت اور کورسوی

کا مجسمہ پیش کر رہے ہیں +

اتنی بہت سی خطاؤں اور لغزشوں کے ازکاب کی تصور و ادراک ٹھکر کر اب پاپائیت میں اتنا دم نہیں کہ بیان صفائی پیش کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے اب یہ رویہ اختیار کر لیا ہے کہ جہاں سائنس کا نام آیا اور وہ ایسی انجان بنی کہ گویا اس سے کبھی کی جان پہچان ہی نہ تھی۔ اور طرہ یہ ہے کہ اس پر بھی دیرین دلیری کی شان اسی گن بان کے ساتھ قائم ہے۔ باوجودیکہ واقعات کی قطاریں اس کی تفلیط متفیضہ تکذیب و تحقیق کرنے کے لئے مقابل میں صف بستہ کھڑی ہیں پھر بھی وہ برابر اپنی ضد پر قائم ہے اور معصوم ہونے کی وہی ایک بڑا اسکے جاتی ہے +

لیکن پاپا کو معلوم ہونا چاہئے کہ اُسے بجز ان حقوق کے جنہیں وہ از روئے عقل ثابت کر سکے اور کوئی حقوق نہیں عطا کئے جا سکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مذہبی معاملہ میں تو معصوم ہونے کا دعویٰ کرے اور علمی امور میں جب عصمت کا ذکر آئے تو اُسے قلم کا نوں پر دھرے عصمت عن بظہا جملہ امور پر حاوی ہے۔ اس سے مراد حرم و حریم و ہمہ شناسی ہے۔ اگر دنیاویات و آسمانیات پر اس کا اطلاق صحت کے ساتھ ہو سکتا ہے تو سائنس پر بھی ہونا چاہئے۔ مگر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ پاپائیت کی مسلمہ اجتہادی خطاؤں کو اس کے دعوئے عصمت کے ساتھ تطبیق دی جا سکے +

جب پاپا کا معصوم اور خطا سے مبرا ہونا ایک دعوئے بلا دلیل و قیاس بے بنیاد و توکیا وجہ ہے کہ اس کے اس مضامینہ کو رد نہ کر دیا جائے کہ پاپائی عقاید کی اشاعت دنیا میں جبر کا استعمال روا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اس قول کی سختی کے ساتھ تردید نہ کی جائے کہ بوجہ بد اعتقاد ہی کے جس کی زمانہ میں عام ہوا چل رہی ہے محکمہ اعتبار عقاید کا قیام لازمی و ضروری ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ فطرت انسانی کی زمانی وسعہ کو اس محکمہ کی حیثیت سفاکی اور جابرانہ تحریف سے علی رؤس الاشباد بیزاری کا اظہار نہ کیا جائے؟ کیا ایمان



یا ضمیمہ یا میزہ کو تمام دنیا کے مقابلہ میں ناقابل انتقال حقوق حاصل نہیں ہیں؟  
 کیسے لوگ مذہب اور زمانہ کے رجحان خیال کے درمیان ایک ایسا ناقابل عبور مسلک  
 قائم ہو گیا جس کا پاٹ لحظہ لحظہ زیادہ چوڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اس مذہب کو اس امر پر  
 ہے کہ گورانیان عقل پر ترجیح رکھتا ہے اور واقعات کے مقابلہ میں اسرار و اہام نہایت  
 وقعت کے قابل ہیں اس کو یہ دعویٰ ہے کہ حقایق فطرت کے کشاف اور حقایق الہامی  
 کے مبعوث ہونے کا حق بجز اس کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ وہ کتب مقدسہ کے تعلق پر اس  
 رائے کے تسلیم کرنے سے اعراض کرتا ہے جو موجود فن تنقید کے اصول کی رو سے  
 ظاہر کی گئی ہو اور حکم دیتا ہے کہ بائبل کی آیات کے وہی معانی صحیح سمجھے جائیں جو مفسرین  
 ٹرینٹ نے بیان کئے ہیں۔ وہ آزادی و حریت اور دستور و آئین کی نسبت اپنی نفرت کا  
 اظہار علانیہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان شخصوں کی خطا ناقابل درگزر ہے جو پاپا اور تہن  
 کے نام کی باہمی مصلحت کو دین امکان یا قرین صواب تصور کرتے ہیں۔

لیکن عیسٰی جو آج کل کے تہن کی علم بردار ہے پوچھتی ہے کہ اُسے دینا نو سنی دیوتا  
 کی تہذیب یا خاصہ فرسائی کا پابند کیوں بنایا جاتا ہے اور ان جاہل اور نکتہ ناشناس لوگوں  
 کی بادخوائی کے صحیح تسلیم کرنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے جن کے انجیلی کارنامے کلیسا کے  
 قرون اولیٰ سے تعلق رکھتے ہیں؟ عقل کہتی ہے کہ اُسے تنقید جامد اور اندھا و حند ایمان  
 میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی بلکہ ان ایسے ایمان کو نظر اشتباہ دیکھتی ہے وہ چاہتی ہے کہ  
 سچ و جھوٹ کے تیزانہ کے لئے قرین و ثوق ہونے کا جو عام قاعدہ اس وقت مروج  
 ہے اس میں اور زبان اصلاح ہو جائے۔ وہ ان مصنوعی روایتوں اور فرضی حکایتوں  
 کو صحیح مان لینا اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتی جو محض پادریوں کی مقصد برآری کے لئے  
 تصنیف کر لی گئی ہیں۔ وہ اس دلیل کو کہ چونکہ یہ قصص دروایات زمانہ قدیم سے چلے آئے  
 ہیں لہذا ضرور صحیح ہیں باور کرنے کی کوئی مقول وجہ نہیں پاتی اس لئے کہ اگر قدمت ہی سیما

صحت ہو تو کلیسا کی روایات کے مقابلہ میں بت پرستی کی روایات بہت زیادہ قدیم ہیں خود کلیسا کی درازی عمر کی وجہ ربانی حفاظت یا سادہ تائید نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے موم کی ناک بن کر اپنے آپ کو زمانہ کے ہاتھ کے حوالے کر دیا۔ اور جدھر کی ہوا چلتی دیکھی اُدھر کا رخ اختیار کر لیا۔ مجھ مذہب نصرانیت سے بھی بقدر کئی صدیوں کے زیادہ قدیم ہے۔ تو کیا اس قدامت سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ اُس کی روایات بمقابلہ نصرانیت کی روایات کے زیادہ صحیح اور زیادہ معتبر ہیں یہ حقیقت یہ ہے کہ کلیسا اس الزام سے اپنے آپ کو کسی طرح بری نہیں کر سکتا کہ اس نے اکثر موقعوں پر تاریخ میں دیونہ و دانستہ تدبیریں و تصرفات سے کام لیا اور تاریخی واقعات کا اختراع کر دیا رکھا۔ اگرچہ کلیسا کا اخلاق اس جھوٹے ظاہر ہوتا ہے کہ مقصد اگر مقدس ہو تو اس کی تکمیل کے ذرائع بھی خواہ وہ فی الحقیقت کیسے ہی ناروا ہوں پاک ہو جائے ہیں لیکن جو صورت یہاں بیان کی گئی ہے اُس پر یہ اخلاقی مقولہ صادق نہیں آتا۔

غرض نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ روحانی نصرانیت اور سائنس کے پیروان دونوں کے اجتماع کو اجتماع ضمیمہ سمجھنے لگے ہیں۔ دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں۔ ضرور ہے کہ ایک کی جگہ دوسرے سے ملے۔ بنی نوع انسان کو پاسبانہ کہ دونوں میں سے جس کو چاہیں پسند کریں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی وقت میں دونوں سائنس پر مستولی ہوں +

کیسٹھولک نصرانیت اور سائنس کو اس باغیر ساز و آرمائی میں مصروف چھوڑ کر جب ہم پراشٹنٹ نصرانیت اور سائنس کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مصالحت نہ صرف ممکن ہے بلکہ آسانی سے ہو سکتی ہے۔ پراشٹنٹ کلیساؤں کو اُس اصول پر عمل کر سنے کی توفیق ہو جو ان کو لوگوں سے ترکیں ملا ہے اور جتنے کئی سال کی جنگ و جدل سے لے کر سائنس و مروجہ مذہب کو دیا ہے۔ وہ اصول

یہ ہے کہ ہر شخص کتب مقدسہ کے مفسر ہونے کے اعتبار سے اپنا مجتہد آپ ہے۔ یہ اصول حریت عقلی کا سنگ بنیاد تھا۔ لیکن اگر آیات الہامی میں اجتہاد شخصی کو دخل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ صحیفہ فطرت کے معانی سمجھنے میں اس حق سے کام نہ لیا جاسکے۔ جو غلط فہمیاں اب تک واقع ہوئی ہیں ان میں فطرت انسانی کی کمزوری کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ واقعہ اصلاح کینڈہ کے بعد سالہا سال تک اگر لوگوں نے اس علت غائی کو جو محرک اصلاح بنی ہوئی تھی پوری طرح نہیں سمجھا اور ہمیشہ اس پر عمل نہیں کیا تو وہ قابلِ درگزر ہیں۔ کیلون نے جب سر ڈیٹس کو زنج آگ میں جلا دیا تو وہ اصول جنہوں نے اس وحشیانہ کارروائی پر اسے آمادہ کیا اصلاح کے سکھائے ہوئے منہ سے بلکہ کیتھولک نصرانیت سے اُسے ترک میں پہنچے تھے اور وہ ان کی قید سے اپنے آپ کو پوری طرح آزاد نہ کر سکا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس ان ذی اثر پرسنٹ پادریوں پر بھی یہی قول صادق آتا ہے جنہوں نے علمائے طبعین کو کافر و زندقہ ٹھہرایا۔ کیتھولک نصرانیت اگر سائنس کے ساتھ صلح کرنی چاہے تو اُس کے رستہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں موجد ہیں جو شاید ہی نہیں ہو سکتیں۔ لیکن پرسنٹ نصرانیت کا ملاپ سائنس کے ساتھ ہو سکتا ہے ایک کو منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کینڈہ و عناد اور دشمنی و عداوت کی منازل بغیر اٹلے کرنی پڑیں گی۔ دوسرے کو صرف دوستی تازہ کرنی پڑے گی جس میں غلط فہمی کی وجہ سے فرق آگیا ہے۔

۱۱۔ دوستی ہوئی ہی کب تھی جو تازہ ہو۔ کیا صفت کو وہ جان و مانع گایاں یا دنیوں میں جو تحریک اصلاح کینڈہ کے بانی بنائی مارن و مرنے غلام ذوال علم کی شان میں عموماً اور رسول کی شان میں خصوصاً تعقیف کی تھیں؟ کیا ڈیرہ کو خود اپنا ہی فقرہ بھول گیا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ واقعہ اصلاح کا سائنس کے سر پر ذرا سا بھی احسان نہیں ہے؟ کیا ڈیرہ کو اپنی یہ عبارت فراموش ہو گئی ہے کہ ”کھیسائے سہی کی دوزخ جہنم میں پرسنٹ و کیتھولک باوجود باہمی رفاقت کے اس امر میں متفق و متحد ہیں (بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۸۳)“

لیکن وہ عقلی خطرہ جو سچی دنیا میں بہت جلد نمودار ہوا چاہتا ہے خواہ ابتدائیں کیے  
 ہی نتائج کیوں نہ پیدا کرے لیکن اس میں تو شک نہیں کہ موجودہ نسل کا اس خطرناک  
 طور پر چپکے چپکے مذہب سے قطع تعلق کرتے جانا ایک دن پوسٹل رنگ لاکر رہے گا۔  
 فرانس اپنی رعایا کے طبقہ مافیل کے روحانی عقاید میں نیا رات کی سرپرستی معجزات  
 و کرامات کے صدور اور آسمانی نشانات کی نمائش کے ذریعہ سے از سر نو جان ڈال رہا  
 ہے لیکن اس کا یہ طرز عمل یہ معنی نہیں ہے۔ اس کے مقدر کا لکھا ان عملات میں حصہ  
 لینے پر اسے مجبور کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کی جبین عقل عرق انفعال سے تریب ہو  
 جاتی ہے۔ جرمنی نے قصہ کر لیا ہے کہ: خلائی عنصر کو خارج کر کے دو عقلی حکمت  
 کی قید سے آزاد ہو جائے اور اس اصلاح کو جسے تین سو سال قبل اس نے ناتمام  
 پھوڑا تھا تکمیل کے درجہ کو پہنچائے۔ یہ قصہ بھی ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ وہ وقت  
 قریب آگیا ہے کہ انسان جامہ و غیر متحرک مذہب اور متحرک و متحرک سائنس میں سے جس کو  
 (بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کہیں ان علوم کے جو ان کی سائنس میں کتب مقدسہ کے نفیض نہ ہوں اور کسی علم کو  
 سائنس اور روحانیت کی نظر سے دیکھا جائے؟

ہمارے جن ناخبرین نے اس کتاب کو باعتماد نظر پڑھا ہے وہ آسانی سے نتیجہ پہنچ گئے ہوں گے کہ سائنس  
 اور سائنس کا اجتماع ضیق کا اجتماع ہے۔ یورپ نے علوم و فنون اور تمدن میں جو ترقی کی ہے وہ مذہب آزاد ہو کر کی ہے  
 اور جوں جوں یہ ترقی بڑھتی جائے گی مذہب میں بے دینی و اعتقاد دینی اور دھرم کا زور بھی بڑھتا جائے گا۔ یورپین اہل  
 سائنس میں سے آج دو فیصدی بھی ایسے نہیں گے جو سچیت کی تعلیم کی حجت کے تو کینارہ کی ہستی کے بھی گور  
 صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ایمان کے قوسین میں عش کو جگہ دی ہے جس نے دنیا  
 میں شان و درایت پیدا کر دی ہے جس نے سائنس کی شریعت ہی سے سرپرستی کی ہے۔ اسلام کو اللہ تعالیٰ  
 عز و جل اور بن رشد بر فخر و ناز ہو سکتا ہے لیکن سچیت کے لئے فریاد گشتی و اللہ تعالیٰ اور کھیلے باعث  
 تنگ و غار ہیں۔

چاہے اختیار کر لے یا تو مذہب کا دامن پکڑ لے جو سرمایہ تسکین ہونے کے اعتبار سے  
محض قرون متوسطہ کے اوہام کا مجموعہ رہ گیا ہے اور یا سائنس کے پیچھے ہو لے جو شا  
زندگی کے قدم قدم پر برکتوں اور رحمتوں کے موتی برساتا جاتا ہے انسان کو ساش  
کی معراج پر پہنچا رہا ہے اور بنی نوع انسان میں اتحاد کی روح پھونک رہا ہے اس کی  
فتوحات محکم و دیر پائیں لیکن اس کا میا بی کا نور جو کیتھولک نصرا نیت کے ماتھے پر  
فلسفہ کے ٹکرائے کے بعد چمک سکتا ہے زیاد سے زیادہ اس شہاب ثاقب کے  
آنی و عارضی اور بے سود و بے مصرف نور کے مشابہ ہے جو آسمان سے زمین پر گرتا  
ہے +

اگرچہ گائیڈو کا یہ قول کہ کلیسا نے ہمیشہ جبر اور مطلق العنانی کا ساتھ دیا ہے بال  
صحیح ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی حکمت عملی کی باگ سیاسی ضرورتوں کے  
ساتھ میں ہے۔ کلیسا جو کچھ کرتا ہے انیس صدیوں کے متفقہ دباؤ سے مجبور ہو کر کرتا  
ہے۔ اس کے افعال میں تو شان مجیدی نظر آتی ہے ہی لیکن اس کی زندگی میں بھی  
اس قانون کی جھلک دکھائی دے رہی ہے جس کا عمل آج تک نہ ٹلا ہے ڈٹلے گا  
یعنی پاپائیت کا بھی وہی حشر ہو رہا ہے جو ہر تنفس کا ہوتا ہے۔ اس نے اول شیر  
خوار کی وطنولیت کا مرحلہ طے کیا۔ اس کے بعد سن رشد و بلوغ کی منزل میں قدم رکھا  
اور جب جو ش شباب کے ساتھ اس کی زندگی کا مقصد بھی ختم ہو چکا تو ضرور ہوا کہ  
یہ بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو اور سال خوردہ دنیا تو ان بڑھوں کی طرح اس کا مزاج  
چرچڑا ہو جائے۔ اس کی جوانی تو پلٹ کر آنے سے رہی۔ باقی رہا اس کی یاد و کاروں  
کا اثر سود البتہ قائم رہے گا۔ جس طرح بت پرست رومانے اپنا خستی سایہ سلطنت  
روما پر ڈال کر اس کی تکمیل کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا اسی طرح مسیحی رومان اپنا آخری

سایہ یورپ پر ڈال کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے \*  
 کیا تمدن جدید اُس ترقی کے جلد سے دست بردار اور کنارہ کش ہونے کے  
 لئے رضا مند ہو گا جس نے اس کی قوتوں اور خوشیوں میں اتنا بڑا اضافہ کیا ہے؟  
 کیا تمدن جدید رجعت قہقری کر کے قرون متوسطہ کی نیم وحشیانہ حالت داؤ لہم پرستی  
 دور کی طرف عود کرنے پر آمادہ ہو گا؟ کیا تمدن جدید اُس طاقت کا حلقہ گہوش بننا پسند  
 کرے گا جو اگرچہ ملہم من اللہ ہونے کی مدعی ہے لیکن کوئی صداقت نامہ ایسا نہیں  
 پیش کر سکتی جس سے اُس کا دعویٰ لائق اعتبار سمجھا جاسکے۔ وہ طاقت جس نے صد  
 سال تک یورپ کو جمود کی زنجیروں میں جکڑے رکھا ہے اور ہر اُس کوشش کو جو  
 ترقی کے لئے کی گئی ہے یا قواب آہن میں ڈبو دیا ہے یا شعلہ آتش میں جلادیا ہے۔  
 وہ طاقت جو عقل و تہذیب اور فہم و شعور سے اپنا مرتبہ اونچا سمجھتی ہے۔ وہ طاقت جو  
 حریت خیال اور آزادی تمدن سے متنفر ہونے کا اعلان علی رؤس الاسماء کرتی ہے۔  
 وہ طاقت جو اپنے اس ارادہ کو نہیں چھپاتی کہ موقع پائے ہی ان میں سے ایک کا  
 گلا گھونٹ ڈالے گی اور دوسرے کو سولی پر لٹکا دے گی۔ وہ طاقت جس کے  
 نزدیک یہ عقیدہ ہلک اور مجنونانہ ہے کہ آزادی ایمان و آزادی عبادت کا حق ہر  
 شخص کو حاصل ہے۔ وہ طاقت جو مذہب و تمدن سلطنتوں میں قانون کے ذریعہ  
 اس حق کے نافذ کئے جانے کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہے۔ وہ طاقت جو  
 ازراہ غایت استحقار اس اصول کی نفی کرتی ہے کہ زبان خلق کو جو نقارۂ خدا ہے  
 ضرور ہے کہ قانون کی شکل اختیار کرے۔ وہ طاقت جو مذہبی معاملات میں ذاتی رائے  
 کا حق ہر شخص سے چھیننے پر تلی ہوئی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ لوگوں کا فرض صرف  
 اسی قدر ہے کہ جو کچھ کلیسا کہے اُس پر ایمان لے آئیں اور جو حکم دے اُس کی  
 تعمیل بلا چون و چرا کریں۔ وہ طاقت جو کسی دینی حکومت کو کلیسا کے اقتدارات

کی تجدید اور اُس کے حقوق کی تعیین کا مجاز نہیں سمجھتی۔ وہ طاقت جو صاف الفاظ میں کہتی ہے کہ نافرمانیہ داروں کو تعیل حکم پر طوعاً و کرہاً مجبور کرنا اُس کے لئے نہ صرف جائز ہے بلکہ وہ ایسا ضرور کرے گی۔ وہ طاقت جو گھر کی پاک چار دیواری کا بھی ادب نہیں کرتی اور جو شخص اُس کی نظروں میں مشتبہ ہو اُس کی بی بی بیٹیوں اور نوکروں چاکروں کو بندیہ اعتراف سری اُس کا جاسوس و مخبر بناتی ہے۔ وہ طاقت جو بلا الزام لگانے والے کے مواجہ کے اس پر مقدمہ چلاتی ہے اور اُسے شکنجہ میں کھینچ کر خود اپنے ہی خلاف شہادت دینے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ طاقت جو والدین کے اس حق کو غصب کرتی ہے کہ وہ اس کے کلیسا سے باہر اپنی اولاد کو تعلیم دلا سکتے ہیں اور برہنہ صراحت کہتی ہے کہ لوگوں کی خانگی زندگی کی نگرانی اور معاملات نکاح و طلاق کا انضباط اُس سے متعلق ہے۔ وہ طاقت جو اُن لوگوں کو ڈھیٹھ اور دین دلیہ کہہ کر پکارتی ہے جو کلیسا کے اقتدار کو حکومت کے اقتدار کے تابع کرنا چاہیں یا جو کلیسا کو حکومت سے علیحدہ کرنے کے خواہشمند ہوں۔ وہ طاقت جس کو رد اداری و مسابقت کے نام سے چڑھے اور جس کا یہ دعویٰ ہے کہ ہر ملک میں عبادت کے دوسرے طریقوں کو موقوف کر کے صرف کیتھ لک مذہب ہی کو ملکی مذہب ہونے کا حق حاصل ہے۔ وہ طاقت جو یہ مطالبہ کرتی ہے کہ تمام وہ قوانین جو اس کے اغراض و مقاصد کی راہ میں حائل ہوں منسوخ کر دیئے جائیں اور جب یہ مطالبہ منظور نہیں ہوتا تو تمام اپنے پیروؤں کو ان قوانین کی خلاف ورزی کا حکم دیتی ہے ؟

چونکہ اس طاقت کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ کوئی کرامت یا معجزہ جس سے اس کی مطالبہ برآری ہو سکے اس سے عاویز نہیں ہو سکتا لہذا وہ بلا تامل حکومتوں کے خلاف سازشیں کر کے محکمہ انقضامن ہوتی ہے اور اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے جبر و تشدد کی قوتوں کے ساتھ اتحاد قائم کرتی ہے ؟

اس قسم کے دعاوی اور اس طرح کے مطالبات کے معنی یہ ہیں کہ تمدن جدید کے  
خبر من میں سرکشی و بغاوت کی چنگاری ڈال دی جائے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ موجود  
تہذیب و شائستگی کا قصہ منہدم کر دیا جائے خواہ اس کے نیچے کتنی ہی قویں کیوں نہ رہیں  
جائیں اور کیسا ہی بڑا نقصان دینا کو کیوں نہ پہنچ جائے۔ اگر لوگ ان مطالبات کو بلا چون  
چرا تسلیم کر لیں تو ہم سمجھیں گے کہ یہ حقیقت میں غلام ہیں +

جو معرکہ پیش آئے والا ہے اس کا نتیجہ ارباب عقل سلیم سے مخفی نہیں۔ ہر قوت جس کا  
دار و مدار جھوٹ اور دھوکے پر ہے مغلوب ہو جائے گی۔ ہر اس نظام کو جو تلبیس کا  
سرگز اور فریب دہی کا مصدر ہے جواب دہ ہونا پڑے گا کہ اسے قائم رہنے کا کیا حق  
حاصل ہے۔ ایمان کو عقل کے دباؤ میں حاضر ہو کر جو ابدی کرنی پڑے گی۔ ادھام دہا کر کے  
اپنی مسند و اوقات و حقایق کے لئے خالی کرنی ہوگی یذب کو اس خود مختار و حکمران  
سے دست کش ہونا پڑے گا جو اس نے ایک مدت میں سے بمقابلہ سائنس اختیار کر کے  
رکھی ہے۔ آزادی خیال کا علم بلند ہو کر رہے گا۔ پادریوں کو ان حدود کے اندر رہنے کا  
سبق سیکھنا ہو گا جو انہوں نے اپنے لئے اختیار کی ہیں اور فلاسفہ پر ظلم و فحش کر کے  
باز آنا ہو گا اس لئے کہ فلاسفہ اپنی روز افزوں قوت کے بھروسے اور اپنی نیک نیتی کے  
بل پر آئیں اپنے حریفوں کی مزاحمت اور دست اندازی کے رد و اوار نہ ہوں گے۔ حق سے  
دو ہزار تین سو سال پہلے عزت نے بابل کی بید مجنون سے چھائی ہوئی نڈیوں کے کنارے  
بیٹھ کر جملہ لکھا تھا اس کی صداقت میں آج بھی کلام نہیں بدلتا۔ ہمیشہ برقرار رہتا ہے اور  
اس کی قوت قائم رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور فتح اس کا ساتھ دیتی ہے +



کتابخانه

سخاوت علی اکبر آبادی (حیدرآباد دکن)

و

عبد القادر جنڈیالوی (کرم آباد پنجاب)

## GLOSSARY.

فہرنگ مصطلحات علمیہ

ذیل میں اوں علمی اصطلاحات کا ترجمہ ردیف وار درج کیا جاتا ہے جو اس کتاب میں آئی ہیں۔ اگرچہ یہ ترجمہ لفظاً و معناً کامل و مکمل نہیں ہے اور غالباً ارباب فضل و کمال کی ناقدانہ نگاہوں کو اس میں بہت سے نقائص محسوس ہونگے لیکن ایسی حالت میں جبکہ کوئی علمی لغات اردو زبان میں ایسی موجود نہ تھی جس سے مجھے اس کتاب کے ترجمہ میں مدد ملتی میں مجبور تھا کہ انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ اپنی سمجھ اور قابلیت کے موافق اولتاً سیدھا جیسا مجھے سے بن پڑے کروں اور اسے اس کتاب کے اخیر میں بطور ضمیمہ اس اعیان پر شامل کردوں کہ اگر کسی نکتہ سنج ادیب کی عنایت ان اصطلاحات میں سے کسی کا نعم البدل پیش کوسکی تو کتاب کی طبع ثانی کے وقت بشرطیکہ ملک سے اسے سند قبول عطا ہو اسے لحاظ سے تعمیم کردی جائیگی۔

اس فہرنگ کی ترتیب و تدوین سے میرا بڑا مقصد یہ ہے کہ اس سے اوں مترجمین کو جو آئندہ کسی علمی کتاب کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کریں ترجمہ میں مدد ملے اور جب کبھی کسی علمی تالیف یا ترجمہ میں اوں خیالات کے اظہار کی ضرورت پیش آئے جو اس فہرنگ کے الفاظ میں مرکوز ہیں تو یہی الفاظ استعمال کر کے ادب اردو کے علمی شعبہ میں اصطلاحی یکسانی پیدا کی جائے تاکہ جو دقتیں ایک ہی مفہوم کو مختلف الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کرنے کی بدولت آج کل میں پیش آرہی ہیں وہ رفتہ رفتہ رفع ہوئی جائیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جب تک علمی اصطلاحات کی ایک جامع لغات اردو زبان میں تیار نہ ہو جائیگی اسوقت تک تالیفات و تراجم کی تیاری میں موافقین و مترجمین کو برابر دقتیں پیش آئی رہیں گی اور ہر شخص ہر لکھے مفہوم کے لئے نئے لفظ گزہ کر زبان کی مشکلات میں اضافہ کرتا رہیگا۔ اس جامع لغات کی تیاری کا مسئلہ شاید

انجمن ترقی اردو علمی کڑہ کے زیر غور لیکن خدا جائے یہ لغات کب تیار ہو۔ چونکہ ترجمہ و تالیف کا کام اوسکے انتظار میں رکا نہیں رہ سکتا۔ لہذا مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو نئی علمی کتاب شائع ہو اوسکے آخر میں اوں مصطلحات کی فہرست شامل کر دی جائے جو اوسمیں آئی ہوں اور دوسرے مؤلفین و مترجمین بلحاظ ضرورت انہیں مصطلحات کا استعمال کرتے ہوئے انکے علاوہ اور جو نئی اصطلاحات قائم کریں انہیں بطور ضمیمہ اپنی کتاب کے ساتھ شریک کر دیا کریں۔ اسطور پر ایک بہت بڑا ذخیرہ علمی الفاظ کا جو اردو زبان کیلئے بطور قدر مشترک ہوگا جمع ہو جائیگا اور یہ ذخیرہ اوس مکمل و جامع لغات کی تیاری کو جسکی ضرورت انجمن ترقی اردو محسوس کر رہی ہے بہت زیادہ آسان کر دیگا۔

ظفر علی خان۔

Tavertine.	۱ جزائے کلسیہ متحجرہ	(الف)	
Star Occulta- tion.	احتجاب کواکب	Clepsydra.	آبی گڑھی
Scurvy.	احتراق خون	Fossils.	آثار متحجرہ
Aqueous rocks.	احجار آبی	Saw Mill.	آرہ کشی کی کل
Igneous rocks.	احجار آتشی	Spokes.	آرے (پہلے کے)
Metamorphic rocks.	احجار مستحیلہ	Firmament.	آسمان
Confusion of languages.	اختلاف اللہ	Glazing.	آئندہ بندی
Perturbation.	اختلال	Diocese.	ایوبیہ
Aberration of the fixed stars.	اختلال ثوابت	Sphinx.	ابو الہول
Free will.	اختیار	Elevation.	اہار
		Reunion.	اتحاد ثانی
		Chance.	اتفاق
		Detritus.	احراف

Obliquity of the Ecliptic.	اصول اعوجاج طریق الشمس -	Excommunication.	اخراج از کلیسا
Virtual Velocities.	اصول حقیقت سرعت رفتار -	Literature.	ادب
Communism.	اصول مساوات جانداد -	Sentiment of personality.	ادراک ذات
Principle of interference.	اصول مقاربت	Astronomical observation.	ارتصاد
Auricular confession.	اعتراف سرپی	Oscillation.	ارتعاش
Secession.	اعتزال	Earths.	ارضیات
Peripheral nerves.	اعصاب بیرونی	Geocentric.	ارضی الموتر
Vesicular nerves.	اعصاب منقوط	Consciousness.	استبصار
Obliquity.	اعوجاج	Efficacy of prayer.	استجاب دعا
Submergence.	اغراق	Metamorphosis	استحاله
Foreclosing of Mortgage.	اغلاق الوهن	Precession of the equinoxes	استقبال اعتدالین
Horizon.	افق	Induction.	استقرا
Satellites.	اقمار	Demonstration.	استقراء تمام
Centralization.	اكتتاز	Immaculate conception.	استقرار حمل بحالت دوشیزگی
Oxidation.	اکسداد	Deduction.	استنباط
Elixir.	اکسیر حیات	Cave lion.	اسد کهفپی
Theology.	الهیات	Cylinder.	اسطوانه
Hallucination.	التمس حواس	Bishop.	اسقف
Deposit.	التمام	Organic forms.	اشکال ذوی الاعضا
		Porisms.	اشکال کثیر النتائج

Samaritin.	بائبل کا نسخہ سامری-	Elohistic.	انوهیمی
Vulgate.	بائبل کا نسخہ لاطینی-	Revelation.	الہام
Reaction En- gine.	باخروہ استر جاعیہ	Bulging.	انتا
Dividing Engine	باخروہ انقسام	Absorption.	انجذاب
Calculating Engine.	باخروہ تخمین	Condensation.	انجماد
Visual Sense.	بامرہ	Deflection.	انحراف
Chance.	بخت	Stereotyping.	نطباع حروف مسبوکہ
Full moon.	بدر کامل	Refraction of light.	انعطاف ضیا
Heresy.	بدعت	Refraction of light.	انعکاس ضیا
Constellation.	بورج	Emanation.	انفصال
Serpentarius.	بورج ثعلب	Decomposition.	انفکاک
Orion.	بورج جوزا	Winter Sol- stice.	انقلاب شتوی
Cassiopeia.	بورج ذات الکرسی	Summer Sol- stice.	انقلاب صیفی
Reindeer.	بورانی بارہ سینکا	Incarnation.	انوار
Glacier.	بورف کا پہاڑ	Nutation of the Earth's axis.	اھتزاز معکور زمین
Inverse Vision.	بصارت مقلوب	Pyramids.	اھرام مصر
Voltaic pile.	بطاریہ کھر بائید	Faith.	ایمان
Paroxysm.	بطش شدید	( ب )	
Immortality of the soul.	بقائے روح	Septuagint translation of the Bible.	بائبل کا ترجمہ سبعینہ
Conservation of Force.	بقائے قوت		

Incarnation.	تجسد	Pawnbroking Establishment	فدھک نا ساھوکارہ
Anthropomorphism.	تجسیمیت	Legerdemain.	بھان منی
Censorship.	تحریم	Ellipticity.	بیضویت
Sowing machine.	تخم ریزی کی کل	(پ)	
Imagination.	تخیل	Pontiff : Pope.	پا پائے روما
Papal dispensations and indulgences.	تذکرات غفران پا پائی -	Papacy.	پا پائیت
Quadrature of the circle.	تربیع دائرہ	Rhinoceros leptorhinus.	پتلی تہوتہنی والا البتدا -
Filtration.	ترویق	Layer.	پرت
Fusion.	تسییم	Escapement.	پوزہ
Individualism.	تشخص	Creation.	پیدائش
Transfusion of blood.	تشریب خون	Stoics.	پیروان حکیم زینو
Disintegration.	تشعبیت	Sublapsarians.	پیروان مسئلہ تاخر تقدیر ہبوط -
Scepticism.	تشکیک	Supralapsarians.	پیروان مسئلہ تقدیر تقدیر ہبوط
Sublimation.	تصعید	(ت)	
Crucifixion.	تصلیب	Apotheosis.	تالیہ
Intercommuni- cation.	تعامل	Phases of the moon.	تبدلات قمر
Plurality of worlds.	تعدد عوالم	Anathema.	تبرا
Denudation.	تعریہ	Relics.	تبرکات
Emplacement.	تغیر مناظر کواکب	Glaciation.	تبرید
		Experiment.	تجربہ

(ج)		Schism.	تفرقه مذہبی
Plastic.	جابل	Canonization.	تقدیس الاموات
Necessity.	جبر	Calcination.	تکلیس
Particulars.	جزئیات	Inoculation.	تلقیم
Molecule.	جزو لا یتجزئ	Vaccination.	تلقیم البقری
Organism.	جسم ذوی الاعضا	Allusion.	تلمیح
Minority.	جماعت اقلین	Painting of the body.	تلوین بدن
Majority.	جماعت اکثرین	Common sense.	تمیز مشترک
Articulation.	حوز	Correlation of force.	تناسب قوت
Divine essence.	جوہر ربانی	Transmigration	تداسخ
Gnomon (Geometry.)	حیب	Incarnability of the celestial objects.	تذرہ فلکیات
Sine (Trigonometry.)	حیب مستوی		
(ج)		Equilibrium.	توازن
Spiral.	چکر	Energy.	توانائی
Spiral spring.	چکر دار کہانی	Pentateuch.	تورات
Lime stone.	چونے کا پتھر	Tattooing.	توشیم
(ح)		(ث)	
Omnipresent.	حاضر و ناظر	Second.	ثانیہ
Immaculate conception.	حبل بلا دنس	Dualism.	ثویت
Periodical sun.	حرارت آفتاب کا موقت اشتداد ہونا	Fixed stars.	ثواب
		Efficacy of alms.	ثواب خیرات

Diagonal.	خط اُزادیہ	Circular motions.	حرکات مستدیر
Tangent.	خط المماسنہ	Progressive motion of light.	حرکت نور پرسیل تدرج
Tropic of capricorn.	خط جدی	Alkalies.	حوضیات
Tropic of cancer.	خط سرطان	Calculus.	حساب
Cuneiform.	خط شریخی	Calculus of partial differences.	حساب اختلافات جزئیہ
Line of no variation.	خط عدم انحراف	Integral calculus.	حساب تمامی
Equinoctical lines.	خط معدل النهار	Differential calculus.	حساب جزئیات
Curved line.	خط مقوس	Double entry.	حساب مزدوج
Meridian line.	خط نصف النهار	Infinitesimal calculus.	حساب مقادیر لامتناہی
Vacuum.	خلاء	Book-keeping by double entry.	حساب و کتاب ذو اندراجین
Flexure.	خمیدگی	Resurrection.	حشر اُجساد
Supernaturalism.	خوارق عادات	Peat.	حشیش متعجر
Slide rest.	خیراد	Truth.	حق
Ventral chord.	خبط البطن	Fauna.	حیوانات
(د)		Mollusks.	حیوانات مفصلیہ
Antarctic circle.	دائرہ قطب جنوبی	Achromatic microscope.	نور دیدین بے رنگ (خ)
Arctic circle.	دائرہ قطب شمالی	Cave bear	خرس کھفی
Thrashing machine.	دالین چلانہ کی کل	Exodus.	خروج
Minute.	دقیقہ		
Cerebral light.	دماغی بینائی		



(ج)	Circumference.	دور
Heresiarch.	راس الملاحده	Circulation of blood. دوران خون
Reaction.	رد عمل	Tertiary period. دور ثالثه
Observatory.	رصد گاہ	Post Tertiary period. دور ثالثہ الاخری
Pendulum.	رقاص ساعت	Miocene period. دور ثالثہ اوسطی
Friction.	رگڑ	Quaternary period. دور رابعہ
Remontoir.	رمنتار	Glacial period. دور زمہریزیہ
Planing machine.	رنده کپی کل	Eccentrics. دوائر مختلف المراكز
Toleration.	رواداری	Balance wheel. دولاب تعدیل
Tradition.	روایت	Double star. دھوا ستارہ
Cotton gin.	روئی سے بنوئے جدا کرنیکی کل۔	Depression. دھس
Myrtle.	ریحان	Sun dial. دھوپ ٹہڑی
(ج)	Sun dial.	دھوپ ٹہڑی
Parallax.	زاویہ اختلاف منظر	Gnomon. دھوپ ٹہڑی کا کاتنا
Horizontal parallax.	زاویہ اختلاف منظر افقی۔	Ecstatic meditation. دھیان اور گیلان
Lens.	زجاجہ	Abbey. دیر
Greater inequality of Saturn.	زحل کی عدم مساوات اکبر۔	Theology. دینیات
Tertiary Age.	زمانہ تانیثہ الثالثہ جدید۔	Colossus. دیو ہینل مجسمہ
(د)	Calamite.	ذنب انفرس
Stone Age.	زمانہ حجریہ	Mammals. ذوات الثدي
Neolithic Age.	زمانہ حجریہ جدید	

Zenith.	سمت الراس	Palaeolithic Age.	زمانه حجره قديم
Canopus.	سهييل	Bronze Age.	زمانه نحاسيه
Semony.	سيمونيت	Heresy.	زندقة
(ش)		(س)	
Olfactory Sense.	شامه	Intransmissible term.	ساعت موقوت
Laurel.	شجرة الغار	Tropical year.	سال انقلابي
Depravity.	شقاوت	Sidereal year.	سال كوكبي
Ellipse.	شكل اهليلجي	Auditory sense.	سامعه
Hyperbola.	شكل بعيد البيضوي	Semitic.	سامي
Binomial Theorem.	شكل ذو عدد دين	Silhouette.	سايله سياه
Parabola.	شكل قريب البيضوي	Velocity of light	سرعت نور
Spheroid.	شكل مثيل كره	Predestination.	سر نوشت ازاي
Conoid.	شكل مثيل مخروط	Quadrangular plane.	سطح ذواربعة الزوايا
Statistics.	شمار و اعداد	Inclined plane.	سطح مایل
Comet.	شهاب ثاقب	Sophistry.	سفسطه
Meteoric stream.	شهابه متواليه	Papal Nuncio.	سفیر پاپا
Burning Mirror	شيشه آتشي	Congeries of stars.	سلسله الكواكب
(ص)		Cephalic Ganglia.	ساعة الراس
Thunder bolt.	صواعقه	Nervous Ganglia.	ساعة الاعصاب
Conservation of Force.	صیانت قوت	Forecastle.	سلوقيه

Ivy.	عشق پیچان	(ط)	
Infallibility.	عصمت	Coal bearing strata.	طبقات زغال
Grace.	عفو	Palaeozoic formations.	طبقات قدیمه تحتانیید-
Orthodoxy.	عقاید راشده	Stratum.	طبقه
Pleiades.	عقد ثریا	Physicists.	طبیعیین
Intellect.	عقل	Ecliptic.	طریق الشمس
Passive Intellect.	عقل انفعالی	Ordeal.	طریقہ ابتلا
Active Intellect.	عقل فعال -	Method of increments.	طریقہ اضافات
Universal Intelligence.	عقل کل	Derivative functions.	طریقہ : عمل استخراجی -
Individual Intellect.	عقل منفرد	Variations.	طریقہ تغیرات
Objective Intellect.	عقل موجود فیه استخراج -	Fluxions.	طریقہ تضایی
Subjective Intellect.	عقل موجود فیه الذهن -	Metric system.	طریقہ محاسبه
Dogma.	عقیده مذهبی	The Deluge.	طوفان نوح
Panthelism.	عقیده همه اوست	Longitude.	طول البلد
Notation.	علامات نویسی	(ع)	
Cause.	علت	Ectasy.	عالم حال
Final cause.	علتہ العلی	Digit.	عدد مفرد
Secondary cause.	علت ثانوی	Nonentity.	عدم
Gnomon.	علم	Latitude.	عرض البلد
Metallurgy.	علم استخراج معنیات -	Transubstantiation.	عشایه ربانی

Spherical trigonometry.	علم مثلث کروی	Jurisprudence.	علم اصول فقه
Optics.	علم مناظر و مرآیا	Harmonics.	علم الاصوات
Botany.	علم نباتات	Economics.	علم الاقتصاد
Astronomy.	علم هیئت	Anthropology.	علم الانسان
Profane learning.	علوم دنیویہ	Mythology.	علم الافان
Sacred learning.	علوم دینیہ	Psychology.	علم النفس
Mechanical.	علمی سیل الاضطراب	Dynamics.	علم تحریک اجسام
Theoretically.	علمی سیل النظر	Anatomy.	علم تشريح ابدان
(ع)		Physiology.	علم تشريح اعضا
Incandescent gas.	غاز مسکوقد	Topography.	علم تعین بلدان
Calend.	غره عامه	Mechanics.	علم جز تقیل علم حركات وحیل
Opaque.	غیر شفاف	Meteorology.	علم حوادث الجو
Endless screw.	غیر متناهی پیچ	Zoology.	علم حیوانات
Amorphous.	غیر منظم شکل	Medicine.	علم طب
(ف)		Geology.	علم طبقات الارض
Safety lamp.	فانوس سلامتی	Physics.	علم طبیعیات
Theological odium.	فتوای بدعت	Conic sections.	علم فصل مندرجی
Hippopotamus amphibious.	فروس البحر ذو عضوین	Scholasticism.	علم کلام
Gnostics.	فرقه ادویه	Chemistry.	علم کیمیا
Sectarianism.	فرقه بندی	Hydrostatics.	علم معانیات
		Trigonometry.	علم مثلث

Pharmacopoea.	قرا با دین	Stoics.	فرقہ جبریدہ
Conjunction of planets.	قران سیارگان	Agnostics.	فرقہ لا اداریہ
Fate.	قسمت	Reaping machine.	فصل کے لاونی کوئیکی کل
Ecclesiasticism.	قسسیت	Space.	فضا
Destiny.	قضا و قدر	Genius.	فطانت
Pole. *	قطب	Metallic Oxide.	فلزاتی انسید
Greater or Equatorial diameter.	قطر استوائی یا قطر اکبر	Platonism.	فلسفہ اشراقیہ
Less or Polar diameter.	قطر قطبی یا قطر اصغر	Neo Platonism.	فلسفہ اشراقیہ جدید
First inequality of the moon.	قمر کی عدم مساوات اولین	Peripateticism.	فلسفہ مشائخہ
Evection.	قمر کی عدم مساوات ثانیہ	Annihilation.	فنا
Force. *	قوت	Theosis.	فنا فی الہی
Perpendicular force.	قوت عمودی	Hermeneutics.	فن تفسیر نگاری
Oblique force.	قوت غیر مستقیم	Horticulture.	فن چمن بندی
Electro magnetism.	قوت مقناطسیہ کھر بائیہ	Mammoth.	فیل شعرانی
Hypothesis.	قیاس	(ق)	
(ک)		Inflammability.	قابلیت اغطرام
Universe.	کائنات	Refrangibility.	قابلیت انعطاف
Genesis.	کتاب پیدایش	Omnipotent.	قادر عطا ق
Tile Library.	کتاب خانہ خشتی	Canon law.	قانون دینیہ
		Immutable law.	قانون غیر متغیر
		Efficacy of litanies.	قبولیت استغفار

Tube rose.	گل شب بو	Holy Scriptures	کتاب مقدسه
Ranunculus.	گل شقایق نعمانی	Density.	کثافت
Marigold.	گل صدبرگ	Polygamy.	کثرت ازدواج
Mowing machine.	ماشین کاشنه کپی	Pollysyllabic.	کثیر الہجا
Chronometer.	گھڑی	Cardinal.	کودینال
		Rhinoceros with chambered nostrils.	گرمردن مشبک المانجر
( ل )		Sphere.	کرہ
Agnosticism.	لا ادراکیت	Armillary sphere.	کرہ فلکی
Atheism.	لا عذہبی	Ark.	کشتی نوح
Llamaism.	لامائییت	Gravity.	کشش ثقل
Antennae.	لامسہ زونیکے	Atonement.	نقارہ
Anchor.	لنگر ( گھڑی کا )	Dead beat.	نلالہ
Rifled gun.	لولی انتغویب ( بندوق )	Carbonite of lime.	کلس مفحم
( م )		Universals.	ذاتیات
Matter.	مادہ	Church.	کلیسا
Antidulivian.	مقابل طوفان	Amber.	کهر با
Ultramontane.	ماوراء الجبال	Offing.	کہلا سمندر
Half moon.	ماہ نیم ماہ	Chemical laboratory.	کیمیا خانہ
Automaton.	متحرک بالذات		
	گل	( گ )	
Retina	متشبکہ	Rotaion.	گردش

Madoñna.	مریم عذرا
Reflecting sex- tant.	میزوله انعکاسی
Land survey- ing.	مساحت
Undulatory theory of light.	مسئله ارتعاش نور
Evolution.	مسئله ارتقا
Antepodes.	مسئله تقابلی زمین
Fatalism.	مسئله تقدیر
Nebular theory	مسئله ضبابینه النجوم
Theory of the Fall.	مسئله هبوط آدم
Equation of the centre.	مساوات مرکز
Quadratic Equations.	مساوات درجه چهارم
Cubic Equa- tions. -	مساوات درجه سوم
Equidistant.	مساوی البعد
Rectangle.	مستطیل
Prolate.	مستطیلته القطبین
Oblate.	مسطح القطبین
Mastodon.	مسطودان
Observation.	مشاهده

Mystics.	مذصفین
Duplex.	مثنی (گهزی یا پوزه)
Rhapsody.	مچذبانه بر
Solids.	مجسمات
Pandects of Justinian.	مجلته القوانين جستینین
Synod.	مجلس عامه
Oecumenical Council.	مجلس عمومی
Metropolitan.	مجلس مطرانیه
Cathedral chapter.	مجمع الکلیروس
Magianism.	مجو سیت
Convex.	محدب
Gibbous.	محدب التلویز
Apocryphal.	مخبرف
Inquisition.	مخندہ احکساب مقتاید
Axis.	محور
Resistance.	مدافعت
Orbit.	مدار
Averroism.	مذهب ابن رشد
Anthropocen- tric.	مركز المزمز
Transit of Venus.	مرور زهره

Zodiac.	منطقه البروج	Greater inequality of Jupiter.	مشتري کی عدم مساوات اکبر
Torrid Zone.	منطقه حاره	Lithography.	مطبع سنگ
Temperate Zone.	منطقه معتدله	Purgatory.	مطهر
Panorama.	منظر وسیع	Phenomenon.	مظهر
Self luminous.	منیر	Rationalism.	معقولیات
Table of chords.	میزان الاوتار	Laboratory.	معمل
Eolipile.	میزان البخار	Reagent.	معیار ( کیمیا )
( ن )		Minima.	مقادیر اقل
		Maxima.	مقادیر اکثر
Herbivorous.	نباتات خوار	Indeterminate quantities.	مقادیر غیر معینہ
Salvation.	نجات	Destiny.	مقدر
Asteroid.	نجم	Holy Virgin.	مقدس دوشیزہ
Geocentric system.	نظام ارضی	Contemporaneous magnetic disturbances.	مقتضای اختلافات در حوادث متعاصرہ
Heliocentric system.	نظام شمسی	Parallaetic rules.	مقدمات اختلاف مناظر کواکب
Pythagorean system.	نظام فیثا غورث	Indicator (distance.)	مقیاس المسافت
Theory.	نظریہ	Spectroscope.	مقیاس - الوان نور منشور
Intellegent Principle.	نفس ناطقه	Encyclical Letter.	مکتوب عمومی
Locomotion.	نقل و حرکت		
Naturalism.	نیچریت		





(۱)	ہندی	(۲)	واحد الہ جا
Bill of exchange.	ہندی	Monosyllabic.	واحد الہ جا
Reptiles.	ہوام الارض	The Reformation.	واقعہ اصلاح کلیسہ
Templar Knights.	ہیکلیبن	Chord (Trigonometry.)	وتر
Chaotic mass.	ہیولی	Primordial Existence.	وجود اولین
(۱)			
Sabbath day.	یوم السبت	Monotheism.	وحدانیت
Jehovistic.	یہو وائی	Specific gravity.	وزن مخصوص





آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مسکعار  
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی  
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

---

# جامعہ پٹنہ

۱۔ اکبر بن علی کا مجلس تھا، بعض اوقات ایک ایک لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔  
 ۲۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ کی کتابیں ایک ایک لکھنؤ میں رکھی گئیں۔  
 ۳۔ علی بن ابی طالب کے زمانے میں ایک ایک لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔  
 ۴۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ کی کتابیں ایک ایک لکھنؤ میں رکھی گئیں۔  
 ۵۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ کی کتابیں ایک ایک لکھنؤ میں رکھی گئیں۔  
 ۶۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ کی کتابیں ایک ایک لکھنؤ میں رکھی گئیں۔  
 ۷۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ کی کتابیں ایک ایک لکھنؤ میں رکھی گئیں۔  
 ۸۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ کی کتابیں ایک ایک لکھنؤ میں رکھی گئیں۔  
 ۹۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ کی کتابیں ایک ایک لکھنؤ میں رکھی گئیں۔  
 ۱۰۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ کی کتابیں ایک ایک لکھنؤ میں رکھی گئیں۔







